خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
دسمبر 2020
بانی
معراج رسول
صفحات 290
قیمت 100 روپے
PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

سسپنس ڈائجسٹ

CPNE — MEMBER APNS

مدیراعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333 3285269

جلد49 • شمارہ 12 • دسمبر 2020 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021)35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ٭ مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ٭ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

جنتا رضی

میرا خیال ہے کہ چیل کوّے، چڑیاں، سانپ، بچھو، نیولے، کن سلائیاں، گلہریاں، تیتّے، بھڑیں، مچھّر، مچھلیاں، کچھوے، گائے بیل، کتّے، شیر اور ہاتھی...... اور شاید بندر اور لنگور بھی خواب نہیں دیکھتے۔ یہاں خواب سے خواب کا ایک خاص مفہوم اور ''دماغ'' کا ایک خاص عمل مراد ہے۔

منطق نے انسان کو ''حیوانِ ناطق'' کے خطاب سے نوازا ہے اور میں اسے ''خواب دیکھنے والا جاندار'' قرار دینے کی خواہش رکھتا ہوں۔ یہاں میں یہ بات دُہرادوں کہ خواب سے ''دماغ'' کا ایک خاص عمل مراد ہے۔ میں نے ''ذہن'' کے بجائے دماغ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے جس کا بیان کرنا اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ بہرحال خواب کے عام مفہوم کے مطابق انسان کے علاوہ بہت سے دوسرے جاندار بھی خواب دیکھ سکتے ہیں مگر دماغ کے ایک خاص عمل کے مفہوم کی رو سے صرف انسان ہی خواب دیکھتا ہے اور اس کی یہ خصوصیت اس کی بے حد اہم فضیلت ہے۔

اس خصوصیت کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے، بد سے بہتر اور بہتر سے بہترین کی خواہش۔ میں یہ بات فرض کرنے کی ادنیٰ اہلیت بھی نہیں رکھتا کہ ہرن، نیل گائیں اور پاڑے ایک ایسے جنگل کا خواب دیکھ سکتے ہوں گے جہاں وہ شیر اور چیتے کی خوں خواری سے محفوظ رہ سکیں یا چھوٹی مچھلیاں ایک ایسے سمندر کو تلاش کرنے کی تحریک چلا سکتی ہوں گی جس میں وہ بڑی مچھلیوں کے ''سامراج'' سے چھٹکارا پاسکیں۔

تو ہے یوں کہ جانداروں میں صرف انسان ہی وہ جاندار ہے جو خواب دیکھتا ہے اور خواب دیکھنے کی جزا یا سزا پاتا ہے۔ انسانوں میں جو انسان سب سے زیادہ پرمایہ اور دراز سایہ خواب دیکھتے اور دکھاتے ہیں وہ حکیم، فلسفی اور شاعر کہلاتے ہیں۔ اگر انسانوں کے علاوہ دوسرے جاندار بھی خواب دیکھ سکتے تو ان میں بھی حکیم، فلسفی اور شاعر بیدا ہوتے۔

...ر کی نسل تو فنا ہوگئی لیکن ہاتھی اپنے حجم اور ضخامت کے اعتبار سے اس امر کا حقدار ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے سامنے یہ اعلان کرتا کہ میں تمہاری فلاح اور بہبود چاہتا ہوں اور تمہیں نجات کی راہ دکھانے آیا ہوں۔

لیکن میری معلومات کے مطابق کسی بھی مغربی، افریقائی اور مشرقی ہاتھی نے کسی بھی دور میں اپنی حاکمیت کا اعلان نہیں کیا اور یہ کہ انہیں بد سے ''بہتر'' اور بہتر سے ''بہترین'' کی امید نہیں دلائی۔

ہاں تو خواب دیکھنے اور دکھانے کی بات ہو رہی تھی اور عرض کیا گیا تھا کہ خواب دیکھنا انسان کی بے حد اہم فضیلت ہے (یا شاید سب سے بڑی فضیلت ہے) اگر کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ خواب دیکھنے کی اہلیت سے محروم ہو تو اس پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

انسانیت کی ساری سرگزشت اور تہذیب کی ساری روداد دراصل خواب دیکھنے اور خواب دکھانے والوں کی ماجرا طلبی اور ماجرا سازی کی سرگزشت اور روداد ہے۔ خواب انسانیت کا سب سے زیادہ قیمتی اندوختہ اور سرمایہ ہیں۔ اگر یہ اندوختہ اور سرمایہ نہ ہوتا تو انسان ''نسناس'' جیسی کوئی ''شے'' ہوتا اور وہ آج بھی اسی حالت اور ہیئت میں پایا جاتا جس حالت اور ہیئت میں آج سے لاکھوں برس پہلے پایا جاتا ہوگا۔

جو لوگ اپنے اور اپنی نوع کے دوسرے لوگوں کے لیے خواب نہیں دیکھتے، وہ نیم انسان ہوتے ہیں۔ خواب دیکھنا اپنے میں اپنے آپ سے آگے ہوتا ہے۔ جو شخص یا جو معاشرہ خواب دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ اپنے آپ میں اپنے سے پیچھے ہوتا ہے یا کم سے کم وہیں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے اور وہیں کا وہیں رہتا ہے اور اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

ہیں۔ جب یہ کسی کے دماغ پر قبضہ کر لیتی ہیں تو اس کا انجام بھی الیگزینڈر جیسا ہی ہوتا ہے۔ تنہائی، محرومیاں اور ناکامیاں اس کا مقدر ٹھہرتی ہیں۔ مرزا امجد بیگ صاحب اس بار ''مارِ آستین'' لے کر آئے۔ جابر نے اپنے بھائی کی مدد نہیں کی۔ حرص و ہوس وہ بوری ہے جو کبھی بھرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنے بھائی کے ساتھ بنا کر رکھتا اور اس کے زیرِ سایہ رہتا تو اپنی زندگی سے ہاتھ نہ دھوتا۔ بحث میں الجھنے کے بجائے میں تو یہ کہوں گا کہ مارِ آستین دراصل جابر خود تھا جس نے ہر قدم پر اپنے بھائی کے ساتھ فراڈ کیا اور اس کی دولت ہڑپ کر بیٹھ گیا۔ بہرحال اس سلسلے میں بیگ صاحب داد کے مستحق ضرور ہیں کہ انہوں نے عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر کے اپنے موکل کو بری کروالیا۔ اس کہانی میں کافی معلومات بھی ہیں جس کے لیے جناب حسام بٹ صاحب تعریف اور داد کے مستحق ہیں۔ محمد الیاس کی ''ہمدردی'' بھی ایک سبق آموز تحریر ہے۔ ہمدردی کی آڑ میں رشتوں کا خون کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ کل ان کے ساتھ بھی یہ ہو سکتا ہے۔ ثمرہ کا جواب زبردست ہے۔ یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ آج کل لوگ ظاہری شکل وصورت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ''ساش'' کا آٹھواں حصہ بھی ٹھیک ٹھاک آگے بڑھ رہا ہے۔ کہانی کا ٹیمپو کچھ سلو ہے۔ خیر آگے بھی بہت کچھ سامنے آئے گا۔ ''حسد کی آگ'' تنویر ریاض نے کافی اچھی لکھی۔ کچھ فیصلے اچانک ہو جاتے ہیں اور کچھ کے لیے برسوں سوچنا پڑتا ہے۔ باقی کہانیوں میں ''پراسرار محبت'' (کاوش صدیقی)، صبا شفق کی ''سازش'' اور ضیا تسنیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریر ''پیر اولیا'' بہت پسند آئیں۔ (اس قدر خوب صورت اور جامع تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا اور آپ کا شکریہ بھی)۔''

✠ محمد سرفراز تانڈا خرم شہزاد فیصل آباد سے ''ہر ماہ تحریر سسپنس کے ابتدائی صفحات پر ماہ بہ ماہ محترمہ زویا اعجاز کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ان کے انتخابات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں نئی منزلیں سر کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کہانی کا مرکز ایک ہی کردار چنیدہ ہو تو پڑھنے والے اثر سے محروم نہیں رہ جاتے ورنہ عموماً دیکھنے میں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے جنگ وجدال کو ہی اپنا محور بنا رکھا تھا اور ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ''عسکری'' کلاس پڑھنے والوں کو میدانِ جنگ کی جزئیات سے بہرہ مند کیا جا رہا ہے۔ ماضی کی جنگیں ایک حقیقت ہیں مگر انسان ماضی قریب اور حال میں زندہ رہتا ہے اور ماضی بعید میں ہر ایک کا دلچسپی لینا بعید از قیاس ہوتا ہے۔ بلاشبہ زویا اعجاز نے سسپنس کے ابتدائی صفحات کے اس تاثر کو کم کرنے کی لائقِ ستائش کوشش کی ہے۔ تاہم نہیں پیار ومحبت، جنگ وجدال کے ماضی میں سے مساواتِ انسانی، اخلاق، انصاف، کردار [illegible] جیسے واقعات [illegible] بھی احاطۂ تحریر میں لانا چاہیے۔ دوسری طرف بھارتی فلم انڈسٹری نے گزشتہ دہائی میں مسلم حکمرانوں، کرداروں کی [illegible] کردار کشی کرتے ہوئے گمراہ کن فلمیں بنائی ہیں جن میں پدماوتی، اورنگزیب، ٹیپو، [illegible] چندر گپت، [illegible] ہیں۔ سسپنس اور اس کے مصنفین کو اس بارے میں ایک فہرست مرتب کر کے اصل حقائق سامنے لا کر اپنی قومی ذمے داری [illegible] چاہیے۔ ''ساش'' کا سفر دلچسپ اور موضوعاتی تبدیلی کا حامل ہے۔ [illegible] جاوید شاہ صاحب کی غیر حاضری کھٹکتی ہے۔ [illegible] سے ڈسے ہوئے ہیں۔ تصوف کا سلسلہ بھی بے مثال ہے۔''

✠ رمضان پتافی کراچی سے خط لکھ رہے ہیں ''سب سے پہلے محفل یاراں کے ایک دوست ریاض بٹ سے بات کروں گا۔ [illegible] صاحب آپ کو میرے خطوط میں کون سی خوبی یا ندرت نظر آئی جو آپ کو میرے خط کا انتظار رہتا ہے۔ وہ سیدھا سادہ سا مختصر تبصرہ ہوتا ہے۔ آپ اختصار کے شیدائی ہیں تو اور بات ہے بہرحال آپ کے حسنِ نظر کا شکریہ۔ آئندہ بھی [illegible] ملاقات ہوتی رہے گی انشاء اللہ۔ [illegible] اب تازہ شمارے پر تبصرہ۔ ناقابلِ بیان وجوہات کی بنا پر اس بار پورا پرچہ نہیں پڑھ سکا البتہ چھوٹی کہانیاں تمام ہی پڑھ ڈالیں، سو تبصرہ حاضر ہے۔ ''رقیب'' کیا مغرب میں بھی ایسے عاشق ہوا کرتے ہیں، یہ تو ہمارے مشرق کا حصہ ہے۔ ''چابک'' [illegible] گھریلو کہانی تھی۔ دیت [illegible] بہت آیا۔ ''عشق بلاخیز'' اس کہانی میں وہ مزہ نہیں آیا جو ایسی کہانیوں میں آنا چاہیے تھا۔ حسد کی آگ پسند نہیں آئی۔ ''مارِ آستین'' امجد صاحب کو اس بار روایتی ڈھنگ کا کیس ملا ہے۔ عدالتی کارروائی میں خوب مزہ آیا۔ آخر میں سسپنس کے ذہین قارئین سے ایک سوال۔ عاجز اتنا ذہین تو نہیں ہے البتہ اس ناچیز کی عقل کہتی ہے کہ دونوں ہی خواتین مارِ آستین تھیں۔ ''ہمدردی'' اس کہانی نے تو دل میں چھید کر دیا۔ ''سازش'' نے بھی دل موہ لیا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ آخر میں ایک اہم بات معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا خط آپ کو کس تاریخ تک مل جانا چاہیے۔ سسپنس میں اعلان کیجیے۔ (محترم قارئین! آپ سب کے خطوط اگر ہمیں ہر ماہ کی 15 سے 20 تاریخ تک مل جائیں تو بہ آسانی محفل میں شرکت کی جا سکتی ہے)۔''

✠ ماسٹر رازق بخش ذکی آہیر، جلال پور پیروالا سے ''نومبر 2020ء کا سسپنس ملا۔ اس بار تو سرورق کے لیے ایک

خوبصورت حسینہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ویری گڈ۔ سرورق کا دلکش اور خوبصورت ہونا ضروری ہوتا ہے۔ سب سے پہلے جون ایلیا کے انشائیہ ''نجات'' سے ملاقات کی پھر خطوط کی محفل میں چلے گئے۔ بھائی ریاض بٹ کی شفایابی کا معلوم ہوا تو خوشی بھی ہوئی اور دعا بھی کی اور اللہ کا شکر بھی کیا۔ انہوں نے مجھے بھی یاد کیا، ان کا دلی شکریہ۔ اس کے بعد سلسلہ دار کہانیاں جن کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اسما قادری کی ''شہ زور'' اور پھر عمر عبداللہ کے ''ساشا'' کا مطالعہ کیا۔ یہ قسطیں زبردست تحریر کی گئی ہیں۔ پڑھ کر کچھ حیرانی، کچھ پریشانی، کچھ سکون اور بہت کچھ انتظار کی شدت محسوس کی جو اگلے شمارے تک رہے گی۔ یہ دونوں بہترین قلم کار ہیں۔ اب کچھ دوسری کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ ''چارا'' کی سویرا نے سہاگ بچانے کے لیے اپنی بہن سوہا کو بطور چارا استعمال کیا تو جب سوہا کو پتا چلا تو اس نے بہن کو سزا دینے کے لیے بہنوئی ثاقب کو قتل کر دیا۔ سوہا کا پہلے بہنوئی سے محبت اور پھر اس کا قتل دونوں اقدام غلط ہیں۔ ظفر اقبال ظفر کی ''عشقِ بلاخیز'' میں سارا قصور میڈم قیصرہ کا ہے۔ ان جیسے لوگوں کو ادارے میں کوئی خاص ذمے داری نہیں دینی چاہیے۔ ہر ادارہ خیال کرے۔ ''مارِ آستین'' کی فریدہ نے شوہر جابر کو مارا۔ اس کے بے گناہ بھائی ناصر کو پھنسایا۔ فریدہ کو جائداد کی لالچ اور چوتھا شوہر بھی کرنا ہو سکتی ہے اور جابر باپ کا نافرمان، بڑے بھائی سے وعدہ خلافی اور پھر بیوی سے بے وفائی پھر ایسوں کو تو بیوی فریدہ جیسی آستین کا سانپ ملتی ہے۔ یعنی جیسی نیت ویسی مراد۔ ''سازش'' کی مکار رمشا کو عارش نے ٹھکرا کر عریشہ کا انتخاب کیا، اچھا فیصلہ ہے۔ رمشا ان دونوں سے مکاری کر چکی تھی اس وجہ سے عارش کو کھو چکی۔ رمشا کے ستائے ہوئے عارش اور عریشہ دونوں ایک ہو گئے۔ صبا مغل کی یہ کہانی خوبصورت ہے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ محفل شعر و سخن میں بھائی ریاض بٹ اور لبنیٰ وکیل کوئٹہ اور طاہر مجاہد پھالیہ کے شعر پسندیدہ ہیں۔''

☒ چودھری محمد رفیق مہر کا گزشتہ شمارے پر تبصرہ گوجرانوالہ سے۔ ''کورونا وائرس کے بعد بیروزگاری، بڑھتی ہوئی مہنگائی نے عوام کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ برسرِاقتدار طبقے نے مہنگائی کے جن کو قابو نہ کیا تو تبدیلی کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی اور پھر عوام پوچھ سکتے ہیں، بقول شاعر ''ادھر ادھر کی نہ تو بات کر یہ بتا...... کارواں کیوں لٹا تیری راہبری کا سوال ہے۔'' ایک بات اور ذخیرہ اندوزوں کو جرمانے کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر آپ کسی کو لاکھ دو لاکھ جرمانہ کرتے ہیں، مصنوعات کی قیمت بڑھا کر دس لاکھ وصول کرتے ہیں۔ ان کو سرِعام کوڑے مار دو تاکہ دوسرے عبرت حاصل کریں۔ اب ہو جائے موجودہ شمارے 2020ء کی بات تو سب سے پہلے زویا اعجاز کی ''بے منزل مسافر'' پڑھی جو کہانی کا آخری حصہ تھا۔ آزادی کے متوالے پائلے خان سے واسطہ پڑا مگر کہانی کا انجام خلافِ توقع تھا۔ اس کے بعد حضرت جنید بغدادیؒ پڑھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کا نام پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ ضیا تسنیم صاحبہ ہم آپ کو ڈائجسٹ میں خوش آمدید کہتے ہیں، تشریف لاتی رہا کریں۔ مجھ جیسے کم علم انسانوں کو اپنے مضامین سے مستفید فرماتی رہا کریں، شکریہ۔ اسما قادری کی ''شہ زور'' کی یہ قسط مجھے الجھن میں ڈال گئی۔ کہانی کے ہیرو معاذ سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی ہمت ہار کر دشمنوں کے چنگل میں جا پھنسے گا۔ عمر عبداللہ کی ''ساشا'' بھی ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ ہیرو صاحب اب سانپوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ ملک صفدر حیات کی ''غور طلب'' میں یہی سوال غور طلب تھا، زر، زمین اور زن ناجائز طریقے سے حاصل کرنا یہ تین چیزیں شیطان کے ہتھیار ہیں۔ ان کا لالچ دے کر ہی انسانوں کو تباہ و برباد کرتا ہے۔ جہاں شیطانی منشور پر عمل ہو وہاں لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں وہاں قاتل اور مقتول بھی ہوتے ہیں۔ کبیر عباسی کی ''زندان'' ایک باپ بیٹے کی محبت کی داستان تھی۔ باقی چھوٹی کہانیاں بھی ٹھیک ہی تھیں۔ آپ کے خط کی محفل میں پہنچے تو کرسی صدارت پر شاہانہ سلطان تشریف فرما تھیں۔ شاہانہ مبارک باد قبول فرمائیں۔ محمد انور ندیم صاحب میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ بابر عباس اور فضل عباس صاحبان آپ کا مجھے ذہین سمجھنا آپ کی ذرہ نوازی ہے۔''

☒ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں سے گزشتہ شمارے پر تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''خوش رہیں، شاد رہیں۔ رب کائنات سے امید کرتا ہوں کہ آپ اور سسپنس کے دیگر اراکین خیریت سے ہوں گے اور جبکہ آپ لوگوں کی مزید خیریت کے لیے میں خدائے بزرگ و برتر کے حضور دعا گو ہوں۔ خدا آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، (آمین)۔ سر جی! 20 دنوں سے پے در پے سانحات سے گزرنا پڑا۔ پہلے باجی کی ساس فوت ہوئیں، پھر بھائی کا سالا فوت ہوا، پھر 2 اکتوبر کو میری بہن لاہور میں فوت ہو گئی۔ سر جی! یقین کریں ان پے در پے سانحات نے ہلا کر رکھ دیا (بہت افسوس ہوا۔ اللہ مرحومین کی بخشش و مغفرت فرمائے، آمین)۔ 12 اکتوبر سے 18 اکتوبر تک لاہور میں رہا۔ لاہور میں جب بھی موقع ملا سسپنس کا پتا کرتا رہا۔ اس بار سسپنس کے سرورق نے بالکل متاثر نہ کیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہیر سیال کا بڑھاپا ہے۔ پاؤڈر میں لگاتا نہیں، میٹھا میں پیتا نہیں کیونکہ شوگر ہے، سو دونوں اشتہارات کو یوں نظرانداز کیا جیسے بیگم کی بے جا فرمائشوں کو نظرانداز کرتا ہوں۔

فہرست کو چیک کیا تو منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ اس کڑواہٹ کو دور کرنے کے لیے میں اپنی محفل میں پہنچا تو حسبِ معمول، حسبِ دستور اور حسبِ حال آپ عزیزی بن کر وہ تلخ باتیں کر رہے تھے جن کا اثر غالباً کسی پر نہیں ہوتا۔ سر جی! کیوں اپنا خون جلاتے ہیں آپ۔ (ہم خون نہیں جلاتے بلکہ آپ کا بڑھاتے ہیں اور یہ سوچ کر یہ باتیں کرتے ہیں کہ یہ محض لفظ نہیں بلکہ بند دروازوں پر مسلسل دستک ہے، شاید کسی پر کچھ اثر ہو جائے)۔ اپنی محفل میں دوستوں کے خط چیک کیے، تو حیرت در حیرت ہوئی! اور وہ بھی اپنا خط محفل میں پا کر کیونکہ مجھے امید نہیں تھی کہ میرا خط شائع ہوگا۔ سر جی! آپ کو ذرا پالش کر دوں، میرا مطلب ہے کہ آپ کی ذرا تعریف کر دوں، تعریف تو بنتی ہے نا پھر۔ سر جی! ویسے ایک افسوس ہے، جب سے سسپنس پڑھنا شروع کیا ہے اور جب سے خط لکھ رہا ہوں کرسی صدارت کا مزہ ابھی تک نہیں لیا ہاں البتہ کسی کی مہربانی سے ستمبر 2010ء کے شمارے میں دوسرے نمبر پر خط شائع ہوا تھا، موبائل نمبر کے ساتھ اور پھر ان آؤٹ کے چکروں میں رہا کیونکہ دوست نہ رہا سسپنس کا وہ پیارا نہ رہا۔ اس بار کرسی صدارت پر شاہانہ سلطان بڑے شاہانہ انداز میں براجمان تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ کھی کھی کر کے کہہ رہی تھیں کر لو جو کرنا ہے۔ بی بی ہم نے بھلا کیا کرنا ہے۔ یہ تو آپ سر جی کو دعائیں دیں جن کی وجہ سے آپ کو صدارت کی کرسی مل گئی ہے۔ ناہید یوسف صاحبہ، آپ کے خط نے میرے دل جگر کو بڑا متاثر کیا۔ محمد انور ندیم صاحب خط پسند کرنے کا شکریہ، آتے رہا کریں۔ رازق بخش ذکی صاحب ارے بھئی اب بھلا ایسی بھی کیا مصروفیات کہ اتنی تاخیر سے حاضری دے رہے ہیں۔ ارے بھیا اتنا لیٹ ہونا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھیا، بیٹے کی شادی مبارک ہو۔ واہ جی واہ، اپنے رمضان پاشا دیوتا والے بھی اس بار تشریف لائے ہیں۔ رمضان پاشا صاحب کیسے ہیں آپ، ٹھیک تو ہیں نا؟ سر جی! جاتے جاتے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے گولڈن جوبلی نمبر نے ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ گولڈن جوبلی نمبر جس طرح کا ہونا چاہیے تھا اس طرح کا نہیں تھا۔ چونکہ ان دنوں میں احتجاجاً خط نہیں لکھ رہا تھا اس لیے تبصرہ نہیں لکھا تھا۔ آپ سے گزارش ہے سسپنس کا گولڈن جوبلی نمبر صحیح معنوں میں یادگار ہونا چاہیے جو مدتوں یاد رہے۔ (اچھا جی! دعا کریں کہ ہم آپ کی امید پر پورا اتریں اور ساتھ ہی کچھ مشوروں سے بھی نواز دیتے تو اچھا تھا کہ کیسے یادگار ہونا چاہیے؟) عمر عبداللہ کی ''ساشا'' ابھی تک اپنا آپ بنا نہیں پائی۔ عمر عبداللہ صاحب ''ساشا'' کو بہتر کریں بہرحال میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ سمجھ میں نہیں آیا ''بے نام'' میں امجد جاوید صاحب یا کہنا چاہتے ہیں۔ غربت کی کہانی صبا مغل صاحبہ اس بار ''آتشیں سوال'' لے کر آئیں اور ہلکا پھلکا متاثر کر گئیں۔ اس سوال کا جواب غالباً کسی کے پاس نہیں۔ مہنگائی کیوں ہوتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں اپنے منظر امام صاحب اپنے قلم کے بادشاہ ہیں۔ خوب لکھتے ہیں، مزاح یا پھر سنجیدہ موضوع وہ بہت اچھا لکھتے ہیں ''باپ کا باپ'' بھی منظر صاحب کی ایک خوبصورت تحریر تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحبہ حضرت جنید بغدادیؒ کے حالاتِ زندگی لے کر آئیں۔ بزرگانِ دین کے حالاتِ زندگی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں جن سے ہم کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی کاوش اچھی تھی۔ حسام بٹ صاحب اس بار ملک صاحب کی ڈائری سے ''غور طلب'' لے کر آئے۔ اپنے غلام قادر صاحب اس بار ''منزل'' لے کر آئے اور مسافر کو خوب منزل تک پہنچایا۔ حماد اور رتنا ایک ساتھ منزل تک پہنچے۔ (محترم! آپ نے جن رائٹرز کے بارے میں لکھا...... آپ اپنی رائے میں آزاد ہیں مگر دل بڑا ہو تو ہر ایک کی کاوش اور محبت کو سراہنا اچھی بات ہے)۔''

☒ انجم فاروق ساحلی کا مختصر نامہ لاہور سے۔ ''اس مرتبہ سسپنس کا ٹائٹل روپہلی (زرد) چاندنی میں ڈوبا ہوا روشن روشن اور خوشنما معلوم ہوا۔ چاندنی میں نہائے ہوئے حسین ماحول میں سرورق کی لڑکی اداس اداس کسی خیال و خواب میں گم تھی۔ وجدان میں چمک سی لہرائی۔ عورت، چاندنی اور پھول کائنات کا حسنِ فطرت ہیں جو انسان کی روح میں شادابی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس بار اداریہ روحِ عصر کی روشن تصویر تھا۔ جون ایلیا صاحب نے تاریخ کے آئینے میں دانائی کا سبق دیا۔ محمد زبیر ساگر صاحب کے جذبات قابلِ قدر ہیں۔ ریاض بٹ صاحب کی علالت کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ میں خود بھی گزشتہ ماہ علیل رہا ہوں۔ اب طبیعت بہتر ہو رہی ہے۔ تندرستی بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ بیماریوں سے بچائے۔ کہانیوں میں نفس گزیدہ، رقیب، چارا، حسد کی آگ، مارِ آستین، کبیرا، اولیا خوب ہیں۔ ''دوسرا فاتح'' ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ عنوان اچھا ہے۔ ''ہمدردی'' بھی خوب تھی۔ شہ زور ہنگامہ خیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ محفل شعر و سخن بھی جذبات اور احساسات کو چھو لینے والی تھی۔ کچھ حصہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

فہمیدہ بشیر، لاہور۔ طیب شاہین، پھالیہ۔ سلیم احمد، کروڑ لالعیسن۔ رانا احسان، کراچی۔ صائمہ کھوکھر، منڈی بہاءالدین۔ محمد عنصر شیخ، لاڑکانہ۔ رانا فیصل، کراچی۔ امتیاز احمد، حیدرآباد۔ ماہ نور شہزادی، ملتان۔

[illegible]

زویا اعجاز

تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں دکھائی
دینے والا ہر عکس وقت کی دھول میں اپنے
نقوش لازماً لکھ دیتا ہے۔ جانبداری اور غیر ذمے
داری تاریخ کے بدن کا موذی سرطان ہیں جو کہ
حقائق کو متضاد روپ میں ہی سامنے لاتے ہیں۔
وہب بن عمرو بھی اس سرطان کا شکار ایک کردار ہے۔
بہرحال تاریخ میں اس کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔
اس کے باطن کی خوبصورتی اور ظاہری بدصورتی میں
تضاد کے باوجود خلیفہ اس کی زیرک گفتگو کا نہ صرف
شیدائی تھا بلکہ اس کے لفظوں کے پردوں میں چھپے ماخذ کو
بھی بڑی گہرائی سے جان لیتا تھا اور یہی بات اس عہد کے دوسرے
شرفاء کو بہت چبھتی تھی کیونکہ ... اس بہلول کی باتوں میں
کانٹوں کی چبھن جو موجود تھی۔

ماضی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

بغداد میں صبح کا آغاز ہوتے ہی کاروبارِ زندگی رواں ہو گئے تھے۔ خوبصورت، سادہ، دلنشین بازاروں میں معمول کی چہل پہل تھی۔ بازار پُرسکون اور دکانیں منظم تھیں۔ دکاندار اپنے سامان کی خرید و فروخت میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ بغداد کے ''بازار کرخ'' میں یہ رونق بہت زیادہ تھی۔ اسی بازار سے چند قدم دور ایک گلی میں چند لڑکے بے فکرے اور خوش باش انداز میں کھیل رہے تھے۔ ہر چہرہ مطمئن اور خوش باش تھا۔ اس سارے منظر میں صرف ایک ہی شخص ایسا تھا جس کے چہرے پر قدرے تردد اور اضطراب دکھائی دیتا تھا۔

وہ شخص ایک نانبائی تھا۔ اس کے سامنے رکھی ٹوکری میں مختلف ساخت کی بنی روٹیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن آج ایک بھی روٹی فروخت نہ ہو سکی تھی۔ جبری طور پر صبر کر کے بیٹھے اس شخص کا نام غوث تھا۔ اس کا حلیہ نہایت عام سا تھا۔ گہرے رنگ کا جبہ، سر پر مخصوص انداز میں بندھا عمامہ اور بیضوی چہرہ۔ وہ نہایت انہماک سے بازار میں چلتے پھرتے خریداروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اطمینان میں خلل اس وقت پڑا جب اسے چند گز دور بے معنی سی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں کا کوئی مطلب تھا، نہ ہی موقع محل۔ غوث کا انہماک مزید بڑھ گیا۔ اس کے سامنے ایک مجہول سا شخص مخصوص ساخت کا عصا تھامے اس انداز میں چلا آ رہا تھا گویا کسی گھوڑے پر سوار ہو۔ غوث کی توجہ اسی شخص پر مرکوز ہو گئی۔ اس شخص کا حلیہ نہایت ابتر تھا۔ ساتخوردہ کپڑوں پر پیوند موجود تھے۔ بڑھے ہوئے کھچڑی نما بال اور ڈاڑھی، حلقوں میں دھنسی آنکھیں اور خشک، پپڑی زدہ ہونٹ۔ وہ اپنے عصا کا بہت خیال رکھتا تھا اور اس پر سوار ہو کر کسی گھوڑے کی طرح بھاگتے خود کو گھڑسوار تصور کیا کرتا۔ غوث اس شخص سے آشنا تھا۔ وہ ''وہب'' تھا۔ آج اس کی پیٹھ پر سرکنڈوں سے بنی دو ٹوکریاں لدی ہوئی تھیں۔

''کہاں جا رہے ہو وہب؟''

مجہول صورت شخص ٹھٹک کر رک گیا اور اپنا سر کھجانے لگا۔

''میں ...... میں تو اپنی ٹوکریاں فروخت کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک تھی۔ حلقوں میں دھنسی وہ آنکھیں اپنے اندر ایک عجیب گہرائی سموئے ہوئے تھیں۔ گہرائی، چمک، بے خوفی، ذہانت بھری روشنی اور بے باکی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ چہرے پر بھی جھلکتی تھی۔

''آج روٹی نہیں خریدو گے؟'' غوث نے للچایا۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں؟ ذرا دکھاؤ تو روٹی۔'' اس نے ٹوکری پر نظریں جمائیں۔

غوث نے اپنی ٹوکری سے ایک چھوٹی سی روٹی نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

''بغداد میں روٹی اتنی چھوٹی کیوں ہو گئی ہے؟ یہ روٹی ہے یا ایک درہم کا سکہ؟ کیا قیمت ہے اس کی؟''

''ربع دینار۔'' غوث نے اطمینان سے جواب دیا۔

وہب نے ٹوکری میں ہاتھ مارا اور قدرے بڑی جسامت کی ایک اور روٹی نکال کر پوچھنے لگا۔

''اس کی کیا قیمت ہے بھلا؟''

''یہ بھی ربع دینار کی ہی ہے۔'' نانبائی کے اطمینان میں کوئی فرق نہ پڑا۔

وہب حیرانی سے دونوں روٹیوں کو باری باری دیکھنے لگا۔ ان کی باہمی جسامت تقریباً چار گنا مختلف تھی۔ اس نے اپنی ٹوکری نیچے رکھ کر دوبارہ سر کھجایا اور حیرت سے بولا۔

''ان دونوں روٹیوں کی قیمت یکساں کیسے ہو سکتی ہے؟''

''ان کی جسامت نہ دیکھو وہب! ان میں آٹا یکساں استعمال ہوا ہے۔'' غوث نے دلاسا دیا۔

''اچھا بھئی! تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہو گا۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا اور عمامے میں رکھا ربع دینار سے بھی کمتر مالیت کا سکہ نکال کر اسے تھما دیا۔

''یہ کیا ہے؟ یہ میری مطلوبہ قیمت تو نہیں۔'' نانبائی بے چینی سے بولا۔

''لیکن اس کا وزن ربع دینار کے برابر ہی ہوتا ہے۔ یہ تو تسلیم کرتے ہو نا تم؟''

''ہاں ...... لیکن......'' غوث سے کوئی جواب بن نہ پڑا اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ وہب کے سامنے یونہی کئی بار لاجواب ہوا تھا۔ وہب نے بے نیازی سے بڑی جسامت کی روٹی اٹھائی اور اپنا ''گھوڑا'' ہنکارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

غوث مایوسی اور جھنجلاہٹ کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں اپنی روٹیوں کی خرید و فروخت بڑھانے کے لیے ایک نیا خیال پیدا ہوا تھا لیکن اس کے لیے رات تک انتظار کر لینا ہی بہتر تھا۔ وہ اپنا مزاج معتدل کرتے ہوئے نئے گاہکوں کا انتظار کرنے لگا۔ یہ آٹھویں صدی کے بغداد میں عوامی زندگی کی پہلی تصویر تھی۔

☆☆☆

بازار کرخ میں غوث کے ٹھکانے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک مسافر خانہ تھا۔ نکھری ہوئی دھوپ میں اس مسافر خانے کے در و دیوار روشنی میں نہائے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ دیواریں صاف ستھری اور سادہ طرزِ تعمیر کا نمونہ تھیں۔ مرکزی چوبی دروازے کے دائیں جانب جانوروں کے پانی کے لیے مختصر سا حوض بنا تھا۔ مسافر خانے کا صحن کشادہ تھا۔ صحن سے ہی دائیں سمت چوبی زینہ تھا جس کے بعد بالائی جانب کمروں کی قطار شروع ہو جاتی۔

اس مسافر خانے کا مالک ''منکش ابن متاہر'' تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جو پیٹھ اور کندھوں کے درمیان کوب سے خاصا بدہیئت دکھائی دیتا۔ قدرے چھوٹی آنکھوں میں مکاری کی چمک جھلکتی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اس معذوری کے باوجود اپنے کام میں کافی پھرتیلا اور چاق و چوبند تھا۔ یہ پھرتی اور چستی اس صورت میں مزید بڑھ جاتی جب مہمان اسے منہ مانگا معاوضہ دینے پر راضی ہو جاتے۔

اس وقت وہ گزشتہ روز سے قیام پذیر مہمانوں کو ناشتا فراہم کرنے میں مگن تھا۔ اس صبح فی الحال کوئی نیا مہمان نہیں آیا تھا۔ منکش کی متلاشی نظریں بار بار مرکزی دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔ بالآخر اسے دن کا پہلا مہمان آتا دکھائی دے گیا۔ سبز جبے میں ملبوس درمیانے قد و قامت کا حامل شخص متجسس انداز میں اندر چلا آیا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں مسکراہٹ ثبت دکھائی دیتی تھی۔

''کیسے آنا ہوا اجنبی؟'' منکش نے پوچھا۔

''میں منکش ابن متاہر کا مسافر خانہ تلاش کر رہا ہوں... دراصل میں نے ان کی مہمان نوازی کی بہت تعریف سنی ہے۔''

''تم بالکل درست مقام پر پہنچے ہو اجنبی! میں منکش ابن متاہر ہی ہوں۔'' وہ فخر سے بولا۔

''خوب! جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ مجھے علم ہوا تھا کہ یہاں مہمانوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔'' نووارد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ روایت تو خیر میرے آبا و اجداد سے ہی چلی آ رہی ہے۔ یہ مسافر خانہ میرے دادا نے بڑی محنت اور مشقت سے قائم کیا تھا۔ اس کے بعد میرے والد نے خوب محنت کی لیکن اصل عروج تو اسے میں نے دیا ہے... میں نے۔'' منکش نے گردن اکڑائی اور پھر پوچھنے لگا۔

''تم آئے کہاں سے ہو اے شخص؟''

''میں شام سے آیا ہوں۔ پیشہ ور قصاب ہوں۔ علم ہوا تھا کہ یہاں بہت اچھے جانور ملتے ہیں۔ بس انہی کی تلاش میں چلا آیا۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اوہ... اچھا... قصاب ہو تم...'' منکش کا سارا جوش سرد ہو گیا۔ چہرے پر بھی قدرے سختی در آئی تھی۔ اس نے نووارد کے کم قیمت جبے، کمر پر بندھے پٹکے اور جوتوں کی طرف بے نیازی سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

''جو بھی درکار ہے ذرا جلدی کہو۔ میں مصروف ہوں۔''

''مجھے ایک کمرا چاہیے۔'' نووارد نے تحمل سے کہا۔

''دو دینار قیمت ہو گی۔'' منکش کی رکھائی برقرار تھی۔

''اتنی زیادہ... کچھ تو رعایت کیجیے۔'' نووارد حیران ہوا۔ ''میں نے صرف نیند ہی تو پوری کرنی ہے۔''

''تو پھر نصف دینار میں بھی سونے کی جگہ مل جائے گی۔ یہیں صحن میں رکھے بستر پر نیند پوری کر لینا۔'' منکش نے ایک اور راہ دکھائی۔ نووارد الجھ کر وہاں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ نصف اور دو دینار کی اس قیمت اور سہولیات پر غور و فکر کر رہا تھا۔

منکش کو اس غریب الوطن سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس نے مہمان کو بازو سے پکڑا اور ایک جھٹکے سے اٹھا دیا۔

''اس کرسی پر صرف میرے گاہک بیٹھتے ہیں۔ جس وقت تم یہاں قیام کا فیصلہ کر لو گے تو کرسی پر بیٹھنے کے حق دار بھی بن جاؤ گے۔'' منکش کی توجیہہ پر وہ خاموش ہو گیا۔

''جلدی فیصلہ کر لینا۔ میرے پاس مہمانوں کی کبھی کمی نہیں ہوتی۔'' منکش نے اترا کر کہا۔

اسی لمحے اسے مسافر خانے کے باہر گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ وہ لپک کر بیرونی جانب بڑھا۔ گھوڑے پر سوار شخص کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ اس کے سامنے بصرہ کا ایک قاضی موجود تھا۔ بھاری جسامت، چوڑا چہرہ، دیدہ زیب شیشوں سے مزین سفید جبہ اور شاہانہ کروفر۔ وہ منکش کے باہر آنے تک گھوڑے سے اترا ہی نہ تھا۔

''خوش آمدید محترم قاضی! خوش آمدید۔'' منکش نے اپنی معذوری سے جھکی ہوئی کمر کو مزید جھکایا۔

''میرا گھوڑا پیاسا اور تھکن زدہ ہے منکش! اس کا جلدی کچھ بندوبست کرو۔'' قاضی نے تحکمانہ کہا۔

''جو حکم عالی جناب! میں اسے یہاں عام جانوروں کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے مخصوص مقام پر اپنی خصوصی صراحی سے سیراب کروں گا۔'' منکش نے خوشامدانہ جواب دیا۔

قاضی کے چہرے پر فخر، غرور اور کروفر کے رنگ جھلکنے

گئے۔ وہ ایک شان بے نیازی سے گھوڑے کو منکش کے حوالے کرنے کے بعد اندرونی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک منقش چوبی صندوق تھا جسے قاضی نے کسی عزیز از جان شے کی طرح تھام رکھا تھا۔ مسافر خانے میں قدم رکھتے ہی اس کا سامنا سبز جبے والے شخص سے ہوگیا۔ منکش گھوڑے کو عقبی سمت میں کسی ملازم کے حوالے کرکے وہیں چلا آیا تھا۔

"یہ بصرہ کے قاضی ہیں اجنبی! عدل و انصاف کے تسلیم دیوتا۔ تم نے دیکھا کہ کس قدر معزز لوگ میرے مہمان بن کر آتے اور بخوشی یہاں قیام کرتے ہیں۔"

منکش کی اس بات پر جبہ بردار شخص نے قاضی سے بھرپور انداز میں ایک سلام کی۔ قاضی کی آنکھوں کی چمک اس کے چہرے کو بھی روشن کررہی تھی۔ منکش کے الفاظ اور انداز تخاطب اسے ہمیشہ ہی بہت بھاتا تھا۔ قاضی بنیادی طور پر ایک خوشامد پسند شخص تھا۔ مقابل کی یہ عاجزی اور مسکینیت اس کا دماغ عرش پر پہنچا دیتی۔

"میں اس بار طویل قیام کے لیے نہیں آیا ہوں منکش! کل صبح تک یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔"

قاضی کے اس جواب پر منکش نے چہرے پر افسردگی طاری کرلی پھر کچھ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"آپ یقیناً خلیفہ ہارون الرشید سے ملاقات کے لیے آئے ہوں گے۔"

"نہیں! اس بار کوئی اور ضروری کام ہے۔" قاضی نے ٹالا۔

"جیسے آپ کی خوشی محترم قاضی! میں آپ کے لیے طعام کا بندوبست کرتا ہوں۔" اس نے جبہ بردار کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ جبہ بردار بھی اس کی توجہ اور ترجیح بھانپ گیا تھا۔ وہ مسافر خانے میں قیام کے متعلق کسی بھی فیصلے پر پہنچنے سے قبل بازار میں گھوم پھر کر جانوروں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

بازار میں نکلتے ہی جبہ بردار شخص کا سامنا نانبائی سے ہوا۔ وہ بڑی دلچسپی سے اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا فروخت کررہے ہو تم؟" وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ لیے بولا۔

"یہاں اجنبی معلوم ہوتے ہو؟" غوث نے سوال داغا۔

"ہاں! میں شام سے آیا ہوں۔" اس کے انداز میں اپنے آبائی وطن کے لیے فخر و غرور در آیا تھا۔

"شام میں اس کے نام سے واقف نہیں ہو یا وہاں اناج کھانے کا رواج نہیں؟" غوث نے تنگی سے پوچھا۔

"شام میں تو اسے پراٹھا کہا جاتا ہے۔ لذیذ، خستہ، تل دار اور خوشبودار۔ یہ تو مجھے انسانوں کے لائق چیز لگ ہی نہیں رہی۔" اس نے استہزائیہ کہتے ہوئے پتلی سی روٹی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"بغداد میں اسے روٹی کہتے ہیں اور انسان ہی تناول بھی کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے بغداد میں کھانے کے لیے نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لیے کھاتے ہیں۔" غوث نے بھی سرجھٹکا۔ وہ ظرف تنگی کی حد تک بڑھنے لگی تھی۔

"مجھے تو یہ لگتا ہے کہ اس گیلی شے کا نام روٹی ہے نہ پراٹھا۔ یہ تو فسادیہ ہے۔" جبہ بردار شخص بولا۔ وہ ہمہ وقت ایسے ہی مزاج سے مغلوب نظر آتا تھا۔ غوث کو اس کی بات پر مزید غصہ آیا۔ اس نے روٹی چھین کر ٹوکری میں رکھی اور ایک کپڑے سے ڈھانپ کر خود بھی منہ پھیر لیا۔

جبہ بردار کوئی اثر لیے بغیر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ بازار میں اسی طرح گھوم پھر کر مطلوبہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دور جاتے ہی اسے ایک عجیب و غریب شخص کی دید نے ٹھٹک کر رکنے پر مجبور کردیا۔ وہ مجہول سا شخص ایک مخصوص ساخت کی لکڑی کو گھوڑے کی طرح ہنکاتا اپنی زبان سے بھی ویسی ہی آوازیں برآمد کررہا تھا۔ جبہ بردار الجھن اور حیرت میں اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"یہ تم کیا کررہے ہو احمق؟"

"نظر نہیں آتا! میں اپنے گھوڑے پر سواری کررہا ہوں۔ پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ میرا گھوڑا تمہیں دولتی مار دے گا۔" مجہول شخص نے اپنا سر دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا؟ گھوڑا! بہت خوب! تمہارے شہر بغداد میں اسے گھوڑا کہتے ہیں؟ ہمارے شام میں تو اسے لکڑی کہتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر اپنے وطن کا فخریہ حوالہ دیا۔

ابووہب پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہنوز ہنہنانے کی آوازیں نکال کر لکڑی کو گھوڑے کی طرح پکار رہا تھا۔

"یہ میرا گھوڑا ہے۔ پرستان سے آیا ہے۔ تم اس کے راستے سے ہٹ جاؤ۔" اس نے اپنی ہی لے میں کہا۔ جبہ بردار شخص اس کی جانب بغور دیکھنے لگا۔ وہ الجھی بکھری ڈاڑھی میں پوشیدہ میل خوردہ چہرے اور نقوش دیکھ کر تذبذب کا شکار ہوا تھا۔

"کیا تمہارا کوئی ہم شکل بھی ہے اے شخص؟" اس

نے پوچھا۔

''ہٹ جاؤ میری راستے سے...... ہٹ جاؤ!'' وہب تنہجلا گیا تھا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں تم سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔'' اس نے ذہن پر زور دیا۔ ''نہیں! وہ تم نہیں تھے شاید...... تم سے ملتا جلتا ایک شخص تھا۔ میری اس سے شام میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک فقیہہ عالم اور قابل شخص تھا۔ اس کی باتوں سے دانائی ٹپکتی تھی۔ اس کا نام ابن عمرو تھا۔ وہ تم نہیں ہوسکتے۔ اس کی دانائی و فراست تو دل موہ لیتی تھی۔'' اس کی باتوں پر وہب کی آنکھوں میں ہر پل رنگ بدل رہے تھے۔

''ہاں! میں کیسے ہوسکتا ہوں؟ میں شام ہی کیا صبح اور دوپہر بھی کہیں نہیں گیا۔ ایک بار میرا یہ گھوڑا اڑنے کے قابل ہوجائے پھر میں ہر جگہ جاؤں گا۔ ہر جگہ سیر کروں گا۔ چل میرے گھوڑے!'' وہ ٹخ ٹخ کی آوازیں نکالتا ایک بار پھر آگے بڑھ گیا۔ جبہ بردار کچھ لمحوں کے لیے وہیں کھڑا کسی سوچ میں کھویا رہا اور پھر سر جھٹک کر خودکلامی کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں مغیث! یہ ابن عمرو کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو اس خوشبودار، نفیس اور دانا شخص کا سایہ بھی نہیں ہوسکتا۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

وہ خودکلامی کرتا ہوا بازار میں آگے بڑھ گیا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی قریبی دیوار کی اوٹ میں کھڑا ابو وہب باہر نکل آیا۔ اس کا چہرہ اب پُرسکون دکھائی دینے لگا تھا۔

☆☆☆

مسافر خانے میں منکث کی چاندی ہورہی تھی۔ اس نے بصرہ کے قاضی کو کمرے میں ہی مرغن کھانا، پھل اور مشروبات پہنچا دیے تھے۔

''میرے گھوڑے کا بھی خیال رکھنا ابن مظاہر! وہ مجھے بالکل ہشاش بشاش چاہیے۔'' قاضی نے رعب جمایا۔

''آپ اس غلام کے ہوتے ہوئے فکر ہی کیوں کرتے ہیں اعلیٰ حضرت؟ آپ کا گھوڑا یہاں رہنے والے سبھی انسانوں سے زیادہ عزیز ہے مجھے۔'' منکث نے کہا۔

''بہت خوب! تمہاری یہی تابعداری اور معاملہ فہمی تو مجھے پسند ہے اور میں باقی مسافر خانے چھوڑ کر ہر بار یہاں چلا آتا ہوں۔'' قاضی نے بھنے ہوئے گوشت کا ٹکڑا دانتوں سے نوچا۔

''آپ کی کرم فرمائی ہے اعلیٰ حضرت! میں تو ایک مسکین شخص ہوں۔'' منکث نے مزید خوشامد کی۔

''ایک خدشہ ضرور ہے مجھے۔ کہیں میرے لیے بھی پانی اسی صراحی سے تو نہیں لائے؟'' قاضی نے معنی خیزی سے کہا۔

''حضورِ والا! آپ پر میری جان بھی قربان۔ آپ کے لیے چشمے سے صاف شفاف پانی لایا ہوں۔ کیا آپ کو پہلے کبھی شکایت کا موقع دیا ہے میں نے؟''

''نہیں۔ کھانا بہترین اور لاجواب ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں تمہیں طلب کرلوں گا۔ اب تم جاکر اپنے دیگر کام نمٹالو۔'' قاضی نے فیاضی جتائی۔

منکث تعظیم پیش کرتا ہوا زینوں سے نیچے اتر آیا۔ اسے مرکزی دروازے پر ایک اور شخص دکھائی دیا۔ وہ جواں سال تھا۔ اس کا لباس نفیس اور اطوار شائستہ تھے۔ اس شخص کے ساتھ واحد ناگوار شے اس کی سواری تھی۔ منکث نے گدھے کو دیکھتے ہی تیوریاں چڑھائیں۔

''کیا نام ہے تمہارا اے شخص؟'' اس نے رعب سے پوچھا۔

''عبید ابن حر۔'' اجنبی نے متانت سے جواب دیا۔

''یہاں جانور کے ساتھ قیام کرنا ہے تو دونوں کے دو دینار وصول کروں گا۔'' اس نے پہلی شرط سامنے رکھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ انسان اور حیوان کو یکساں کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟'' عبید اس کی بات سن کر الجھ گیا۔

''بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں اجنبی! میرے پاس مہمانوں کی کمی نہیں۔ تمہارا گدھا بھی آخر کچھ نہ کچھ کھائے پیے گا۔ اس کے اخراجات تو وصول کروں گا ہی نا آخر؟'' منکث نے حسب سابق رکھائی سے کہا۔ وہ مہمانوں کی استطاعت کے مطابق ہی خوش خلقی کا تناسب کم یا زیادہ کرتا تھا۔

''اور اگر میں تنہا مسافر خانے میں رہ کر اسے اصطبل میں چھوڑ دوں؟'' عبید نے از خود اس کا مدعا بھانپ لیا۔

''اس صورت میں رقم میں کمی کی جاسکتی ہے۔ تمہارے اخراجات میں بھی کمی ہوسکتی ہے بشرطیکہ کسی کے ساتھ کمرا بانٹ لو۔''

''ٹھیک ہے! مجھے میرا کمرا دکھادو۔'' عبید نے مزید کسی بحث سے گریز کے لیے کہا۔ وہ کافی تھکاوٹ زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ منکث کا چہرہ...... خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ اسے جبہ بردار شخص کے ساتھ ٹھہرانے کا ارادہ کرچکا تھا۔

☆☆☆

بغداد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں سہ پہر کا سرمئی آنچل لہرانے لگا تھا۔ دکان دار بھی دن بھر کی محنت اور کمائی سے کافی مطمئن و خوش باش دکھائی دے رہے تھے۔ ان

دکانداروں میں چند البتہ ایسے بھی تھے جن کے منافع کی شرح کا تناسب قدرے کم رہا تھا۔ وہ بھی اسی امید و آس کی کیفیت میں جھولتے نظر آرہے تھے۔ غوث بھی مؤخرالذکر افراد کی فہرست میں تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور جھنجلاہٹ نمایاں تھی۔ ان کیفیات میں وہب کو اپنے پاس آتے دیکھ کر مزید اضافہ ہوگیا۔ اسے صبح کے آغاز میں ہی اس کی وجہ سے ہونے والا نقصان اور اپنی کھسیاہٹ یاد آگئی تھی۔ اس کے بعد تقریباً سارا دن ہی مندا بیت گیا تھا۔

''تم...... اب کیا لینے آئے ہو یہاں؟'' وہ غصے سے بولا۔

''تم سے ملنے آیا ہوں۔ ذرا میرے گھوڑے کی لگام پکڑو۔ بڑا شریر گھوڑا ہے۔ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔'' وہب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں اب تمہیں اپنا کوئی نقصان نہیں کرنے دوں گا۔ خاموشی سے کھسک جاؤ ورنہ بہت برا ہوگا۔''

''غصہ کیوں کرتے ہو میرے بھائی؟ میں تمہیں یہ ربع دینار دینے آیا تھا۔'' وہب نے ایک سکہ اسے تھمایا۔

''یہ صبح والی روٹی کی قیمت ہے۔ اب مجھے میرا پہلا سکہ واپس کردو۔'' وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''لیکن تم نے تو مجھے دلائل اور منطق سے مطمئن کردیا تھا۔ بات تو خیر تمہاری ٹھیک ہی تھی۔'' غوث نے تسلیم کیا۔

''تمہارے مطمئن ہونے اور میرے اطمینان میں فرق ہے۔ میں بہرحال مطمئن نہیں تھا۔ صبح میرے پاس تمہاری مطلوبہ قیمت نہیں تھی۔ اب اپنی ٹوکریاں فروخت کر آیا ہوں تو تمہارا حق ادا کرنا مجھ پر واجب ہوگیا ہے ورنہ وہ روٹی میرے لیے جہنم کا ایندھن بن جاتی۔'' وہب کی اس نئی منطق اور حلال و حرام کے تصور نے غوث کو ششدر کردیا۔

''وہب! تم بہت عجیب شخص ہو۔ بغداد بھر تمہیں بہلول، احمق یا پاگل کہتا ہے۔ کوئی پاگل ایسی دانا باتیں کیسے کرسکتا ہے؟'' غوث نے الجھ کر کہا۔

''پاگل...... پاگل...... ہاں میں بھی پاگل...... تم بھی پاگل...... ہم سب اپنی دنیاداری کے پیچھے پاگل ہیں۔ مجھے گھوڑا واپس کرو میرا۔'' وہ ایک بار پھر اپنی سابقہ کیفیت میں لوٹ آیا تھا۔

غوث کے سر پر چپت مارنے کے بعد اس نے چوبی گھوڑے کو ''ایڑ'' لگائی اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ ایک مکان کے دروازے پر پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ وہب نے دروازے پر دستک دی۔ مکان کی اندرونی جانب سے ایک بوڑھا شخص برآمد ہوا۔

وہب نے اپنے تھیلے سے کچھ سامان نکالا اور اسے تھماتے ہوئے بولا۔

''یہ لو! تمہارے لیے کھانا لایا ہوں۔''

''بہت شکریہ اے بہلول! تمہارا بہت شکریہ۔'' بوڑھے شخص کا چہرہ چمکنے لگا۔

''میری ٹوکریوں کی فروخت سے آج دو دینار اکٹھے ہوئے تھے۔ یہ بھی تم رکھ لو۔ میرے تو کسی کام کے نہیں ہیں۔'' اس نے بوڑھے شخص کو سکے یوں تھمائے جیسے اب تک کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ اٹھا رکھا ہو۔ بوڑھے نے جلدی سے وہ سکے دبوچ لیے۔ وہب بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ بوڑھے نے سکوں کی مالیت شمار کی اور غصے سے دور جاتے وہب کو گھورنے لگا۔

''احمق...... جھوٹا کہیں کا...... یہ دو دینار تو نہیں ہیں...... اس میں ربع دینار کم ہیں۔ دنیا میں دھوکے بازوں کی کمی نہیں ہے۔ توبہ! کیا زمانہ آگیا ہے۔'' بوڑھا اس قدر تاسف میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا، گویا کسی نقصانِ عظیم سے دوچار ہوگیا ہو۔

یہ بغداد کی عمومی معاشرتی زندگی کا ایک اور رنگ تھا جہاں مایوسی، ذاتی مفاد، بےحسی اور خودغرضی نے اپنے پنجے گاڑ رکھے تھے۔

☆☆☆

رات کے سائے نمایاں ہوتے ہی مکانوں میں چراغ روشن ہوگئے تھے۔ مسافر خانے کی دیواروں پر نصب مخصوص لکڑیوں میں مشعلیں روشن کردی گئیں۔ مسافر اپنی مصروفیات سے نمٹ کر نیند کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے تیار تھے۔ عبید اور مغیث نے نچلی منزل پر صحن میں ہی سونے کو ترجیح دی تھی۔ وہ کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹے ہی تھے کہ دروازے پر ایک اور شخص کی آمد ہوئی۔ اس کا ڈیل ڈول جاندار تھا۔ بادی النظر میں وہ کوئی گوشت کا پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بڑے استحقاق اور کروفر سے چلتا ہوا مسافر خانے میں چلا آیا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی حسیات عبید کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

''تم...... عطر فروش ہو کیا؟'' نووارد نے دریافت کیا۔

''جی ہاں! آپ کو کیسے علم ہوا؟'' عبید حیران ہوا۔

''تمہارے لباس اور بالوں سے اٹھنے والی خوشبو کی وجہ سے۔'' وہ فخریہ بولا۔

''جی ہاں! میں عطر فروش ہی ہوں۔ آج بغداد میں

اپنا مال فروخت کرنے آیا تھا۔ اللہ کا کرم ہے میری ساری خوشبویات فروخت ہوگئی ہیں۔'' عبید نے سرشاری سے بتایا۔ سیاہ پوش کے چہرے پر غصہ در آیا۔

''ارے داروغہ صاحب! خوش آمدید! آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔'' منکش نے اسے دیکھتے ہی فدویانہ انداز اختیار کرلیا۔ داروغہ نے شانِ بے نیازی سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور شکوہ کناں نظروں سے منکش کو دیکھنے لگا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ منکش کے مسافر خانے میں آنے والے کسی شخص کے مال سے محروم رہا تھا۔ اسے اعلیٰ خوشبویات سے محرومی کا قلق ستانے لگا۔

''حضورِ والا! آپ ہم سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ آج رات ہمیں اپنی خدمت کا کوئی موقع دیجیے۔ آپ ہی کے دم سے تو یہ بہار ہے۔'' منکش نے مزید خوشامد کی۔ اسے داروغہ کی کمزوری کا علم تھا۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد وہ منکش کی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔

منکش جھک کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ اپنی خمیدہ کمر کی وجہ سے اس کا یہ انداز مضحکہ خیز صورت اختیار کرجاتا تھا۔

''آپ تشریف رکھیے داروغہ صاحب! میں قاضی صاحب کے لیے رات کے کھانے کا بندوبست کردوں۔'' منکش کافی عجلت میں تھا۔ مسافر خانے میں روٹیاں ختم ہوچکی تھیں اور قاضی نے اس سے خصوصی طور پر روٹیاں لانے کی فرمائش کرکے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اپنی کنجوس فطرت کی بدولت کسی ملازم کا بندوبست نہیں کیا تھا۔

اس وقت منکش کے ذہن میں غوث کا تصور تھا۔ اس کی وہاں موجودگی کے امکانات بہرحال روشن تھے۔ منکش کی قسمت اچھی تھی۔ مسافر خانے سے نکلتے ہی غوث سے ملاقات ہوگئی۔ اسے علم نہ تھا کہ غوث درحقیقت اسی سے ملاقات اور باہمی معاملہ طے کرنے کے لیے چلا آرہا تھا۔ رسمی علیک سلیک میں وقت ضائع کیے بغیر منکش اپنے اصل مدعا پر آگیا۔

''تمہارے پاس روٹیاں ہیں تو مجھے فروخت کردو۔ اس وقت ضرورت آن پڑی ہے۔''

''لو بھئی! جتنی مرضی لے لو۔'' غوث نے ٹوکری سر سے اتار کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ''ویسے تمہاری ہمت کی بھی داد دینی ہوگی۔ تنہا ہی مسافر خانے کا انتظام سنبھال رکھا ہے۔ کسی ملازم کا ہی بندوبست کرلو۔''

''اچھے اور محنتی ملازم ملتے ہی کہاں ہیں؟ ہر کوئی موقع سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتا ہے۔ مشکل تو دونوں صورتوں میں میرے ہی لیے ہے۔'' اس نے ٹوکری سے بہترین روٹیاں چھانٹتے ہوئے کہا۔ غوث نے موقع غنیمت جان کر فوراً اپنا مدعا سامنے رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اگر تم چاہو تو ایک مشکل یہیں حل ہوسکتی ہے۔ مسافروں کے لیے روٹیوں کی خریداری مجھ سے کرلیا کرو۔ منافع ہم نصف بانٹ لیا کریں گے۔'' غوث کی تجویز پر منکش کے ہاتھ ساکت ہوگئے تاہم وہ فوری ردِعمل نہیں دینا چاہتا تھا۔

''ایسا کرو کہ اندر چلے آؤ۔ قاضی صاحب کو تمہاری روٹیاں پسند آگئیں تو ہم کوئی معاملہ طے کرلیں گے۔'' اس نے امید تھمائی۔ غوث نے یہ بات بخوشی تسلیم کرلی۔ تھوڑی ہی دیر میں منکش کھانے کے برتن لیے نیچے چلا آیا۔ اس کے آتے ہی قاضی بھی الجھے ہوئے انداز میں سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک منقش چوبی صندوق تھا۔

''منکش! مجھے ایک امانت تمہارے پاس رکھوانی ہے۔ کل روانگی سے پہلے مجھے لوٹا دینا۔'' قاضی نے اس سے کہا۔

''بے فکر ہوکر رکھوائیے جنابِ عالی! بغداد میں امن وامان اور قانون کی بالادستی ہے۔ یہاں آپ کو کبھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' منکش نے جواب دیا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا جہاں ایک بڑی جسامت کا چوبی صندوق رکھا تھا۔ منکش نے اپنی گردن میں لٹکی چابی نکال کر قفل کھولا اور امانت اندر رکھوا کر قفل دوبارہ قاضی سے ہی بند کروایا۔

''یہ چابی بھی آپ اپنے پاس رکھ لیجیے اعلیٰ حضرت! کل اپنے ہاتھوں سے امانت اٹھا لیجیے گا۔'' وہ پُراعتماد تھا۔ قاضی اس کے انداز پر پسندیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

''پھر بھی صبح میری آمد تک تم یہاں سے ہلنے کی غلطی نہ کرنا۔''

''جیسے آپ کا حکم میرے آقا!'' منکش نے اس پابندی پر جز بز ہونے کے باوجود فدویانہ جواب دیا۔ قاضی بے نیازی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح کا آغاز ہنگامہ خیز تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی قاضی اپنی امانت وصول کرنے چلا آیا۔ اسے اب بصرہ کے لیے واپس روانہ ہونا تھا۔ اپنا ذاتی کام وہ گزشتہ شام ہی نمٹا چکا تھا۔ چوبی صندوق کھلتے ہی قاضی کا چھوٹا صندوق خالی نظر آیا۔ وہ غم و غصے سے بے حال ہوگیا۔

''یہ سب کیا ہے منکش؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس کمرے سے ہلنے کی غلطی بھی نہ کرنا۔'' وہ چلا اٹھا۔

"میں صرف فجر کے وقت وضو کے لیے یہاں سے اٹھا تھا جناب! اور چابی بھی تو آپ کے پاس ہی تھی۔" وہ منمنایا۔ قاضی کی امانت کا مسافر خانے سے غائب ہو جانے کا مطلب اس کے مسافر خانے کی تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"اس کا مطلب ہے یہ کسی مسافر کا ہی کام ہے۔ اسی لیے مجھے اپنے جبے کے پاس یہ سکہ بھی پڑا ہوا ملا تھا۔" اس نے ہتھیلی پر رکھا سکہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"کسی بھی مسافر کو یہاں سے باہر نہ جانے دینا۔ میں خود سب سے تفتیش کروں گا۔ ایک ہزار دینار کا وہ ہار اگر مجھے نہ ملا تو میں تمہیں تہس نہس کر دوں گا...... سمجھے!" قاضی غم و غصے سے بے حال تھا۔

کچھ دیر تک تینوں مسافروں سے ناکام تفتیش کے بعد انہیں ایک ہی کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ غوث، عبید اور مغیث ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ گزشتہ رات کی باہمی خوشگوار گفتگو اور مثبت تاثرات بالکل مفقود ہو چکے تھے۔ قاضی کی جارحانہ تفتیش نے ان کی عزتِ نفس بھی بری طرح مجروح کی تھی اور اب اس ممکنہ قید کا تصور مزید بے بسی میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ اس وقت وہ لاعلم تھے کہ باہر داروغہ کی آمد بھی ہو چکی ہے جس نے منکش سے اس صورت حال کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے عبید کو مجرم ٹھہرا دیا ہے۔

"عبید ابن حر؟ نہیں! میرا دل اسے مجرم سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ خاصا شریف النفس انسان ہے۔" منکش متامل تھا۔

"تمہیں ان معاملات کی کیا خبر احمق؟ داروغہ میں ہوں یا تم؟ مجھے خلیفہ ہارون الرشید نے چھان پھٹک کر ہی اس عہدے پر تعینات کیا تھا۔ میں تو ایک نظر میں مجرم کے سارے جرائم جان لیتا ہوں۔ قاضی صاحب کا ہار عبید نے ہی چرایا ہے۔ تمہارے کمرے میں اس کے جوتوں کا نشان سب سے بڑا ثبوت ہے۔"

منکش نے بھی مسافروں کے جوتوں کی بابت جوابی دلیل دی لیکن داروغہ کی رٹ برقرار تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے عبید کو مجرم ٹھہرانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ منکش جانتا تھا کہ گزشتہ روز عطریات کی بوتلوں سے محرومی کا غصہ ہے جو عبید پر کسی نہ کسی صورت نکل کر ہی رہے گا۔ داروغہ نے اپنی اس دریافت سے قاضی کو بھی فوری آگاہ کر دیا۔

"خاموش ہو جاؤ بے وقوف!" قاضی نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے گھورتے ہوئے ڈپٹا۔ "کمرے میں جوتوں کے نشان میرے تھے۔ اس مجرم تک ہمیں یہ سکہ پہنچائے گا۔"

تھوڑی ہی دیر میں تینوں مسافر ان کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ وہ تفتیش کے نئے آغاز سے کافی گھبراہٹ میں مبتلا دکھائی دے رہے تھے۔ قاضی نے ان کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ سکہ بردار مسافر کی جیب میں یقیناً کوئی سوراخ ہوگا۔ تفتیش کے اس انداز نے مغیث کو بے قصور ثابت کر دیا۔ اس کے لباس میں کوئی جیب ہی نہ تھی۔ اب غوث اور عبید ایک بار پھر تفتیش کا مرکز بن گئے۔ قاضی انہیں قہرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس نے مغیث کو جانے کی اجازت دے دی۔

منکش سیڑھیوں پر سر تھامے اس ناخوشگوار صورت حال کو دیکھ رہا تھا۔ اسے قاضی اور اس کے طریقہ کار سے اختلاف تھا۔ اس کے ذہن میں بارہا ایک ہی خیال دستک دے رہا تھا۔

"ان دونوں سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس مسئلے کا حل صرف بہلول کے پاس ہے۔ وہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔" منکش فوری طور پر اس فیصلے پر پہنچا اور وہب کی تلاش میں باہر نکل گیا۔ بغداد کے گلی کوچوں میں بکھری اس عام زندگی کا یہ ایک اور رنگ تھا۔ یہاں اہم عہدیدار باہمی عزت و ذہنی ہم آہنگی سے محروم تھا۔ قانون ذاتی پسند و ناپسند کی بیڑیوں میں جکڑا تھا ہوا اور عہدیداران کی قابلیت پر عام آدمی بہ مشکل ہی اعتبار کر پاتا۔

☆☆☆

وہب کی آمد نے قاضی اور مغیث کو چونکا دیا۔ مغیث کے ذہن میں ابن عمرو کا تصور اجاگر ہو گیا۔ قاضی بہر حال اس کے 'ماضی' سے آگاہ تھا۔ منکش اسے راستے ہی میں ساری صورت حال سے آگاہ کر کے لایا تھا۔ وہب نے تینوں مسافروں کا جائزہ لیا اور سکہ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد ناک سے لگا کر کئی بار سونگھا۔

"قاضی صاحب! آپ کس احمق اور دیوانے کو برداشت کر رہے ہیں۔ یہ کسی قابل ہوتا تو بغداد میں اعلیٰ مقام پر نہ ہوتا۔" داروغہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ وہب اسے نظر انداز کیے اپنے کام میں مشغول رہا۔

"عبید بے گناہ ہے۔ یہ سکہ اس کا نہیں ہے۔ مجھے ایک برتن میں شفاف پانی لا دیں تو ابھی باقی معاملات بھی حل ہو جائیں گے۔"

اس کی فرمائش پر داروغہ پھر جزبز ہونے لگا۔ وہب کی اپنی ہی لے میں بے ساختہ حرکات اسے مزید مشتعل کر رہی تھیں۔ منکش فوری طور پر ایک چھوٹی سی کٹوری میں پانی

ڈرا دیا۔ وہب نے وہ سکہ پانی میں ڈالا اور اپنی نظریں پانی کی سطح پر جما دیں۔ کچھ لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اور منکش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''تمہارا مجرم مل گیا ہے مجھے! قاضی صاحب کا ہار اس قصاب نے چرایا ہے۔''

اس انکشاف نے قاضی اور داروغہ کو ساکت کر دیا۔ مغیث کو بھی اپنے قدموں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔

''قانون ثبوت مانگتا ہے قاضی صاحب! اس دیوانے کے پاس کوئی ثبوت موجود ہے یا کسی جادوئی چھڑی کو گھما کر مجرم کا علم ہو گیا ہے اسے؟'' داروغہ ایک بار پھر زہر اگلے بغیر نہ رہ سکا۔

''ثبوت تو آپ سب کے سامنے ہے۔ سکے میں کسی قسم کی کوئی خوشبو نہیں بسی تھی۔ پانی میں ڈبونے سے خمیر یا آٹے کے بجائے گوشت کے ننھے پارچہ جات اور چکنائی کے ذرات سطح پر تیرنے لگے ہیں۔''

وہب نے کٹوری میں موجود ''ثبوت'' اس کے سامنے دھرا اور اپنا چوبی گھوڑا سنبھال کر ٹخ ٹخ کی آوازیں برآمد کرتا مسافر خانے سے باہر نکل گیا۔ قاضی اور داروغہ دونوں ہی ایک احمق کی اس فراست سے دنگ تھے۔ منکش کے چہرے پر آسودگی جھلکنے لگی۔

☆☆☆

شام اپنے اختتامی مراحل میں تھی۔ گلی کوچوں میں سناٹا طاری ہونے لگا تھا۔ وہب اپنی لکڑی ہاتھ میں تھامے خراماں خراماں گھر کی طرف گامزن تھا۔ اس کا کھلا لبادہ ہوا سے پھڑ پھڑانے لگتا۔ گردن میں طویل منکے، ادھ کھلا عمامہ اور بکھری الجھی ڈاڑھی دیکھ کر کوئی بھی شخص اس کی ہیئت پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

ایک ذیلی گلی سے نکل کر بیرونی جانب آتے ہی اسے کسی دکان کے کھلے ہونے کا احساس ہوا۔ اس کی حساس نظر اور تیز سماعت نے مخصوص آواز سن کر اندازہ لگا لیا تھا کہ داروغہ سعد کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔ وہب کو یہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس نے اپنا چوبی گھوڑا تیار کیا اور اس پر سوار ہو کر ہنہناتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ داروغہ سعد اسے دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھا۔ وہ اس کے پیچھے لپکنا چاہتا تھا لیکن اپنی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے ایسی پھرتی اس کے لیے ممکن ہی نہ تھی۔

''ارے! کوئی روکو اسے...... فوراً روکو!'' داروغہ چلّایا لیکن وہب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

''کیا وہ تمہارا کوئی دیرینہ دوست تھا؟'' دکاندار نے اس کی بے چینی دیکھ کر استفسار کیا۔ وہ ایک عطر فروش تھا۔ مختلف شہروں سے عطر، صابن اور آرائشی اشیاء خرید کر بغداد میں فروخت کرتا تھا۔

''نہیں! میں ایسے احمقوں کو اپنا دوست نہیں بناتا۔'' سعد نے ناگواری سے کہا۔

''تو پھر اس کے پیچھے یوں لپکنے کا کیا مقصد تھا؟'' عطر فروش نے پوچھا۔ وہ داروغہ کے منصب یا شخصیت سے بالکل خائف نہیں تھا۔ داروغہ سے بے تکلفی اور اس کی شخصی خامیوں نے ایسا کوئی بھی تاثر پیدا ہونے ہی نہیں دیا تھا۔

''یہ تو میرے فرائض میں شامل ہے۔'' اس نے.... رازدارانہ انداز میں بتایا اور اردگرد دیکھتے ہوئے مزید سرگوشیانہ لہجہ اپنا لیا۔

''مجھے خلیفہ ہارون الرشید نے اس پر نظر رکھنے کا حکم دیا ہے۔''

''اس وہب پر نظر...... تمہیں پتا بھی ہے کہ ہم اس کی حماقتوں اور نادانیوں کے باعث اسے بہلول کہہ کر پکارتے ہیں۔'' عطر فروش نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں! مجھے علم ہے کہ یہ بہلول ہے۔'' داروغہ نے نفرت جتائی۔

''تو یہ سب جا کر خلیفہ کو بھی بتا دو۔ خوامخواہ اپنی توانائی ایک احمق کے پیچھے ضائع کر رہے ہو۔'' عطر فروش نے مفت مشورہ دیا۔

''خلیفہ اسے احمق یا پاگل سمجھتا ہی نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہب ابن عمرو نے جان بوجھ کر یہ سوانگ رچا رکھا ہے۔'' سعد نے بتایا۔

''سارا بغداد جانتا ہے کہ وہب کا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔'' عطر فروش نے اسے قائل کرنا چاہا۔

''لیکن خلیفہ کو یقین نہیں۔''

''انہیں یہ بھی بتانا تھا کہ اس کے اہلِ خانہ اور عزیز و اقارب اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے بھی آئے تھے۔ ایک نیم پختہ گھر میں کچے فرش پر بازو کو تکیہ بنا کر سوئے ہوئے وہب کو دیکھ کر کئی اقارب تو رو ہی پڑے تھے۔ وہ اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے اپنی حماقت اور جنون میں اسی زندگی کو ترجیح دی۔ کہنے لگا یہاں دربان کی مصیبت ہے نہ ہی چور کا ڈر۔ میں یہیں رہوں گا کیونکہ یہاں رہنے سے روزِ حشر باز پرس کی سختی کم ہو جائے گی۔''

''اہلِ خانہ اچھے ہوتے تو اس کا ذہنی علاج کرواتے۔'' سعد نے ایک بار پھر نفرت جتائی۔
''انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بہلول نے انہیں کہا کہ بیمار تو سب ہی ہیں۔ بغداد میں خلیفہ، وزرا، مشیروں سمیت ہر ایک کو علاج کی ضرورت ہے۔ وہ بہت عرصے تک اس سے ملاقات کے لیے آتے اور قائل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے لیکن اس کے جنون کے سامنے کسی کی دال نہ گلی۔'' اس نے مزید انکشافات کیے۔
''چھوڑو اس احمق کے ذکر کو۔ یہ بتاؤ اس بار سفر کے لیے کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' داروغہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ایک خاص مقصد کے تحت پوچھا۔
''بصرہ کے لیے کل ہی روانگی متوقع ہے۔ وہاں سے صابن اور عطر بہت مناسب قیمت پر مل جاتے ہیں۔'' وہ اس کی عدم دلچسپی بھانپ کر سرسری سے انداز میں بولا۔
''بہت خوب! تو یہ بتاؤ کہ شہر کی طاقتور ترین ہستی داروغہ کے لیے کیا تحفہ لاؤ گے؟'' اس کے استفسار میں حرص نمایاں تھی۔
''تمہارے لیے کچھ لانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تمہیں جو چیز درکار ہوتی ہے، بنا پوچھے ہی اٹھا کر لے جاتے ہو۔'' عطر فروش نے طنز کیا۔
داروغہ کے چہرے پر سرخی چھائی لیکن اس میں احتجاج کرنے یا کچھ بھی کہنے کی اخلاقی جرأت نہیں تھی۔ اس لیے کھسیا کر ہنسنے پر ہی اکتفا کیا۔

☆☆☆

داروغہ اور وہب کی اگلی ملاقات جلد ہی ہوگئی۔ صبح کی سنہری دھوپ میں بغداد کے کوچے اور مکانات مکمل نہائے ہوئے تھے۔ وہب اپنی گھڑسواری میں مشغول بازار سے گزر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک اور پشت پر دو ٹوکریاں تھیں۔ اس نے اپنے تھل تھل کرتے وجود کو سنبھالا اور وہب کے رستے میں کھڑا ہوگیا۔
''کیا بات ہے سعد؟ کیوں روکا ہے مجھے؟'' اس نے اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے پوچھا۔ آنکھوں میں حد درجہ معصومیت اور بے نیازی تھی۔
''مجھے تمہارے سامان کی تلاشی لینی ہے۔'' داروغہ نے رعب جمایا۔
''کیسی تلاشی؟ میں مجرم نہیں ہوں۔ میں تو رزقِ حلال کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ تم خوامخواہ میرا رستہ کھوٹا کرنے چلے آئے ہو۔''
''میں خلیفہ کے حکم کا پابند ہوں۔ انہوں نے سختی سے ہدایات کر رکھی ہیں کہ بازار میں کوئی بھی شخص ملاوٹ شدہ اشیاء فروخت نہ کرے۔'' داروغہ نے اس کے سامانِ روزگار کی پڑتال کرنی چاہی۔
''تمہارے خلیفہ کو خود کھرے اور کھوٹے کی تمیز کہاں ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو وہ تم جیسے غبی اور نااہل شخص کو ایسے معائنے کے لیے نہ بھیجتا۔ خدا جانے اس نے تمہاری ذات میں ایسی کیا خوبی دیکھ لی ہے جو عوام کے سروں پر مسلط کر دیا ہے۔''
وہب کا بے باک اور نڈر انداز داروغہ کا دل دہلانے لگا۔
''تم خلیفہ کے عتاب سے ڈرو اے بہلول! تمہیں زمین کے اندر گاڑ دیا جائے گا۔'' وہ قہر برسانے لگا۔
وہب نے اس کی بات نظر انداز کی اور گھڑسواری کرتا آگے بڑھ گیا۔ داروغہ کینہ توز نظروں سے اس کی پشت گھورتا رہا۔ وہ خلیفہ کو اس گستاخ کی جسارت کے متعلق بتانے کے لیے حتی الامکان منفی ترین الفاظ مرتب کرنے لگا۔ اس کی توقعات کے برعکس خلیفہ ہارون الرشید بہلول کی تازہ ترین کارگزاریوں سے نہایت مثبت انداز میں آگاہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

خلیفہ ہارون الرشید دربار میں قاضی القضاۃ کے ہمراہ موجود تھا۔ ان دونوں کے درمیان مختلف امور پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ موضوعِ گفتگو یکدم ایک نئی صورتِ حال کی جانب مڑ گیا۔
''ابنِ ثقیت! بغداد میں تمہیں کیا بات سب سے زیادہ خوشی اور غم دیتی ہے؟'' ہارون نے دریافت کیا۔
قاضی القضاۃ اس سوال پر خاموش رہ گیا۔ اس کے ذہن میں بہت سے خدشات بیک وقت رقصاں تھے۔ اس کے سامنے موجود دراز قد، فصیح البیان، علم دوست اور مذہب پسند خلیفہ کے لیے بغداد بہت عزیز تھا۔ اس شہر کو ''عروس البلاد'' کی حیثیت حاصل تھی۔ مادی اعتبار سے بھی دولت مند شہر تھا۔ تعمیری خوبصورتی تو لاثانی تھی۔ ہر چپہ اور گوشہ زندگی پر ور مناظر سے بھرپور دکھائی دیتا۔ البتہ محض اتنا تھا کہ اس خوبصورتی کی چکاچوند میں وہ عوامل دکھائی ہی نہیں دیتے تھے جو عمومی معاشرتی زندگی کے لیے بدنمائی ثابت ہو رہے تھے۔ اپنی فراست، بہادری اور لگن سے بغداد کو عروج دینے والے ہارون سے بھی یہ پہلو فی الوقت پوشیدہ تھے۔ ابنِ ثقیت کو یہی پہلو ایسے انداز میں خلیفہ کے سامنے رکھنے تھے کہ اس کی طبع پر کچھ ناگوار بھی نہ گزرے۔
''بغداد بے شک ایک سحر انگیز اور حیران کن شہر ہے۔

میں ایک ہی بات پر بیک وقت خوش اور دکھی ہوتا ہوں۔ اس عظیم الشان شہر اور آپ کی بے مثال حکومت میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جسے افلاس و غربت کی وجہ سے دو وقت کی روٹی کے لالے رہتے ہیں اور ان لوگوں کی ضروریات بہلول جیسا شخص پوری کرتا ہے۔'' ابن ثقیت نے حتی الامکان نپے تلے لفظوں کا انتخاب کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ناممکن! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ میرے خزانے مالا مال ہیں۔'' ہارون الرشید کے وجیہہ چہرے پر طیش کی سرخی دوڑ گئی۔

ہارون کا یہ یقین غلط بھی نہ تھا۔ اس وقت خراج کی سالانہ آمدنی ہی ''ساڑھے سات ہزار قنطار'' تھی۔ ایک قنطار آٹھ ہزار چار سو دینار کے مساوی تھا۔ ہر صوبے کا خراج الگ مقرر تھا۔ زرِ نقد کے علاوہ بھی خراج میں بے شمار اشیاء سالانہ وصول ہوتیں۔

''یہ سب ایک حقیقت ہے امیر المومنین! ایک تلخ حقیقت جسے میں نے اپنی آنکھوں سے وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے۔ بہلول اسی طرح مستحق افراد کی مدد کرتا ہے کہ دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہیں ہونے پاتی۔ سوال بس یہ ہے کہ یہ سب ہماری ذمے داری ہے یا اس بہلول کی؟'' ابن ثقیت نرمی سے بولا۔

ہارون الرشید کی پیشانی پر بل گہرے ہونے لگے۔ ان دنوں سلطنت کے اندرونی حالات بھی کافی منتشر تھے۔ ایسے میں وہب جیسے شخص کی بابت اس انکشاف نے خلیفہ کی ذاتی انا پر خاصی ضرب لگائی تھی۔ اس نے وہب کو دربار میں طلب کر لیا۔

وہب میلے کپڑوں اور الجھی بکھری حالت میں ہی اس کے سامنے پیش ہوا۔ اس کے پاس اپنا چوبی گھوڑا بھی تھا۔ وہ بڑی شفقت سے اس کی ایال سہلا رہا تھا۔ ہارون الرشید کی تیز اور گہری نظریں اس کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ ابن ثقیت بھی اس نادر روزگار شخص کو اپنے نقطۂ نظر سے جانچ رہا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو وہب کہ خلیفہ نے تمہیں یہاں کیوں بلوایا ہے؟'' ابن ثقیت نے اسے مخاطب کیا۔

''حاکم کو جب کسی غیر متعلق شخص کو طلب کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ لمحۂ فکریہ ہوتا ہے۔ پھر وہ اچھا حاکم نہیں رہتا۔'' وہب نے اپنے مخصوص مضحکہ خیز انداز میں جواب دیا۔ ہارون الرشید کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ایک اچھے حاکم کی کیا خوبی ہوتی ہے وہب؟'' خلیفہ نے محظوظ ہو کر اسے خود مخاطب کیا۔

''جس کی سلطنت میں کوئی بھوکا نہ سوئے۔ اس کی ترجیح مادی ترقی، خزانے میں اضافہ، سرحدوں کی توسیع اور بلند و بالا عمارتوں کے بجائے اپنے مفلوک الحال عوام کی خوشحالی ہو۔'' وہب نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا میری رعایا میں کوئی ایسا بھی ہے جو عسرت کا شکار ہو؟'' خلیفہ نے نیا سوال کیا۔

''ایک اچھا سربراہ وہی ہوتا ہے جسے اپنے گھر میں رہنے والے ہر ایک فرد کی ذاتی خبر ہو۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے سربراہی سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔'' اس نے اپنی بات کا تسلسل جاری رکھا۔

''تم نے خلیفہ کی بات کا جواب تو دیا ہی نہیں وہب؟'' ابن ثقیت نے اسے ٹوکا۔

''مجھے علم ہوا ہے کہ تم کرخ کے بازار میں عوام کی مدد کیا کرتے ہو۔ کیا یہ بات درست ہے؟'' ہارون الرشید نے ایک اور سوال داغا۔

''کون...... میں؟'' وہب حیران ہوا۔ ''بھلا میں کیسے کسی کی مدد کر سکتا ہوں؟ میرے پاس ان ٹوکریوں اور گھوڑے کے سوا ہے ہی کیا؟'' اس نے ایک بار پھر بات گھما دی۔ ابن ثقیت اس کی ہر ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ہارون الرشید بھی گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک باوقار، نڈر اور نفیس حکمران تھا۔ اس نے سلطنت میں وہب جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا تھا۔

وہب خلیفہ کا صرف ''قرابت دار'' ہی نہیں بلکہ سب سے بڑا ''ناقد'' بھی تھا۔ اس کی کئی سرگرمیوں کو آڑے ہاتھوں بھی لیا کرتا۔ اس کے باوجود اسے یہ باتیں ناگوار نہیں گزرتی تھیں۔ اس کے دل میں ایک ہی الجھن تھی کہ وہب نے دیوانگی کا یہ بہروپ دانستہ طور پر اختیار کر رکھا ہے۔ ابن ثقیت اور خلیفہ کے دل و دماغ میں مچلنے والے ان سوالوں سے بے نیاز وہب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

قصر کی طویل، خوبصورت اور آراستہ راہداریوں سے نکلتے ہوئے اس کی ملاقات ''مسرور'' سے ہو گئی۔ وہ بھی اکثریت کی طرح وہب کو احمق اور دیوانہ سمجھتا تھا۔ وہ اس کی ''گھڑ سواری'' دیکھ کر بے ساختہ ہنسنے لگا۔ وہب نے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے وہیں روک دیا۔

''تمہارے بارے میں سچ کہا جاتا ہے بہلول! یقیناً تم سے بڑا احمق بغداد میں کہیں نہیں ملے گا جو لکڑی کے

ڈنڈے کو اپنا گھوڑا تسلیم کرتا ہے۔‘‘ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
’’تم نے درست کہا مسرور! مجھ سے بڑا احمق بغداد میں نہیں ملے گا بلکہ اس قصر کے اندر ہی ملے گا۔‘‘ وہب نے برجستہ کہا۔
’’کون؟ یہاں بھلا کسی احمق کا کیا کام؟‘‘ مسرور چونکا۔
’’وہ احمق جو اپنی تلوار پر سوار رہے اور اس کی تلوار کی ہر جنبش کسی دوسرے کے حکم کی محتاج ہے۔ میرا گھوڑا مجھے آزادی سے کہیں بھی لے جایا کرتا ہے لیکن کیا تم اپنی مرضی سے اس ہتھیار کو جنبش دے سکتے ہو؟‘‘ وہب کی بات پر مسرور سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔
’’میں کسی دیوانے سے الجھ کر اپنا وقت برباد نہیں کر سکتا۔‘‘ اس نے وہب کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔
’’مصلحتوں سے آزاد دیوانہ کسی مجبور اور بے کس فرزانے سے بہتر ہوتا ہے مسرور!‘‘ وہب نے ایک اور وار کیا اور مخصوص آوازیں برآمد کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

ہارون الرشید کے امورِ سلطنت میں ان دنوں تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ ’’دیلم‘‘ کے عوام حکومت کے خلاف تحریک کے درپے تھے۔ انہیں ’’یحییٰ ابن عبداللہ‘‘ نے فی الوقت متحد کر رکھا تھا۔ یہ مظاہرے رفتہ رفتہ بغاوت کے شعلوں میں ڈھلتے نظر آنے لگے۔ دیلم کے عوام اور مقامی مظاہروں کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا مطلب مستقبل قریب میں بغداد سے بھی محرومی تھا۔
ہارون الرشید نے ابو وہب کی حقیقت کا تجسس پس پشت ڈال کر اپنے بااعتماد وزیر ’’فضل ابن یحییٰ‘‘ کو خراسان سے طلب کرنے کے لیے قاصد روانہ کر دیا۔ وزیر فضل نے فوری طور پر روانگی کے لیے تیاری کا آغاز کر دیا۔
’’اتنی عجلت میں کیوں بلایا ہے خلیفہ نے آپ کو؟‘‘ اس کی اہلیہ حیران تھی۔
’’تمہیں تو اب تک اندازہ ہو جانا چاہیے شہناز! امورِ سلطنت ایسے ہی ہوتے ہیں۔ سازشوں کا سدِباب کرنے کے لیے بہت سے مہرے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔‘‘ فضل نے اسے بتایا۔
’’خلیفہ کے خلاف کون سازش کرے گا؟ ہمارے خلیفہ تو بہت عالی مقام اور اچھے ہیں۔‘‘ شہناز نے اپنے جذبات بیان کیے۔
’’بے شک وہ شاندار حاکم ہیں لیکن بادشاہوں اور خلفاء کے خلاف ایسی بغاوتیں اور تحریکیں ماضی میں بھی سامنے آتی رہی ہیں۔‘‘ فضل نے متانت سے اسے سمجھایا۔
’’میری دلی دعا ہے کہ خلیفہ عالی مقام اس مشکل سے جلد از جلد نجات حاصل کر لیں۔‘‘ شہناز نے خلوص سے کہا۔ فضل ابن یحییٰ مسکرا دیا۔ وہ بھی اہلیہ کی طرح خلیفہ ہارون الرشید کا بہت مداح اور وفادار تھا۔
ہارون نے اسے خراسان بھیجنے سے قبل بہت سی ہدایات دی تھیں۔ خوفِ خدا، اطاعتِ الٰہی، اسلامی احکام کی پابندی، حفاظت، قرآن و سنت کو راہنما، حلال و حرام امور میں احتیاط، مشتبہ امور میں ذاتی فیصلوں کے بجائے علمائے دین سے مشورے کے ساتھ قرب و جوار کے علاقوں کے حاکمین سے محتاط طرزِ عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ فضل انہی احکامات پر سختی سے کاربند تھا۔
’’اب کیا سوچنے لگے ہیں؟ اس بار بغداد میں خلیفہ سے مسجد کے بارے میں بھی بات کر آیئے گا۔‘‘ شہناز نے اسے یاددہانی کروائی۔ وہ طویل عرصے سے بغداد میں ایک مسجد تعمیر کروانے کی خواہش مند تھی۔
’’میں خلیفہ کا مزاج دیکھ کر ہی بات کروں گا۔‘‘ فضل نے اسے ٹالا اور سفر کی تیاریاں مکمل کرنے لگا۔
بغداد میں حالات حسبِ توقع تھے۔ ہارون الرشید کی پیشانی شکن زدہ تھی۔ وہ دیلم کے ان حکومت مخالف مظاہروں سے بے حد ناخوش تھا۔ فضل ابن یحییٰ کو وہاں بھیجنے کا مقصد بھی بہرحال یہی تھا کہ وہ ماضی میں دیلم کا عامل رہ چکا تھا۔ اسے وہاں کے حالات، عوام کے جذبات و نفسیات سے بہتر آگاہی تھی۔
’’یہ بغاوت ہر حال میں سرد ہونی چاہیے ابن یحییٰ! اگر ایسا نہ ہو سکا تو بغداد بھی مٹھی سے ریت کے مانند سرکنے لگے گا۔‘‘ ہارون الرشید نے تشویش جتائی۔ فضل اسے کامیابی کی بھرپور تشفی دینے لگا۔
’’اس مہم میں کامیابی کے بعد شاندار انعام تمہارا منتظر ہو گا۔‘‘ ہارون نے فیاضی سے کہا۔
’’جان کی امان پاؤں تو ایک عرض کروں گا کہ خلیفہ میری دیرینہ خواہش کی تکمیل پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیں۔‘‘ اس نے موقع غنیمت جان کر کہا۔
’’اگر دیرینہ خواہش ہے تو میں تم سے اس بات پر ناراض ہونے میں حق بجانب ہوں کہ پہلے ذکر کیوں نہ

کیا؟'' ہارون نے شفقت سے جواب دیا۔ منظورِ نظر فضل ابن یحییٰ نے عاجزی سے سرِ تسلیم خم کیا اور نظریں جھکا کر کہنے لگا۔

''خلیفہ کی محبت و سخاوت میرا اثاثہ ہیں۔ میں بغداد میں آپ کی اجازت سے ایک مسجد تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہایت احسن خیال ہے۔ دیلم سے کامیاب لوٹ آؤ تو ہم اس معاملے کو آگے بڑھائیں گے۔'' ہارون نے اسے اپنی ذمے داری میں مکمل تندہی کا حکم دیا۔

فضل ابن یحییٰ آداب بجالا کر دیلم روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ابن ثقیت اپنی رہائش گاہ میں کافی دیر سے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کے سرخ و سفید چہرے اور جہاندیدہ آنکھوں میں الجھن بھی نمایاں تھی۔ ان دنوں وہ صرف وہب کے متعلق سوچ میں مبتلا رہتا۔ وہ بلاشبہ بغداد کا ایک عجیب و غریب کردار تھا۔ دیوانگی کی لے میں فرزانگی کی ایسی باتیں کہہ جاتا کہ مقابل کے لیے یقین دشوار ہونے لگتا۔ بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو شاید وہ نظرانداز کر جاتا لیکن کرخ کے بازار میں غرباء کی امداد ایک ایسا معاملہ تھا جسے وہ اب تک نظرانداز نہیں کر پایا تھا۔ اس نے وہب سے ذاتی ملاقات کا فیصلہ کرکے اسے اپنے مکان پر طلب کیا تھا۔

وہب کچھ ہی دیر بعد وہاں چلا آیا۔ ابن ثقیت اس کی ہر ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ عام ملاقاتیوں کی طرح اس نے قاضی کے بہترین منقش جبے، نفیس عمامے، کمرے میں رکھے دلکش آرائشی سامان، ریشمی پردوں اور خوب صورت نشستوں پر مشتمل دیوان کی طرف صرف نگاہِ غلط دہرائی تھی۔

''آؤ وہب! میں تو کب سے تمہارا منتظر ہوں۔ آؤ یہاں بیٹھو!''

''مجھے یہاں کیوں بلوایا ہے قاضی؟ یہ میرے رزقِ حلال کا وقت ہوتا ہے۔'' وہ دیوان پر بیٹھتے ہی اپنے مخصوص سابقہ انداز میں لوٹ آیا تھا۔

''تم اس رزقِ حلال سے کیا کرتے ہو ابو وہب؟'' ابن ثقیت نے مدعا کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''شکم کی آگ بجھاتا ہوں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ تم اپنی کمائی سے ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتے ہو۔'' ابن ثقیت نے نرمی سے پوچھا۔

''ریاست میں ضرورت مندوں کی مدد کرنا تو حاکم کا کام ہوتا ہے جناب قاضی! مجھ جیسا بہلول بھلا یہ سب کیسے کر سکتا ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ہمارے خلیفہ بے شک اپنی رعایا کے لیے بہت دردمند دل کے مالک ہیں۔ وہ ان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔'' قاضی القضاۃ نے جواب دیا۔

''تو پھر تم نے یہ کیسے سن لیا کہ یہاں ضرورت مند افراد بھی ہیں۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم اپنے خلیفہ کی صلاحیتوں کے متعلق ہی شکوک و شبہات کا شکار ہو۔'' وہب کی اس بات پر قاضی لاجواب ہوگیا۔

''نہیں! مجھے خلیفہ کی اہلیت پر بھلا کیسے شک ہوسکتا ہے؟ وہ ایک باصلاحیت اور مدبر حکمران ہیں۔'' ابن ثقیت نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''بالکل! خلیفہ کی صلاحیتوں پر کیسا شک؟ بغداد ایک دولت مند شہر ہے۔ اس کے ایوان فلک بوس ہیں۔ یہاں صوفیا کی خانقاہیں، علماء کے مدارس اور زاویے ہیں۔ ایوانوں میں درہموں اور دیناروں کا انبار موجود ہے۔ حسین و جمیل کنیزیں، جام کے دور، نغموں کی آوازیں خوب تر۔ کسی مطربہ کا نغمہ پسند آنے پر اسے لاکھوں دینار بخش دیے جاتے ہیں۔ کسی مغنیہ کی لے بھا جائے تو وہ عرش پر پہنچا دی جاتی ہے۔ رقاصاؤں کے لیے خزانوں کی تھیلیاں کھول دی جاتی ہیں۔'' وہب کے الفاظ و انداز میں سادگی کے باوجود ایک کاٹ نمایاں تھی۔

''میرا سوال اب بھی وہیں برقرار ہے۔ مجھے مسدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ تم کرخ کے بازار میں مستحق افراد کی مدد کرتے ہو۔ تم ان کے نام خلیفہ کو کیوں نہیں بتا دیتے تاکہ ان کے لیے کسی ماہانہ وظیفے کا بندوبست ہوسکے۔ خلیفہ ایک بہترین حکمران ہیں۔ وہ ان کی بہرصورت مدد کریں گے۔''

''اس گھر کے سربراہ کی اہلیت کیسے مستند ہوگئی جس کے اہلِ خانہ میں سے کچھ محتاجی کا شکار ہوں اور وہ خود شکم سیر ہوکر سوئے۔ ایسے سربراہ کو تو خود ہی اپنی مسند سے علیحدگی اختیار کرلینی چاہیے۔'' وہب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''تم ایک بار ان کے نام تو بتاؤ۔ انہیں خلیفہ کے پاس جانے کا کہو۔ ان کے ماہانہ وظیفے کا بندوبست ہوجائے گا۔'' ابن ثقیت بضد تھا۔

''ضرورت مند اور محتاج اپنی مشکلات خود بیان نہیں کرتے۔ تمہارا خلیفہ یوں تو قرآن و سنت پر عمل کے دعوے کرتا ہے لیکن اسے اتنا علم نہیں کیا کہ ایسے ضرورت مند

چہروں سے ہی پہچان لیے جاتے ہیں۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔''

وہب کی اس بات نے ابن ثقیت کی پیشانی ندامت سے تر کردی۔ اسے اپنے سامنے موجود اس بظاہر احمق اور دیوانگی میں مبتلا دکھائی دینے والے شخص کی بابت خلیفہ ہارون الرشید کے شبہات بالکل درست معلوم ہونے لگے کہ اس نے ایک ''بہروپ'' اختیار کر رکھا ہے۔

''اب میں چلتا ہوں قاضی! میرا گھوڑا بھوکا ہے۔ اسے گھاس اور دانہ بھی کھلانا ہے۔'' ابن ثقیت کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں دیکھ کر وہب نے فوراً چوبی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور باہر نکل گیا۔

ابن ثقیت نے اس تازہ ترین صورتِ حال کے متعلق ہارون الرشید کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تاہم اسے اندازہ نہیں تھا کہ خلیفہ سے ملاقات ممکن نہ ہو پائے گی۔ خلیفہ نے امورِ سلطنت کی تھکاوٹ اور ذہنی دباؤ سے نجات کے لیے سیر و تفریح اور شکار کا ہنگامی منصوبہ بنالیا تھا۔

☆☆☆

ہارون الرشید نے دیلم کے حالات، درباری امور کے تناؤ اور یکساں معمولات سے تازہ دم ہونے کے لیے دو روزہ روانگی کا منصوبہ بنایا تھا۔ تیاریاں مکمل ہوتے ہی اس نے اپنے محافظ خصوصی ہسرور کو ضروری ہدایات جاری کیں۔ اس نے شہر کے داروغہ کی طرح مسرور کو بھی ابووہب کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی ذمے داری سونپ رکھی تھی۔ مسرور کی جانثاری اور خلوص شک و شبہے سے بالاتر تھا۔

بغداد کے اس پُرشکوہ خلیفہ کی تفریحی سرگرمیاں بھی اس کے مزاج کے مطابق ہی کی طرح منفرد تھیں۔ وہ ''نبیذ'' قسم کی ایک شراب کا رسیا تھا جسے عراقی فقہاء نے حلال قرار دے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ راگ اسے اس قدر بھاتے کہ وہ ان کے لیے کثیر رقم لٹانے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھتا۔ خلیفہ کی یہ سیر و تفریح اگر بغداد کی حدود میں ہوتی تو امراء اور وزراء راگ رنگ کی محافل ہی منعقد کرتے تھے۔ عمدہ کھانے، مغنی، ستار بجانے والے، رقص میں ماہر لونڈیاں، شعراء کا بھی انتظام ہوتا۔ صاحبِ مجلس کے اپنے اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچتے ہی تمام لوگ پہلے سے زیب تن لباس تبدیل کر کے سرخ، زرد اور سبز رنگ کے کپڑوں پر مشتمل نہایت قیمتی اور قدرے باریک ''لباسِ مجلس'' پہن لیتے۔ اس کے بعد اگلے مرحلے میں گھر کا منتظم انہیں لیے بڑے کمرے میں چلا آتا جو عام طور پر اسی مقصد کے لیے تیار و آراستہ ہوتا تھا۔ اہلِ مجلس کے اکٹھے ہونے اور نشستیں سنبھال لینے کے بعد غلام بلوریں صراحیوں میں نبیذ لا کر مہمانوں کی خدمت میں پیش کرتے۔ انواع و اقسام کے میوہ جات اور ٹھنڈے گوشت کی رکابیاں الگ اشتہا بڑھاتیں۔ فضا میں عطریات کی مہک طبیعت میں فرحت پیدا کر دیتی تھی۔ اس کے بعد ذہنی تراوٹ کے لیے راگ رنگ کی محفل کا آغاز ہوجاتا۔ یہ سرگرمی ہارون الرشید کو بے حد مرغوب تھی لیکن اس وقت وہ ذہنی دباؤ کے اس عالم میں تھا کہ بیرونی سیر و شکار کے سوا کسی بھی جانب طبیعت مائل ہو ہی نہ رہی تھی۔

خلیفہ کے شکار کی سرگرمیاں بھی دلچسپ ترین تھیں۔ وہ حاجب کو اپنے ارادے کی اطلاع دے دیتا تھا جس کے بعد حاجب ان تمام افراد کو اکٹھا کرنے پر مامور ہو جاتا جو اس شکار میں مددگار ثابت ہوسکتے تھے۔ باز اور کتے خصوصی طور پر منگوائے جاتے۔ ملازمین کو تیار کیا جاتا۔ یہ تیاریاں مکمل ہوتے ہی وہ اپنے قافلے کے ساتھ بغداد سے نکل کر ''دجیل'' روانہ ہوجاتا۔ دجیل کا وہ علاقہ کئی میلوں پر محیط تھا۔

شکار کا انداز بھی خوب تھا۔ قافلے کے ہمراہ آئے افراد جنگل میں ہر سمت پھیل جاتے اور مطلوبہ جانوروں کو اپنے گھوڑوں اور کتوں کی مدد سے... ہنکاتے دائرہ تنگ کرنے لگتے۔ ان جانوروں کو کہیں اور راہِ فرار نہ ملتی تو دیوار کی طرف بھاگنے کے سوا چارہ نہ رہتا۔ ان کے احاطے میں پہنچتے ہی محاصرہ مکمل کر کے خلیفہ کو اطلاع دے دی جاتی۔ خلیفہ اپنے خواص کے ساتھ خواہش کے مطابق جانور شکار کر کے بقیہ چھوڑ دیتا۔

پرندوں کے شکار کا معاملہ بھی منفرد تھا۔ اس شکار کے دوران باز اور شکروں کو ہوا میں اڑا دیا جاتا۔ وہ شکار پر جھپٹ کر ایک ہی پل میں انہیں زمین پر لے آتے۔ ان سرگرمیوں کے علاوہ ہارون الرشید کو اپنے خصوصی باغ کی سیر بھی بہت مرغوب تھی۔ اس کا باغ خوبصورتی میں بے مثال تھا۔ کیاریوں میں سیکڑوں اقسام کے پھول خوشنمائی دکھاتے۔ ہندوستان، خراسان اور ترکستان سے منگوا کر اگائے گئے درختوں کی اقسام کا بھی کوئی جواب نہ تھا۔ جھاڑیوں کی خوبصورتی اس سے بھی سوا تھی۔ انہیں قینچی سے کاٹ کر مور، ہدہد، ابابیل جیسے خوبصورت پرندوں کی اشکال دی گئی تھیں۔ کیاریوں کے درمیان حوض بنائے گئے تھے۔ ان حوضوں میں تیرنے والی مچھلیوں کی خوش نمائی دیدہ زیب تھی۔

اس دلکش خوبصورتی سے لطف اندوز ہونے کے لیے

ہی ہارون الرشید دوروزہ دورے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں ابن ثقیت ملاقات کے لیے دربار میں آیا تو اپنے سامنے ''وجہ ملاقات'' کو پہلے ہی سے موجود پا کر دنگ رہ گیا۔ مسرور کی بھی کم وبیش یہی حالت تھی۔ وہب جانے کب اور کس لمحے پہریداروں کو غچا دے کر ہارون الرشید کے تخت پر آبیٹھا تھا۔ اس کے میلے اور دھول مٹی سے اٹے جوتے اس نفیس مسند پر شاہکار نقش ونگار بنا رہے تھے۔

''یہ کیا حرکت کی تم نے بہلول؟ خلیفہ کی مسند پر کیسے بیٹھ سکتے ہو تم؟'' ابن ثقیت کی آواز غم وغصے سے بلند ہوگئی۔ مسرور کی رنگت بھی طیش سے مزید سیاہ پڑ گئی۔

وہب نے قہقہہ لگایا اور نشست سے اٹھ کر دوبارہ براجمان ہو کر بولا۔

''ایسے...... اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟''

''اے پاگل شخص! تو خلیفہ کی مسند پر کیوں بیٹھ گیا؟ کیا تجھے اپنے انجام کی ذرا بھی پروا نہیں ہے؟'' مسرور بھی غم وغصے سے بولا۔ اس کے دل میں شدت سے وہب کی گردن تن سے جدا کر دینے کی خواہش مچل رہی تھی۔

''جب خلیفہ کے کرنے والے کام کوئی اور کرنے لگے تو اسے بھی مسند پر بیٹھنے کا حق ہونا چاہیے کہ نہیں؟ اگر نہیں تو پھر بھلا خلیفہ کیوں اس پر بیٹھتا ہے؟ وہ بھی تو نااہل ہی ہوا نا۔'' وہب کے جواب میں پوشیدہ ان سوالوں نے ابن ثقیت کو دنگ کر دیا۔ رہ ایک نظر اسے اور پھر اس کے لباس' احمقانہ اندازِ گفتگو اور چوبی گھوڑے کو دیکھ کر رہ جاتا۔ شخصیت کا یہ تضاد اسے کسی بھی حتمی فیصلے پر پہنچنے ہی نہ دیتا۔

''تم اس نشست پر بیٹھنے کا مطلب سمجھتے ہو بہلول؟'' اس نے ضبط کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں! یہ آگ ہے...... نری آگ...... یہ کانٹوں سے بنی ہے...... اس پر بیٹھ کر انسان اپنی انسانیت کے درجے سے گر جاتا ہے۔ اس کے دل میں حرص وہوس پروان چڑھنے لگتی ہے۔ باپ بیٹا' بھائی بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔'' وہب کا معصوم انداز اور دانا باتیں اسے پھر الجھانے لگیں۔

''تم ایسے باز نہیں آؤ گے احمق شخص! مجھے تمہارا علاج کرنا ہی پڑے گا۔'' مسرور نے دانت کچکچائے اور اسے کوڑوں کی زد میں رکھ لیا۔

ابن ثقیت تاسف سے سر ہلاتا واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ وہب اپنے مکان کے اس مختصر سے اکلوتے کمرے میں بیٹھا عمامہ کھول رہا تھا۔ ہر لڑی سے کوئی نہ کوئی سکہ برآمد ہو جاتا۔ یہ سکے اس کی دن بھر کی کمائی تھے جنہیں پرتوں سے نکال کر دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔ آج اس نے پانچ دینار کمائے تھے۔ اس کے ذہن میں کچھ نام جگمگا رہے تھے جن کے پاس اگلی صبح اسے یہ امانت پہنچانی تھی۔ وہب نے گہری سانس بھرتے ہوئے متشکرانہ انداز میں کمرے کی چھت کی جانب دیکھا اور اٹھ کر چراغ گل کر دیا۔ اب وہ سکون اور اطمینان کی نیند سو سکتا تھا۔

☆☆☆

فضل ابن یحییٰ دیلم سے لوٹا تو قدرے پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔ اس کی ملاقات خلیفہ سے تو ممکن نہ ہو سکی البتہ قاضی القضاۃ سے اس معاملے پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

''دیلم میں حالات ہماری سوچ سے بھی زیادہ خراب ہو چکے ہیں۔'' اس نے ابن ثقیت کو بتایا۔

''تو کیا خلیفہ کو ایک اور جنگ کا سامنا کرنا ہوگا؟'' وہ تشویش زدہ ہوا۔

''یہ جنگ ہارون الرشید کے لیے کسی طور بھی سود مند نہیں رہے گی قاضی صاحب! یحییٰ ابن عبداللہ نے دیلم کو اپنے لیے ایک مضبوط قلعہ بنالیا ہے۔ اس کی قیادت میں ہزاروں افراد متحد ہیں۔ جنگ ہماری سلطنت کو ہی نقصان پہنچائے گی۔'' فضل نے دوٹوک انداز میں بتایا۔

''تم شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ خلیفہ کے لیے اس کی سلطنت کا ہر ایک علاقہ بہت قیمتی ہے۔ مانو یہ ہار کی ایک لڑی ہے جس کا ایک دانہ بھی ٹوٹا تو لڑی بری طرح بکھر کر رہ جائے گی۔'' ابن ثقیت نے بھی تجزیہ کیا۔

''دیلم کے متعلق یہ خبر ناخوشگوار ہی سہی لیکن خلیفہ تک پہنچانی تو ہوگی۔ خدا جانے اب اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؟'' فضل نے کسی ممکنہ خدشے کے تحت کہا۔

دو روز کے بعد ہارون بھی اپنے تفریحی دورے کی تکمیل کے بعد لوٹ آیا۔ امورِ سلطنت سے اس وقتی تعطل نے اسے ذہنی طور پر تازہ دم کر دیا تھا۔ دربار میں آتے ہی اس نے مسرور سے اپنی غیر حاضری کے دوران پیش آنے والے واقعات کے بارے میں دریافت کیا۔ وہب کو دی جانے والی سزا اور فضل ابن یحییٰ کی اس قدر جلد واپسی نے اسے تشویش زدہ کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر دیلم کے متعلق کوئی بھی خبر سننے کو تیار ہو گیا۔ اس نے وہب کے ساتھ فضل ابن یحییٰ کو بھی دربار میں طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ وہب کو دربار میں عہدیدار بنانے کا بھی خواہش مند تھا لیکن وہ شخص کسی کے قابو میں آنے کے لیے ہی نہ دیتا۔ مسرور کے ذریعے بھیجے جانے والے پیغام کو بھی یہی کہہ کر ٹال دیا کہ خلیفہ کو کہنا فرصت ملتے ہی دربار میں چکر لگاؤں گا۔

اس جوابی پیغام سے محظوظ ہوتے ہارون الرشید نے فضل ابن یحییٰ کو بات چیت کے لیے شرف باریابی بخش دیا۔

''دیلم کے حالات ہمارے تصور سے بھی زیادہ ہولناک صورتِ حال اختیار کرنے والے ہیں عالی مقام! دیلم ایک وسیع علاقہ ہے۔ گنجان آباد بھی ہے۔ وہاں مخالفانہ تحریک اور مظاہروں کو دبانا کسی طور آسان ثابت نہیں ہوگا۔'' فضل نے ایمانداری سے بتایا۔

''تو تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ہارون نے استفسار کیا۔

''میں اس عزت افزائی پر آپ کا مشکور ہوں کہ مجھے رائے دہی کا اہل سمجھا۔ میری التجا تو یہی ہے کہ یحییٰ ابن عبداللہ کو کسی بھی طرح ڈرا دھمکا کر صلح اور اطاعت کے لیے راضی کیا جائے۔''

''اور اگر اس نے صلح نامے سے انکار کر دیا تو؟'' ہارون الرشید نے ایک اور خدشے کے تحت دریافت کیا۔

''تو پھر ہمارے پاس جنگ کے سوا کوئی راہ نہ بچے گی۔ ہم جنگ سے گھبرانے والے نہیں ہیں۔ شہادت کی تمنا تو رگوں میں لہو کی طرح دوڑتی ہے لیکن یہاں صورتِ حال کٹھن ہوگی۔ ہماری تلواروں کو اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون بہانا پڑے گا۔'' فضل نے تاسف سے جواب دیا۔

''یہی بات کسی خلش کی طرح میرے دل میں بھی پیوست ہے۔ میری خواہش تو یہی ہے کہ کسی طرح اول الذکر راہ پر عمل کر لیا جائے لیکن اگر یحییٰ ابن عبداللہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا تو مجھے اپنی ہر خلش اور کمزوری کو دبانا بھی خوب آتا ہے۔'' ہارون الرشید جلال میں آ گیا تھا۔ فضل کو اس کے مزاج سے بخوبی آشنائی تھی اسی لیے اس نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی۔

''تم خراسان واپس جا کر اپنی ذمے داریاں سنبھال لو۔ ضرورت پڑنے پر تمہیں طلب کر لیا جائے گا۔'' ہارون الرشید نے حکم دیا۔

فضل نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اسے علم تھا کہ خلیفہ نے یقینی طور پر کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیا ہے۔ فضل کی روانگی کے بعد اس نے ایک بار پھر وہب کو طلب کر لیا۔ وہ اس کی اُلجھی

ہوئی شخصیت کا اسرار کسی نہ کسی طور حل کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ وہب کی آمد اور انداز نے اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ بکھیر دی۔

''کیسے ہو وہب؟ مجھے علم ہوا تھا کہ تم میری غیر موجودگی میں مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' اس نے شفقت سے پوچھا۔

''ہاں! میں آیا تھا۔ میرا گھوڑا مجھے یہاں لے آیا تھا۔'' اس نے اپنے مخصوص بے ربط انداز میں کہا۔

''مجھے مسرور کی اس حرکت پر بھی افسوس ہے۔ اسے ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تم مسرور کے اس عمل پر کافی دکھی اور افسردہ ہو۔ اس نے غلط کیا...... بے شک غلط کیا۔'' ہارون الرشید نے اسے تشفی دی۔ وہب کی آنکھوں سے جھلکنے والی ناقابلِ فہم کیفیت اسے حسب سابق مضطرب کر رہی تھی لیکن شاہی وقار کا تقاضا تھا کہ ایسی کسی بھی کیفیت کو ظاہر نہ کیا جائے۔

''میں اپنی ذات کے لیے دکھی یا افسردہ نہیں ہوں اے ہارون!'' وہ بے باکی سے گویا ہوا۔ ''مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ جس مسند پر چند لمحوں کے لیے بیٹھنے سے ایک ادنیٰ غلام مجھے سزاوار ٹھہرا سکتا ہے تو اسی مسند پر شب و روز بیٹھنے اور اسے اپنا حق سمجھنے کی پاداش میں کائنات کا حاکم تمہیں کیا سزا دے گا؟'' وہب کے قہقہے اور سر کی دائیں بائیں جنبش سے ہارون کی دھڑکنوں کا زیر و بم بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ سوچ اور فکر کا ایک نیا پہلو تھا جو ایک لمحے میں ہی بھیانک عفریت بن کر اس کے سامنے رقصاں تھا۔ ابو وہب نے نگاہِ غلط اس کی جانب دوڑائی اور اپنی گھڑ سواری کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

دیلم کا معاملہ شدید بگاڑ کا شکار ہونے لگا۔ بغاوت کے شعلے ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ مزاحمتی تحریک میں شرکاء کی تعداد میں بھی تشویش ناک حد تک اضافہ ہونے لگا۔ ہارون الرشید نے فوج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ فضل ابن یحییٰ کی نگرانی میں بغداد سے پچاس ہزار سواروں کا دستہ روانہ کر دیا گیا۔ بغداد سے نکلتے ہی فضل نے اپنی کامیابی کے لیے مختلف تدابیر پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد فضل ابن یحییٰ نے ایک راہ نکالی۔ طالقان پہنچتے ہی اس نے یحییٰ علوی کے نام ایک خط لکھا۔ زورِ قلم کمال تر تھا۔ فضل نے سلطنت کے جاہ و جلال اور خلافتِ عباسیہ کی شان و شوکت، رعب و جلال کو اس انداز میں اجاگر کیا کہ یحییٰ ابن عبداللہ پر ہیبت طاری ہو گئی۔ فضل نے دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خط کے ہمراہ بیش قیمت تحائف بھی ارسال کیے۔ ان دونوں ممکنہ راہوں سے یحییٰ پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اگر اس معرکے کا خاتمہ باہمی صلح پر ہو تو یہ اس کے لیے نفع بخش امر ہو گا۔

یحییٰ ابن عبداللہ نے بھی غیر ضروری جوش و جذبے سے گریز کرتے ہوئے فضل کو جوابی خط ارسال کر دیا جس میں اس کا مطالبہ تھا کہ اسے صلح صرف ایک ہی شرط پر منظور ہو گی کہ خلیفہ ہارون الرشید نہ صرف اپنے قلم سے صلح نامہ لکھے بلکہ اس پر تمام...... مشائخ، قضاۃ اور فقہاء کے دستخط بھی شامل ہوں۔ فضل نے شرط منظور کر کے خلیفہ کو حالات و واقعات کی مکمل تفصیل کے ساتھ یحییٰ کا مسودہ بھی ارسال کر دیا۔ ہارون الرشید نے مصلحت کوشی کے تحت صلح کو ہی غنیمت سمجھا اور یحییٰ کی منشا کے مطابق تمام علماء، فقہاء اور مشائخ کے دستخط ثبت کروا دیے۔ معاملات خوش اسلوبی کی جانب گامزن ہونے لگے۔

یحییٰ اس صلح نامے سے مطمئن ہو کر بغداد چلا آیا۔ اس کے دل میں پنپتے خدشات دواہیے ہارون الرشید کے نرم برتاؤ سے ماند پڑنے لگے۔ ہارون نے یحییٰ سے عمدہ سلوک کیا۔ اس اہم اور تاریخ ساز صلح نامے کی تکمیل پر فضل ابن یحییٰ کی قدر و منزلت میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ ہارون الرشید نے اسے وعدے کے مطابق بغداد میں مسجد تعمیر کروانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تو ابن عبداللہ کی شاہانہ مہمان نوازی میں بیت گیا۔ ہارون الرشید کے دماغ میں پنپتے خیالات سے کسی کو بھی آگاہی نہ تھی۔ اس نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق فتویٰ طلب کر لیا کہ موجودہ صورت حال میں نقضِ عہد جائز ہے یا نہیں؟ صورت حال بہت گمبھیر ہو چکی تھی۔ ابوالبختری قاضی اور سبھی علماء نے خلیفہ کے خوف سے نقضِ عہد جائز قرار دے دیا۔ اس موقع پر ''امام محمد'' ہی واحد شخص تھے جو اس نئے فتوے اور نقضِ عہد کے مکمل مخالف رہے۔ ہارون الرشید نے کثرتِ رائے کو تسلیم کرتے ہوئے صلح نامے کی دستاویز چاک کر دیں۔ یحییٰ ابن عبداللہ کی نظر بندی عمل میں آئی۔ وہ آخری سانس تک اسی نظر بندی میں رہا۔

☆☆☆

فضل ابن یحییٰ اپنی کامیابیوں پر بہت سرشار تھا۔ اس نے خلیفہ کی اجازت سے مسجد کے لیے زمین حاصل کر کے تعمیر کا آغاز بھی کروا دیا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ اپنی اہلیہ کی

دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے قابل ہو گیا۔ شہناز کو مسجد کی تکمیل کا اس قدر شوق تھا کہ وہ خراسان میں وقت بے وقت اذان کی آواز سماعت میں گونجتی محسوس کرتی۔ شہناز فی الوقت بغداد میں فضل کے ساتھ ہی قیام پذیر تھی۔ مسجد کی تعمیر حیران کن رفتار سے جاری تھی۔ فضل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ مزدوروں کے ساتھ عملی طور پر اس تعمیر میں حصہ لیتا رہا۔ عوام میں اس کے شوق کا چرچا ہونے لگا۔ اسی دوران ایک روز وہب وہاں چلا آیا۔

''یہ کیا بنوا رہے ہو اے فضل؟'' اس نے معصومیت سے استفسار کیا۔

''مسجد تعمیر کروا رہا ہوں اے بہلول!'' فضل نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''کیوں بنوا رہے ہو؟''

''اپنے رب کی رضا کے لیے۔ جنت میں ایک چھوٹا سا قطعۂ زمین حاصل کرنے کی خواہش میں۔''

''اللہ تمہارے ہر کام میں آسانیاں پیدا فرمائے۔'' اس نے ایک بار پھر معصومیت وخلوص سے کہا۔

''بہت شکریہ اے بہلول!'' فضل مسکرایا۔ اس کی توجہ ہاتھ میں پکڑی ایک لوح کی طرف تھی جس پر مسجد کا نام کندہ تھا۔ وہ اس لوح کو بہت خوشی وسرشاری سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہب کے چہرے پر اضطراب اور تاسف ہلکورے لے رہا ہے۔

اگلے روز تعمیر کے آغاز سے قبل فضل ابن یحییٰ وہاں آیا تو لوح کی تبدیلی دیکھ کر طیش میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے سامنے جلی حروف میں ''مسجد بہلول'' لکھا دکھائی دے رہا تھا۔ غم و غصے اور احساسِ اہانت نے اسے خلیفہ کے در پر دستک دینے کے لیے مجبور کر دیا۔ خلیفہ نے اس کی استدعا پر وہب کو بھی دربار میں طلب کر لیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں ابو وہب؟ تم نے فضل ابن یحییٰ کی بنوائی گئی مسجد سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔'' خلیفہ نے نرمی سے استفسار کیا۔

''نہیں اے ہارون! میں نے تو صرف لوح تبدیل کی ہے۔'' اس کی معصومیت دیدنی تھی۔

''دیکھا امیر المومنین! اس شخص کی ڈھٹائی ملاحظہ کریں۔ کس قدر اعتماد وسکون سے اپنی حرکت کا اعتراف کر رہا ہے۔'' فضل بلبلا اٹھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا ابو وہب؟'' خلیفہ نے اسے گھرکا۔

''آپ اس سے پوچھیے کیا اس نے مجھے یہ نہیں کہا تھا کہ مسجد اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بنا رہا ہے؟'' وہب نے جوابی سوال کیا۔

''ہاں! میں نے بالکل ایسا کہا تھا تمہیں۔'' فضل نے اسے گھورا۔

''تو اگر یہ مسجد صرف اللہ کی رضا کے لیے بن رہی ہے تو اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا نام ''مسجد شہناز'' ہو یا ''مسجد بہلول''۔ اب بغداد میں یہ وقت بھی آ گیا ہے کہ نمود ونمائش کا دائرہ مقدس مقامات تک پھیلے گا۔ اگر بیوی کو خوش کرنا ہے تو کوئی قصر تعمیر کروا کے اس کے نام کی لوح نصب کروا دے۔ اللہ کے نام پر جھوٹ یا ذاتی خواہش تو منسلک نہ کرے۔'' وہب کے کاٹ دار جملوں نے فضل کو گنگ کر دیا۔ ایک بظاہر احمق دکھائی دینے والے اس شخص نے کس قدر مہارت سے اس کی ہر سوچ طشت از بام کر دی تھی۔ وہب نے ایک نگاہِ غلط خلیفہ اور اس کے منظورِ نظر وزیر کی جانب دوڑائی اور اپنے ''گھوڑے'' پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہب کی یہ سرگرمیاں بلا تعطل جاری رہیں۔ کچھ روز ہی گزرے تھے کہ بخارا سے آنے والے تجارتی قافلے نے بغداد میں پڑاؤ ڈال لیا۔ واپس لوٹنے والے تاجروں کے چہرے متفرق جذبات کی آماجگاہ تھے۔ منافع حاصل کرنے والوں کی آنکھوں میں اہل وعیال سے ملنے کی تمنا چمک رہی تھی۔ کم قیمت کمانے والے البتہ کسی متوقع ناخوشگوار صورتِ حال کی سوچوں میں مبتلا تھے۔

انہی میں ایک تاجر کا نام ''لبیب'' تھا۔ درمیانی عمر' متوسط قد وقامت' مضبوط کاٹھی کا حامل۔ اس کے انداز میں توانائی اور آنکھوں سے مکاری کی ایک مخصوص کیفیت جھلکتی تھی۔ وہ اس بار پانچ ہزار درہم منافع کما کر لایا تھا۔ اہلیہ سے ملنے کی تمنا قدموں میں بجلی بھر رہی تھی۔ اس کی اہلیہ کا نام بانو رباب تھا۔ خاصی کم گو' نفیس اور شائستہ مزاج خاتون تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا محبت و گرمجوشی سے استقبال کیا۔ کچھ روز تو سفر کی تھکاوٹ دور کرتے اور اصفہان' بخارا کے قصے سنانے میں بیت گئے۔ رباب کے لیے شوہر کی واپسی خوش کن سہی لیکن ایک تکلیف دہ امر یہ بھی تھا کہ لبیب کی خود غرضی' لالچ اور بے حسی پہلے سے سوا ہو گئی تھی۔ واپسی کے بعد کوئی بھی دن ایسا نہ گزرا تھا جب اس کی طمع و بدلحاظی نے رباب کا دل نہ دکھایا ہو۔ وہ صدقِ دل سے شوہر کی اصلاح اور ہدایت کے لیے دعا گو تھی۔

آرام وسکون کے لمحات بسر کرلینے کے بعد لبیب کے دل میں سرمایہ کاری کا خیال مچلنے لگا۔ اس کی یہ بے چینی رباب سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ شوہر سے اس کیفیت کے متعلق استفسار کرنے لگی۔

''میں اپنی جمع پونجی سے کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہوں لیکن فی الحال سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس کاروبار میں ہاتھ ڈالوں۔'' لبیب نے اپنی الجھن بتائی۔

''بغداد جیسے شہر میں کاروبار کی سمجھ نہیں آرہی؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''یہاں تو سرمایہ کاری' ترقی اور خوشحالی کے بہترین مواقع ہیں۔ بغداد ایک مثالی اور جنتِ نظیر شہر بن چکا ہے۔''

''بے شک ایسا ہی ہے۔ پروردگار ہمارے خلیفہ کو سلامت رکھے۔'' لبیب نے بڑی محبت سے کہا۔

''آپ بھیڑیں پالنے کا کام کیوں نہیں شروع کر لیتے؟ میں نے یہاں بہت سے تاجروں کو اس سے خوشحال ہوتے دیکھا ہے۔ بھیڑوں سے اون' گوشت اور دودھ بھی میسر آجاتا ہے۔'' رباب نے مشورہ دیا۔ لبیب اب بھی خاموشی سے کسی سوچ میں مگن تھا۔

''کرخ کے بازار میں اشیائے خورد ونوش کی بہت طلب ہے۔ بغداد کے عوام وخواص مرغن کھانوں کے بہت شوقین ہیں۔ کلیجی' کباب اور گوشت کی مختلف دکانوں پر بہت ہجوم دیکھا ہے میں نے۔'' رباب نے ایک اور تجزیہ بتایا۔

''تم نے تو صرف ہجوم دیکھا ہے۔ میں نے مکھیاں بھی دیکھی ہیں۔'' لبیب نے اپنی بات پر زور دیا۔

''مکھیاں......کیسی مکھیاں؟ بغداد جیسے نفیس اور صاف ستھرے شہر کے بازاروں میں مکھیوں کا کیا کام؟'' رباب حیران ہوئی۔

''یہی تو فرق ہے تمہارے اور میرے دیکھنے میں۔ تم نے کرخ کے بازار میں ہجوم اور آمدن کے ذرائع دیکھے ہیں لیکن میں نے وہاں داروغہ سعد جیسی وہ مکھیاں بھی دیکھیں جو ان اشیاء سے اپنا مفت حصہ وصول کرنے چلی آتی ہیں۔ میں نے وہاں دکانداروں کو داروغہ جیسے چند عہدیداروں سے خار کھاتے دیکھا ہے۔ یہ عہدیداران کا استحصال کرتے ہیں۔ عہدے کی دھونس ایسے جماتے ہیں کہ وہ اپنا جائز حق مانگتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ وخوف محسوس کرتے ہیں۔ کرخ کے بازار میں ہونے والی یہ بے ایمانیاں دیکھنے کے بعد خود کو بھی اسی قطار میں نہیں دیکھ سکتا۔'' لبیب نے صاف گوئی سے بتایا۔

''داروغہ اور عہدیدار ایسا کیسے کرسکتے ہیں؟ خلیفہ ہارون الرشید کے اصول وضوابط بہترین ہیں۔ ان کا انتظام لاثانی ہے۔ ان کے زیرِ اثر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' رباب نے عمومی عوامی رائے کے تحت شدومد سے سر ہلایا۔

''ہاں! یہ بات ناقابلِ یقین سہی لیکن بہرحال حقیقت ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید ایک بہترین اور مثالی حکمران ہیں۔ میں نے اصفہان اور بخارا میں بھی ان کی فراست ودانائی کے چرچے سنے ہیں لیکن بغداد کی اس چکا چوند میں کچھ گوشے تاریک بھی ہیں۔ اسے قدرت کا قانون کہہ لو یا پھر انسانی فطرت کی کارستانی......اچھائی کے ساتھ برائی' نیکی کے ساتھ بدی اور پھول کے ساتھ کانٹے تو ضرور ہوا کرتے ہیں۔'' لبیب نے اپنا تجزیہ بتایا۔

''بغداد میں آرائشی اور نمائشی سامان کی مانگ بھی بہت ہے۔ خواتین اور امراء زیورات' عطر' ریشمی کپڑوں کے مداح ہیں۔ آپ چاہیں تو اس کاروبار کا آغاز کردیں۔'' رباب نے ایک اور راہ سجھائی۔

''نہیں اے عورت! بالکل نہیں۔ میرے ذہن میں ایک ہی شخص کا تصور آرہا ہے جو مجھے بہترین مشورہ دے سکتا ہے۔ اس کی دانائی ہی مجھے کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے میں مدد دے گی۔'' لبیب نے جواب دیا۔

''ایسا ہمدرد اور بے لوث دانا تو صرف وہب ہی تھا۔'' رباب نے کہا۔ ''لیکن وائے ہو! اب وہ بھی بہلول بن گیا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت متوازن رہی ہی کہاں ہے؟''

لبیب نے بیوی کی بات ان سنی کردی۔ اسے فی الوقت وہب سے ملاقات کے سوا کسی بات میں دلچسپی نہ تھی۔ وہب اسے اپنے مختصر نیم پختہ گھر میں ملا۔ وہ اس وقت گھر میں ہی موجود قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس نے قرآن پاک بند کیا اور بوسہ دے کر ایک مخصوص مقام پر چھپادیا۔ وہ اپنے گھر لبیب کی آمد سے کافی حیران ہوا تھا۔ لبیب نے اسے بہت ٹھہراؤ اور متانت سے مخاطب کرکے اپنے موجودہ مسئلے سے آگاہ کیا۔ وہب لمحہ بھر کے لیے سوچ میں مبتلا ہوگیا۔

''میرا خیال ہے کہ تم لوہے اور کوئلے کا کاروبار کرلو لبیب! یہ تمہیں ایسی کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال سے بھی محفوظ رکھے گا۔'' اس کے مشورے پر لبیب کے چہرے پر چمک در آئی۔

''یہ خیال تو میرے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔'' وہ پُرجوش ہوا۔ ''لوہا بخارا اور تاشقند سے اچھال جائے گا۔''

''ہاں! اور بہترین کوئلہ تمہیں شام میں ملے گا۔''

وہب نے راہ بھائی۔ اس لمحے وہ دیوانگی، ہڑبونگ اور انتشار سے کوسوں دور دکھائی دے رہا تھا۔ لبیب اس کا بھرپور شکریہ ادا کرکے اپنے گھر لوٹ گیا۔

کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ بازار کرخ میں لبیب کی خوشحالی کے چرچے زبانِ زدِعام ہو گئے۔ خواص و عام کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ نئے کاروبار میں لبیب کو اپنے اصل سرمائے سے دوگنا منافع ہوا ہے۔ رباب بھی بے حد خوش رہنے لگی تھی۔ لبیب کی طرح اس کا لباس، انداز اور اطوار قدرے شاہانہ ہو چلے تھے۔

''آپ نے وہب سے دوبارہ کوئی بات کی؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے اس سے کیا بات کرنی ہے بھلا؟'' لبیب نے اپنے چمکدار لباس سے نادیدہ گرد جھاڑی۔

''اس کا شکریہ ادا کرنا تو واجب ہے۔ آخر اسی کے مشورے سے آپ کو یہ ترقی و خوشحالی نصیب ہوئی ہے۔''

''یہ ترقی و خوشحالی مجھے اپنے سرمائے، لگن اور محنت سے ملی ہے۔ میں کسی بھی کاروبار میں ہاتھ ڈالتا قسمت اسی طرح یاوری کرتی۔ اس میں بہلول کا کیا کمال؟'' وہ نخوت سے بولا۔

''ہمیں وہب کی کوئی مدد کرنی چاہیے۔ سرمائے میں اضافہ تو بہرحال اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' رباب اب بھی بضد تھی۔

''احمقوں جیسی باتیں نہ کرو۔ میں بہلول سے ایسا کوئی تعلق ظاہر کرنا ہی نہیں چاہتا ورنہ لوگ اس کی طرح مجھے بھی دیوانہ اور بہلول کہنے لگیں گے۔'' لبیب نے سر جھٹکا... اور بازار کی جانب چل دیا۔

لبیب کا سر فخر و غرور سے تنا تھا۔ بازار کے دکاندار اسے رشک و حسد کے متفرق جذبات لیے دیکھتے رہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہب بھی اپنے چوبی گھوڑے پر سوار وہیں چلا آیا۔

''وائے ہو تم پر اے لبیب!'' اقسم نامی کباب فروش نے اسے دیکھتے ہی تان لگائی۔ ''تم خود تو شاندار گھوڑے پر سوار ہو لیکن تمہارا کاروباری مشیر آج بھی اسی بدحالی میں ہے۔ اسے اپنے گھوڑے جیسا نہ سہی کم از کم کوئی خچر یا گدھا ہی لے دیتے۔''

''میرا کوئی کاروباری مشیر نہیں ہے۔ میں نے یہ ترقی و خوشحالی صرف اپنے بل بوتے پر حاصل کی ہے۔'' لبیب نے تڑخ کر جواب دیا۔

''لیکن ہم نے تو سنا ہے کہ لوہے و کوئلے کی خرید و فروخت کا مشورہ بہلول نے ہی دیا تھا۔'' داروغہ سعد نے اپنی مکار آنکھوں سے اسے گھورا۔

''میں کیا احمق ہوں جو ایک دیوانے کا مشورہ تسلیم کر کے اپنا سرمایہ کسی کاروبار میں لگاؤں گا؟'' لبیب کے اس جواب پر وہب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''کاش مجھے ایسا کوئی مشورہ ملا ہوتا تو میں بھی موقع سے بھرپور فائدہ اٹھا لیتا۔'' اقسم نے آہ بھری۔

''لہسن اور پیاز ذخیرہ کر لیا جائے تو مستقبل میں کافی منافع کمایا جا سکتا ہے۔'' وہب نے اپنی ہی لے میں کہا۔ لبیب چونکنا ہو گیا۔ اقسم البتہ دوبارہ آہ بھر کے رہ گیا۔ اس کے پاس فی الحال اتنا سرمایہ موجود نہ تھا کہ اشیا کا ذخیرہ کر سکتا۔

لبیب کے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال پیدا ہوا۔ اس نے اپنے گھر میں لہسن اور پیاز کی ڈھیروں بوریاں جمع کر لیں۔ لالچ اور حرصِ دولت نے ایک ایک پل گزارنا محال کیا ہوا تھا۔ کچھ وقت گزرا تو اپنے غلط فیصلے کے ادراک نے اس کے سر پر ساتوں آسمان ایک ہی بار ڈھا دیے۔ ذخیرہ شدہ لہسن اور پیاز گل سڑ کر ناقابلِ استعمال ہوا اور سرمایہ مکمل طور پر ڈوب گیا۔ لبیب کی بے بسی و لاچاری قابلِ دید تھی۔ شاہانہ لباس، ضیافتیں اور کروفر ایک ہی جھٹکے سے زمین بوس ہو چکے تھے۔ اب وہ پرانے میلے لباس میں مریل گدھے پر سواری کرتا۔ اس کی یہ حالت داروغہ سعد اور اس جیسے کئی افراد کو بے حد محظوظ کرتی تھی۔ سعد نے تو اسے ایک روز نیا مشورہ فراہم کر دیا۔

''تمہاری اس حالت کا ذمے دار بہلول ہے۔ بہت ترس آتا ہے تمہاری یہ حالت دیکھ کر۔''

''میری ہی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے جو میں نے اس دیوانے کی بات پر عمل کر لیا۔ میری برسہا برس کی محنت برباد ہو گئی۔'' لبیب شدید ذہنی تناؤ میں تھا۔

''تمہیں مقدمہ دائر کر کے بہلول کو سزا دلوانی چاہیے کہ اس نے دانستہ طور پر تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔'' سعد بالآخر اپنے اصل مدعا پر آ گیا۔

زخم خوردہ لبیب نے بلا سوچے سمجھے یہ بات تسلیم کر لی۔ معاملہ ابن ثقیت کی عدالت میں پہنچ گیا۔ وہب کے ساتھ استغاثہ گواہان کے طور پر کباب فروش اقسم اور داروغہ سعد کو بھی طلب کر لیا گیا۔ مقدمے کی نوعیت سن کر وہب کے ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے قاضی کے ایک سوال کے جواب میں بڑے اطمینان سے کہا۔

''گواہان سے ذرا یہ بھی پوچھیے کہ جب کرخ کے بازار میں اس کاروباری مشورے کی بابت ذکر ہوا تھا تو اس وقت تاجر لبیب نے میرے بارے میں کیا کہا تھا؟''

''میں بتاتا ہوں جناب!'' اقسم نے فوری طور پر لبا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے...... اس نے کہا تھا کہ وہ کسی دیوانے کے کہنے پر سرمایہ کاری نہیں کرے گا۔''

''جناب عالی! میں تو دیوانہ ہوں۔ دیوانے کی بات پر عمل کرکے کوئی کاروبار کیسے کرسکتا ہے؟ دیوانہ اور احمق تو مشورہ بھی اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی دے گا نا؟'' وہب کے اس معصومانہ انداز نے ابن ثقیت کو دنگ کردیا۔ وہ اس کا اصل ''نکتہ'' سمجھ گیا تھا۔ وہب کے کہنے کا مطلب یہی تھا کہ پہلی بار لبیب اس سے برابری کی سطح پر مشورہ طلب کرنے آیا تھا لہٰذا اس نے منطقی بات گوش گزاری۔ دوسری دفعہ لبیب کا رویہ، سوچ اور نظریہ مختلف تھا۔ غرور و بد دماغی میں اس نے وہب کو احمق، دیوانہ قرار دے دیا تھا۔ اس لیے مشورہ بھی احمقانہ ہی حاصل کیا۔

ابن ثقیت نے معاملے کی نوعیت پر غور وفکر کے بعد فیصلہ ابو وہب کے حق میں دے دیا کیونکہ کسی بھی دیوانے پر قانون اور سزا کا نفاذ ممکن نہیں تھا۔ یہ فیصلہ سناتے ہوئے اس کے ذہن پر ایک بار پھر سابقہ سوالات کی ہی یورش تھی کہ ایسا باریک بین شخص آخر دیوانہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے اپنی عزتِ نفس اور خودداری کا بہت شاندار دفاع کیا تھا۔

ابن ثقیت اس روز کی گتھی سلجھانے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کے علاوہ وہ داروغہ سعد کی روش کے متعلق بھی خاصا تشویش زدہ تھا۔ داروغہ کے اطوار اسے بے حد کھٹکتے۔ اس کی غیر ذمے دارانہ حرکات قاضی القضاۃ کے لیے بالکل... ناقابلِ برداشت تھیں۔ ابن ثقیت نے سعد کو اچھی طرح جھاڑ پلاتے ہوئے اپنے اطوار میں اصلاح کا حکم دے کر رخصت کردیا۔ داروغہ، وہب کو کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے وہاں سے لوٹ تو گیا لیکن اس کا دل بغض و انتقام کے شعلوں سے سوختہ ہو رہا تھا۔ اسے وہب کو کسی بھی طرح نیچا دکھا کر اپنی انا کی تسکین درکار تھی۔

فرعون صفت داروغہ کو یہ مواقع بھی بہت جلد میسر آگئے۔ اس کا پہلا نشانہ احنف نامی ایک چرواہا بنا جو وہب کا دیرینہ شناسا تھا۔

☆☆☆

احنف ایک معمولی چرواہا تھا۔ اس کے پاس چند ایک دنبے، بکری اور مرغی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ یہ جانور ہی اس کا ذریعۂ معاش تھے۔ خیمے میں بنیادی سہولیات بہ مشکل میسر تھیں۔ اس کی بیوی رملہ ایک حسین اور باشعور خاتون تھی۔ تنگی و ترشی میں بھی شوہر کے ساتھ گزر بسر کرتی رہی پھر ایک روز داروغہ سعد کی آمد نے انہیں نئی آزمائش میں مبتلا کردیا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ خلیفہ ہارون الرشید شکار و تفریح کے سلسلے میں تقریباً ایک میل دور علاقے میں موجود تھا۔ اس کے ہمراہ قافلے میں کئی وزرا بھی تھے۔ انہی میں سے ایک وزیر ابوعبداللہ داروغہ سعد کے ہمراہ علاقے کی سیاحت اور ہوا خوری کے لیے نکل کھڑا تھا۔ احنف کی بدقسمتی تھی کہ وہ اسی علاقے میں اپنے جانور چرا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ ان دونوں کی آنکھیں یکا یک چمک اٹھی تھیں۔ ابوعبداللہ دنبے اور بکری کو دیکھ کر رال بہانے لگا تو سعد، وہب اور احنف کی شناسائی کے تصور سے اپنے دل میں انتقام کے شعلے بھڑکتے محسوس کرنے لگا۔

''واہ! کیا زبردست جانور ہیں۔ ذرا دیکھو تو سہی سعد!'' ابوعبداللہ نے اسے متوجہ کیا۔

''دیکھ رہا ہوں جناب عالی! میں سب دیکھ رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ چرواہا بہلول کے پاس بھی آتا جاتا رہتا ہے۔'' سعد نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ان جانوروں کے کباب بہت لذیذ بنائے جاسکتے ہیں۔'' ابوعبداللہ ندیدگی سے مسکرایا۔ سعد نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور اسے لیے احنف کے خیمے کی جانب بڑھ گیا۔

احنف نے اپنی بساط کے مطابق ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

''تم جانتے ہو احنف! ابوعبداللہ خلیفہ ہارون الرشید کے بہت خاص وزیر ہیں۔'' سعد نے معنی خیزی سے کہا۔

''مجھے امیر المومنین کے مصاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ پروردگار امیر المومنین کا اقبال ہمیشہ بلند رکھے۔'' احنف نے سادگی سے کہا۔

''خلیفۂ وقت کا پڑاؤ یہاں سے بہت قریب ہے۔ تمہیں ان کی خدمت کا شاندار موقع میسر آیا ہے۔'' سعد مسکرایا۔ احنف الجھ گیا۔

''اگر میں امیر المومنین کی خدمت سرانجام دے سکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی لیکن میں تو ایک غریب آدمی ہوں۔ میری کیا بساط؟'' اس نے حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

''تم اپنے دنبے ان کے حوالے کرکے یہ سعادت حاصل کرسکتے ہو۔'' ابوعبداللہ نے اسے راہ دکھائی۔ احنف

کا چہرہ... متغیر ہوگیا۔ اپنے ذریعۂ معاش سے محرومی کا تصور اسے ہولا رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ جانور ہی میری روزی روٹی کا ذریعہ ہیں۔'' وہ منمنایا۔ سعد نے اس کی بات نظر انداز کر کے ابوعبداللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''امیرالمومنین کے لیے دنبے بہترین تحفہ ثابت ہوں گے جناب! آپ بھی تو اپنی خدمت کا کوئی موقع دیجیے نا اسے۔''

''مجھے بکری کا گوشت اور تیار شدہ کباب بہت پسند ہیں۔'' ابوعبداللہ نے فوراً جواب دیا۔

''بس تو پھر اس بکری کا تحفہ احنف کی طرف سے آپ قبول کیجیے۔'' اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''ارے! احنف سے تو پوچھ لو۔ کیا علم یہ ہمیں اپنے گھر میں تیار شدہ کھانا کھلا کر ہی رخصت کرنا چاہے۔'' ابو عبداللہ سے احنف کی حالت بہرحال پوشیدہ نہ تھی۔

''ایسا کیسے سوچ لیا آپ نے جناب عالی؟'' سعد فوراً بولا۔ ''احنف کو بھی معلوم ہے کہ امیرالمومنین اور ان کے وزیر کی مہمان نوازی کس قدر باعث سعادت ہے۔''

''ویسے شہر کے داروغہ کے لیے بھی تو کوئی تحفہ ہونا چاہیے کہ نہیں؟'' ابوعبداللہ کے شاہانہ انداز اور رائے پر احنف کی رنگت سرسوں کی طرح زرد ہوگئی۔

''آپ اگر اتنا اصرار کر رہے ہیں تو میں مرغی قبول کر لوں گا۔'' سعد نے عاجزی جتائی۔ احنف کو اپنی دنیا تاریک ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ ان جانوروں سے محرومی کا مطلب معاشی تباہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے جانوروں پر قبضہ کر کے انہیں شاہی پڑاؤ میں منتقل کر دیا گیا۔ احنف چشم زدن میں بے روزگار ہوگیا۔ رملہ بھی اس نقصان پر اپنی بیزاری اور چڑچڑاپن پوشیدہ نہ رکھ سکی۔

''کیا آپ میں اتنی بھی جرأت نہ تھی کہ ان سے جانوروں کی قیمت ہی وصول کر لیتے؟''

''کیسے کر لیتا؟ وہ بااختیار لوگ ہیں۔ مجھ جیسے بے حیثیت کی ان کے سامنے کیا بساط ہے؟'' احنف سخت مایوس تھا۔

''کیا خلیفہ کے لیے جانوروں کی اتنی ہی کمی تھی کہ ان کی خوراک کے لیے ہمارے جانور بھینٹ چڑھا دیے گئے۔'' رملہ نے نکتہ اٹھایا۔

''خلیفہ تو یقینی طور پر اس لوٹ مار سے انجان ہوں گے ورنہ ان کے انصاف اور حق گوئی پر مجھے کوئی شک نہیں۔'' احنف نے کہا۔

''تو پھر اس مسئلے کا کوئی تو حل نکالو۔ یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے اب زندگی تو نہیں بیت سکتی۔ اس شکم کی آگ کو تو کسی طرح بجھانا ہے نا؟''

''اس مسئلے کا حل صرف ایک ہی شخص سے مل سکتا ہے۔ بغداد میں صرف وہی ایک انسان ہے جو ان ناانصافیوں کی ٹھوس دیواروں میں اپنی دانائی اور منطق سے رخنہ بنا لے گا۔'' احنف نے اپنی پیشانی مسلی۔

☆☆☆

احنف شام ڈھلے وہب کے گھر پہنچا تو وہاں قدرے ادھیڑ عمر شخص کو موجود پا کر ٹھٹک سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مایوسی اور کبیدگی کی جھلک تھی۔ احنف کو یہ کیفیات بہت شناسا محسوس ہوئیں۔

''رک کیوں گئے احنف؟ چلے آؤ!'' وہب نے اسے کمرے کے دروازے پر ساکت کھڑے دیکھ کر کہا۔

''معذرت خواہ ہوں۔ مجھے مہمان کی آمد کا علم ہوتا تو......'' احنف نے شائستگی سے کہا۔

''اتنا تردد نہ کرو۔ یہ ابراہیم ہے۔ بغداد میں ہی تھوڑی سی زرعی اراضی کا مالک ہے۔'' وہب نے تعارف کروایا۔ احنف اس کے پاس آ بیٹھا۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے... ابراہیم؟'' وہب نے اپنی ٹوکریوں کی بنائی کا سامان سمیٹ کر ایک جانب کیا۔

''مجھے تمہاری مدد درکار ہے وہب! داروغہ سعد' مظاحم اور قاضی جنید کے گٹھ جوڑ نے مجھے حق پر ہوتے ہوئے بھی باطل قرار دے دیا ہے۔'' ابراہیم کے اس انکشاف پر احنف بھی چونکا۔ اسے اس معاملے اور وہب کے مہمان میں پہلی بار دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔

''یہ مظاحم تو وہی ہے نا جس نے آج کل ایک چوزہ خرید کر مرغی پالی ہوئی ہے۔'' وہب نے دریافت کیا۔

''ہاں! وہی ہے۔ وہ اپنے چوزے کو میری زرعی زمین پر چھوڑ گیا تھا۔ میں ہی اسے کھلاتا پلاتا رہا۔ اب اس مرغی نے انڈے دیے ہیں تو اصولی طور پر ان انڈوں کا حقدار میں ہی ہوا نا۔ میں نے اسے انڈے دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے قاضی جنید کے سامنے یہ مقدمہ رکھ دیا۔ مجھے مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ مظاحم نے داروغہ سعد سے شناسائی کے ذریعے قاضی جنید پر دباؤ ڈالا ہے۔ قاضی نے ہمیں طلب کر کے صورتِ حال کی نوعیت جانی اور فیصلہ یہ سنایا کہ اگر مظاحم نے میری زمین کو زرخیز اور سودمند سمجھتے ہوئے اپنی مرغی وہاں چھوڑ دی تھی تو ایسا کرنا اس کا فطری

حق تھا لیکن انڈوں پر اس کا حق برقرار رہے گا۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''یہ کیا بے کار منطق ہے؟'' احنف خاموش نہ رہ سکا۔

''یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ جب میں نے قاضی جنید سے اس فیصلے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ ہر جاندار تادمِ حیات اپنی جائے ولادت سے منسوب ہوتا ہے۔ پھر اپنی مثال دیتے ہوئے بولا کہ میں بچپن سے بغداد میں رہتا آیا ہوں لیکن لوگ آج بھی مجھے آبائی علاقے گرگان سے منسوب کرتے ہیں۔ میرے وطن گرگان کا مجھ پر بھرپور حق ہے۔ میری زمین اگر زرخیز ہے تو یہ فرض ہے کہ جانداروں کی خدمت کی جائے۔ یہ کہہ کر اس نے مظاہم کی مرغی کے سبھی انڈوں کے حقوق اس کے نام کردیے۔'' ابراہیم آزردہ تھا۔

''نہایت احمقانہ تاویل ہے۔ اس بات کا قانون اور شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہب نے دوٹوک انداز میں کہا۔ اس لمحے اس کی دیوانگی، انتشار اور ہڑبونگ زدہ حالت بالکل عنقا دکھائی دے رہی تھی۔

''میری مدد کرو وہب! اس وقت تمہارے سوا کوئی مجھے اس منجدھار سے نہیں نکال سکتا۔ اگر یہی حال رہا تو کل کلاں کو بغداد کا ہر مرغی فروش اپنے جانور خوراک و پرورش کے لیے میری زمین پر اپنا حق سمجھ کر چھوڑ دے گا۔''

''تم کہیں سے دو عدد دنبوں کا بندوبست کرسکو تو میں کل ہی تمہاری یہ مشکل حل کردوں گا۔'' وہب نے اسے تسلی دی۔

دنبوں کے ذکر پر احنف کے زخم ایک بار پھر ہرے ہوگئے۔ اسے محنت و مشقت سے پالے گئے اپنے جانوروں کی درگت یاد آگئی تھی۔

''ہاں تم بتاؤ احنف! اتنا طویل سفر خیریت سے کیا نا؟'' وہب اس کی طرف متوجہ ہوا۔ احنف نے بلا کم وکاست اس کے سامنے اپنا مسئلہ بیان کردیا۔

''آہ...... یہاں بھی وہی داروغہ سعد......'' وہب نے تاسف سے سر ہلایا۔ وہ اس شخص کی ذہنی استعداد، اطوار اور اپنی ذات کے لیے بغض و کینہ سے اچھی طرح واقف تھا۔

''میرا مسئلہ تو حل ہوجائے گا نا ابو وہب؟'' احنف نے آس سے پوچھا۔

''ہاں! تمہاری قسمت اچھی ہے کہ وزیر ابوعبداللہ نے اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہوا ہے۔'' اس نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔

''اس بات کا میرے دنبوں، بکری اور مرغی سے کیا تعلق؟'' احنف حیران ہوا۔

''وہی تعلق ہے جو خلیفہ ہارون الرشید کے جوتوں، عمامے اور چادر کا ہے۔ ابھی کل ہی تو خلیفہ نے میری غربت پر ترس کھا کر اپنے جوتے، عمامہ اور چادر دیے تھے حالانکہ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ میرے جوتے پاؤں کو سنگریزوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ عمامہ بھی سر کو دھوپ سے بچالیتا ہے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں لیکن اب سمجھ آئی کہ ان کی اصل ضرورت کیا تھی؟'' وہب کی ان الجھی باتوں سے احنف مزید کوفت زدہ ہونے لگا۔

''اے بہلول! یہ تو کیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ مجھے اپنے مسئلے کا حل درکار ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''اس دنیا میں مسئلے سے پہلے ہی اس مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے۔ وہ سب تیرے مسئلے کا حل تھا اور میں اسے اپنے لیے بوجھ سمجھتا رہا۔ فکر نہ کر اے احنف! اللہ نے چاہا تو تیرا مسئلہ حل ہوجائے گا۔'' وہب نے اپنے مخصوص انداز میں اسے تسلی دی اور اپنی ٹوکریاں بُننے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ احنف الجھن اور ناسمجھی سے اسے دیکھتا اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز وہب خلیفہ کے سامنے موجود تھا۔ خلیفہ نے حسبِ سابق بہت محبت اور شفقت سے اس کا خیر مقدم کیا۔

''آج ہمارے پاس کیسے آنا ہوا وہب؟'' خلیفہ نے پوچھا۔

''میں نے سنا ہے کہ ابوعبداللہ اپنا مکان فروخت کر رہا ہے۔ اسی مکان کا سودا کرنے آیا ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔

''کیا تم مکان خریدنا چاہتے ہو ابو وہب؟'' خلیفہ نے حیرانی سے پوچھا۔ اس کی درویش صفتی اور طرزِ رہائش دیکھ کر ایک لاکھ مالیت کا وہ مکان خریدنے کا یہ سوال پیدا ہونا فطری تھا۔

''جی ہاں! کیا ابوعبداللہ میرے ساتھ معاملہ طے کرنے کے لیے تیار ہے؟'' وہ اعتماد سے بولا۔

وزیر نے آمادگی ظاہر کردی۔ وہب نے خلیفہ کے قیمتی جوتے گٹھری سے نکال کر ابوعبداللہ کے سامنے رکھ دیے۔

''یہ جوتے خلیفۂ وقت کی ملکیت رہے ہیں۔ انہیں پہن کر وہ خطبہ دیا کرتے ہیں۔ ان قیمتی جوتوں کی قیمت میں نے صرف پچاس ہزار دینار رکھی ہے۔'' وہب نے اطمینان سے بتایا اور پھر ایک عمامہ نکال کر بولا۔

''یہ عمامہ نمازِ پنجگانہ کے وقت خلیفہ نے کئی بار استعمال کیا ہے۔ یہ انمول ہے، اس کی قیمت صرف تیس

ہزار دینار رکھی ہے اور اس چادر کی قیمت بھی صرف چالیس ہزار دینار ہے۔ میں ایک لاکھ دینار کے مکان کے عوض تمہیں ایک لاکھ بیس ہزار عنایت کر رہا ہوں۔ اب وہ مکان میرے حوالے کر دو۔"

"یہ کیسا سودا ہے؟ میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔" ابوعبداللہ نے تڑپ کر جواب دیا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم نے ضرور کوئی نہ کوئی ایسا عمل کیا ہے جس کے جواب میں وہب یہ ردعمل دینے پر مجبور ہوا ہے۔" خلیفہ نے کڑی سنجیدگی سے کہا۔ ابوعبداللہ کی رنگت متغیر ہوگئی۔

"بولو نا وزیر! تم سچ بتاؤ گے یا میں تمہارے اس راز سے پردہ اٹھاؤں؟" وہب نے اسے ٹہوکا دیا۔

ابوعبداللہ اپنی متوقع ذلت سے شدید خائف دکھائی دینے لگا۔

"احنف باہر ہی موجود ہے۔ اس کے نقصان کی تلافی کر دینا۔ مجھے ابھی ایک اور جگہ بھی جانا ہے۔" وہ سخت نگاہوں سے اسے گھورتا ہوا اپنی نئی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔

وہب نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق ابراہیم سے دنبے لے کر قاضی جنید کی رہائش گاہ کا رخ کرنا تھا۔ قاضی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہب نے اس کے دنبوں کو باغیچے میں پھول پودوں سے خوب اچھی طرح سیر کروایا۔ قاضی جنید تک جب یہ خبر پہنچی تو وہ سر کے بل دوڑتا ہوا واپس چلا آیا۔ وہب کو چوپایوں کے ساتھ ڈھٹائی سے وہیں کھڑے دیکھ کر اس کے طیش میں مزید اضافہ ہوگیا۔ سوئے اتفاق داروغہ سعد بھی جنید کے ہمراہ ہی تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے اے بہلول؟ تم نے میرا باغیچہ اجاڑ دیا۔ میں تمہاری کھال کھنچوالوں گا۔" وہ غصے سے چلایا۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا قاضی! تمہاری یہ ملکیت سرزمین بہت زرخیز ہے اور ہر جاندار کا فطری حق ہے کہ وہ زرخیز سرزمین کے وسائل سے بھرپور استفادہ کرے۔" وہب نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"ناممکن! یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ اس طرح میری ذاتی ملکیت میں دخل اندازی کر کے اسے یوں تباہ و برباد کر دے۔" جنید کے طیش میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

"آہاہ...... اگر ان دنبوں کو تمہاری زمین میں کھا پی کر پروان چڑھنے کا حق نہیں ہے تو تم نے مظاحم کو ابراہیم کی زمین پر پروان چڑھنے کا فتویٰ کیسے صادر کر دیا؟" وہب نے اسے گھورا۔

"میں ایسا کر سکتا ہوں...... میں قاضی ہوں۔" وہ بوکھلایا۔

"قاضی کا مطلب بھی جانتے ہو؟ خدا کے احکامات کو بندوں پر لاگو کرنا ہے۔ تم نے اس عہدے کو مذاق سمجھ لیا ہے کیا؟" وہب نے تلخی سے کہا اور پھر ابراہیم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں قاضی القضاۃ کا در کھٹکھٹانا چاہیے۔ اس وقت صرف وہی تمہیں انصاف فراہم کر سکتے ہیں۔"

ابن ثقیت کا ذکر سنتے ہی سعد اور جنید کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ اپنی بدنیتی اور پیشہ ورانہ غیر ذمے داری کے باعث ابن ثقیت سے بہت خائف رہتے تھے۔

"یہ معاملہ یہیں ختم کر دو ابراہیم! میں اپنا سابقہ فیصلہ کالعدم قرار دیتا ہوں۔ مظاحم کی مرغی کے دیے گئے انڈوں پر تم دونوں کا یکساں حق ہوگا۔"

جنید کے اس نئے فیصلے پر سعد اور مظاحم جز بز ہو کر رہ گئے۔ وہب کے لیے داروغہ کے کینہ میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

احنف اپنے خیمے میں موجود کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کی آنکھوں میں جوش، حیرت اور آس کے رنگ جھلک رہے تھے۔ انہی کیفیات میں لبوں پر مسکراہٹ بھی رینگ جاتی۔ اس کی یہ حالت اور اطوار دیکھ کر رملہ کی پیشانی پر بل گہرے ہونے لگے۔ وہ شوہر کی اس انوکھی تبدیلی پر تلملاہٹ محسوس کرنے لگی تھی۔ احنف کے بغداد سے آنے کے بعد ہی اس کے اطوار تبدیل ہوئے تھے۔ بغداد کی چکاچوند، پُرتمدن زندگی اور آسائشات نے اس کے دل و دماغ خیرہ کر رکھے تھے۔

"کن خیالات میں گم ہو احنف؟ کوئی کام کرنے کا بھی سوچا ہے یا نہیں؟" اس نے کئی بار کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

"اسی کے بارے میں تو محنت کر رہا ہوں اے عورت!" احنف نے انکشاف کیا۔

"تمہارا شاعری سے کیا واسطہ؟ اور تمہیں اس بے کار جھنجٹ میں کب سے دلچسپی پیدا ہوگئی؟" رملہ حیران ہوئی۔

"کردی نا احمقوں والی بات۔ شاعری بے کار جھنجٹ نہیں ہے۔ یہ ایک منافع بخش اور عزت بخش کاروبار ہے۔" احنف نے حسرت سے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہارے دماغی توازن پر شبہ ہونے لگا ہے میں نے تو سنا تھا کہ شاعری کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے۔

کاروبار کی حیثیت کب سے اختیار کر گیا؟'' رملہ مزید حیران ہوئی۔
''میں نے بغداد میں ایسا ہی دیکھا ہے اے عورت! تمہیں کیا علم کہ بغداد کی شان کیسی نرالی ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک شاعر کو صرف ایک بار کلام پیش کرنے کا تین ہزار دینار معاوضہ ملا ہے۔'' احنف کے اس نئے انکشاف پر رملہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔
''تین ہزار دینار...... صرف ایک بار کلام پیش کرنے کے؟'' وہ بدقت بولی۔ ''وہ سب تعلیم یافتہ، محنتی اور قابل لوگوں کے کام ہیں۔ تم جیسا معمولی چرواہا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کیسے بن سکتا ہے؟'' رملہ نے اسے آئینہ دکھایا۔
''کیوں نہیں بن سکتا؟ میں بھی محنت سے اپنی قابلیت میں اضافہ کرلوں گا۔ میں نے بغداد میں ابوالعتاہیہ کے بارے میں سنا۔ وہ شخص نابینا ہے۔ اس نے خلیفہ کو چند اشعار سنائے۔''
''اس میں کون سی منفرد بات ہے بھلا؟'' رملہ نے بیزاری سے کہا۔
''منفرد بات خلیفہ کا ردعمل ہوتا ہے بے وقوف عورت! ان اشعار کو سن کر خلیفہ پر رقت طاری ہوئی تھی۔ اس نے ابوالعتاہیہ کو انعام و کرام سے نوازا۔ میں بھی اپنے اشعار سے اس کا دل اور خون گرما دوں گا۔ میں اس کی بہادری، انصاف اور انتظامی صلاحیتوں کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاؤں گا۔ پھر مجھے بھی ہزاروں دینار انعام میں ملیں گے۔ ہم اس بنجر اور بیابان کے بجائے کسی عالی شان مکان میں رہیں گے۔'' احنف خوابوں سے بوجھل تھا۔
''اور یہ سب ہوگا کیسے؟'' رملہ تنک گئی۔
''میں بغداد منتقل ہو جاؤں گا۔ وہاں سے میرے کلام کی شہرت کسی نہ کسی طرح خلیفہ تک پہنچ جائے گی۔ میں نے اس کی شان میں قصیدہ بھی تیار کرلیا ہے۔ سننا چاہو گی؟''
''مجھے ان بے کار مشاغل میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سہ پہر ڈھلنے والی ہے اور چشمے سے پانی بھر کر لانا ہے۔'' اس نے بیزاری سے اپنے نکھٹو ہوتے شوہر کو دیکھا جسے اپنی ذمے داریوں سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔

☆☆☆

بغداد کے گلی کوچوں میں رونق عروج پر تھی۔ بازار کرخ میں بھی کافی چہل پہل تھی۔ خرید و فروخت کے لیے آنے والے اپنی ہی دھن میں مگن نظر آتے۔ دکاندار بھی ان سے خوب بھاؤ تاؤ کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نانبائی غوث، کباب فروش اقسم، کپڑا فروش سلیمان سبھی مصروف سے مصروف تر تھے۔ بازار بھر میں ایک ہی بات پر چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ داروغہ میں آنے والی اچانک تبدیلی کتنا عرصہ قائم رہ پائے گی۔ حیران کن طور پر سعداب دکانداروں سے نقد دام پر اشیاء خرید کر کھاتا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب سی بے بسی اور لاچاری نظر آتی تھی۔
نانبائی غوث کے پاس اصفہان سے آنے والا ایک تاجر کھڑا تھا۔ غوث نے کچھ عرصہ قبل سرائے کے مالک منکش کی بددیانتی اور استحصال سے تنگ آکر اپنا کاروبار دوبارہ بازار میں منتقل کرلیا تھا۔ غوث کے اس فیصلے کے پیچھے کہیں نہ کہیں وہب کا ہی ہاتھ تھا۔ اصفہان کے تاجر سے روٹی کے معاملات طے ہو رہے تھے جب وہب ایک بغلی گلی سے نمودار ہوگیا۔ وہ حسب سابق اپنے چوبی گھوڑے پر سوار لکڑی کے ہی مختصر ڈنڈے سے اسے چابک مار رہا تھا۔ غوث کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ تاجر شدید الجھن اور حیرت سے وہب کی پشت گھورتا رہا۔
''بغداد واقعی ایک انوکھا شہر ہے۔ میں نے اس کی خوبصورتی اور نفاست کے بارے میں سنا تھا لیکن کسی نے یہ بتایا ہی نہیں کہ یہاں پر لوگ لکڑی کے گھوڑے پر سواری کرتے ہیں۔'' تاجر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''لوگ نہیں ...... صرف وہب...... بغداد بھر میں صرف وہب ہی ایسا شخص ہے۔'' غوث نے متانت سے جواب دیا۔
''کیا یہ شخص دیوانہ ہے؟'' تاجر متجسس ہوا۔ ''دیوانہ ہی ہوگا اسی لیے تو ایسی حرکات کرتا ہے۔''
''یہ تو تم نے لاکھوں دینار کی مالیت کا سوال کر دیا۔ اگر وہب دیوانہ ہے تو پھر ہم نے عقل و فہم پایا ہی نہیں۔ سچ بتاؤں میرے عزیز! اس وقت بغداد میں وہب سے زیادہ باشعور اور زیرک انسان کوئی نہیں۔ شاید خلیفہ بھی نہیں۔ وہ مظلوموں کی مدد اور انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔'' غوث نے سنجیدگی سے بتایا۔
''حیرت انگیز! مجھے تو ان باتوں پر یقین ہی نہیں آرہا۔'' تاجر کو وہب کی زبان سے برآمد ہونے والی ٹخ ٹخ کی آوازیں یاد آئیں۔
''یہی تو اس شخص کا کمال ہے۔ اس کے ظاہر کو دیکھ کر باطن کی جانب کوئی توجہ ہی نہیں دیتا۔ ایک چھوٹی سی مثال سنو۔ اس نے بغداد میں ایک عالم سے کھانے کے آداب کے متعلق دریافت کیا اور ان کا جواب غلط بھی ثابت کر دیا۔'' غوث نے توقف کیا۔
''کھانے کے آداب بتانا کیا مشکل ہے بھلا؟ ہمیں

بچپن سے ہی تو سکھایا جاتا ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے جائیں' تسمیہ پڑھ کر کھانے کا آغاز ہو' دائیں ہاتھ سے کھایا جائے' لقمے کو اچھی طرح چبانے کے دوران منہ سے آوازیں نہ نکالی جائیں' دوسروں کے لقموں اور پلیٹ پر نظر نہ رکھی جائے۔'' تاجر نے روانی سے کہا۔

''عالم نے بھی یہی کہا تھا لیکن وہب کہنے لگا کھانے کا سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ حلال رزق سے حاصل کیا گیا ہو۔ لقمے میں نمک کے ذرّے کی مقدار برابر بھی حرام کی آمیزش ہو تو ان آداب کو پورا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' غوث کی اس بات پر تاجر کی آنکھیں حیرت سے کانوں کے قریب جا لگیں۔

''یہ سب اس مجہول شخص نے کہا تھا؟'' تاجر کے پردۂ بصارت سے اس کی گھڑسواری اور خستہ لباس اوجھل نہیں ہو رہا تھا۔

''ہاں! یہی حقیقت ہے کہ بظاہر دیوانے دکھائی دینے والے اس شخص سے زیادہ سمجھدار بغداد میں شاید ہی کہیں موجود ہو۔''

''اگر یہ ذہانت و فہم میں اتنا ہی یکتا ہے تو دربار سے منسلک کیوں نہیں؟ خلیفہ اسے دربار سے نتھی کیوں نہیں کر لیتا؟'' تاجر کے ایک اور فطری سوال پر غوث ہنس دیا۔

''خلیفہ یہ کوشش کر کے بھی دیکھ چکا ہے۔ وہب ہوا کا جھونکا ہے جسے ایک جگہ قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔ ہاں البتہ وہ وقتاً فوقتاً دربار میں جاتا ضرور ہے اور اس کے بعد وہاں کوئی نہ کوئی نیا غدر مچا آتا ہے۔'' غوث نے شرارت سے بتایا۔

''مجھے یقین ہے کہ وہ اب بھی شاہی دربار ہی گیا ہو گا۔'' غوث کے اس اندازے پر تاجر ایک بار پھر خستہ لباس میں ملبوس وہب اور نفیس' باوقار' طرح دار شاہانہ کروفر کے حامل خلیفہ کو بالمشافہ تصور کرنے لگا۔ تصور کا خیال ہی محال تھا۔ اس لیے سر جھٹک کر رہ گیا۔

☆☆☆

وہب خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں موجود تھا۔ خلیفہ کی نشست سے کچھ دور اکڑوں بیٹھے ہوئے اس کے چہرے پر تکدر و ناگواری کے تاثرات واضح دکھائی دے رہے تھے۔ وہب کی ناخوش نظروں کا مرکز خلیفہ اور اس کے سامنے خوشامد کے پل تعمیر کرتا ''ابولبابہ'' تھا۔ ابولبابہ ایک شاعر تھا اور اپنی قصیدہ گوئی سے اکثر ہی خلیفہ کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا۔ اس وقت بھی اس کی شاعری سننے کے بعد خلیفہ نے سو گز زمین ابولبابہ کے نام کرنے کا اعلان کیا تو وہ اپنے جوشِ خطابت پر قابو نہ رکھ سکا۔

''امیرالمومنین عظیم الشان حکمران ہیں۔ عدل' شجاعت' سخاوت' بردباری اور محبت میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ بغداد کی چمک اور خوبصورتی آپ ہی کے مرہونِ منت ہے۔ عالمِ اسلام کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ان جیسا حکمران نصیب ہوا' وہ اپنی ذہانت سے خورشید و قمر بھی تسخیر کر سکتے ہیں۔'' ابولبابہ کے ان الفاظ پر ہارون الرشید کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

''ابولبابہ! تمہارے ہنر کا بھی جواب نہیں ویسے۔'' وہب نے اسے سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ ابولبابہ اس تعریف پر کھل کر آداب بجا لانے لگا۔

''میں تو شکر ادا کر رہا ہوں کہ خلیفہ نے تمہیں صرف سو گز زمین دی تو تم نے انہیں سورج کا مکین بنا دیا۔ اگر دو سو گز یا اس سے بھی زیادہ دے دی ہوتی تو تم انہیں جنت کا مکین ہی بنا دیتے۔ یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ تیرا شکر ہے میرے معبود کہ تو نے ہمارے خلیفہ کو ذہانت و فراست عطا کی ہے۔ اس لیے انہوں نے خود کو قبل از وقت جنت مکین ہونے سے بچا لیا۔'' وہب ہاتھ اٹھائے شکرانہ ادا کرتا بہت پُرسکون اور عاجز دکھائی دے رہا تھا۔

خلیفہ اس کی برجستگی' انداز اور تشویش سے بہت محظوظ ہوا۔ ابولبابہ جزبز ہو کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں تپش او کینہ چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔ وہب ان نظروں میں جھانکتا ایک ہی بات سوچنے پر مجبور تھا کہ شاعری کا بازار گر ہونے کے بعد یہ آتش مزید کتنے افراد کا دامن گھیرے گی' وہب کی یہ تشویش بے جا بھی نہ تھی۔ اسی کا ایک شناسا احنف اس لالچ اور بغداد میں قدم جمانے کی غرض سے اسی رو اپنی اہلیہ کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا۔

☆☆☆

بغداد کے سفر نے احنف اور رملہ کو تھکا دیا تھا۔ ان کے ساتھ صرف ایک خچر تھا جسے راستے میں یکے بعد دیگر سواری کے لیے استعمال کرتے وہ بالآخر کرخ چلے آ تھے۔ سفر پر روانگی سے قبل احنف کے پاس صرف سات درہم تھے۔ اس نے کمال دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہو پانچ درہم سے اخروٹ خرید لیے تھے تاکہ بغداد میں فروخت کر کے منافع حاصل کر سکے۔ دو درہم کے متعلق الب اس کا اندازہ تھا کہ کھانے اور کسی سرائے میں وقتی قیا پر صرف ہو جائیں گے۔

احنف کا جوش و ولولہ اس وقت ماند پڑا جب وہ پا

لینے کی غرض سے ایک دکان پر پہنچا۔ پیاس سے اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔

''خوش آمدید مسافر! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ابوموسیٰ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''مجھے پانی درکار ہے اور تقریباً ہر راہگیر نے آپ کی دکان کا پتا بتایا ہے۔'' احنف نے جواب دیا۔

''کیوں نہ بتاتے؟ میرے پاس اصفہان میں تیار کردہ برف کا پانی ہوتا ہے۔ ایسا خوش ذائقہ پانی تمہیں پورے بغداد میں نہیں ملے گا۔'' ابوموسیٰ نے فخر سے بتایا۔

''تو جلدی سے دے دو نا بھائی؟ میری بیوی اور سواری کا جانور بھی پیاسے ہیں۔'' احنف نے حلق میں پڑتے کانٹے بہ مشکل برداشت کیے۔

''اوہ......تم تو واقعی بہت پیاسے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم تین جانداروں کے لیے آدھے درہم کا پانی ہی کافی ہو گا۔'' ابوموسیٰ کی اس بات پر احنف کا منہ حیرت سے وا ہو گیا۔

''بغداد میں پانی فروخت ہوتا ہے کیا؟ وائے ہو تم پر! ہم جنگلوں، صحراؤں میں رہنے والے مسافروں کو خود پانی لا کر پیش کرتے ہیں۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''تو پھر وہیں رہ کر یہ کام کرتے رہتے مسافر! بغداد کیوں چلے آئے ہو؟ یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' ابوموسیٰ نے رکھائی سے جواب دیا۔

اس کی بدقسمتی کہیے یا احنف کی خوش قسمتی۔ اسی لمحے وہاں ہنہناہٹ کی آوازیں نکالتا وہب چلا آیا۔ وہ دربار سے واپسی کے بعد اس راہ گزر پر آیا تھا۔ اس نے ابوموسیٰ اور احنف میں تناؤ کی کیفیت بھانپ لی۔

''احنف! تم یہاں کیسے؟ کہیں دوبارہ سعد کے شر کا شکار تو نہیں ہو گئے؟'' وہب نے استفسار کیا۔

''نہیں! میں تو بغداد میں کاروبار کرنے اور اپنی شاعری سے شاہی دربار میں دھوم مچانے آیا ہوں۔'' احنف نے فخر سے بتایا۔

''شاباش! بہت ہی شاندار فیصلہ کیا ہے تم نے۔'' وہب نے ناراضگی سے کہا۔

''شکریہ اے بہلول! بہت شکریہ۔'' وہ اس کا طنز بھانپ ہی نہ سکا۔ ''لیکن یہاں تو پانی کی بھی قیمت وصول کی جاتی ہے۔ ایسا کہیں اور تو نہ دیکھا۔'' اس نے گلہ کیا۔

''یہ پانی میری ملکیت ہے اے مسافر! تجھے خریدنے کی استطاعت نہیں ہے تو کہیں اور چلا جا۔'' ابوموسیٰ نے غصے سے کہا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا ابوموسیٰ کہ پروردگار بھی بادلوں میں پانی ذخیرہ کرنے اور بارش برسانے کی قیمت وصول کرنے کا کوئی نظام نافذ کر دیتا۔ وائے ہو اہلِ بغداد پر! وہ نعمتوں سے خود مفت لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن دوسروں سے اس کی قیمت طلب کرتے ہیں۔ وائے ہو!'' وہب اپنے مخصوص انداز میں قہقہے لگاتے اور طنز کرتے آگے بڑھ گیا۔ اس نے احنف سے موجودہ فیصلے کے متعلق کسی بحث سے گریز ہی کیا تھا۔ کچھ لوگ کچھ باتیں وقت آنے پر ہی سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

بازار کرخ میں دوپہر کی نکھری روشن دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ کاروباری معاملات میں کافی تیزی آ چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اشیائے خورد و نوش کی دکانوں پر چکراتی خوشبو میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ عوامی معاملات پر نگاہ رکھتے ہوئے سعد ان اشیا کو دیکھ کر صرف دل ہی للچا سکتا تھا۔ ابن ثقیت کی جانب سے ملنے والی تنبیہ اور ممکنہ سزا کے خوف سے اس نے لالچ پر بند باندھ رکھے تھے۔ آگے بڑھتے ہوئے یکایک اسے ایک ناگوار بدبو محسوس ہوئی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے چونک کر بدبو کے ماخذ کی جانب دیکھا۔ اس کے قریب ہی ابولبابہ اپنی دھن میں مگن کہیں جا رہا تھا۔ سعد نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔

''شراب پی کر کہاں جا رہے ہو اے ابولبابہ؟'' سعد نے سختی سے پوچھا۔

''نہیں داروغہ! میں نے تو شراب نہیں پی۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

''جھوٹ! جھوٹ بول رہے ہو تم۔ مجھ جیسے ہونہار داروغہ سے جرم پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔'' سعد نے مزید سختی جتائی۔

''تھوڑی بہت تو چکھنے چکھانے میں چل ہی جاتی ہے داروغہ! اب ہمارے خلیفہ بھی تو نبیذ......'' وہ اتنا کہہ کر دانستہ طور پر خاموش ہو گیا۔

''جرم تو بہر حال جرم ہے ابولبابہ! خلیفہ نے سختی سے شراب کی ممانعت کر رکھی ہے۔ تمہاری گرفتاری اور سزا اب ہر حال میں لازم ہے۔''

''خلیفہ نے یہ حکم کب جاری کیا؟'' ابولبابہ تنگ گیا۔

''جب سے اس کم بخت بہلول نے محفل میں خلیفہ پر شراب کا فلسفہ جھاڑا ہے۔'' سعد نے دانت پیسے۔ اس کے ذہن میں وہب اور ہارون الرشید کی حالیہ ملاقات

اجاگر ہوگئی تھی۔

ہارون الرشید کے کہنے پر وزراء اور امراء کے ہمراہ محفل نا ؤنوش سجائی گئی تھی۔ خلیفہ بھی کنیزوں کے ہاتھ سے جام لیے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں وہب بھی وہاں پہنچ گیا۔ اسے امیر المومنین کے اس عمل پر بہت دکھ ہوا تھا۔ ہارون بھی اس کی موجودگی پر کافی جزبز ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہب اپنی عادت سے مغلوب ہوکر اس سرگرمی پر کوئی نہ کوئی اعتراض ضرور اٹھائے گا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے وہب کو خود لاجواب کرنے کی ٹھان لی۔

''میرے ایک سوال کا جواب دو گے وہب؟''

''جی پوچھیے۔'' اس نے شراب کو ناگواری سے دیکھا۔

''کیا کسی شخص کا انگور کھانا حرام ہے؟''

''نہیں! انگور اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''اگر انگور کھا کر پانی پی لیا جائے تو؟'' ہارون نے اگلا سوال کیا۔

''تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔''

''انگور کھانے والا پانی پی کر دھوپ میں بیٹھ جائے تو پھر؟''

''جتنی دیر چاہے بیٹھ سکتا ہے۔'' وہ خلیفہ کا مدعا سمجھ گیا تھا۔

''تو یہی انگور، پانی اور دھوپ سے پیدا شدہ ''نبیذ'' حرام کیوں ہوئے بھلا؟'' اس نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

''کیا میں بھی خلیفہ سے کچھ سوال کر سکتا ہوں؟'' وہب نے کہا۔

''ہاں! بالکل پوچھو۔'' ہارون قدرے سرور میں تھا۔

''اگر کسی شخص کے سر پر تھوڑی سی مٹی ڈال دی جائے تو کیا اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے؟''

''بالکل نہیں۔''

''مٹی کے بعد اگر تھوڑا پانی ڈال دیا جائے تو نقصان کا احتمال ہے کیا؟''

''وہ ممکن ہی نہیں بالکل!'' ہارون کا سرور بڑھ رہا تھا۔

''لیکن اسی مٹی اور پانی کی آمیزش کے ساتھ اینٹ بنا کر اسی شخص کے سر پر ماردی جائے تو کیا عالم ہو سکتا ہے؟''

''اس کا سر کسی تربوز کی طرح دو ٹکڑے ہو جائے گا۔'' ہارون نے محظوظ ہو کر کہا۔

''یہی آپ کے سوال کا جواب سمجھ لیجیے۔ انگور، پانی اور دھوپ کی آمیزش ایک حرام اور ناپاک شے تخلیق کرتی ہے جو انسان کو اس کا منصب ہی فراموش کروا دیتی ہے۔

مذہب میں اس کے استعمال پر سزا واجب ہے۔'' اس نے خلیفہ کے سرور پر چوٹ کی۔ ہارون الرشید کی گمبھیر خاموشی اس بات کی گواہ تھی کہ اب یقیناً ایک سخت فیصلہ صادر ہوگا۔

سعد سے یہ سارا واقعہ سننے کے بعد بھی ابولبابہ نے شراب کے نشے میں زیادہ اثر ہی نہ لیا۔ اسے بھی علم تھا کہ سعد اسے خلیفہ کے پاس تو ہرگز نہیں لے کر جائے گا۔

''ٹھیک ہے! میں قاضی کے پاس چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ قاضی جنید کوئی نہ کوئی درمیانی راہ نکال لیں گے۔'' ابولبابہ نے ایک اور پتا ظاہر کیا۔

''اس معاملے کو قاضی جنید نہیں بلکہ قاضی القضاۃ دیکھا کرتے ہیں۔ میں تمہیں انہی کے پاس لے کر جاؤں گا۔'' سعد کے اس انکشاف پر ابولبابہ کی سٹی گم ہوگئی۔ وہ بھی ابن ثقیت کی اصول پرستی، انصاف پسندی اور اٹل موقف سے بے حد خائف رہتا تھا۔

''میرے پاس اس مسئلے کا ایک اور حل ہے سعد! کچھ لے دے کر معاملہ یہیں ختم کرتے ہیں۔ تم یہ سمجھ لینا کہ میں یہاں سے گزرا نہ ہی تم نے مجھے دیکھا۔ جب دیکھا ہی نہیں تو کسی شراب نوشی کا کیا سوال؟'' ابولبابہ نے اپنی کمر پر بندھے پٹکے میں رکھی ایک تھیلی نکال کر اس کے سامنے لہرائی۔ داروغہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے چیل کی طرح وہ تھیلی دبوچ لی۔ اس کے ذہن میں ایک نئے خیال نے جنم لیا تھا۔ قانون شکن عناصر کو ابن ثقیت کے نام سے خائف کر کے مادی فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اپنی انہی سوچوں میں مگن وہ خراماں خراماں آگے بڑھ گیا جہاں تقدیر نے اس کے لیے ایک اور شکار تیار کر رکھا تھا۔

☆☆☆

''عوام الناس متوجہ ہوں! موجود یہ پیغام غیر موجود تک پہنچا دیں۔ بازار کرخ میں رہنے والوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے حکم جاری کیا ہے جو بھی عوام کی پریشانی کا سبب بنے گا گرفتاری کے بعد قید خانے میں منتقل کر دیا جائے گا۔''

منادی کرنے والے مختلف مقامات پر خلیفہ کا یہ پیغام عوام تک پہنچاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس نئے فرمان پر عوام کی طرف سے متفرق ردعمل سامنے آ رہا تھا۔ احنف بھی اسی بازار میں رملہ کے ہمراہ موجود تھا۔ ابووہب کی بدولت کسی بھی دام کے بغیر پانی حاصل کرنے میں تو کامیابی مل گئی تھی لیکن اب بھوک ان کے معدے بری طرح ادھیڑ رہی تھی۔ رملہ اس کی کم فہمی پر شکوہ کناں تھی کہ اگر اس نے

اخروٹ نہ خریدے ہوتے تو قیام و طعام کا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو سکتا تھا۔

''میں اخروٹ بہترین قیمت پر فروخت کر کے منافع کما لوں گا۔ تم تردد نہ کرو۔'' احنف کی رٹ برقرار تھی۔

وہ دو درہم جیب میں ڈالے پھرتے رہے لیکن اس روز قسمت بالکل مہربان نہ تھی۔ کھانے و رہائش کا بندوبست کہیں سے بھی ہو کے ہی نہ دیا۔ دوپہر کی سنہری چادر سرمئی اور پھر سرمئی پوشاک میں سیاہی ڈھل گئی۔ بدن تھکاوٹ سے چور ہو چکے تھے اور شکم کی آگ سوختہ کیے دے رہی تھی۔ وہ تھک ہار کر ایک مکان کے باہر چبوترے پر بیٹھ گئے۔

''یہ کیسا شہر ہے احنف؟ تم تو اس کی خوب صورتی اور چمک دمک کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔'' رملہ بے حال ہو چکی تھی۔

''تو کیا غلط کرتا تھا؟ تم نے خود یہاں کے منظم انداز کا اندازہ نہیں لگایا؟'' احنف نے بھی ہانپتے ہوئے کہا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ہم ہی بدقسمت ہیں شاید۔'' اس نے مکان کی دیوار سے سر ٹکایا۔

''رزق کا وعدہ تو پروردگار نے کیا ہے۔ ہمیں اپنے نصیب کا رزق ہر صورت میں مل کر رہے گا۔'' احنف نے خود کو تسلی دی۔

اسی اثناء میں وہب اپنے خراماں انداز میں چلتا وہاں سے گزرا اور بے نیازی سے احنف کو کھانے کی ایک پوٹلی تھما دی۔ احنف ممنون نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہب اس کے لیے ہمیشہ ہی بہت مددگار ثابت ہوا تھا۔ وہ دونوں کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ رات کی تاریکی گہری تر ہوتی گئی۔ کھانے کے لقمے تیزی سے نگلتے وہ شب بسری کے متعلق یکساں طور پر تشویش محسوس کر رہے تھے۔ ایک طویل رات ان کے لیے بہت بڑی آزمائش بن کر سامنے کھڑی تھی لیکن اس سے بھی قبل ایک اور امتحان نے انہیں آلیا۔ شہر کی گلیوں میں.... گردش کرتے داروغہ سعد کی آنکھیں انہیں دیکھتے ہی چمک اٹھیں۔ ایک صحت مند خچر اور پُرشباب عورت کی دید ہرگز نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ آن کی آن میں ان کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

''رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو تم؟'' وہ سختی سے بولا۔

''مسافر ہیں۔ شب بسری کے لیے ٹھکانا درکار ہے۔'' احنف نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

''میں تمہیں قانون کی خلاف ورزی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔'' داروغہ کے اطمینان نے انہیں دم بخود کر دیا۔

''کون سا جرم؟ ایسا کیا جرم ہو گیا ہم سے؟'' رملہ خاموش نہ رہ سکی۔

''تم لوگ رات گئے سڑکوں پر جانور کے ہمراہ شور شرابا کرتے پھر رہے ہو۔ خلیفہ کے نئے حکم کے مطابق عوام کی پریشانی کا باعث بننے والوں کو قید خانے میں منتقل ہونا پڑے گا۔ چلو اس طرح تمہاری شب بسری کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

داروغہ کی اس ڈھٹائی پر ان کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔ احنف اس لمحے اپنی بغداد آمد کے فیصلے پر ملال محسوس کر رہا تھا۔ اگلے کچھ لمحے داروغہ سے بحث میں بیت گئے۔ اس کے بعد فضا ایک اعلان سے مرتعش ہو گئی۔ آواز کا ماخذ قدرے دور تا ہم الفاظ بالکل واضح سنائی دے رہے تھے جن کے مطابق خلیفہ ہارون الرشید کی سواری اپنے روزمرہ گشت پر بغداد کے اسی علاقے میں موجود تھی۔ حاجت مند اور مستحق سائل اپنی دادرسی کے لیے براہ راست اس سے ملاقات کر سکتے تھے۔ داروغہ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

''کیا ہوا سعد؟ اب بھی گرفتار کرو ان مسافروں کو۔'' اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانکتے وہب نے کچوکا دیا۔

''میں انہیں گرفتار کرنے میں حق بجانب ہوں۔ میں قانون کا نفاذ چاہتا ہوں اور خلیفہ کا یہی حکم ہے کہ عوام کی تکلیف کا باعث بننے والوں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

''میں تمہاری بات سے بالکل متفق ہوں پیارے داروغہ!'' وہب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اگر ان کی میرے مکان کے باہر موجودگی کسی عوامی پریشانی کا سبب ہے تو خلیفہ ہارون الرشید کی رات کے اس پہر گشت پر آمد اس کے کارندوں کی ہر تھوڑی دیر بعد منادی بھی میرے لیے بے سکونی اور نیند میں خلل کا باعث بن رہی ہے۔ قانون تو سب کے لیے ہی برابر ہوتا ہے۔ میری اس شکایت پر اپنے خلیفہ کو گرفتار کر لو تو آ کر ان دونوں کو بھی زندان میں ڈال دینا۔'' وہب کی اس دلیل نے سعد کے چھکے چھڑا دیے۔ احنف اور رملہ اس دیوانہ سمجھے جانے والے شخص کی مہربانی در مہربانی کے بوجھ تلے مزید دب گئے۔

☆☆☆

بازار کرخ میں کاروباری سرگرمیاں اپنے اختتام پر تھیں۔ دکاندار بوجھل انداز میں سامان سمیٹنے میں مصروف

تھے۔ اقسم کباب فروش بھی اپنی دن بھر کی جمع پونجی گن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں تھیں۔

''کیسے ہو اقسم؟'' اسے ابوموسیٰ کی آواز نے متوجہ کیا۔ وہ بھی کافی تھکاوٹ زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

''بس تمہارے سامنے ہی ہوں میرے دوست!'' وہ بوجھل انداز میں مسکرایا۔

''لگتا ہے آج سعد ضرورت سے زیادہ سیخیں ڈکار گیا ہے۔ اسی لیے اتنے نڈھال دکھائی دے رہے ہو۔''

''نہیں! سعد کی صورت حال تو کافی تبدیل ہوگئی ہے۔ اب اگر میری دکان پر آئے تو للچائی نظروں سے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کیا کرتا۔'' اقسم نے بتایا۔

''تو پھر اس افسردگی کی وجہ؟''

''وجہ تو خیر وہی ہے جس نے تمہارے دل میں بھی خلش پیدا کر رکھی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' اقسم نے طنز کیا۔

''نہیں! غلط تو نہیں کہہ رہے۔ میں منافع کی شرح کم ہونے سے بہت پریشان ہوں۔'' ابوموسیٰ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''ہمارا غم مشترک ہے میرے دوست! منافع تیزی سے کم ہوتا جارہا ہے۔''

''اس کی ایک وجہ بہلول بھی ہے۔ کم بخت بوتل کے جن کی طرح کسی بھی وقت حاضر ہو جاتا ہے اور گاہکوں کے سامنے بال کی کھال اتارنے لگتا ہے۔'' ابوموسیٰ کا غم ابھی تازہ ہی تھا۔

''ہاں! وہ ایسی صورت حال پیدا کر دیتا ہے کہ گاہک سے جائز قیمت لینے یا اسے بنا خریداری بھیج دینے کے سوا کوئی صورت نہیں بچتی۔'' اقسم نے غصے سے کہا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ وہ قاضی القضاۃ یا خلیفہ کا کوئی جاسوس ہے۔ اتنی دیدہ دلیری یا بے باکی تو سرکاری اختیارات ملنے پر ہی سامنے آتی ہے۔'' ابوموسیٰ نے ایک خدشہ جتایا۔

''خدا جانے جاسوس ہے یا ہمارے لیے کوئی عذاب بھری آزمائش۔'' اقسم جلبلا گیا۔

''داروغہ اور قاضی جنید کو تو ابن ثقیت نے نکیل ڈال لی ہے۔ اسے راہِ راست پر کون لائے گا؟'' ابوموسیٰ نے حسرت سے کہا۔

''ابن ثقیت کی بھی خوب کہی۔ مجھے تو وہ شخص بھی اپنے لیے سخت خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ خدشہ ہے کہ کہیں منافع خوری کے سلسلے میں ہماری گردنیں بھی نہ دھر لے۔''

''یہ باتیں ابھی قبل از وقت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ دکانداروں کی ان معمولی باتوں کی ٹوہ لیتا پھرے۔ منافع خوری ہمارا حق ہے بھئی۔'' ابوموسیٰ نے دہل کر کہا۔

''مجھے اس شخص اور بہلول سے کسی خیر کی توقع نہیں میرے دوست! میں تو ہر نماز کے بعد بھی یہی دعا کرتا ہوں کہ پروردگار ہمیں ان دونوں سے نجات عطا فرمائے۔''

☆☆☆

وقت گزرتا گیا۔ بغداد کی کشور کشائی اور غربت کی کشمکش کا یہ انوکھا تضاد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بقا قائم رکھے ہوئے تھا۔ ہارون الرشید کی سیاسی اور عسکری کامیابیاں اسے بے مثال حکمران ثابت کر رہی تھیں۔ علمی اعتبار سے بھی اس کا دربار شاندار اور ہر صنف کے اصحاب کمال کا مرکز تھا۔ اس کے پاس جمع شدہ نورتن کسی فرماں روا کو میسر نہ آئے تھے لیکن دوسری طرف کسی نہ کسی گلی کوچے میں غربت، افلاس، محرومی اور استحصال اپنا پھن پھیلائے بھی ضرور ملتے۔ وہب بھی اسی افلاس کی دوری کے لیے دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ اسی جدوجہد میں اس کی ملاقات عروہ نامی ایک عورت سے ہوئی۔

عروہ پُرشباب، حسین اور دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ اکثر لکڑیاں اکٹھی کرنے جنگل میں چلی جایا کرتی۔ وہب پہلے اس کے حالات سے واقف نہ تھا۔ اسے تنہا عورت کا یوں ویرانوں میں بھٹکنا بہت افسردہ کرتا۔ وہ غیر اختیاری طور پر اس کی حفاظت کے لیے جنگل میں چلا جاتا۔ عروہ بھی اس کی موجودگی کی عادی ہو چکی تھی اس لیے کبھی کبھار اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس سے گفتگو بھی کر لیا کرتی۔ اس روز بھی ابووہب اسے لکڑیاں چنتے دیکھ کر وہیں چلا آیا۔

''یہ لکڑیاں مت اٹھاؤ عروہ! ان کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' اس کے ٹوکنے پر اپنے خیالات میں مگن عروہ چونکی اور پھر وہب کو سامنے پا کر پُرسکون ہوگئی۔

''تمہیں پتا ہے اے بہلول! اگر تمہاری جگہ یہاں کوئی اور ہوتا تو میں ابھی بھاگ جاتی۔''

''ہاں! مجھے پتا ہے۔'' وہب مسکرایا۔ ''لیکن تم شاید کسی الجھن کا شکار ہو اسی لیے غلط لکڑیاں چن رہی ہو۔''

اس کے کامل اندازے پر عروہ حیران ہوئی اور بالآخر پوچھ بیٹھی۔

''تم یہاں کس لیے آتے ہو بہلول؟ میں نے تمہیں

کبھی لکڑیاں اکٹھی کرتے تو دیکھا ہی نہیں۔''

''میں ......میں وہ......ہاں میں اپنے گھوڑے کو سیر کروانے آتا ہوں۔ اس کے چند رشتے دار بھی تو یہیں رہتے ہیں۔ یہ بے چارہ ان سے اداس ہو جاتا ہے۔ مجھ سے اس کی اداسی دیکھی نہیں جاتی۔''

عروہ حیرت سے اس عجوبہ روزگار شخص کو دیکھنے لگی جو ایک پل میں اتنی سمجھداری سے اسے نقصان سے بچاتا دوسرے ہی پل احمقانہ گفتگو کرنے لگتا تھا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو اے بہلول! تمہیں کسی چیز کی فکر پریشانی ہی نہیں۔ تم کس قدر پُرسکون زندگی بسر کر سکتے ہو۔'' عروہ نے حسرت سے کہا۔ اس کی بات پر وہب کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''تم بھی تو خوش قسمت ہو عروہ! ہر وہ انسان ہی خوش قسمت ہے جسے اللہ پاک نے صحت' جوانی' خوبصورتی' گھر' ازدواج اور سب سے بڑھ کر اپنی عبادت کی توفیق دے رکھی ہے۔'' وہب وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر اسے سمجھانے لگا۔

''صحت' جوانی' خوبصورتی' گھر اور ازدواج معاشی بدحالی کے سامنے اپنی قدر کھو دیتے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''ایسا نہ سوچو عروہ! غسیل ابن حازم بہت اچھا انسان ہے۔'' وہب نے اس کے شوہر کا حوالہ دیا جو دجلہ سے مچھلیاں پکڑ کر فروخت کرتا تھا۔

''وہ اچھا اور سمجھدار انسان محنتی اور خوش قسمت بھی ہوتا تو شاید میں ان ویرانوں میں نہ بھٹک رہی ہوتی۔ وہ ایسا بدقسمت اور اناڑی ہے کہ کوئی بھی مچھلی اس کا کانٹا نگلتی ہی نہیں۔'' عروہ نے سر جھکا۔

''وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ کاروبار میں اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ آج برا وقت ہے تو کل اچھا بھی آئے گا۔''

''وقت بھی ان کے لیے تبدیل ہوتا ہے جو اپنے حالات تبدیل کرنا چاہیں۔ غسیل دن چڑھے تک سویا رہتا ہے۔ سورج سر پر چلا آئے تو بددلی سے اپنی ٹوکری اور کانٹا پکڑے دجلہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔'' عروہ سخت کبیدہ تھی۔

''کاروبار میں سحر خیزی' لگن اور نیت نہ ہو تو یہی مسائل سامنے آتے ہیں۔'' وہب نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ اس پر کسی بھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''کوشش جاری رکھو عروہ! وہ اپنے معمولات ضرور تبدیل کرے گا۔'' وہب نے دلاسا دیا۔

''میں تو ناامید ہو چکی ہوں اے بہلول! غسیل میں کام اور ترقی کا جذبہ رہا ہی نہیں۔ جانتے ہو کل اس نے کیا کارنامہ انجام دیا؟'' عروہ نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور لاعلم پا کر اپنے سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے بولی۔

''کل وہ گھر آیا تو پاؤں میں جوتے ہی نہ تھے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا دجلہ میں مچھلی کو جوتوں کی ضرورت تھی اسے ہی دے آیا ہوں۔ وہ تمہاری طرح لکڑی بھی تھامنے لگا ہے۔''

''اوہ......اب سمجھا......'' وہب نے سر ہلایا۔ ''کل دوپہر دجلہ کے کنارے میری بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ بیدار ہوا تو غسیل میرے پاس ہی موجود اس گھوڑے کو اپنی لکڑی سے ناپ رہا تھا۔ مجھ سے ادھر اُدھر کی کئی باتیں بھی کرتا رہا۔ اب علم ہوا کہ وہ معاشی تنگی کے باعث یہ سمجھنے لگا ہے کہ دیوانگی اختیار کر کے اپنی ذمے داریوں سے فرار حاصل کر لے گا۔''

''ہاں! وہ پہلے بھی چند ایک بار یہ کہہ چکا ہے کہ اس دور میں تفکرات سے آزاد ہو کر جینا ہے تو انسان اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جائے ورنہ غم معاش کا آسیب کبھی رہائی نہیں دے گا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ بہت جلد بغداد کے گلی کوچوں میں تمہاری ہی طرح گھوڑا دوڑایا کرے گا اور لوگ اسے بہلول کہہ کر آوازے کسا کریں گے۔''

''تم فکر نہ کرو عروہ! وہ ایسی راہ کبھی اختیار نہیں کرے گا۔'' وہب کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ''تم اسے سمجھاؤ۔ عورت کی نازک سی ذات میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس قدر طاقت کہ اگر وہ مرد سے علیحدہ ہونے کی بات ہی کر لے تو مضبوط اعصاب کا حامل مرد بھی اپنی انا اور متوقع ذلت کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔''

اس کی بات نے عروہ کو ایک بار پھر چونکا دیا۔ وہ ایسی گہری اور پُرمغز گفتگو کر رہا تھا کہ کسی بھی طور احمق یا دیوانہ ہونے کا گمان ہی نہ ہوتا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں عروہ کو نہایت آزمودہ گر بتا دیا تھا۔

عروہ کی یہ مشکوک نظریں وہب سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ اس نے اپنا ''چوبی گھوڑا'' اٹھایا اور ہنہنانے لگا۔

''اب میں چلتا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔''

''کہاں جا رہے بہلول؟'' عروہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہیں جہاں سے مجھے کھانا مل جایا کرتا ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا اور گھڑ سواری کرتا آگے بڑھ گیا۔

اسے خلیفہ کے دربار میں جانا تھا۔ اس کے ذہن میں غسیل اور عروہ کے موجودہ مسئلے کا حل بھی موجود تھا۔ وہب

کے ان خیالات سے بے خبر عروہ اس کی شخصیت کے تضاد پر حیران ہو رہی تھی۔ وہ ایک نظر اس پتھر پر ڈالتی جہاں کچھ لمحے قبل وہب نہایت ہمدردی و خلوص سے اس سے بات چیت کر رہا تھا اور دوسری نظر گھوڑے کے انداز میں اپنی ٹانگوں کو جنبش دیتے اور دور جاتے ہوئے شخص پر پڑی۔

☆☆☆

خلیفہ کے دربار کی شان بے مثال تھی۔ وہب کے سامنے ایک بڑے سے تھال میں انواع و اقسام کے کھانے رکھ دیے گئے۔ وہ ان نعمتوں کو بڑے بڑے لقموں سے شکم میں منتقل کرتا عروہ اور غسیل جیسے ان افراد کے متعلق سوچ رہا تھا جنہیں ایسی ایک بھی نعمت میسر نہ تھی۔ اس لمحے اس کے دل میں اتنی دولت و حیثیت حاصل ہو جانے کی خواہش مچلنے لگی جس سے وہ ان ضرورت مندوں کی حاجات پوری کر سکتا۔ اس کے چہرے کا یہ تلاطم اور غیر معمولی خاموشی ہارون الرشید کی عقابی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کیا بات ہے وہب؟ کھانا پسند نہیں آیا کیا؟'' اس نے ملائمت سے پوچھا۔

''یہ تو شاہی کھانا ہے خلیفہ! شاہی کھانا اچھا تو ہو گا ہی۔'' اس نے اپنی انگلیاں زبان سے صاف کیں۔

''تمہیں خلیفہ اور بادشاہ پسند نہیں لیکن ان کا کھانا پسند ہے۔ یہ بھلا کیا تضاد ہے؟'' ہارون نے اسے بغور دیکھا۔

''ہاں اے ہارون! مجھے بادشاہ اور خلیفہ پسند نہیں کیونکہ وہ بہت اسراف کرتے ہیں۔ اسراف کرنے والا تو شیطان کا بھائی ہوتا ہے۔ اب میں شیطان کے بھائی کو بھلا کیسے پسند کروں؟'' وہب نے اطمینان سے چوٹ کی۔ ہارون الرشید اس برجستگی پر مسکرا اٹھا۔

''کھانے میں کسی چیز کی کمی تو نہیں؟'' وہ اس کے تاثرات اور خاموشی کی قلعی کھولنے کے لیے بے تاب تھا۔

''دجلہ کی مچھلی اس کھانے میں شامل ہوتی تو لطف آ جاتا۔'' اس نے اپنے منصوبے کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔

''میرے دسترخوان پر دیلم تک سے مچھلیاں لائی جاتی ہیں وہب۔'' ہارون الرشید نے بڑے فخر سے بتایا۔

''ہاں! لیکن دجلہ سے پکڑی گئی غسیل ابن حازم کی تو بات ہی اور ہے۔'' وہ بھی بضد تھا۔ کھانا مکمل ہو چکا تھا اس لیے وہ ہاتھ اچھی طرح صاف کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چل دیے اب؟'' خلیفہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''بازار کرخ میں اپنی ٹوکریاں فروخت کرنے جا رہا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''ارے چھوڑو ٹوکریاں! میں تو تمہیں بازار کرخ کا نگران بنانے کا خواہشمند ہوں۔'' خلیفہ نے حسب سابق اسے اپنے خول سے نکالنے کی ایک اور کوشش کی۔

''توبہ کرو ہارون! بازار کرخ کا نگران بننے کا مطلب ہے کہ اپنی آنکھیں بند اور منہ کھول لیا جائے۔'' اس نے بے نیازی سے چوٹ کی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ داروغہ اپنی ذمے داریاں نظر انداز اور مطالبات کے لیے زبان کھلی رکھتا ہے۔'' ہارون نے فوری طور پر اس کا مدعا بھانپ لیا۔

وہب نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ دبائی۔ اسے بھی ہارون کی فراست، ذہانت اور صلاحیتوں میں کبھی شبہ نہیں رہا تھا۔

''میں تو بہلول ہوں۔ بس اپنے گھوڑے پر ادھر اُدھر سیر کر لیتا ہوں۔ میں نے تو کچھ دیکھا نہ ہی تمہیں کچھ بتایا اے ہارون!'' اس نے معصومیت سے جواب دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

اسے خوشی تھی کہ وہ اپنے دونوں ہی پیغام ہارون الرشید تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ہارون کے چہرے پر تردد اور پیشانی کے بل واضح نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

غسیل ابن حازم دجلہ کے کنارے کسی گہری سوچ میں مبتلا بیٹھا تھا۔ مچھلی پکڑنے کے لیے ڈور پانی میں لٹکا رکھی تھی۔ اس کے دائیں جانب رکھی ٹوکری نصف سے زیادہ بھر چکی تھی۔ آج کانٹا نگلنے والی مچھلیوں کی تعداد حیران کن طور پر بہت زیادہ تھی۔ وہ کافی حد تک سرشاری بھی محسوس کرنے لگا۔

''آج عروہ کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔'' اس نے ایک اور مچھلی کانٹے میں پھنستی دیکھ کر خود کلامی کی۔ عروہ کا خیال آتے ہی ذہن میں سابقہ تلخیاں بھی اجاگر ہو گئیں۔

عروہ نے سخت ترین حالات میں بھی غسیل کا ساتھ دیا تھا۔ اسی آسودگی سے غسیل آرام طلب ہونے لگا تھا۔ معاشی بدحالی بددلی کا سبب بن کر محنت کا جذبہ ماند کرتی جا رہی تھی۔ اسی بات سے عروہ کی بیزاری چڑچڑے پن اور پھر تلخی میں منتقل ہو کر بحث و لڑائی کا باعث بن گئی۔ گزشتہ روز عروہ نے گھر چھوڑنے کا عندیہ دیا تو غسیل کی انا یہ بات برداشت نہ کر سکی اور وہ علی الصباح ہی اپنے سامان کے ساتھ دجلہ کے کنارے آ بیٹھا۔

شام سے قبل ٹوکری مچھلیوں سے بھر گئی۔ غسیل اپنی کامیابی کی خبر سب سے پہلے عروہ کو ہی دینا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مچھلیوں کی یہ کثیر تعداد دیکھ کر ضرور حیران ہو

جائے گی۔ اسے علم ہی نہ تھا کہ گھر پہنچتے ہی ایک شدید حیرت اس کی منتظر تھی۔ عروہ نے بتایا کہ خلیفہ کی جانب سے کوئی قاصد اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔

''خلیفہ کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا بھلا؟'' وہ الجھ گیا۔

''قاصد بتا رہا تھا کہ انہیں تم سے ہی مچھلیاں خریدنی ہیں۔'' عروہ کے جواب پر وہ سر کھجا کر رہ گیا۔

''اب میری مانو تو یہ ٹوکری دربار میں لے جاؤ۔ تمہیں اچھی قیمت وصول ہوگئی تو گھر کے حالات بھی سدھر ہی جائیں گے۔'' بیوی کی تجویز پر غسیل نے سر ہلایا اور دربار پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے خلیفہ نے اسے اپنے پاس طلب کرلیا۔

''ہم یہ مچھلیاں خریدنا چاہتے ہیں ابن حازم! بولو کیا قیمت لگاتے ہو؟'' خلیفہ کے مخاطب کرنے پر وہ مزید بوکھلا گیا۔

''خریداری کی کیا ضرورت ہے امیر المومنین؟ میں آپ کو یہ مچھلیاں تحفتاً دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ آپ میرا تحفہ قبول کرلیں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ارے غسیل! تمہاری خوشی خلیفہ کی خوشی سے زیادہ ہے کیا؟ انہیں دجلہ کی مچھلیاں خریدنے کی تمنا ہے۔ تم ان کی تمنا پوری ہونے میں روڑے اٹکاؤ گے کیا؟'' وہب نے کہا۔ غسیل خاموش رہا۔

''اب بتا بھی چکو قیمت!'' اس نے اکسایا۔

''میں کیسے بتاؤں؟ گستاخی کا خدشہ ہے مجھے۔'' غسیل نے نظریں جھکالیں۔

ہارون الرشید نے وہب کی تجویز پر اسے دو ہزار درہم عنایت کرکے مچھلیاں خرید لیں۔ غسیل کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ محنت، لگن، خلوص اور سحر خیزی سے قسمت نے کیسا پلٹا کھایا تھا۔ اس کے سارے مسائل ایک ہی جھٹکے میں حل ہوگئے تھے۔ وہ اپنے وجود میں مزید محنت کا عزم و سرشاری محسوس کرنے لگا۔ اس کی کیفیات بغور دیکھتے ہوئے وہب کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ بغداد سے غربت کا ایک در ختم کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

☆☆☆

وہب اپنے مختصر سے گھر کے اکلوتے کمرے میں ایک چادر بچھائے سجدہ ریز تھا۔ اس کا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا۔ طویل اور پُرسکون سجدوں کے بعد اس نے نماز کے بقیہ ارکان مکمل کرکے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو آنسو ایک نئی طغیانی اختیار کرگئے۔ اس کا چہرہ، ڈاڑھی اور گریبان آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ چہرے پر گداز اور تڑپ کی کیفیت نمایاں تھی۔ عاجزی سے سر جھکائے وہ زیر لب دعا میں مشغول تھا۔

''اے میرے پروردگار! دونوں جہانوں کے رب! اے قادرِ مطلق! میں تیرا گناہ گار اور عاجز بندہ ہوں۔ میری ذات حقیر ہے۔ دنیاداری میں الجھی ہے۔ مجھے اپنی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمانا۔ میرے معبود! مجھے صراطِ مستقیم عطا فرمانا۔ میں ایک مجبور اور بے بس انسان ہوں۔ مجھے ہمت اور طاقت عطا فرمانا۔ میں اپنے لوگوں کو مصائب سے بچانا چاہتا ہوں۔ ان کے لیے زندگی آسان کرنا چاہتا ہوں۔ معاشی استحصال اور بدحالی انسان کو مزید گناہوں کی طرف مائل کردیتی ہے۔ مجھے اتنی ہمت دینا کہ میں ان کے لیے زندگیاں پُرسکون کرسکوں، مشکلات آسان کرکے مسائل کے حل میں مددگار بن سکوں۔ میرے ان لوگوں پر نیک اور پرہیزگار حکمران مسلط فرمانا۔ میرے حکمرانوں کو اپنے فرائض سے مکمل آگاہی دینا میرے مالک! میری آخرت کی منزلیں آسان فرمانا۔ مجھے ہمت عطا فرمانا...... بس ہمت عطا فرمانا۔''

وہ زار و قطار روتے ہوئے التجائیں کرتا رہا۔ نماز مکمل کرکے کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کی تو سوختہ دل کو سکون میسر آنے لگا۔ نیند کی وادی میں جانے سے قبل بھی اس کے ذہن میں مصیبت زدہ عوام کا ہی خیال تھا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ اگلی صبح بغداد کے ایک کوچے میں انسانیت اور شرم کا ایسا جنازہ نکلنے والا ہے جو اس سمیت ہر ایک کے تصور و گمان سے بھی پرے تھا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی بغداد میں معمولاتِ زندگی کا مکمل آب و تاب سے آغاز ہوگیا۔ وہب نے بھی اپنا گھوڑا سنبھالا اور گلی کوچوں میں گھڑسواری شروع کردی۔ اس کی نظریں معمولات اور افراد پر ہی مرکوز تھیں۔ کچھ دور جاتے ہی اسے منکش ابن مظاحم کا مسافر خانہ... دکھائی دیا۔ وہب کا حلق کڑوا ہوگیا۔ عوام الناس میں منکش کی بے حسی اور لالچ کے قصے اب زبان زد عام تھے۔

منکش اپنے مسافر خانے میں آنے والے کسی بھی مسافر کو اخراجات کی کند چھری سے ذبح کردیا کرتا۔ وہب بھی اس کے اطوار سے خاصی ناگواری محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے ایک تاسف بھری نظر مرغی کے پیچھے لپکتے منکش پر ڈالی اور افسردگی سے سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے بڑھتے ہی وہاں کی صورتِ حال یکسر تبدیل ہوگئی۔ مرغی کو پکڑنے کے لیے زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے منکش کو عقب سے کسی نے

درشتی سے دبوچ لیا۔ منکش بلبلا کر رہ گیا۔
''کون ہے؟ کون ہے بھئی؟'' وہ حواس باختہ ہوا۔ نووارد نے اس کے جبے کو جھٹکا دے کر اس کا رخ اپنی جانب کیا۔
''اوہ...... اقسم...... تم ہو...... یہ کیا حرکت ہے؟'' اس نے اپنا جبہ سنبھالا۔
''یہی تو میں تم سے پوچھنے آیا ہوں منکش ابن مظاحم...... کہ یہ کیا حرکت ہے؟'' اقسم نے تندی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔
''کہیں صبح سویرے شراب تو نہیں پی لی جو اول فول ہانک رہے ہو؟'' منکش نے بھی تیور دکھائے۔
''آج علی الصباح تم نے اپنے مسافر خانے سے جو مسافر رخصت کیے ہیں، وہ ناشتے کے لیے میرے پاس ہی آئے تھے۔ تمہارے متعلق بہت پیار محبت سے بات کر رہے تھے۔'' اقسم نے ہر لفظ چباتے ہوئے ادا کیا۔
''تو اس میں اتنا طیش زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' منکش نے اسے گھورا۔ وہ اپنے بارے میں عوامی رائے سے بخوبی آگاہ تھا۔
''یہ بھی بتا رہے تھے کہ ان سے کھانے پینے کے دس درہم حاصل کیے ہیں۔'' اقسم نے دانت پیسے۔
''میں اپنے مسافر خانے اور یہاں کے معاملات میں کلی طور پر آزاد ہوں۔ تم اس قدر تن فن کیوں کر رہے ہو؟'' منکش نے لمحے بھر کے لیے گڑبڑانے کے بعد ڈھٹائی سے جواب دیا۔
''میں تن فن کیوں نہ کروں ابن مظاحم؟ مجھ سے خچر کا گوشت چار درہم میں خرید کر مسافروں سے دسیوں درہم کھرے کرو گے تو میں بھی خاموش نہ رہوں گا۔ دھوکا دیا ہے تم نے مجھے۔'' وہ دبی آواز میں چلایا۔ منکش بے اختیار دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگا۔ کسی کو بھی متوجہ نہ پا کر اس کی سانس میں سانس آئی تھی۔
''ہر شخص اپنی قسمت کا رزق حاصل کرتا ہے۔ میرے نصیب میں یہ دسیوں درہم لکھے تھے سو میں نے حاصل کر لیے۔ اب جاؤ! اپنا راستہ ناپو۔'' وہ بھی تندی سے بولا۔
''ہرگز نہیں! تمہیں میرا اصل حصہ ابھی اور اسی وقت ادا کرنا ہوگا ورنہ خچر کا گوشت بکرے کے گوشت کے دھوکے میں کھلانے کا راز سب پر عیاں کر دوں گا۔'' اقسم نے دھمکی دی۔
''تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم خود بھی اس جرم میں یکساں شریک ہو۔'' منکش کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔
''میرے اس جرم کا کوئی ثبوت نہیں تمہارے پاس۔ البتہ خچر کا گوشت خام حالت میں تمہارے مسافر خانے سے ضرور مل جائے گا۔ بولو! کیا کہتے ہو؟'' اقسم کی دھمکی نے منکش کو گڑبڑا دیا۔ اپنے جرم کی سنگینی سے بہر حال وہ بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔
''کیا چاہتے ہو مجھ سے اب؟'' اس نے نرمی دکھائی۔
''اپنا مکمل حصہ...... چار درہم میں لے چکا ہوں۔ بقیہ چھ درہم بھی ابھی اور اسی وقت ادا کرو۔'' اقسم نے ایک بار پھر اس کا گریبان جکڑ لیا۔
منکش بلبلا کر رہ گیا۔ یک مشت چھ درہم کی ادائیگی کا تصور ہی اس کے لیے ہولناک تھا لیکن اقسم بھی کسی قسم کی رعایت کرتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔ منکش کے پاس اس وقت چار درہم موجود تھے۔ اس نے وہی رقم اقسم کو ادا کر دی۔
''بقیہ دو درہم لینے بھی جلد آجاؤں گا۔ مجھ سے کسی نرمی کی امید نہ رکھنا اور آئندہ گوشت کی خرید و فروخت بھی نئے نرخوں پر کی جائے گی۔'' وہ اسے دھمکاتا ہوا چلا گیا۔
منکش غصے و بے بسی سے اسے گھورتا رہا۔ صبح سویرے چار درہم سے محرومی اسے شدید وحشت میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھی۔
''جانے آج صبح صبح کس کا منہ دیکھ لیا تھا جو یہ نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔
''ارے ہاں! یاد آیا۔ بہلول کے درشن ہوئے تھے۔ یہ سب اسی کا کمال ہے۔'' اسے یاد آیا۔ ''الٰہی! اس بہلول کو میری نظر اور مسافر خانے سے دور رکھنا۔ میرے کاروبار پر اس کی نظر بھی نہ پڑنے دینا۔'' منکش نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعا کی۔
وہ لمحہ ہرگز قبولیت کا نہ تھا۔ بازار کرخ میں اسی وقت موصل سے آنے والے ایک مسافر جوڑے کی آمد ہوئی تھی اور آتے ہی ان کا سامنا وہب سے ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

وہب اپنے گھوڑے پر سواری کرتا گلی کوچوں میں گھوم رہا تھا کہ بازار میں ہجوم کی وجہ سے لکڑی ایک عورت کے بازو پر لگ گئی۔ عورت غصے سے بلبلا کر رہ گئی۔
''معاف کرنا بہن! میرے گھوڑے نے آج تک کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ آج جانے اسے کیا ہو گیا؟ میں اسے سزا دوں گا۔ ضرور سزا دوں گا۔'' وہب نے اسے کہا۔
عورت کا غصہ اور ناگواری ایک ہی پل میں غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ حیرت اور ہنسی نے لے لی تھی۔
''یہ لکڑی تمہارا گھوڑا ہے کیا؟'' وہ دلچسپی سے اس شخص

کو دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں! یہ میرا گھوڑا ہے۔ میں اس پر سواری کرتا ہوں۔" وہب نے معصومیت سے جواب دیا۔ عورت کھلکھلا کر ہنس دی۔

"دیکھا آپ نے حارث! یہ شخص پاگل ہے کیا؟" اس نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ درمیانی عمر کا قبول صورت، سنجیدہ اور کم گو دکھائی دینے والا حارث بھی گہری نظروں سے اس اجنبی کو دیکھنے لگا۔

"پاگل...... پاگل تو ہم سبھی ہیں۔ کوئی کسی خواہش کے پیچھے...... تو کوئی کسی مقصد کے لیے۔" وہب نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

حارث کی آنکھوں میں مزید حیرانی دکھائی دینے لگی تاہم عورت اب بھی بے نیازی نظر آرہی تھی۔

"بغداد میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تم لوگوں کو؟" وہب نے دریافت کیا۔

"ہم آج ہی موصل سے آئے ہیں۔ کچھ ضروری تجارتی معاملات نمٹا کر ایک دو روز میں واپس لوٹ جائیں گے۔" حارث نے بتایا۔

"پروردگار تمہارے ہر کام میں خیر و برکت اور آسانی پیدا فرمائے۔" وہب نے خلوص سے کہا۔

"ہمیں اس شہر کی بابت زیادہ علم نہیں ہے۔ کسی مسافر خانے کی بابت راہنمائی کر سکو تو ممنون رہوں گا۔" حارث نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے حارث؟ ایک دیوانہ شخص کسی کو مشورہ دینے کا اہل ہوتا ہے کیا؟" اس عورت نے تنک کر کہا۔ وہ کافی تندمزاج، عجلت پسند اور خود پسندی کا شکار دکھائی دیتی تھی۔

"تم خاموش رہو بطحا! میں ان معاملات کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔" حارث نے اسے ٹوکا۔

وہب اپنی مخصوص بے نیازی اور معصومیت سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور خاموش ہونے پر کہنے لگا۔

"بغداد میں تقریباً ہر مسافر خانے میں ہی آسائشات اور آرام ملے گا۔ تمہیں جو مناسب لگے کر لینا لیکن ایک مشورہ ضرور دوں گا کہ منکش ابن مظاحم کے مسافر خانے کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔"

"کیوں؟ ایسا کیا ہے وہاں؟ کہیں کوئی آسیب وغیرہ کا معاملہ تو نہیں؟" بطحا کی مخصوص نسوانی ہٹ دھرم حس بیدار ہو گئی۔

"ہاں! ٹھیک ہی کہا تم نے اے خاتون!" وہب نے سر ہلایا۔ "آسیب کا ہی معاملہ ہے۔ لالچ اور خود غرضی سے بڑا کوئی آسیب ہوا بھی ہے اس دنیا میں؟ ابن مظاحم کے پاس قیام کرنے والے اپنی دولت سے محروم ہو کر تن کے کپڑے جانے کیسے بچا کر نکلتے ہیں۔" اس نے دوٹوک کہتے ہوئے اپنے چوبی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک بار پھر گھڑسواری کا آغاز کر دیا۔

"عجیب احمق شخص ہے۔ میں نے تو موصل میں زندگی بھر ایسا انسان نہ دیکھا جو لکڑی کو اپنا گھوڑا سمجھ کر سواری کرتا ہو۔" بطحا نے تمسخر سے کہا۔

"اس کی باتیں ہرگز نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ مجھے اس کی گفتگو میں سچائی اور خلوص کی مہک محسوس ہوئی ہے۔" حارث نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ اس غیر معمولی شخص کی بات تسلیم کر لے۔ اس نے یہ معاملہ اپنے کام کی تکمیل تک مؤخر کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کی نظر تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑے وہب اور اقسم پر نہ پڑی تھی۔ اقسم اپنی دکان کے سامنے ہونے والی چھیڑ چھاڑ کے متعلق تشویش مند تھا۔

"میں نے داروغہ سعد کو یہاں منڈلاتے دیکھا تھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ کافی بھوکا ہے۔ بڑی بے تابی سے تمہارے سامان کی طرف دیکھ رہا تھا۔" وہب نے اسے بتایا۔ اقسم غصے سے دانت پیس کر رہ گیا۔

"خدا جانے اس شخص کے پیٹ میں کون سا کنواں ہے جو سیر ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔" وہ بڑبڑایا۔

"نااہل اور خائن کو جب عہدہ مل جائے تو وہ اسی طرح اپنا پیٹ اور خزانہ بھرتے ہیں۔ خوفزدہ جو ہوتے ہیں کہ عہدہ چھن جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ مال سمیٹ لیا جائے۔" وہب نے قہقہہ لگایا اور اپنے سفر کا دوبارہ آغاز کر دیا۔

"جانے وہ کون احمق ہیں جو تمہیں دیوانہ سمجھتے ہیں وہب بن عمرو!" اقسم نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے خود کلامی کی۔ "میں نے تو پورے بغداد میں تم جیسا دانا نہیں دیکھا۔ تمہیں خلیفہ کا مشیر ہونا چاہیے۔ بغداد کے آدھے مسائل تم چٹکی بجاتے ہی حل کر لو گے۔"

وہب کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اس کا ذہن ایک بار پھر سعد کی طرف منتقل ہو گیا جو کچھ دیر پہلے اس سے درجن بھر سیخیں کھانے کے بعد منکش کی شکایت سن کر گیا تھا۔ اقسم نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے مسافر خانے کے لیے خچر کے گوشت کی فراہمی کا معاملہ گوش گزار کر دیا تھا۔ سعد نے ایک مسلم بکرے کے عوض اس معاملے میں اقسم کو ملوث نہ کرنے کی ہامی بھری تھی۔ اس "نقصان" کے بعد دکان پر غیر موجودگی

میں ہونے والی مڈبھیڑ چھاڑ نے اقسم کو برافروختہ کر دیا۔ اسے داروغہ پر اعتبار پہلے ہی نہ تھا اب تو یہ طیش ایک نئی صورت اختیار کر گیا تھا۔

''کاش اے داروغہ! مجھے کوئی موقع مل جائے کہ میں تم سے بھی اپنا نقصان کسی طرح چکتا کر سکوں۔''

کبابوں سے نکلنے والی بھاپ اسے اپنے دل سے نکلتے دھوئیں جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ تقدیر کی مہربانی نے اسے یہ موقع بہت جلد فراہم کر دیا۔

☆☆☆

اگلی صبح حسب سابق روشن اور نکھری ہوئی تھی۔ اقسم نے اپنی دکان کھولنے کے بعد گوشت کانٹوں پر لٹکانا شروع کر دیا۔ بازار میں چہل پہل ابھی کم تھی۔ اقسم کی نظر کچھ ہی دور بیٹھے ایک جوڑے پر پڑی۔ یہ جوڑا اسے گزشتہ روز بھی بازار میں نظر آیا تھا تاہم آج ان کے بشرے سے جھلکنے والی بے تابی غم وغصہ اور مایوسی غیر معمولی تھی۔ عورت کے چہرے پر چھائی مردنی اور اشتہا سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بھوک بھی لگی ہے۔ وہ بے بس نظروں سے اقسم کی دکان کی جانب دیکھ کر رہ جاتی۔ مرد البتہ قدرے سمجھدار اور گہری سوچ میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ اقسم نے اپنا سامان ترتیب دیا اور کسی گاہک کے انتظار میں فارغ بیٹھنے کے بجائے اس جوڑے کی طرف چل دیا۔

''کیا ماجرا ہے؟ کافی پریشان دکھائی دے رہے ہو؟'' اس نے نرمی سے دریافت کیا۔

''پریشان تو ہوں گے ہی۔ ایک ہی رات میں ہمارا مال و متاع سب کچھ چھین کر موصل روانگی سے بھی منع کر دیا گیا ہے۔'' بطخا نے تڑپ کر کہا۔

''ایک رات میں ایسا کیا ہو گیا تمہارے ساتھ؟'' اقسم حیران ہوا۔

''کچھ نہیں بھائی! کیا بتائیں تمہیں؟'' حارث نے گہری سانس بھری۔ ''ہم موصل سے کچھ اہم کاروباری سلسلے میں بغداد آئے تھے۔ کل سارا دن یہی معاملات نمٹاتے گزر گیا۔ رات ہونے پر کسی مسافر خانے میں قیام و طعام کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ میری بیوی بہت زیادہ تھک چکی تھی۔ گمان تھا کہ جلد از جلد قیام نہ کیا تو کہیں بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔'' اس نے خشمگیں نگاہوں سے بطخا کو گھورا۔

''ہم مسافر خانے کی بابت گفتگو کرتے اس بھلے آدمی کو یاد کر ہی رہے تھے جس نے ہمیں کسی منکث ابن مظاحم کے پاس نہ جانے کی تلقین کی تھی کہ وہاں ایک اور شخص تفتیشی نظروں سے ہمیں گھورتا چلا آیا۔ وہ ہمیں مشکوک مجرم سمجھ رہا تھا۔ علم ہوا کہ وہ شہر کا داروغہ ہے۔ ہم نے اپنی مشکل اور الجھن اس کے سامنے بیان کر دی۔ اس نے یقین دلایا کہ منکث ابن مظاحم سے زیادہ ایماندار، مخلص اور آسائشات کی فراہمی یقینی بنانے والا شخص بغداد بھر میں کہیں نہ ملے گا۔ منکث کے پاس قیام وطعام کے لیے اس اعتماد سے تحریک دی کہ ہم اس بھلے شخص کی تنبیہہ کو بالکل ہی فراموش کر گئے۔''

''خیر! بھلا تو نہ کہو۔ دیوانہ ہی تھا کوئی۔ ورنہ یوں لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہوتا کیا؟'' بطخا اپنے مزاج سے مغلوب ہو کر خاموش نہ رہ سکی۔

''کہیں تم وہب کی بات تو نہیں کر رہے؟'' اقسم چونکا۔

''ہاں! داروغہ نے بھی کل رات میری بیوی کے اسی طرح کہنے پر یہی نام لیا تھا۔ اس نے داروغہ کے سامنے کہا تھا کہ ہمیں کسی عصابردار شخص نے منکث کے پاس جانے سے منع کیا ہے۔'' حارث مزید بتانے لگا۔ ''خیر! داروغہ نے اس قدر اعتماد وخلوص سے ہمیں ترغیب دی کہ منکث ہی اس شہر میں واحد مسیحا محسوس ہونے لگا۔''

''آگے کی کہانی مجھ سے سن لو اے مسافر!'' اقسم نے تاسف سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''منکث نے بالائی منزل کے لیے فی کس دو درہم کرایہ بتایا ہوگا کیونکہ ان کمروں میں روشندان بھی ہیں۔ زیریں منزل کا فی کس کرایہ ایک درہم۔ اس کے بعد تمہیں سواری کے خچر کے ساتھ ہی کسی تنگ، گھٹن زدہ کمرے میں ٹھہرا دیا ہوگا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں! خدا کی قسم! بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' بطخا تڑپ کر بولی۔ ''اس شخص نے تو ہم سے وضو کا پانی استعمال کرنے کے بھی پیسے لیے ہیں۔ احتجاج کرنے پر کہنے لگا کہ بغداد میں کہیں بھی چلے جاؤ تمہیں یہی نرخ ملیں گے۔''

''خیر! ہر جگہ تو ایسا نہیں ہے۔ منافع خوری اور ذاتی مفاد اپنی جگہ مسلم لیکن حالات اتنے بھی خراب نہیں۔'' اقسم نے سر کھجاتے ہوئے تجزیہ کیا۔

''کھانا کس نرخ پر فراہم کیا تھا اس نے تمہیں؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔

''چھ درہم مانگے۔ کہنے لگا کہ میں نے تمہیں بہترین مرغی کا گوشت فراہم کیا ہے۔ اس مرغی کے سوا ان انڈوں کے پیسے بھی دینے ہوں گے جو مرغی کے پیٹ میں موجود تھے۔ اگر مرغی ہمیں نہ کھلائی جاتی تو ان انڈوں سے مزید چوزے پیدا ہو سکتے تھے۔'' بطخا پھر بول اٹھی۔

''ایسا کہاں ہوتا ہے میرے بھائی؟ اتنا اندھیر مچا رکھا ہے۔'' حارث کہنے لگا۔ ''ہم نے اس ناجائز منافع خوری کی

داروغہ سے شکایت کی تو اس نے ہمارا سامان، مال و اسباب اپنے قبضے میں کر لیا اور شہر سے ہی نہیں بلکہ اس علاقے سے بھی باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔ کہاں جائیں ہم؟ آخر کیا کریں؟" اس کی پتا پر اقسم کا ذاتی غصہ بھی عود آیا۔

"کسی قاضی سے شکایت کا بھی سوچا تھا لیکن یہاں سے کہیں ہل نہیں سکتے اور کسی بھی عہدیدار پر یقین بھی نہیں رہا۔ اگر قاضی ان داروغہ سے بھی زیادہ مفاد پرست ثابت ہوا تو کہیں کسی قید خانے میں ہی نہ پھنکوا دے۔" حارث نے کہا۔

"اس صورتِ حال سے تمہیں ایک ہی شخص رہائی دلوا سکتا ہے۔" اقسم نے حارث اور اپنے مشترکہ دشمنوں کی کسی ممکنہ درگت کے تصور سے جواب دیا۔

"کہیں تمہارا اشارہ اسی دیوانے شخص....." بطحا نے تمسخر سے کہنا چاہا لیکن اقسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"اسے دیوانہ اور خود کو عقل مند سمجھنے کا خمیازہ بھگتنے سے تسلی نہیں ہوئی تو بے شک تھوڑا اور تاوان ادا کر لو۔"

"نہیں اے مہربان شخص! میں اپنی اس عجلت پسند بیوی کی طرف سے معذرت کرتا ہوں۔ مجھے اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے کوئی نہ کوئی حل درکار ہے۔" حارث نے فوراً کہا۔

اقسم کو اب وہب کا انتظار تھا جو اپنے معمول کے مطابق صبح گھڑسواری کرتا بازار کرخ سے ضرور گزرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہب کے سوا کوئی بھی حارث اور بطحا کو اس مشکل سے نجات نہیں دلوا سکتا۔

☆☆☆

منکث ابن مظاحم اپنے مسافر خانے میں سخت مضطرب تھا۔ اس کے سامنے داروغہ سعد، حارث اور بطحا موجود تھے۔ سعد کے چہرے پر بھی گھبراہٹ اور سراسیمگی جھلک رہی تھی۔ ان کی کیفیات کا سبب سامنے ہی براجمان ایک قاضی تھا۔

سعد نے علی الصباح اس مسافر جوڑے کا سامان اپنے قبضے میں کیا تھا، مقصد بہرحال یہی تھا کہ کسی طرح ان کو ہراساں کر کے زیادہ سے زیادہ مال بٹورا جاسکے۔ اس نے اپنے تئیں ان دونوں کو کسی سے بھی مدد لینے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ کسی قاضی تک رسائی کا رستہ نکال بھی لیتے تو جنید جیسا مہرہ پہلے ہی اس کے ہاتھ میں تھا۔ سعد کی بدقسمتی تھی کہ کسی وقت بصرہ کا ایک قاضی اس بازار میں چلا آیا۔ حارث اور بطحا کی پریشانی دیکھ کر ان کی پتا جانے بغیر نہ رہ سکا اور اب منکث کے مسافر خانے میں اس کے ساتھ داروغہ کی گوشمالی کرنے بیٹھا تھا۔ سعد نے اس سے شناخت طلب کرنے کی کوشش کی تو وہ بری طرح بھڑک کر قاضی القضاۃ کے پاس چلنے کی دھمکی دینے لگا۔ سعد کا احتجاج وہیں دھرے کا دھرا رہ گیا۔

"جنابِ عالی! میں ایک پردیسی ہوں۔ بغداد میں ہونے والی اس لوٹ مار سے انصاف درکار ہے مجھے۔" حارث نے دہائی دی۔

"محترم قاضی! یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ میری بات سنیے۔" سعد نے کہا۔

"مجھے ایک فریق کی بات تو سن لینے دو داروغہ! فکر کیوں کرتے ہو؟ تمہاری ساری کہانی بھی سن لوں گا۔" قاضی نے تندی سے اسے مخاطب کیا۔

حارث نے اسے مختصراً ساری پتا سنا دی۔ قاضی اس کی بات سن کر یکدم کھڑا ہوا اور پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے میزبان کے گھر ایک دیگچے میں گندم چھوڑ آیا ہوں۔ تمہارے مسئلے میں الجھ کر بھول ہی گیا کہ پانی ابل کر خشک ہو گیا ہوگا۔ اب گندم الگ کرنی ہے تاکہ کاشتکاری کے موسم میں اسے بیج کر مزید گندم حاصل کر سکوں۔"

"جنابِ قاضی! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ابلی ہوئی گندم دوبارہ کیسے کاشت کی جاسکتی ہے بھلا؟" منکث خاموش نہ رہ سکا۔

"بالکل ویسے ہی میرے عزیز جس طرح بھنی ہوئی مرغی کے پیٹ میں موجود انڈوں سے مزید چوزے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔" قاضی کی ہڑبونگ اور عجلت یکدم ہی پُرسکون ہو گئی۔

سعد اور منکث کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ بہت بری طرح اور غلط موقع پر لاجواب ہوئے تھے۔

"اب اس پردیسی جوڑے کا سامان اور زائد وصول شدہ رقم واپس کرو گے یا میں خود یہ مقدمہ قاضی القضاۃ کے پاس لے کر جاؤں؟" قاضی نے مزید دھمکایا۔

سعد اور منکث کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ انہوں نے رقم اور سامان حارث کو لوٹا دیا۔ مسافر خانے سے باہر آنے کے بعد بھی بطحا اور حارث کو اپنی خوش قسمتی کا یقین ہی نہ آرہا تھا۔ انہیں قدرے فاصلے پر بیٹھا "وہب" دکھائی دیا جس نے اقسم کا بھیس بدلنے کے بعد اس سارے ناٹک کی "ہدایت کاری" سرانجام دی تھی۔ اقسم کو بھی اس بہروپ کا حصہ بن کر اپنے دل کا غبار ہلکا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ حارث کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی تھی۔

"بہت شکریہ اے شخص! اگر تم نہ ہوتے تو جانے ہمارے ساتھ کیا ہو جاتا؟ کاش تم بغداد میں کوئی انتظامی عہدہ سنبھال لو تو ایسے شرپسند عناصر کو کبھی پنپنے کا موقع ہی نہ مل سکے

گا۔" حارث نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ اس مشکل سے تمہیں صرف وہب ہی نجات دلوا سکتا ہے۔" قسم نے اپنی اصل آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"تمہاری ان باتوں میں مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میرا گھوڑا بھوکا ہے۔ اسے گھاس اور دانہ کھلانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔" وہب عصا پر سوار ہوا اور ہنہناتے ہوئے گھڑ سواری شروع کر دی۔

حارث اور بطحا اس متضاد رویّے کے حامل شخص کو خاموشی سے جاتے دیکھتے رہے۔

☆☆☆

بغداد کی شان و شوکت میں ہر گزرتے سال کے ساتھ بے مثال اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی عظمت کا یہ عالم تھا کہ یہاں تیس ہزار مساجد تھیں۔ شہر سولہ دروازوں میں تقسیم تھا۔ ہر دروازے کے مابین آٹھ میل کی مسافت تھی۔ شہر میں عام حمام "ساٹھ ہزار" تھے۔ ہر حمام میں کم از کم سات خدمت گار ضرور تعینات ہوتے۔ آبادی دس لاکھ کے قریب ہو چکی تھی۔

بغداد کی اس چمک دمک اور خوبصورتی میں اضافے کے ساتھ کچھ عوامل اپنی جگہ جوں کے توں برقرار رہے۔ غریب طبقے میں پھیلی غربت، انتظامی عہدیداران کی بے حسی، وہب کی ان افراد کے لیے پُرخلوص کوششیں اور خلیفہ کے اس کے متعلق شکوک و شبہات۔ وہب کی نظریں کسی نہ کسی طرح ان افراد کو تلاش کر ہی لیا کرتی تھیں جو غربت و افلاس کے خونخوار پنجوں میں اپنی زندگی کا تانا بانا بچانے کی کوششوں میں جتے ہوتے تھے۔ وہ دربار سے حاصل شدہ اشیائے خور و نوش اور پھل میوے ان غریب گھرانوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس کی حاصل شدہ اشیاء ہی خلیفہ کے شکوک میں اضافہ کیا کرتیں لیکن یقین اور ثبوت ہنوز بہت دور تھے۔ اپنے ذہن میں پنپتے ان خدشات کو دور کرنے کے لیے اس نے داروغہ سعد کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

"شہر کے حالات کی کیا خبر ہے سعد؟" اس نے کڑے تیوروں سے دریافت کیا۔

"حالات بہترین ہیں امیر المومنین! عوام خلیفہ کی محنت، صلاحیتوں اور کاوشوں سے مکمل طور پر مطمئن اور خوش حال ہے۔" داروغہ سعد نے عاجزی سے بتایا۔

"اگر عوام خوشحال ہے تو بازار کرخ میں چوری کا واقعہ کیوں پیش آیا؟ کیا تمہیں علم نہیں کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ کہیں دریا کے کنارے کوئی جانور بھی پیاس سے مر گیا تو اس کی ذمے داری خلیفہ پر ہو گی۔ میری رعایا میں بھی اگر کوئی غربت یا حالات سے مجبور ہو کر چوری جیسے گناہ کا مرتکب ہو گا تو اس کی ذمے داری بھی مجھ پر عائد ہو گی۔"

"امیر المومنین! عوام کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ چوری کے اس واقعے میں ملوث شخص بھی مالی طور پر خاصا مضبوط ہے۔ اس نے محض تفریحِ طبع اور مہم جوئی کے لیے یہ جرم کیا ہے۔" سعد نے اطمینان سے جھوٹ تراشا۔

"پروردگار شیطان کے بہکاوے سے سب ہی کو محفوظ رکھے۔" خلیفہ نے دعا کی اور سعد کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر عوام کو کسی قسم کی شکایت یا تنگی کا سامنا کرنا پڑا تو میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر بازار کرخ میں پھنکوا دوں گا۔" اس کے جلال نے سعد کی سٹی گم کر دی۔

"آپ کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا امیر المومنین! عوام کی خدمت ہی میرا شعار ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ خلیفہ نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور گمبھیر انداز میں استفسار کیا۔

"وہب بن عمرو کے متعلق کیا خبریں ہیں؟ میں نے تمہارے ذمے جو کام لگایا تھا اس میں کوئی کامیابی ملی یا نہیں؟"

"میں آپ کے حکم کے مطابق وقت بے وقت اس کے مکان پر جایا کرتا ہوں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ دروازہ کھولنے میں تاخیر کر دیا کرتا ہے۔ کل بھی جب ایسا ہی ہوا تو میں خود ہی دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ کمرے میں چند کاغذات کی راکھ بکھری تھی۔ ایک کاغذ وہب کے ہاتھ میں تھا جسے شاید وہ ابھی جلا نہیں پایا تھا۔ مجھے وہاں دیکھتے ہی اس نے بقیہ آدھا کاغذ نگل لیا۔" سعد نے واقعہ من و عن بیان کرتے ہوئے بتایا۔

"تم نے اسے روکا کیوں نہیں؟ کیسا کاغذ تھا وہ؟" خلیفہ مضطرب ہوا۔

"میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہو گیا امیر المومنین! اس نے غالباً پہلے ہی ارادہ کر لیا تھا کہ کسی مداخلت کی صورت میں کاغذ نگل جانا ہے۔" سعد نے اپنا تجزیہ بتایا۔ "میں نے اس سے بہرحال پوچھا تھا کہ یہ کاغذ آخر کس چیز کا ہے؟ کہنے لگا کہ خصوصی نقش ہے جسے پی کر وہ اپنے گھوڑے کو لکڑی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو جائے گا۔"

"جھوٹ...... جھوٹ بول رہا ہے وہ۔" ہارون مضطرب ہوا۔

وہ وہب کے اس بہروپ کی اصلیت جاننے کے لیے

مزید انتظار نہیں کر پارہا تھا۔ اسے تاحال اس امر کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ ایک فقیہہ اور عالم دین' جسے قاضی القضاۃ مقرر کرنے کے لیے تمام مشائخ اور علماء راضی تھے' راتوں رات دیوانگی میں مبتلا ہوکر عوام میں وجہ تمسخر کس طرح بن سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں ایک اور خیال کلبلانے لگا۔ اسے امید تھی کہ اس خیال کو عملی جامہ پہنا کر وہ ابووہب کو اپنے خول سے باہر نکلنے پر مجبور کردے گا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے آقا؟'' سعد نے استفسار کیا۔

''تم ابھی جاؤ اور عوام کی خدمت' سکون و بہتری کو یقینی بناتے رہو۔ مجھے کسی بھی قسم کی کوئی شکایت ملی تو تمہارا انجام بہت بھیانک ہوگا سعد!'' خلیفہ نے سختی سے تنبیہہ کی۔

''عوام کی خدمت میری اولین ترجیح رہے گی آقا! آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔'' داروغہ نے اسے ادب و اعتماد سے یقین دہانی کروائی اور آداب بجالاکر روانہ ہو گیا۔ اسے قاضی جنید سے طے شدہ وقت پر ملاقات کرنی تھی۔ جنید نے اسے کسی ضروری کام میں مشورے کے لیے طلب کیا تھا اور سعد کو ملاقات سے قبل ہی بخوبی اندازہ تھا کہ یہ مشورہ درحقیقت کسی نہ کسی شہری کے استحصال میں اس کی عملی مدد ہی ہوگا۔

☆☆☆

قاضی جنید نے اپنے نفیس اور دلکش مکان میں سعد کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور اس کی خاطر تواضع کرنے لگا۔

''تمہیں میرا گھر کیسا لگا سعد؟'' جنید نے پھل تناول کرتے داروغہ سے استفسار کیا۔

''بہت شاندار ہے۔'' سعد نے ندیدگی سے پھل نگلتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں یہاں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی کیا؟'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''تم نے مکان کو بہت خوبصورتی سے منظم کر رکھا ہے۔'' سعد نے داد دی۔ ''ہاں کمی صرف اتنی سی ہے کہ باغیچہ کچھ چھوٹا لگتا ہے۔''

''بالکل درست اندازہ لگایا تم نے! میں بھی اپنے باغیچے میں ہی وسعت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔'' جنید نے کہا۔

''تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ بھی رکھا ہوگا تم نے۔ کیا میں نے غلط کہا؟''

''نہیں! بالکل درست کہا۔ میں اپنے پڑوسی کی زمین خرید کر اس مکان میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دیرینہ خواب ہے کہ اس کی زمین خرید کر ایک عظیم الشان باغیچہ تیار کروں۔'' جنید نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔

''تمہارے پڑوس میں تو جعفر ابن دریدرہتا ہے نا جسے اپنے والد سے زمین ورثے میں ملی ہے اور اب وہاں مکان تعمیر کرنے کے لیے کوششیں کررہا ہے۔'' سعد نے پوچھا۔

''ہاں وہی ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ عرصے تک تعمیر کا آغاز بھی کردے۔''

''تو مشکل کیا ہے؟ اس کے قطعۂ زمین کی مالیت تیس دینار بھی نہ ہوگی۔ تم اگر پچاس دینار کی پیشکش کرو تو وہ بخوشی زمین فروخت کردے گا۔ جہاں تک مجھے اندازہ ہے وہ کافی مالی مشکلات کا شکار بھی ہے۔'' سعد نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''یہی تو مشکل ہے۔ میں اسے کافی عرصے سے اس بات پر قائل کررہا ہوں لیکن وہ ہٹ دھرم شخص اپنی ہی ضد پر قائم ہے کہ زمین اس کے والد کی آخری نشانی اور تحفہ ہے۔ اس لیے وہ کسی کو بھی فروخت نہیں کرے گا۔'' جنید کافی جھنجلایا ہوا تھا۔

''رقم بڑھا دو۔ وہ غریب سا انسان کسی نہ کسی مقام پر تو ٹوٹے گا ہی۔'' سعد نے فراخدلی سے تجویز دی۔

''یہ سب کرکے دیکھ لیا ہے۔ میں نے رقم کی پیشکش دوسو دینار تک بڑھا دی ہے لیکن وہ احمق شخص کسی صورت اپنی ضد نہیں چھوڑ رہا۔ خدا جانے میرا یہ دیرینہ خواب کب مکمل ہو پائے گا۔'' قاضی جنید مضطرب تھا۔

''تم فکر نہ کرو! ہم کوئی اور راہ نکال لیں گے۔'' سعد نے اسے اپنے تعاون کی یقین دہانی کروائی۔

''مجھے اطلاعات ملی ہیں کہ اس نے تعمیراتی سامان اکٹھا کرنا شروع کردیا ہے۔ اگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گیا تو میرے لیے نہایت شرمناک بات ہوگی۔''

''ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم اسے صرف تیس دینار دو۔ زمین سے بے دخل میں کروادوں گا۔'' سعد خباثت سے مسکرایا۔

قاضی کے چہرے پر بھی آسودگی پھیل گئی۔ اسے اپنی انا کی تسکین اور جعفر کا وہ قطعۂ زمین بہرصورت درکار تھے۔

☆☆☆

وہب دربار میں خلیفہ کے سامنے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب اور تشویش ہلکورے لیتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں آنے سے قبل جعفر اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ وہ اپنے قطعۂ زمین پر قاضی جنید کی بدنیتی کے متعلق اسے پہلے بھی آگاہ کرچکا تھا تاہم اب معاملہ کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ جنید نے اسے تیس دینار دے کر داروغہ سعد اور چند سپاہیوں کی مدد سے زمین پر قبضہ کرلیا تھا۔ جعفر کے پاس کوئی اور قطعۂ زمین یا وسائل نہیں تھے۔ وہ اپنی اس پریشانی

کے خاتمے کے لیے ہی وہب کے پاس آیا تھا۔

''کیا بات ہے وہب! آج بہت خاموش اور افسردہ دکھائی دے رہے ہو؟'' خلیفہ نے دریافت کیا۔ ''کیا سوچ رہے ہو آخر؟''

''کچھ نہیں امیرالمومنین! میں صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ جب بااختیار لوگوں کی ہوس بڑھنے لگے تو انسانیت دفن ہو جایا کرتی ہے۔ اس مدفن کے کتبے پر آخر کیا لکھوایا جانا چاہیے؟''

''ایسا کیا دیکھ لیا وہب جو اتنی گہری باتیں سوچنے لگے ہو؟'' خلیفہ اس کے الفاظ اور کیفیت پر چونک گیا۔

''محل جھونپڑیوں کو نگلنے لگے ہیں۔ محافظ لٹیرے اور محرم ہی مجرم بننے لگے ہیں میرے آقا!'' اس نے رسان سے جواب دیا۔

اس کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہارون الرشید کے اضطراب اور سوچ میں اضافہ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ وہب کو بھی یہی کیفیت درکار تھی تاہم اس وقت وزیر ابن خالد کی آمد نے صورتِ حال یکسر تبدیل کر دی۔ برمکی خاندان سے تعلق رکھنے والا وہ عہدیدار خلیفہ کے بہت قریب تھا۔

''کہو! کیا خبر لائے ہو ابن خالد؟ حج کے کارواں کی تیاری کا سلسلہ کہاں تک پہنچا؟'' ہارون الرشید پُرشوق تھا۔ وہ ایک سال حج اور دوسرے سال جہاد کے لیے روانہ ہوا کرتا تھا۔ مذہبی عقائد اور احکامات کی پابندی نہایت سختی سے کیا کرتا۔ وہ حج کے لیے پیدل سفر کرتا۔ بغداد اور مکہ المکرمہ کے درمیان طویل مسافت، خشک اور دھوپ کی تپش سے جلتے ریگستان کی سختی بھی اس شوق کی تکمیل میں حائل نہ ہو پاتی۔

''کارواں کی تیاریاں تقریباً مکمل ہیں امیرالمومنین! کچھ روز میں روانگی یقینی ہوگی۔'' ابن خالد نے اعتماد سے کہا۔

''علماء کو تیار کر لیا ہے کیا؟'' ہارون نے پوچھا۔

''جی امیرالمومنین! ایک سو علماء اپنے لڑکوں کے ہمراہ اس سفر پر جانے لیے تیار ہیں۔'' ابن خالد نے اس کی خواہش کی تکمیل کے تحت جواب دیا۔ حج پر روانگی کے وقت یہ اہتمام لازم ہوتا تھا۔ جس سال وہ اس فریضے کے لیے روانہ نہ ہوتا تو اپنی جگہ تین سو آدمی حج کے لیے بھیج کر سفر کے لیے بڑی فیاضی سے زادِ راہ بھی مہیا کرتا۔

''تم ہمارے ساتھ حج پر چلو گے وہب؟'' اس نے یکدم پوچھا۔ ''تمہاری صحبت میں سفر یقیناً اچھا گزر جائے گا۔''

''حج جیسے مقدس فریضے کی ادائیگی سے بھلا کون انکار کرتا ہے اے خلیفہ؟ میں تیار ہوں۔'' وہب نے فوراً جواب دیا۔

اس پیشکش اور وہب کے اقرار پر ابن خالد ناگواری سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ وہ بھی خلیفہ کے ساتھ حج پر روانگی کا متمنی تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ ہارون کی غیر موجودگی میں ریاستی معاملات اپنے بیٹے ''جعفر برمکی'' کے ساتھ اسی کو سنبھالنے تھے۔ ہارون الرشید رعایا کو کسی سرپرست کے بغیر چھوڑ کر جانے کا قائل ہی نہیں تھا۔

''امیرالمومنین! جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ وہب کا آپ کے ہمراہ جانا مناسب ہوگا کیا؟ یہ مناسک حج، ان کی حرمت اور طریقۂ ادائیگی سے واقف بھی ہے کیا؟'' ابن خالد نے اس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر ایک منطقی سوال کیا۔

''کیا یہ وہاں بھی اپنا گھوڑا ساتھ لیے پھرے گا؟''

''بولو وہب! کیا کہتے ہو؟ کیا وہاں بھی اپنا یہ گھوڑا یونہی ساتھ لیے پھرو گے؟'' خلیفہ کے اس سوال پر وہب سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ان کا اصل مدعا سمجھ گیا تھا۔

''مناسکِ حج کی ادائیگی میں خلیفہ میرے مددگار ثابت ہو جائیں گے نا۔'' وہ تحمل سے بولا۔ ''میں انہی کی پیروی کرتا رہوں گا۔ اور اس گھوڑے کا کیا ہے؟ بے ضرر سا تو ہے۔ یہ بھی ہمراہ چلے تو کیا مضائقہ ہے؟'' اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ ہارون الرشید ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''امیرالمومنین! میرا خیال ہے کہ بہلول کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے انداز و اطوار خلیفہ کا وقار مجروح کر سکتے ہیں۔'' ابن خالد کی اس تجویز پر ہارون الرشید تذبذب کا شکار ہو گیا۔

وہب نے بھی فی الوقت کچھ کہنے سے گریز ہی کیا۔ اس کے ذہن میں جعفر اور اس کی ملکیتی زمین پر قابض قاضی جنید کا معاملہ حل کرنے کے لیے کشمکش جاری تھی۔ اسے خلیفہ اور ابن خالد کی چند باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جنید اپنی چرب زبانی کے باعث دربار میں خاصی اہمیت اختیار کرنے لگا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اسے قاضی القضاۃ کے عہدے پر ہی فائز کر دیا جاتا۔ وہب کو اس سے قبل ہی اس کی اصلیت آشکار کرنا تھی۔ سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک بہترین حل وارد ہو گیا۔

جعفر نے وہب کے کہنے پر قاضی جنید کو اپنے گھر معاملات خوش اسلوبی سے طے کرنے کے لیے بلوایا۔ جنید کی آمد کے بعد ان دونوں نے اس پر کسی طرح قابو پایا اور مشکیں کس دیں۔ اگلے مرحلے میں جعفر نے علاقے میں یہ افواہ پھیلا دی کہ قاضی جنید کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہب نے اسے ایک چارپائی کے ساتھ کسی میت کی طرح باندھ کر اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ بازار کرخ میں افسردگی کا عالم تھا۔ وہب اور جعفر اس زندہ میت کو لیے مسجد پہنچ گئے جہاں خلیفہ کو

بھی نماز ادا کرنے کے لیے آتا تھا۔ ہارون الرشید اس افسوس ناک خبر پر تاسف میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے میت کے آخری دیدار کی فرمائش کی تو قاضی جنید کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا گیا۔ اسے زندہ حالت میں بے بسی سے آنکھیں گھماتے دیکھ کر ہر کوئی انگشت بدنداں تھا۔ ابن خالد نے خلیفہ کے اشارے پر اسے فوری طور پر رسیوں سے آزاد کر دیا۔

''یہ سب کیا ہے قاضی جنید؟'' خلیفہ برہم تھا۔

''میرے آقا! ان دونوں نے مجھے دھوکے سے بے بس کر کے اس حال میں پہنچایا ہے۔ انہوں نے ہی میری وفات کی جھوٹی خبر ہر طرف پھیلائی ہے۔'' جنید نے دہائی دی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا ہے وہب؟'' خلیفہ طیش میں آیا۔

''میں نے خواب دیکھا تھا کہ قاضی جنید کی نمازِ جنازہ پڑھا رہا ہوں۔ اسی خواب کی تکمیل کرنا چاہتا تھا بس۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''تمہیں یہ حق کس نے دیا آخر کہ ایک بے مقصد خواب کے لیے ایسا جرم سرزد کرو۔'' ابن خالد بھی خاموش نہ رہ سکا۔

''تو پھر یہ بتایئے کہ قاضی صاحب کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ اپنے کسی دیرینہ خواب کی تکمیل کے لیے جعفر کو دھمکائے، لالچ دے اور پھر اس کی موروثی زمین پر زبردستی قبضہ کر لے۔'' وہب نے اطمینان سے جواب دیا۔

خلیفہ کا چہرہ طیش و برہمی کی آماجگاہ بن گیا۔ جنید کو اپنے قدموں تلے زمین کھسکتی محسوس ہونے لگی۔ اسے علم تھا کہ ہارون الرشید کے عتاب سے بچنا اب ممکن نہیں ہے۔ انجام کار جنید کو خلیفہ کے حکم پر قید خانے میں منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆

وہب کو وزیر ابن خالد اور خلیفہ ہارون الرشید کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا حج پر جانا اب ممکن نہیں رہا۔ ابن خالد کے مشوروں اور دلائل نے خلیفہ کو اپنا فیصلہ بدلنے پر قائل کر لیا تھا۔ دوسری اور اہم تر صورت یہ بھی تھی کہ خلیفہ نے خود ہی کسی مصلحت کے تحت اسے اپنے ساتھ لے جانے کا ذکر کیا تھا اور اب اس مصلحت کا طوق گلے سے اتار پھینکا تھا۔ ابو وہب کو بہرحال ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے معمولات جوں کے توں برقرار تھے۔ وہ اپنے چوبی گھوڑے پر سوار بغداد کی گلیوں میں گھومتا، عوام کے مسائل سے آگاہی حاصل کرتا۔

اپنی اسی گھڑسواری میں مشغول وہ بازار کرخ کی مسجد کے پاس چلا آیا۔ بازار کی چہل پہل اپنے معمول کے مطابق تھی۔ اس مسجد کے سامنے خزیم ابن عامر کی دکان تھی۔ خزیم ایک عطار تھا۔ وہب سے اس کی اچھی یاد اللہ تھی۔ اس کی دکان پر نظر پڑتے ہی وہب کو یاد آیا کہ وہ کئی دن سے ملاقات کے لیے مصر تھا۔ وہب اس کی دکان کی جانب بڑھا ہی تھا کہ بازار میں ہونے والے ایک تصادم نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

مسجد اور دکان کے اس درمیانی فاصلے میں ایک گدھا کسی شخص سے ٹکرا گیا تھا۔ اس ٹکر سے وہ شخص کوشش کے باوجود نہ سنبھل سکا اور اپنے سامان سمیت زمین بوس ہو گیا۔ اس انوکھے تصادم سے اردگرد موجود افراد بے حد محظوظ ہوئے اور بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔ وہب نے زمیں بوس شخص کو بغور دیکھا۔ وہ ''ابوعبیدہ مصری'' تھا جو کچھ عرصہ قبل ہی بازار کرخ کی اس مسجد میں پیش امام تعینات ہوا تھا۔ وہب کی اس سے کبھی براہ راست ملاقات تو نہ ہوئی تھی البتہ وہ اس کی شخصیت، آنکھوں کی مخصوص کیفیت اور چہرے پر ہمہ وقت چھائے رہنے والے پُرنخوت تاثرات کی ارتعاشی لہروں سے کبھی کلی طور پر مطمئن نہیں ہو پایا تھا۔ وہب کی جہاندیدہ نظریں ایک ہی پل میں بھانپ گئی تھیں کہ وہ ''عالم باعمل'' ہرگز نہیں اور اس کی موجودگی عوام میں شر کی حد تک منفی تاثر پھیلانے کا سبب بن سکتی ہے۔

عوام کے قہقہے ذرا تھمے تو وہب نے اپنے مخصوص انداز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں ہنس رہے ہو بھائیو! کیا کبھی دو ہم جنس چیزوں کا تصادم نہیں دیکھا؟''

اس کی بات پر تھمتے ہوئے قہقہوں کا طوفان ایک بار پھر ابل پڑا۔

''ہاں بھائیو! ٹھیک ہی تو کہا میں نے۔'' وہب معصومیت سے بولا۔ ''فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گدھے پر سامان کا بوجھ لدا ہے، دوسرے پر کتابوں کا۔''

اس بات پر حاضرین لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ ابوعبیدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی برداشت اور ظرف کا پیمانہ ایک ہی پل میں لبریز ہو گیا۔

''شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو! ایک عالم دین کا مذاق اڑاتے ہو۔ وائے ہو تم سب پر! جہنم کی آگ میں جلو گے۔'' وہ غصے سے بولا اور ہجوم کو دھکیلتے ہوئے زمین پر گری اپنی کتابیں اٹھانے لگا۔

وہب مسکراتے ہوئے اس کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اس کی ہنسی اور خوش باش انداز دیکھ کر کوئی بھی انداز

نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ یہاں آنے سے کچھ دیر قبل نماز کی ادائیگی میں کس قدر تڑپ اور عاجزی سے زاروقطار رو کر آیا ہے۔ عوام کے درمیان بے فکری سے قہقہے لگاتے اس شخص کو رزق میں کشادگی بھی عوام کی بھلائی اور فلاح کے لیے درکار تھی۔

''میں تم سے اچھی طرح نمٹ لوں گا اے بہلول! تمہیں اس گستاخی کی قیمت چکانی ہوگی۔'' ابوعبیدہ نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''ناراض کیوں ہوتے ہو ابوعبیدہ! تم میری بات پر خفا ہو یا اس ''راز'' کے سب کے سامنے آشکار ہونے پر؟'' وہب نے ایک اور چٹکی بھری۔

ابوعبیدہ تلملاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہب نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خزیم ابن عامر کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔

''کیسے ہو اے بہلول! بڑے دنوں بعد آنا ہوا۔'' خزیم نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''ہاں! میں اپنے گھوڑے کی تیمارداری کر رہا تھا۔ وہ بیمار ہو گیا تھا نا۔'' اس نے عصا کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ خزیم اس کے معصومیت بھرے انداز پر قہقہہ لگا اٹھا۔

''میں نے ابھی تمہیں ابوعبیدہ سے بات کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ کافی غصے میں نظر آرہا تھا۔'' خزیم نے ٹٹولا۔

''برتن بھرا ہوا ہو تو اس سے کوئی آواز نہیں آیا کرتی اے خزیم! خالی برتن ہی کھنکنایا کرتا ہے۔'' ابووہب سادگی سے بولا۔

''تم شاید ٹھیک ہی کہہ رہے ہو بہلول! میں بھی اس شخص کے بارے میں کچھ دنوں سے ایسی ہی الجھنوں کا شکار ہوں۔ جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ اس کی یہاں موجودگی اور ہمارے بچوں، نوجوانوں کو دی جانے والی تعلیم سودمند ثابت نہ ہوگی بلکہ الٹا اس سے نقصان ہی ہوگا۔'' خزیم نے محتاط نظروں سے قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا تو وہب چونک گیا۔

''ایسا کیا دیکھ لیا تم نے ابوعبیدہ میں؟'' اس نے اپنے تاثرات پر حسب سابق قابو پا کر سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''میں آغاز میں ابوعبیدہ کو بہت قابل، بزرگ اور مضبوط شخص سمجھتا تھا۔ اس کی اپنی دکان پر آمد کا انتظار بھی کرتا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک نورانی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کی یہاں آمد میرے لیے باعث خیروبرکت ہو گی۔ بلکہ مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ ابوعبیدہ سے اچھے تعلقات استوار کرنے میں قدرے لالچ بھی تھا۔ میں سوچتا تھا کہ بغداد میں کوئی عالم ایسا نہیں جسے خلیفہ کی سرپرستی اور عنایات حاصل نہ ہوں۔'' خزیم نے توقف کیا۔

''ہاں! بے شک خلیفہ ایک علم دوست انسان ہے۔ وہ عالموں اور اہل افراد کے لیے کافی خلوص سے مدد کرتا ہے۔'' وہب نے بھی ایمانداری سے اعتراف کیا۔

''بس یہی لالچ مجھے بھی تھا کہ میں ابوعبیدہ سے دوستانہ خوشگوار تعلقات قائم کر کے رکھوں گا تو شاید مستقبل قریب یا بعید میں مجھے بھی خلیفہ سے کہیں نہ کہیں کوئی منفعت مل جائے۔'' خزیم نے قدرے شرمندگی سے کہا۔ ''میں اپنی اسی سوچ اور ارادے میں پختہ بھی رہتا لیکن ابوعبیدہ کی چند ایک باتوں نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک عالم ہے۔ مجھ جیسا گنوار اور علم سے کوسوں دور شخص بھی یہ بات جانتا ہے کہ عالم باعمل ہونا چاہیے۔ اس کا کردار اور ظرف عام لوگوں سے مختلف ہونا چاہیے لیکن ابوعبیدہ اس کے برعکس ہے۔ اس نے مجھ سے شہد کا معجون خریدنے کی بات کر رکھی تھی۔ وہ مجھے بارہا یہ تو یاد کرواتا رہا کہ میں نے معجون دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے لیکن خریداری کے بعد پیسے دینے کا ذکر بھی نہ کیا۔ معجون پکڑا اور یہ جا وہ جا۔''

خزیم کے جلے بھنے انداز نے وہب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

''اب آگے کی سنو! کل کی ہی بات ہے کہ دکان پر گاہکوں کا ہجوم بڑھ گیا۔ اس سے نمٹتے ہوئے نماز کی جماعت کا وقت نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ابوعبیدہ میری دکان پر آیا اور لتاڑتے ہوئے کہنے لگا کہ میں نماز کے لیے مسجد کیوں نہیں آیا؟ میں نے اسے بتایا کہ گاہکوں میں مصروف ہو کر وقت نہ ملا۔ تو بولا نماز ہر کام سے افضل ہے۔ میں نے پھر عرض کی کہ اس بات کا مجھے بھی علم ہے۔ میں نے نماز ترک تو نہیں کی۔ ابھی یہیں دکان پر ہی ادا کر لوں گا۔ اس کے جواب میں وہ مجھے کم عقل اور جاہل کے خطابات دے کر بتانے لگا کہ باجماعت نماز کا ثواب انفرادی ادائیگی سے کتنے گنا زیادہ ہے۔''

''اس نے غلط بات تو نہیں کی تھی خزیم! بات تو بہرحال ٹھیک تھی۔'' وہب نے نرمی سے کہا۔

''میں نے کب کہا کہ غلط بولا۔'' خزیم ابن عامر نے متانت سے جواب دیا۔ ''اس کے انداز میں کچھ ایسا عنصر ہوتا ہے جو غیر معمولی سا لگتا ہے۔ اپنے سوا کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ علم تو عاجزی سکھاتا ہے نا وہب؟ یہ کیسا علم ہے جو دوسرے کو نیچا دکھا کر خوش ہوتا ہے۔ تم بھی اکثر کسی نہ کسی

بات پر ٹوک دیا کرتے ہو لیکن سچ بتاؤں تو تمہاری کہی ہوئی بات کتنی ہی تلخ ہو، بری نہیں لگتی۔'' خزیم بے بسی سے بولا۔

''اچھا! تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔'' وہب نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''میں تمہیں اسی لیے یہاں بلا رہا تھا بہلول! میں نے تم سے کچھ اور ضروری معاملات پر بھی بات کرنی تھی۔'' خزیم نے محتاط نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔

''کیسے معاملات؟ کیا ابوعبیدہ ہی کے متعلق؟'' وہ بھی متجسس ہوا۔

''ہاں! مجھے یقین ہے کہ تمہارے سوا کوئی اور میری الجھن دور نہیں کرسکتا۔ تم آج میرے ساتھ نماز پڑھنے چلنا۔ باقی معاملہ خود ہی تمہارے سامنے آجائے گا۔ اگر تم نے انکار کیا تو یہ نوجوان نسل اور بچے غلط سمت اختیار کرلیں گے۔'' اس کی خلوص بھری پیشکش اور اصرار پر وہب مزاحمت نہ کرسکا۔ اس نے مسجد چلنے کی ہامی بھرلی۔

جماعت کا وقت ہوا تو ابوعبیدہ نمازیوں کو صفیں درست کرنے کی ہدایات دینے لگا۔ اس کی نظر دوسری صف میں کھڑے وہب پر پڑی تو ناگواری سے پیشانی پر بل نمایاں ہوگئے۔

''یہاں ایسے لوگ کیوں دکھائی دے رہے ہیں جنہیں نماز کی حرمت کا کوئی احساس ہی نہیں۔'' وہ کروفر سے بولا۔

وہب اس کا اشارہ بھانپ کر مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ نے ابوعبیدہ کو مزید سلگا دیا۔

''تم یہاں سے ابھی اور اسی وقت باہر نکل جاؤ اے بہلول! تمہیں یہاں نماز پڑھنے کا کوئی حق نہیں۔'' اس کا تکبر نمایاں تر ہونے لگا۔

''ایسا نہ کہیں ابوعبیدہ!'' خزیم نے فوراً وہب کی حمایت کی۔ ''یہ ہماری ہی طرح نماز کی ادائیگی کرنا جانتا ہے۔ آپ اس کے متعلق غلط قیاس کررہے ہیں۔''

''ابن عامر بالکل درست کہہ رہا ہے امام صاحب! وہب نماز اور ارکان نماز سے مکمل واقف ہے۔'' نمازیوں میں سے ایک اور شخص نے بھی اس کی حمایت میں حصہ لیا۔

دھیرے دھیرے دیگر افراد بھی اس کی تائید کرنے لگے۔ ابوعبیدہ اکثریت کی رائے دیکھ کر خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے نماز مکمل کروائی۔ اس کے ذہن میں بہلول کو نیچا دکھانے کے لیے حکمتِ عملی ادھم مچا رہی تھی۔

☆☆☆

خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ماحول خوشگوار تھا۔ خلیفہ اپنے وزراء کے ساتھ موجود تھا۔ وہب کافی روز سے دربار نہیں آیا تھا۔ خلیفہ کو کہیں نہ کہیں اس کی کمی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے مخصوص انداز، دلائل اور بذلہ سنجی میں تلخیاں آشکار کرنے کا عادی ہو چلا تھا تاہم اس خلش اور کیفیات پر قابو پاتے ہوئے خلیفہ نے اپنی توجہ دربار میں شعراء پر مرکوز کردی۔ اس کی سخاوت، علم دوستی اور فیاضی نے بغداد میں فنونِ لطیفہ کو بے حد فروغ دیا تھا۔ شعراء بغداد کی خوبیاں اور رعنائیاں، خلیفہ کی فتوحات اور صلاحیتوں کو اشعار کی صورت میں بیان کیا کرتے۔ ہارون الرشید کی فرمائش پر اس کے پسندیدہ اشعار ایک بار پھر دہرائے جانے لگے۔

رخصت کردیا۔ اس کے مزاج پر خاموشی اور تفکر کی دبیز دھند سی طاری معلوم ہو رہی تھی۔

''امیرالمومنین! آپ اتنے افسردہ کیوں معلوم ہو رہے ہیں؟'' ابن خالد نے پوچھا۔

''مجھے بھی علم نہیں۔ ان کامیابیوں اور خوشحالی کے باوجود دل کلی طور پر مطمئن نہیں رہ پاتا۔ عوام کے مسائل کا حل، راتوں کا گشت، عوام کی بھلائی سب کچھ کرنے کے باوجود کہیں کوئی کمی، خلش سی محسوس ہوتی ہے۔'' خلیفہ نے اپنے جذبات کو گویائی دی۔

ابن خالد سوچتی نظروں سے اپنے خلیفہ کو دیکھنے لگا جس کی سلطنت بخارا سے دیلم اور مصر سے خراسان تک وسیع ہو چکی تھی۔ اس وسعت کے باوجود دل میں خلش بیدار ہونا اس کی روشن ضمیری کی دلیل تھی۔

''ایسا مت سوچیں امیرالمومنین! آپ کی انتظامی صلاحیتوں میں کہیں کوئی سقم نہیں۔'' اس نے تسلی دی۔ ''اس تخت کے آپ ہی بہترین حقدار ہیں۔''

''یہ تخت......'' ہارون الرشید افسردگی سے مسکرایا۔ ''اس تخت سے بڑھ کر بے وفا تو کوئی دیکھا ہی نہیں۔ مجھ سے قبل اس کے حقدار کوئی اور تھے۔ اپنی اپنی جگہ وہ بھی بہترین تھے۔ میرے بعد آنے والے بھی بہترین ہی ہوں گے لیکن یہ تخت صرف صلاحیتیں نہیں مانگتا ابن خالد! اس کے منہ کو خون لگ چکا ہے۔ یہ خونریزی بھی مانگتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ یہ خونریزی مزید کتنی تباہی برپا کرے گی؟'' وہ اپنی ہی لے میں کہتا چلا گیا۔

ابن خالد کے پاس اس آفاقی سچائی کے جواب میں کہنے کے لیے کوئی تسلی یا دلاسا نہیں تھا۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد ہارون الرشید نے یکدم کہا۔

''بازار کرخ کی کیا صورت حال ہے؟ عوام کو کسی قسم
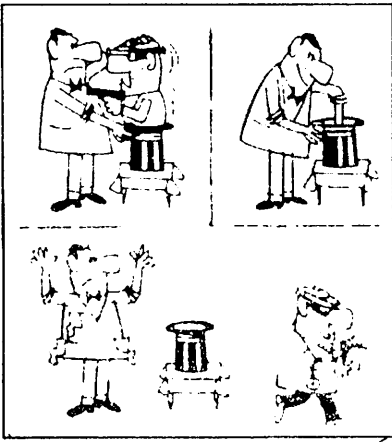
کے مسائل کا سامنا تو نہیں؟''

''عوام بالکل خوش اور مطمئن ہے امیر المومنین! ان دنوں کاروبار ویسے بھی عروج پر ہے۔''

''داروغہ سے کہنا وہاں نگرانی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ برتے۔ عوامی معاملات میں مجھے کوئی بھی غیر ذمے داری درکار نہیں ہے۔'' اس نے تنبیہ کی۔

''سعد اپنے فرائض تندہی سے نبھا رہا ہے۔'' ابن خالد نے بتایا۔

''بازار کرخ کی مسجد میں آنے والے نئے عالم کی کیا خبر ہے؟'' ہارون کو یاد آیا۔ اس نے ابن خالد کو گزشتہ روز رقم کی تھیلی دے کر بھیجا تھا۔ وہ اپنے دور میں کسی بھی عالم یا دانشور کو مالی منفعت سے محروم نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

''میں وہ تھیلی واپس لے آیا ہوں۔'' ابن خالد نے سر جھکا کر بتایا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے ابو عبیدہ کے متعلق جیسا گمان کیا تھا، وہ بالکل ویسا نہیں ہے۔ مجھے اس شخص سے تعصب اور کم ظرفی کی بو آتی ہے امیر المومنین!''

ابن خالد نے اسے گزشتہ روز مسجد میں وہب اور ابو عبیدہ کی تلخ کلامی کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی اس وقت غیر نمایاں سے انداز میں مسجد میں ہی موجود تھا۔ ہارون الرشید یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہا اور دوبارہ گویا ہوا۔

''رقم اس تک پہنچا دو ابن خالد! میرے عہد میں ہر دانشور کو نوازا جانا چاہیے۔''

ابن خالد نے سر تسلیم خم کیا اور بازار کرخ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ نمازیوں کی کثیر تعداد مسجد کے باہر ہی موجود تھی۔ ابن خالد نے آج اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کا کوئی تردد نہیں کیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسجد میں جانے والے نمازی احتراماً راستہ دیتے ایک جانب ہونے لگے۔ اختتامی زینوں پر ایک بوڑھا آدمی اس کے سامنے چلا آیا۔

''میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں محترم وزیر!'' اس نے ابن خالد کو اعتماد سے مخاطب کیا۔ سر کے بال بڑھے ہوئے، سفید بے ترتیب ریش، اندر دھنسی آنکھیں، کمزور وجود لیے وہ شخص مکمل طور پر افلاک زدہ دکھائی دیتا تھا۔

''کہیے! میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' ابن خالد نے دریافت کیا۔

''میں ایک لاوارث انسان ہوں۔ تنہا رہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے لیے کوئی وظیفہ مقرر کر دیا جائے یا امداد کا کوئی اور بندوبست کیا جائے۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

اسی لمحے ابن خالد کو ابو عبیدہ دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ذہن میں پنپنے والے فوری خیال کے تحت ابو عبیدہ کو خلیفہ کی جانب سے دیا گیا ''ہدیہ'' تھما دیا۔ ابو عبیدہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ہمارے خلیفہ ایک عظیم الشان حکمران ہیں۔ مسلم امت کو ایسا فرماں روا بہت خوش نصیبی سے میسر آیا ہے۔ پروردگار انہیں ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ ان کی فتوحات ہماری خوش بختی ہیں۔'' ابو عبیدہ کی زبان فراٹے بھرنے لگی۔

ابن خالد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اس شخص سے ایسے ہی ردعمل کی توقع کر رہا تھا۔ اس کے بعد ابن خالد نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق اسے بوڑھے شخص کے دوبدو کر کے قدرے الجھن میں دریافت کیا۔

''یہ شخص خلیفہ سے مالی مدد کا خواستگار ہے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے ابو عبیدہ؟''

''اے بدبخت انسان! تجھے ایسا سوچتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔ تیرے ہاتھ پاؤں ابھی سلامت ہیں۔ صحت بھی اچھی خاصی ہے۔ کیا تو نے وہ فرمان نہیں سنا کہ محنت کر کے کمانے والا اللہ کا دوست ہے۔ تو ابھی کئی سال تک کمانے کی سکت رکھتا ہے۔ اپنے زور بازو سے کما کر کیوں نہیں کھاتا؟'' ابو عبیدہ نے تھیلی اپنی جیب میں چھپاتے ہوئے اسے پھٹکار دیا۔

ابن خالد کی آنکھوں میں ناپسندیدگی کروٹ لینے لگی۔ یہ شخص اس کے امتحان میں بری طرح ناکام ہو گیا تھا تاہم اس کے کچھ بھی کہنے سے پہلے اسے ایک کونے سے وہب کی

مخصوص کھلکھلاتی آواز سنائی دی۔
''خود خلیفہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے دوسروں کو محنت کی تلقین کیسے کرسکتے ہیں؟ کیا تو نے وہ فرمان نہیں سنا ابوعبیدہ! اے ایمان والو! تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟''
وہب کے ان الفاظ' انداز اور دلیل کی پختگی نے ابوعبیدہ کو سلگا کر رکھ دیا۔ وہ اسے سخت جواب دینا چاہتا تھا لیکن ابن خالد کی موجودگی اور عوام میں بہلول کے تاثر کی بدولت خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔
''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتا اے بہلول! عالم اور احمق کبھی یکساں نہیں ہوسکتے۔ تمہارے ساتھ وقت ضائع کرنا میری شان اور منصب کے خلاف ہے۔'' اس نے نخوت سے کہا اور جماعت کروانے کے لیے اندر بڑھ گیا۔ آج اسے نمازیوں اور اپنے شاگردوں کو وعظ بھی دینا تھا۔

☆☆☆

رات کی سیاہی بغداد پر غالب تھی۔ وہب اپنے گھر کے دروازے پر موجود کسی گہری سوچ میں مبتلا تھا۔ اسے دروازے کے آس پاس کچھ غیر معمولی تاثر محسوس ہو رہا تھا۔
''ارے بہلول! تم کب آئے؟'' ایک پڑوسی نے نظر پڑتے ہی اسے مخاطب کیا۔
''میری غیر موجودگی میں یہاں کوئی آیا تھا کیا؟'' ابووہب نے اس سے دریافت کیا۔
''ہاں! داروغہ تم سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ بے چارہ کچھ دیر تمہارا انتظار کرتا رہا پھر خود ہی چلا گیا۔''
اس انکشاف نے وہب کے چہرے پر سنجیدگی اور تشویش طاری کردی۔ وہ بلاتاخیر گھر کے اکلوتے کمرے میں داخل ہوگیا جہاں اس کی توقعات کے عین مطابق سامان بکھرا پڑا تھا۔ وہب صورتِ حال سمجھ گیا۔ سعد یقیناً اس کے گھر اور سامان کی تلاشی کے لیے ہی آیا تھا۔ اس نے اپنے پوشیدہ سامان کا جائزہ لیا اور اسے اپنی جگہ موجود پا کر مطمئن ہوگیا۔ اس کے ذہن میں مزید احتیاط کی سوچ ڈوب اور ابھر رہی تھی تاہم یہ سوچیں زیادہ دیر تک غالب نہ رہ سکیں دماغ میں اس مفلوک الحال بوڑھے کے آنسو جاگر ہوگئے جسے مسجد میں امداد کے لیے مایوس پا کر اس نے اپنی دن بھر کی کمائی اس کے گھر پہنچا دی تھی۔ وہ رقم اپنے ہاتھ میں لے کر بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔
''تم اگر اسی طرح ہم جیسوں کی مدد کرتے رہے تو حکمرانوں کی جگہ ہمارے دل کے فاتح بن جاؤ گے اے بہلول! یہ جن کا کام ہے انہی کو کرنے دو۔'' اس نے کہا تھا۔
''ارے! یہ تو قرض ہے جو میرے والد نے تم سے لیا تھا۔ میں آج چکانے کے قابل ہوا ہوں۔'' وہب قدرے عجلت میں کہہ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔
اس عجلت کی بھی بہرحال ایک وجہ تھی۔ اس نے مسجد میں ابوعبیدہ کے وعظ و درس میں چند ایسی باتیں سنی تھیں جس کے بعد وہ شدید غم و غصے میں مبتلا ہوگیا۔
''خزیم ابن عامر ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اس شخص کی یہاں موجودگی سراسر نقصان دہ ہے۔ اگر اسے خلیفہ کی مزید پشت پناہی حاصل ہوگئی تو یہ بغداد میں نظریاتی تباہی بھی برپا کر سکتا ہے۔ اسے ایک سبق چکھانے کا وقت آگیا ہے۔ اگر اس کی لگامیں ابھی نہ کھینچیں تو بہت مسائل کھڑے ہوسکتے ہیں۔'' اس نے اپنا عمامہ ایک جانب رکھتے ہوئے خودکلامی کی۔ اس کی پیشانی کے بل' چہرے کی تشویش اور تفکرات یکدم ہی پُرسکون ہوگئے۔ اسے ابوعبیدہ کو سبق چکھانے کا ایک بہترین خیال سوجھ گیا تھا۔
''اب ہارون الرشید اور اس کا وزیر بھی دیکھ لیں گے کہ وہ ایک غلط شخص کو نواز رہے تھے۔'' اس نے اپنے منصوبے کی ''تیاری'' کرتے ہوئے سوچا۔
وہب کو یقین تھا کہ اس کے مجوزہ قدم سے ابوعبیدہ خلیفہ کے سامنے پیشی کو ترجیح دے گا۔ وہ مادیت پرست اور جاہ طلب انسان تھا اس لیے خلیفہ کے دربار میں اپنی مظلومیت ثابت کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دے گا۔ ابووہب بھی یہی چاہتا تھا اور اس کی یہ خواہش اگلے روز ہی پوری ہوگئی۔

☆☆☆

''مجھے تمہاری اس حرکت پر سخت افسوس ہے وہب! یہ تم نے کیا کردیا؟ آخر کیا سوچ کر تم نے ایسی حرکت کی؟'' خلیفہ کی ناراضگی اور ترشی پر ابووہب مسکرا اٹھا۔ وہ اس وقت دربار میں موجود تھا۔
''آپ نے دیکھا..... کیا آپ نے دیکھا امیرالمومنین کہ اس شخص کو اپنی حرکت پر کوئی پشیمانی نہیں۔ یہ دربارِ شاہی کے آداب کے برعکس اپنے جرم پر مسکرا رہا ہے۔'' ابوعبیدہ نے بلبلا کر کہا۔
خلیفہ کا تاسف مزید گہرا ہوگیا۔ وہب کی دربار میں طلبی ابوعبیدہ کی درخواست پر ہی ہوئی تھی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہب نے مٹی کے ڈھیلے میں پتھر ڈال کر اس کی آنکھ پر دے مارا ہے۔ اس ضرب سے ابوعبیدہ کی بائیں آنکھ خاصی مجروح ہوئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھ کپڑے کی پٹی

سے لپیٹ رکھی تھی۔ چہرے پر درد اور اذیت گویا ثبت ہو چکی تھی۔

''تم اپنی اس حرکت کی کیا توجیہہ پیش کرو گے وہب؟'' خلیفہ نے سختی سے پوچھا۔

''میں اس سے مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہوں اے خلیفہ! میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اسی کے عقائد اور نظریات کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔'' وہب نے معصومیت سے جواب دیا۔

''میرے کن نظریات میں اس طرح کے حملے کی ترغیب ہے اے بہلول! تم امیر المومنین کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' ابو عبیدہ ایک بار پھر بلبلایا۔

''کیا تم نے مسجد میں اپنے شاگردوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ ابلیس جہنم میں نہیں جلے گا۔'' وہب نے پوچھا۔

''ہاں! میں نے بالکل ایسا کہا تھا کیونکہ ابلیس ناری مخلوق ہے۔ نار کو نار کیسے جلا سکتی ہے؟'' ابو عبیدہ نے اپنے مخصوص کروفر سے جواب دیا۔

''اگر تمہارا یہ نظریہ درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر تمہاری خلیفہ سے یہ شکایت ہی باطل ہے۔ تم خاک سے بنے انسان ہو۔ تمہیں مٹی کا ڈھیلا کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے؟'' وہب کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں اے بہلول! اس درد اور اذیت سے مجھے رات بھر نیند نہیں آسکی۔'' وہ کراہا۔

''درد...... کیسا درد...... کہاں ہے درد؟ ذرا مجھے دکھاؤ۔'' وہب نے مسکرا کر کہا۔

''درد نظر آتا ہے کیا اے بہلول؟'' ابو عبیدہ کی کیفیت دیدنی تھی۔

''تو جو چیز نظر نہیں آتی' جسے چھوا نہیں جا سکتا اس کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ تم نے اپنے شاگردوں سے یہی کہا تھا نا کہ جنت اور جہنم کا وجود اس لیے ناقابلِ فہم ہے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے اور نہ ہی ہم انہیں چھو سکتے ہیں۔'' وہب نے ایک اور چوٹ کی۔ ابو عبیدہ کی رنگت متغیر ہوگئی۔

''اس کے باوجود مجھے ڈھیلا مارنے کا تمہیں کوئی اختیار نہیں ہے۔ تم نے یہ جرم تو کیا ہے اور خود ہی تسلیم کر رہے ہو کہ دانستہ طور پر کیا ہے۔'' ابو عبیدہ اب بھی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

''میں نے تو یہ کام بھی تمہارے نظریے سے متاثر ہو کر ہی کیا تھا۔'' وہب نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''بھول گئے کہ تم ہی نے تو کہا تھا کائنات میں انسان مختار نہیں بلکہ مجبور ہوتا ہے...... تو ایک مجبور انسان پر گناہ یا جرم کی کیسی سرزنش؟'' وہب کی اس دلیل نے ابو عبیدہ کو چاروں شانے چت کر دیا۔

ابن خالد اور ہارون الرشید کے چہروں پر ستائش و تحسین ابھر آئی۔ وہ اس سارے معاملے کی حقیقت سمجھ گئے تھے۔ ہارون الرشید کی نظروں سے جھلکتے ایک چبھتے ہوئے سوال کا عکس دیکھ کر وہب نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہنہناتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

خلیفہ ہارون الرشید حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ امورِ سلطنت یحییٰ اور جعفر ہی کے ذمے تھے۔ وہب کے معمولات بھی جوں کے توں برقرار تھے۔ وہ بغداد کے گلی کوچوں میں گھڑ سواری کرتا' عوام کے مسائل سے واقف ہوتا اور از خود یہ مسائل حل بھی کر دیا کرتا۔ اسی مصروفیت میں ایک روز اس کی ملاقات ابن جابر بغدادی سے ہوئی۔ وہ ایک پھل فروش تھا۔ اس کی دکان بازار کرخ میں ہی تھی۔ پہلے پہل دکان پر گاہکوں کی آمد اور پھلوں کی فروخت نہ ہونے کے برابر ہی ہوتی۔ قیمتِ خرید ہی بہ مشکل پوری ہو پاتی تھی۔ وہب نے اسے دکانداری اور اپنے اسباب کو بہترین انداز میں پیش کرنے کے چند کامیاب گر بتائے جس کے بعد ابن جابر کی قیمتِ فروخت کا تناسب حیران کن طور پر تبدیل ہوتا گیا۔ گھر میں بھی خوشحالی در آئی۔

وہب کو اس پھل فروش کی یہ عادت اچھی لگتی تھی کہ وہ اپنے پڑوس میں رہائش پذیر بیوہ سے حسنِ خلق سے پیش آتا' اپنی اہلیہ کے توسط سے اسے بھی پھل بھجوا دیتا۔ ابن جابر کے حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ وہ خوش و سرشار رہنے لگا تاہم اس وقت بے حد پریشان اور نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ابن جابر؟ اتنے پریشان تو تم اس وقت بھی نظر نہ آتے تھے جب غربت آسیب بن کر تم سے لپٹی تھی۔''

''کیا بتاؤں اے بہلول! بس یہ سمجھ لو کہ وہی غربت ایک بار پھر اپنے پنجوں میں دبوچنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔'' ابن جابر نے افسردگی سے بتایا۔

''کیوں؟ ایسا کیا ہو گیا بھلا؟'' وہب کو اچنبھا ہوا۔

''میری دکان میں دو بار چوری ہوئی ہے۔ صندوق سے پیسے نکال کر لے گیا کوئی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ صندوق کی چابی تو تمہارے پاس ہی ہوتی ہے نا؟''

''ہاں بالکل! میرے پاس ہی ہوتی ہے۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آتی کہ ایسا کیسے ممکن ہو گیا...... اور ایک بار بھی نہیں دو بار۔'' ابن جابر رو دینے کے قریب تھا۔

''کیا تمہاری دکان پر ایسا کوئی گاہک آیا تھا جس کے سامنے تم نے صندوق میں پیسے رکھے یا نکالے ہوں؟'' وہب نے سر کھجایا۔

ابن جابر سوچ میں پڑ گیا اور کچھ لمحوں بعد جوش سے بولا۔

''ہاں! ایک گاہک ایسا آیا تو تھا۔ وہ دکان کے سارے پھل خریدنے کا خواہشمند تھا۔ اسی کے دیے گئے پیسے صندوق میں رکھے تو وہ قفل کی مضبوطی اور بناوٹ سے بہت متاثر ہوا۔''

''پھر اس نے تم سے یہ پوچھا ہوگا کہ قفل کہاں سے بنوایا؟ خود بھی ایسا ہی کوئی صندوق بنوانے کی خواہش کا اظہار کیا ہوگا۔'' وہب نے کہا۔

''ہاں! ایسا ہی ہوا تھا۔ چابی بھی ایک سی بنوائی۔ اوہ خدایا! چور یقیناً وہی تھا لیکن اب میں اسے کہاں تلاش کروں؟ وہ تو بغداد کا رہائشی تھا ہی نہیں۔'' ابن جابر نے سر پیٹا اور وہب کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بہلول! تم میری مدد کرو خدارا! صرف تم ہی اس مسئلے کا حل نکال سکتے ہو۔''

''مجھے اس سے ملاقات کی تفصیل بتاؤ۔ شاید کوئی راہ نکل آئے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''وہ ایک نوجوان تاجر تھا۔ بازار کرخ میں پھرتا پھراتا میرے پاس آیا تھا۔ میری دکان کے خوشنما پھل اسے بہت بھائے۔ کہنے لگا ان تمام پھلوں کا سودا طے کرنا چاہتا ہے۔ اس کے آس پاس کافی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے پوچھا تم تاجر سے زیادہ قصاب یا شیر فروش لگتے ہو جو اس طرح مکھیاں لباس پر منڈلا رہی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ قصابوں سے میرا دور دور کا کوئی واسطہ نہیں۔ میں ایک تاجر ہوں۔ دو دریا عبور کر کے یہاں آیا ہوں۔ ارے ہاں! مجھے یاد آیا بہلول! تم بھی تو اس وقت وہاں سے گزر رہے تھے۔ اس نے تمہارے ہاتھ میں موجود ٹوکریاں دیکھ کر پوچھا تھا کہ ان کنستروں کی کتنی قیمت لے لیتے ہو؟'' ابن جابر نے اسے یاددہانی کروائی۔

''ہاں! کچھ کچھ ذہن میں تو ہے۔ اس سوال کے بعد وہ یکدم بولا تھا کہ معاف کرنا میرے ذہن میں ملعون کنستر ہی سوار ہو گئے ہیں۔ اس لیے زبان پھسل گئی۔ ورنہ آنکھیں اچھا خاصا دیکھ رہی ہیں کہ یہ ٹوکریاں ہیں۔'' وہب نے یادداشت پر زور دیا۔

''ہاں بالکل وہی! لیکن اسے تلاش کیسے کریں گے؟ میری تو جمع پونجی ہی لٹ گئی۔'' ابن جابر نے دہائی دی۔

وہب گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ لمحے سوچ بچار کے بعد اس نے ابن جابر سے کہا۔

''اس نے کہا تھا کہ دو دریا عبور کر کے آیا ہے۔ یعنی دجلہ اور فرات۔ اس کا مطلب ہے وہ بصرہ کا رہائشی ہے۔''

''بصرہ تو اتنا بڑا شہر ہے بہلول۔ بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کی بات کر رہے ہو تم۔'' ابن جابر جھنجلایا۔

''اس نے قصاب ہونے کی بات پر ردعمل دیا تھا یعنی وہ ایک قصاب ہی تھا۔ میری ٹوکریوں کو کنستر بنا دیا۔ اس طرح کے کنستر سرکہ فروخت کرنے والوں کے پاس ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کسی ایسے علاقے میں رہتا ہے جہاں قریب ہی سرکہ فروش بھی رہائش پذیر ہیں اور دونوں فریقین میں خاصی چپقلش پائی جاتی ہے۔ تمہاری تلاش کا دائرہ صرف ایسے علاقوں تک ہی محدود رہے گا جہاں قصاب اور سرکہ فروش موجود ہوں اور اگر باہمی چپقلش والے فریقین تلاش کرو تو یہ دائرہ مزید تنگ ہو جائے گا۔'' وہب نے بھرپور تجزیہ کیا۔

ابن جابر نے اس کی ہدایات کی روشنی میں کچھ ہی عرصے میں اپنا مجرم تلاش کر کے رقم بھی بازیاب کروالی۔ رقم ہاتھ میں لیتے ہی اس کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

''کیا ایسا ذہین زیرک اور باریک بین شخص احمق یا پاگل ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی احمق یوں بیٹھے بٹھائے مجرم کی نشاندہی کر سکتا ہے؟ وہب واقعی بہلول ہے یا یہ کوئی بہروپ ہے؟''

ابن جابر کے دماغ میں سوچیں اودھم مچاتی رہیں۔ ان سوچوں کا کہیں کوئی کنارہ اور حل نہ تھا۔

☆☆☆

خلیفہ ہارون الرشید حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹ چکا تھا۔ واپسی کے بعد کچھ عرصہ تو اہم عہدیداروں اور اہل خانہ سے ملاقاتوں میں بیت گیا۔ حکومتی معاملات بڑے ہموار انداز میں رواں تھے۔ اسی دوران خلیفہ کو خبر ملی کہ روم کی ملکہ ''رینی'' (آئرنی) کو معزول کر دیا گیا ہے۔ ملکہ رینی ہارون کی باج گزار تھی۔ روم سے جزیہ حاصل کیا جاتا تھا۔ ملکہ کی معزولی کے بعد دربار میں یہ معاملہ گردش کرنے لگا کہ روم کے معاملات کو کیسے رواں رکھا جائے۔

کچھ مشیروں کا خیال تھا کہ ملکہ کا جانشین ''نقفوز'' (نیسی فور) بہت متکبر حکمران ہے۔ اس سے طاقت کا مظاہرہ

کر کے نمٹنا ہی بہتر ہوگا۔ دیگر مشیروں کی رائے البتہ یہ تھی کہ انتظار کی حکمتِ عملی زیادہ بہتر ہے۔ اسے خلیفہ کی جانب سے خراج ادا کرتے رہنے کا مطالبہ پیش کیا جائے۔ پھر اس کے کسی جواب کے بعد ہی جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ ہارون الرشید نے بھی اس معاملے پر غور و فکر کے بعد مؤخر الذکر رائے تسلیم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نقفوذ کو شاہی فرمان بھیج دیا گیا۔ اسے یقین تھا کہ نقفوذ اپنے والدین کی طرح ہی پسپائی، مصلحت اور کمزوری کا مظاہرہ کرے گا لیکن نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ کچھ روز بعد ہی وزیر ابن ربیع اس کے پاس نقفوذ کا خط لیے چلا آیا۔ ہارون الرشید نے اسے نامہ کھول کر پڑھنے کا حکم دیا۔

ابن ربیع نے عبارت پر سرسری نظر دوڑائی تو اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔

"خاموش کیوں ہوگئے ہو ابن ربیع؟ کیا لکھا ہے اس نقفوذ نے؟" ہارون نے سختی سے پوچھا۔

ابن ربیع نے اپنا خشک ہوتا حلق لعاب سے تر کیا اور پھنسی ہوئی آواز میں عبارت پڑھنے لگا۔

"بادشاہِ روم نقفوذ کی طرف سے عرب کے بادشاہ ہارون کے نام!

امابعد

میری والدہ ملکہ روم معزول ہو چکی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے تمہیں رخ کی جگہ استعمال کرتی تھی۔ اپنی خلقی کمزوری اور ضعفِ عقلی کے باعث تمہیں خراج دیا کرتی تھی حالانکہ خراج تو تمہیں اسے دینا چاہیے تھا۔ اس کی ادا شدہ تمہارے پاس امانت ہے۔ میرا یہ خط دیکھتے ہی ہماری وہ جمع شدہ رقم فوراً واپس بھیج دو بصورتِ دیگر فیصلہ تلوار سے ہوگا۔"

"اس حیوان نما انسان کی یہ مجال! وہ ہم سے جزیہ کی رقم واپس مانگے گا۔" ہارون طیش سے بولا۔ ابن ربیع سراسیمگی سے اسے دیکھنے لگا۔

"قلم اور دوات تھامو ابن ربیع! اس خط کا جواب اسی نامے کی پشت پر لکھ کر بھیجا جائے گا۔"

"جو حکم امیر المومنین!" ابن ربیع نے سر جھکایا اور قلم دوات لیے بیٹھ گیا، خلیفہ اسے عبارت کا متن لکھوانے لگا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

امیر المومنین ہارون الرشید کی جانب سے سگِ روم نقفوذ کو علم ہو کہ اس فرزند کافر کا خط پڑھ لیا گیا ہے۔ اس خط کا جواب تجھے بہت جلد عملی صورت میں مل جائے گا۔"

یہ جواب روم ارسال کرنے کے بعد ہارون الرشید نے اپنی فوج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ اس کا غضب شدید تھا، ایشیائے کوچک پر حملہ کر کے "ہرقلہ" فتح کیا۔ اس حملے میں بے شمار آبادیاں تاراج ہوئیں۔ نقفوذ میں اس جم غفیر کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ اسے خراج دے کر صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ اس وقت تک سرما بھی زور پکڑ چکا تھا۔ مسلم فوج کے لیے ایشیائے کوچک کی سردی برداشت کرنا مشکل تھا۔ ان کے لوٹتے ہی نقفوذ اپنے پیمان سے مکر گیا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ ہارون کو راستے میں ہی اس بات کی خبر مل گئی۔ اس کا طیش و غضب ایک نئی شدت سے عود آیا۔ اس نے فوج کو پلٹنے کا حکم دے دیا۔

اس یورش نے نقفوذ کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ ہارون الرشید کی فوج نے ایشیائے کوچک پامال کر دیا۔ نقفوذ نے مقابلے کے باوجود اپنے چالیس ہزار سپاہیوں کا نقصان برداشت کر کے شکست کی ہزیمت اٹھائی۔ اس کے بعد ہارون شام کے معاملات کی طرف متوجہ ہوگیا جو رومیوں کا ایک بہت نازک مور چا تھا۔ مسلم تسلط کے بعد مسلمانوں نے اسی کو مرکز قرار دے کر خشکی کے راستے اناطولیہ کی جانب پیش قدمی کر کے قونیہ و نگورہ پر بھی قابض ہوئے تھے۔ رومی شام پر دوبارہ تسلط جمانے کے لیے بہت بے تاب تھے۔ یہ تسلط براستہ خشکی تو ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اناطولیہ میں قونیہ تک مسلمانوں کا قبضہ تھا۔

رومیوں کے لیے واحد راستہ بحر روم کی جانب سے شام کے ساحل پر بحری حملے تھے۔ ہارون نے اسی خطرے کو مٹانے کے لیے شام کے ساحلی علاقوں پر فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ قلعے تعمیر کروائے۔ طرطوس، عین زربہ اور ہارونیہ آباد کیا اور مصیصہ کو ایک نئے سرے سے مستحکم کر کے ان شہروں میں مسلم عوام کو آباد کرتا رہا۔ ولسہ کے شورش پسندوں کی سرگرمیوں پر انہیں جلاوطن کر کے قابو پایا۔ ان عظیم الشان فتوحات سے وہ بے حد خوش تھا۔ اس مسرت و سرشاری میں اسے اندازہ ہی کہاں ہوسکتا تھا کہ بغداد کے ایک مخصوص طبقے میں غربت و استحصال اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگے ہیں اور عوام بنیادی ضروریات کے لیے بھی بری طرح ترس رہے ہیں۔ عبید لکڑ ہارے کا تعلق بھی اسی استحصال زدہ طبقے کے ایک مجبور گھرانے سے تھا۔

☆☆☆

عبید ایک خوش شکل، کم گو اور محنتی شخص تھا۔ غربت اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ جی جان سے لکڑیاں کاٹ کر انہیں کرخ کے بازار میں فروخت کرتا لیکن آمدنی میں ترقی

نہ ہونے کے برابر ہی رہتی۔ اس کی فروخت شدہ لکڑیاں درہم کا دسواں حصہ بھی بہ مشکل حاصل کر پاتیں۔ عبید کی اہلیہ کا نام رابعہ تھا۔ وہ ایک حسین اور دلکش عورت تھی لیکن غربت نے یہ دلکشی بھی گہنا رکھی تھی۔ قدرت نے انہیں ایک بیٹے فرید سے بھی نوازا۔ سات' آٹھ سالہ فرید دل موہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی خواہشات اسی کے مانند معصوم اور بے ضرر سی تھیں۔ اوائل بچپن میں کھائے جانے والے کبابوں کا ذائقہ آج بھی نوکِ زباں پر مچلتا تھا۔

قسمت کی ستم ظریفی ہی تھی عبید کو دوبارہ اتنی آمدن ہی حاصل نہ ہوسکی کہ وہ اپنے بیٹے کی یہ خواہش پوری کرسکتا۔ کباب تو درکناران کے دسترخوان پر کھانے کے بنیادی لوازمات بھی کم ہوتے جارہے تھے۔ ایک روز فرید روٹی کے ساتھ حسبِ سابق پتلا شوربا موجود نہ پاکر حیران رہ گیا۔

''آج سالن کہاں ہے والدہ؟'' اس نے رابعہ سے دریافت کیا۔

''سالن نہیں بن سکا میرے بچے! آج پانی کے ساتھ روٹی کھالو'' رابعہ نے دل کڑا کے بیٹے سے کہا۔ فرید حیرت و بے بسی سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس سے تو بہتر ہے کہ میں خالی روٹی ہی کھالوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

رابعہ بیٹے کی اس کیفیت پر مزید شکستگی محسوس کرنے لگی۔ وہ اس ننھے سے بچے کو یہ معاشرتی تفاوت سمجھانے سے قاصر تھی کہ اس دور میں امارت کا ایک جانب یہ عالم تھا کہ صاحبِ حیثیت ہزاروں دینار کی کنیزیں خرید لیا کرتے اور دوسری سمت غریب گوشت کی چند بوٹیاں خریدنے سے قاصر تھا۔ فرید افسردگی سے سر نیہوڑائے روٹی کے لقمے کترتا رہا۔ رابعہ کو علم تھا کہ فرید کو پڑوس میں رہائش پذیر افراد کے پکائے گئے مرغن کھانوں کی اشتہا بے چین رکھتی ہے۔ کباب اور گوشت کھانا اس بچے کی زندگی میں بہت بڑی حسرت بن چکا تھا۔ ایسی حسرت جس کا مداوا رابعہ کی ممتا اور ڈھیروں محبت بھی نہ کر پا رہی تھی۔

''اچھا! تم آزردہ نہ ہو میرے بچے! تمہارے بابا آج لکڑیاں لینے گئے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ آج وہ ضرور کوئی خوشخبری لائیں گے۔'' رابعہ نے اس سے زیادہ خود کو دلاسا دیا۔

فرید مایوس نظروں سے ماں کو دیکھتا رہا۔ رابعہ شدت سے عبید کی کمائی میں بہتری کی دعائیں کرنے لگی۔ اس وقت شاید قبولیت کا بھی وقت نہ تھا۔ اس کی خیر خواہی' نیک تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود عبید ایک آزار میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس آزار کا نام داروغہ سعد تھا۔

☆☆☆

عبید لکڑیاں اکٹھی کرنے کے بعد ان کا گٹھا بنائے بازار کی جانب گامزن تھا۔ حسبِ سابق اس کی یہی کوشش تھی کہ لکڑیاں بہتر نرخ پر فروخت ہوجائیں۔ صابر و شاکر بیوی اور مایوس و کم گو بیٹے کو خوشیاں دینے کا تصور ہی اس کا جذبہ مہمیز کیے رکھتا تھا۔

بازار کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے سامنے داروغہ چلا آیا۔ عبید کا اس سے کبھی ذاتی طور پر واسطہ نہیں پڑا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو اے لکڑہارے؟'' سعد نے اسے روک لیا۔

''یہ لکڑیاں فروخت کرنے جا رہا ہوں۔'' عبید نے سادگی سے بتایا۔ سعد نے لکڑیوں کو بغور دیکھا اور معنی خیزی سے مسکرا کر بولا۔

''دجلہ کے کنارے سے لائے ہو نا انہیں؟''

''جی ہاں! وہیں سے لایا ہوں۔'' عبید نا سمجھی سے بولا۔

''تمہیں اپنی اس حرکت پر بیت المال میں جرمانہ جمع کروانا ہوگا۔'' سعد نے اسے دھمکایا۔

''لیکن کس لیے؟ میں نے کیا جرم کیا ہے جو جرمانہ ادا کروں؟'' عبید بوکھلا گیا۔

''یہ لکڑیاں تم نے دجلہ کے کنارے سے لی ہیں۔ دریا' زمین' درخت اور اس سے وابستہ ہر شے پر خلیفہ کا حق ہے۔ اس لیے تمہیں جرمانہ تو ادا کرنا پڑے گا۔ ابھی اور اسی وقت جرمانہ دو! میں اسے بیت المال میں جمع کروادوں گا۔'' سعد نے ایک اور پتا ظاہر کیا۔ عبید اس کی منطق پر سر پیٹ کر رہ گیا۔

''یہ لکڑیاں میں نے کسی درخت سے نہیں کاٹیں۔ انہیں خشک حالت میں زمین سے اٹھایا ہے۔ ان پر کوئی جرمانہ واجب نہیں ہوتا۔'' عبید نے اپنا دفاع کیا۔

''زمین خلیفہ کی ہی ہے۔ جرمانہ تو بھرنا پڑے گا تمہیں۔'' سعد نے اس کی گردن دبوچ لی۔ عبید نے تنگ کر لکڑیوں کا گٹھا نیچے پھینک دیا۔

''میں اس معاملے پر کسی سے منصفانہ فیصلہ کروانا چاہوں گا اے داروغہ! تمہاری منطق سراسر بدنیتی ہے۔''

''ٹھیک ہے تو چلو! ہم کسی قاضی کے پاس چلتے ہیں۔'' سعد نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''مجھے بہلول کے سوا کسی کی سچائی پر اعتبار نہیں۔'' عبید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

سعد تلملا کر رہ گیا۔ اس کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہب بھی اس وقت بازار کے اسی حصے میں گھڑسواری میں مصروف تھا۔ عبید نے اسے دیکھتے ہی اپنے پاس بلایا اور سارا معاملہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''وائے ہو تم پر سعد!'' وہب نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ''اب تم غریبوں کا مال بیت المال میں جمع کرواؤ گے۔ وہ لوگ جنہیں خود بیت المال سے مدد کی ضرورت ہے۔''

وہ عبید کی معاشی حالت اور غربت سے واقف تو نہ تھا البتہ اس کی بے بسی اور شکستگی ظاہری حالت سے مکمل عیاں تھی۔

''یہ داروغہ ایک ہی بات پر مصر ہے کہ دریا کے کنارے کسی اناج یا شے پر ہمارا کوئی حق نہیں۔'' عبید نے جواب دیا۔

''شریعت ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ہم لوگ آپس میں کھانے پینے کی ہر چیز میں شریک ہیں۔'' وہب خلافِ مزاج سنجیدگی سے بولا۔

''یہ کیسی بات کی تم نے اے بہلول؟ لکڑیوں کا اس اجازت سے کیا تعلق ہے؟'' سعد نے تمسخر سے پوچھا۔

''آگ لکڑیوں سے جلتی ہے داروغہ!'' اس نے جواب دیا۔ سعد کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں بہلول کہ یہ دیوانگی صرف تمہارا ایک بہروپ ہے۔ ہر بار ایسے دلائل اور منطق کوئی عالم دین اور فقیہہ ہی پیش کر سکتا ہے۔'' سعد نے برملا کہا اور پھر عبید کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''جرمانہ تو تمہیں ادا کرنا ہی ہوگا۔''

''کیسا جرمانہ؟ جبکہ میں بتا چکا ہوں کہ لکڑیاں چن کر اکٹھی کی ہیں۔ کسی درخت سے نہیں کاٹیں۔'' عبید بے بسی سے بولا۔

''یہ کسی نہ کسی سرسبز درخت کا حصہ تو تھیں نا۔'' سعد بضد تھا۔

''تو ٹھیک ہے! تم اپنا جرمانہ خالد برمکی سے وصول کر لینا۔ مجھے امید ہے وہ عبید کی حالت پر ترس کھا کر تمہیں اس کے حصے کا جرمانہ ادا کر دے گا۔ اتنے معتبر نام پر تو اعتبار ہے نا تمہیں؟'' وہب نے کہا۔

''خالد برمکی انتقال کر چکا ہے۔ وہ قبر سے کس طرح جرمانہ ادا کرے گا؟'' سعد نے حسبِ سابق بلا سوچے سمجھے اس کے جال میں قدم رکھ دیا۔

''تو کیا ہوا؟ وہ بھی زندہ تو تھا نا۔'' وہب نے سکون سے جواب دیا۔

سعد بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ اپنی شکست تسلیم نہ کرتے ہوئے مزید دلائل بھی دینا چاہتا تھا لیکن عبید اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس کی بدقسمتی ہم رکاب ہی تھی۔ اس روز بھی لکڑیاں درہم کے دسویں حصے میں بہ مشکل فروخت ہو پائیں۔ اس رات بھی گھر میں مایوسی اور شکستگی کا راج تھا۔ فرید پانی اور روٹی کے لیے دلی آمادگی نہ پا کر گھر سے باہر نکل گیا۔ یہ بے مقصد سفر یونہی جاری رہا۔ کافی دور چلے آنے کے بعد اسے ایک گھر کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ گھر سے آتی خوشبو نے بھوک سے اینٹھتے معدے کو مزید بے حال کر دیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بلا سوچے سمجھے اندر بڑھ گیا جہاں ایک شخص دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس کی بند آنکھوں سے بہتے آنسو چہرے اور گریبان کو بری طرح بھگو رہے تھے۔ وہ شخص اپنے سامنے رکھے کھانے پر بارگاہِ الٰہی میں شکرانہ ادا کرتا اپنے رزق کی کشادگی اور اس وسیع رزق سے حاجت مندوں کی مدد کرنے کی توفیق طلب کر رہا تھا۔

فرید اس شخص سے واقف تھا۔ وہ اکثر عصا کو اپنا گھوڑا بنائے گلی کوچوں میں بھاگتا پھرتا تھا۔ اس نے دعا مانگنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرا اور آنکھیں کھول دیں۔ فرید پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا۔

''آ جاؤ میرے ننھے مہمان! کھانا کھا لو۔'' وہب نے اسے شفقت سے دعوت دی۔

''کیا آپ نے کباب بنائے ہیں؟'' فرید نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔

''نہیں ننھے فرشتے! میرے پاس صرف چاول ہیں۔ کیا تمہیں کباب بہت پسند ہیں؟'' وہب اس کی آنکھوں سے جھلکتی بے بسی سے اپنا دل کٹتا محسوس کرنے لگا۔

''ہاں! بہت زیادہ۔ میں نے ایک بار کھائے تھے۔ وہ ذائقہ ابھی تک زبان پر موجود ہے۔'' فرید کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''تمہارے والد کا کیا نام ہے بیٹے؟ کیا کرتے ہیں وہ؟'' وہب کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمکنے لگے۔

''ان کا نام عبید ہے۔ وہ لکڑیاں فروخت کرتے ہیں۔''

فرید کے جواب پر وہب کو دوپہر میں ہونے والا واقعہ اور متعلقہ شخص بھی یاد آ گیا۔ اس نے بچے کو اپنے ہاتھوں سے چاولوں کے لقمے بنا کر کھلاتے ہوئے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے لیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہب دجلہ کے کنارے پہنچ گیا۔ تھوڑی سی

تلاش کے بعد اسے لکڑیاں چنتا عبید نظر آ گیا۔ عبید نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ گرم جوشی سے لپک کر اس کے پاس آیا اور گزشتہ روز سعد سے نجات دلوانے پر شکریہ ادا کرنے لگا۔

''تمہارا عظیم الشان ماضی یاد آتا ہے تو اس حالت میں دیکھ کر دل بہت دکھی ہوتا ہے اے بہلول!'' عبید نے خلوص سے کہا۔

''ماضی...... ہاں ماضی سے مجھے یاد آیا کہ میں بھی لکڑیاں فروخت کرتا تھا۔ مجھے اب بھی لکڑیاں خریدنی ہیں۔ کیا تم مجھے اپنا یہ گٹھا ایک درہم میں فروخت کرو گے؟'' اس کی پیشکش پر عبید کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ لکڑیاں اتنی مہنگی نہیں ہیں بہلول! تم کیوں اپنا نقصان کرنے کے درپے ہو؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''نہیں! میں کوئی نقصان نہیں کر رہا۔ مجھے ایسی لکڑیوں کی اشد ضرورت تھی۔'' وہب نے زور دیا اور ایک درہم عبید کے ہاتھ پر رکھ کر گٹھا اٹھالیا۔ اس کی پھرتی اور چستی دیدنی تھی۔

عبید نم آنکھوں سے اپنے ہاتھ میں موجود سکہ دیکھنے لگا۔ اسے اپنے وجود میں اطمینان اور سرشاری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی تشنہ حسرت کی تکمیل کرسکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر بازار کا رخ کیا جہاں اقسم کی دکان ہی معیار کے حوالے سے کافی مشہور تھی۔ اسے کباب بنانے کی ہدایت دے کر عبید کی آنکھوں میں خوشی کے ڈھیروں رنگ اترنے لگے۔ وہ رابعہ اور فرید کے ممکنہ ردعمل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسی خوشی میں اسے یکدم خلش محسوس ہوئی۔ کباب اس قدر زیادہ بھی نہ تھے کہ وہ تینوں سیر ہو کر کھا سکتے۔ عبید کا دل بجھنے لگا۔ ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑاتے اسے یکدم ایک خیال سوجھا۔ اس نے اپنی پوٹلی میں موجود وہ روٹی نکالی جو رابعہ نے دوپہر کے کھانے میں ساتھ دی تھی۔ اسے یکدم ایک خیال سوجھا۔ اقسم اس وقت دکان کے اندرونی حصے میں موجود تھا۔ عبید نے اطمینان سے روٹی کبابوں سے نکلتی بھاپ پر سینکی اور رغبت سے کھانے لگا۔ ہر نوالے کے بعد روٹی سینک کر یہ رغبت اور بھی بڑھ جاتی۔ کچھ لمحوں بعد اقسم بھی باہر چلا آیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' وہ عبید کی اس حرکت پر حیران ہو گیا۔

''اپنے حصے کے کباب کھا رہا ہوں تاکہ میری بیوی اور بیٹا اپنے حصے سے سیر ہو سکیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

اقسم کی آنکھوں میں چمک بیدار ہوئی اور ذہن میں ایک شیطانی خیال اُدھم مچانے لگا۔ عبید کی روٹی اب اختتامی مراحل میں تھی۔

''اس سنکائی کے لیے تمہیں دو دانغ مزید ادا کرنے ہوں گے۔'' اقسم کی فرمائش پر عبید کا نوالہ حلق میں پھنسنے لگا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہمارے درمیان ایک درہم طے ہوا تھا۔'' عبید حیران ہوا۔

''ایک درہم ان کبابوں کی بیخ کا طے ہوا تھا۔ تم نے ان کی بھاپ بھی کھانے کے لیے استعمال کی ہے۔ اس کے دام تو دینے ہوں گے۔'' اقسم نے رکھائی سے کہا۔ عبید چکرا کر رہ گیا۔

''یہ تو ناانصافی ہے۔ سخت ناانصافی ہے۔'' وہ بلبلایا۔

''اگر ناانصافی ہے تو داروغہ یا قاضی سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔'' اقسم نے تجویز دی۔

''ہرگز نہیں! مجھے کسی داروغہ یا قاضی پر اعتبار ہی نہیں۔'' عبید بھڑک کر بولا۔

''تو کسی ایسے شخص کو بلوا لیتے ہیں جس پر تمہیں اعتبار ہو۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' اقسم نے ایک اور راہ دکھائی۔

''ٹھیک ہے! اگر بہلول ہمارے درمیان معاملہ کرے تو مجھے اس کا فیصلہ منظور ہوگا۔'' عبید کو وہب کا خیال آیا تو وہ قدرے اعتماد محسوس کرنے لگا۔

وہب کو تلاش کر کے وہیں طلب کرلیا گیا۔ معاملے سے آگاہ ہوتے ہی اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ وہ تاسف سے اقسم کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے عبید سے دو دانغ کے سکے تھامے اور اقسم سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تمہیں اپنے کبابوں کے دھوئیں کی قیمت درکار ہے نا؟''

''ہاں بالکل! اس کے بغیر میں اسے یہاں سے ہلنے بھی نہیں دوں گا۔'' اقسم ڈھٹائی سے بولا۔

وہب نے مسکراتے ہوئے سکے زمین پر گرائے اور پوچھا۔

''کیا تمہیں سکوں کی آواز آئی؟'' اقسم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس یہی تمہاری اس بھاپ کی قیمت ہے۔''

اقسم نے یہ سن کر بحث کا آغاز کرنا چاہا تو وہب نے کڑی سنجیدگی سے کہا۔

''اگر تم مطمئن نہیں ہو تو ہم یہ معاملہ ابن ثقیت کے پاس لیے چلتے ہیں۔''

اقسم کی رنگت فق ہو گئی۔ وہ کینہ توز نظروں سے وہب

اور عبید کو گھورنے لگا۔ عبید نے اس سے تیار شدہ کباب لیے اور رقم ادا کر کے اپنے گھر کا رخ کر لیا۔ وہ رات عبید کے چھوٹے سے آنگن میں خوشیوں کی نوید لائی تھی۔ فرید کے چہرے اور انداز کی خوشی عبید کو نہال کر رہی تھی۔ اس سرشاری کے باوجود ذہن میں ایک سوال خلش بن کر گردش کر رہا تھا کہ ایسا باریک بین شخص دیوانہ کیسے ہو سکتا ہے؟

☆☆☆

رات اپنے پر مکمل طور پر پھیلا چکی تھی۔ بغداد کے گلی کوچے ویران اور کسی بھی آدم زاد کے وجود سے مبرا تھے۔ نیند کی وادیوں میں جھولتے افراد نے اپنی ایک تہائی نیند مکمل کر لی تھی۔ اس خوابیدہ بغداد میں ایک ہی گھر ایسا تھا جس کا واحد مکین وہب ہنوز بیدار تھا۔ اس نے فرش پر مصلیٰ بچھائے دوزانو بیٹھے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ آنسو کسی ندی کی طرح بہتے ڈاڑھی اور گریبان کو بھگو چکے تھے۔ اس گریہ و زاری سے آنکھیں متورم تھیں لیکن کوئی بھی عنصر اس کے دکھ اور اذیت میں کمی نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے زمان و مکان میں ایک مہیب خلا کے سوا کچھ بھی محسوس نہ ہو رہا تھا۔ آج محل میں ملنے والی ایک خبر اس کے لیے دل فگار تھی۔ اس کی مقرب ہستی ”موسیٰ بن جعفر“ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا تھا۔

موسیٰ بن جعفر اور ہارون الرشید کا اختلاف بغداد میں کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ ہارون نے اپنے اختیارات کا استعمال بھی کیا ہوا تھا۔ وہب ابن عمرو بھی آغاز ہی سے یہ بات جانتا تھا کہ اس وقت ہواؤں کا رخ خلیفہ کے حق میں ہے۔ اس کی نیک دلی بندہ پروری عوام کے لیے خلوص اور انتظامی صلاحیتیں اپنی جگہ مسلم تھیں۔ تاریخ نے اسے یقیناً ایک دلیر حکمران کے طور پر یاد رکھنا تھا۔ ان گوناگوں خصوصیات میں اس کا کسی ایک شخص سے نظریاتی اختلاف اور قید و بند عوام یا دربار سے منسلک مورخین کے لیے خواہ اتنے اہم نہ ہوں لیکن وہب ابن عمرو کے لیے بہت معنی رکھتے تھے۔ وہب نے انہی کے ایما پر چودہ برس سے دیوانے کا یہ بہروپ دھارا ہوا تھا۔ اسے اتنے عرصے بعد آج بھی وہ کڑا وقت یاد تھا جب خلیفہ نے اس کی قابلیت کے پیش نظر اسے قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کرنا تھا۔ اس وقت یہ عہدہ سنبھالنے کا مطلب یہی تھا کہ موسیٰ بن جعفر کے خلاف کسی فتوے میں خلیفہ کا ساتھ دیا جائے۔ وہب بن عمر وان کے لیے اپنی محبت اور عقیدت کے سامنے مغلوب تھا۔ وہ اس محبت اور ان کی حفاظت کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا اور اس نے یہی کیا۔

آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کرتے اس کی نظر اپنے عصا پر پڑی۔ یہ عصا کسی وفادار ساتھی کی طرح ایک طویل عرصے سے اس کے ہمراہ تھا۔ وہب کو اس سے بھی انسیت سی ہو چکی تھی لیکن اس وقت اسے شدید وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ عصا توڑ کر اپنا یہ بہروپ بھی ترک کر دے۔ اس عمل کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہی ہوتا کہ ہارون الرشید اسے بھی موسیٰ بن جعفر کی طرح نظریاتی اختلاف کے تحت برسہا برس تک قید کر لیتا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس خواہش پر عمل بھی کر لیتا لیکن بغداد کا ایک مخصوص طبقہ اپنی آہوں، سسکیوں اور حسرتوں سمیت اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہب کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آنکھوں میں آنسو ایک نئی شدت سے عود آئے۔ سابقہ فیصلہ اور خواہش پر کاربند رہنا دوبھر ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

وہب کی بازار کرخ میں آمد و رفت اور معمولات جوں کے توں برقرار رہے۔ وہ اپنی تیار کردہ ٹوکریاں بازار میں فروخت کرتا اور حاصل شدہ آمدن سے ضرورت مندوں کی مدد کر دیتا۔ بغداد میں اس کی گھڑسواری کے باوجود عوام اس کی دانشمندی اور فہم پر مکمل بھروسا کرتے تھے۔ عوام کی رائے یہی تھی کہ وہب غالباً کسی ایسے مرض کا شکار ہے جس کی بدولت وہ زیرک اور دانا ہونے کے باوجود کبھی دیوانگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی گھڑسواری، خستہ لباس اور کچا مکان بھی اسی دیوانگی کا شاخسانہ ہے۔

عوام کی اس رائے کے برعکس وہب اپنے مشاغل میں مگن تھا۔ اسے اس بات کا بہرحال افسوس ضرور تھا کہ خلیفہ نے اپنے مصاحبین کے اصرار اور التجاؤں پر قاضی جنید کو دوبارہ رہائی دے دی ہے۔ اسے یقین تھا کہ قاضی اس سے الجھنے اور اسے نقصان پہنچانے کی پوری کوشش بھی کرے گا۔ وہب ذہنی طور پر ایسے کسی بھی الجھاؤ کے لیے مکمل تیار تھا۔

ایک صبح گھر سے نکلنے کے بعد اس نے ٹوکریوں کی فروخت کے لیے بازار کا رخ کیا تو قسم کی آواز سماعت میں پڑی۔

”بہلول...... اے بہلول! ذرا میری بات سنو گے؟“

”کیا ہوا قسم! آج میری یاد کیسے آ گئی تمہیں؟ کہیں اپنے دو دانغ کے نقصان کا واویلا تو نہیں کرنا چاہتے؟“ وہب نے مسکراتے ہوئے چوٹ کی۔

”نہیں! وہ معاملہ تو اب پرانا ہو گیا۔“ اقسم نے جواب دیا۔

"تو کیا کسی نئے طریقے سے کسی اور غریب کی کھال اتارنا چاہتے ہو؟"

"ارے نہیں بہلول! میں اتنا بھی برا نہیں ہوں جتنا تم گمان کرتے ہو۔ میں تو تمہیں یہ کباب دینا چاہتا تھا۔" افسم نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"میرے پاس انہیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ میں یہ کیسے لے سکتا ہوں بھلا؟" اس نے کنی کترائی۔

"رکھ لو بہلول! تحفتاً دے رہا ہوں۔"

"تحفہ برابری کی سطح پر دیا جاتا ہے افسم! مجھ بہلول کا تم سے کیا مقابلہ؟" وہب نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے علم ہے کہ تم ہمیں گمراہ کررہے ہو۔ خدا کی قسم! مجھے یقین ہے کہ تم جیسا ہوش مند پورے بغداد میں کوئی نہ ہو گا۔ منافع خوری یا ذاتی مفاد میری شخصی خامیاں سہی۔ اس کے باوجود میرے دل میں تمہاری بہت قدرومنزلت ہے۔" افسم قطعی سنجیدہ تھا۔ وہب نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"یہ مجھ سے بھی زیادہ کسی ضرورت مند کو دے دینا۔ بس اس سے بھاپ کی قیمت وصول کرنے مت بیٹھ جانا۔" وہ مسکرا کر بولا۔ پھر یکدم ہڑبڑا کر پیشانی پر ہاتھ مار کر کہنے لگا۔

"ارے ہاں! مجھے یاد آیا۔ میں اپنے گھوڑے کا چابک تو گھر ہی بھول آیا ہوں۔" اس نے اپنے پاس ڈیڑھ فٹ طویل چھڑی نہ پا کر کہا۔

افسم گہری اور ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہب نے اپنے گھوڑے کا رخ گھر کی جانب موڑ لیا۔ دروازے کے پاس پہنچتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ دروازہ اور کھڑکی مضبوطی سے بند کر کے ہی گھر سے نکلا تھا۔ اس وقت دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں اندر قدم رکھا اور کمرے سے آنے والی اٹھا پٹخ کی آوازوں سے چونک گیا۔ کمرے میں موجود سعد اس کے سامان کی تلاشی لے رہا تھا۔ وہب ایک لمحے کے لیے سخت طیش زدہ ہوا لیکن صورتِ حال کی نزاکت بھانپ کر اس نے اپنے انداز میں ردعمل دینے کا فیصلہ کرلیا۔

اس نے اپنا عصا تھاما اور سعد کی پشت پر زوردار انداز میں رسید کرتے ہوئے چور چور کی صدائیں دینی شروع کردیں۔ سعد تلملا کر رہ گیا۔ وہب اس کی جانب دیکھے بغیر بڑی مہارت سے ڈنڈازنی کررہا تھا۔ اس کے چہرے کا رخ بیرونی دروازے کی جانب تھا۔ سعد اس کی چال سمجھ گیا کہ وہ عوام کو اکٹھا کر کے اس کی گھر میں آمد عیاں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو عصا کی ضربات سے کسی طرح بچایا اور

چوٹیں سہلاتا ہوا فوری طور پر باہر نکل گیا۔ اس کا بدن بر طرح دکھ رہا تھا۔ اس شامتِ اعمال کے بعد سعد کو فطری طو پر کسی ہمدرد اور غمگسار کی ضرورت تھی۔ اس نے قدموں رخ قاضی جنید کے مکان کی طرف کرلیا۔

"تمہیں احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا سعد!" جنی نے اس کی بپتا سننے کے بعد مشورہ دیا۔

"مجھے کیا علم تھا کہ وہ اچانک گھر چلا آئے گا۔ سا دن بازاروں میں ہی تو گزرتا ہے اس کا۔" سعد نے بلبلا ک جواب دیا۔

"پریشان نہ ہو میرے دوست! بس دعا کرو کہ کس طرح ایک موقع مل جائے۔ میں بھی اسے نقصان پہنچتے دیکھ چاہتا ہوں۔ مجھے جس روز موقع ملا اسے قید خانے میں پھنکو دوں گا۔" جنید نے مٹھیاں بھینچیں۔

"میری تو یہ بھی دعا ہے کہ خلیفہ کسی طرح اس سے بدظن ہو جائے۔ وہ دوبارہ کہیں نظر ہی نہ آئے۔" سعد نے کوسا۔

☆☆☆

وہب ہارون الرشید کے شاندار محل کے باہر اپنی ہی سوچ میں مگن بیٹھا تھا۔ اس کا عصا ایک جانب پڑا تھا۔ وہب کا ذہن درحقیقت موسیٰ بن جعفر کی یاد سے بوجھل تھا۔ اسی کیفیت میں جانے کس جذبے کے تحت اس نے بچوں کی طرح مٹی سے کھیلنا شروع کردیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس مشغلے میں مکمل طور پر منہمک ہوگیا۔ مٹی کی ڈھیریوں سے کیاریاں اور عمارت کا خاکہ بناتے بناتے اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہاتھ ایک انوکھی ساخت میں کھڑکیاں اور دروازے بھی تشکیل دے رہے ہیں۔

اس کا یہ مشغلہ کافی دیر یونہی جاری رہا۔ یکدم اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لباس کی سرسراہٹ اور وجود سے پھوٹنے والی خوشبو نے عیاں کردیا تھا کہ وہاں شاہی محل سے تعلق رکھنے والی مستورات موجود ہیں۔ وہب نے نظریں اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور اپنے کام میں ہی منہمک رہا۔

"یہ تم کیا کررہے ہو بہلول؟" ایک کھنکتی ہوئی آواز سماعت میں پڑی۔

"محل بنا رہا ہوں ملکۂ عالیہ!" وہب نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔ اس کے لیے آواز و انداز سے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہاں خلیفہ ہارون الرشید کی زوجہ اور چچا زاد "زبیدہ" اپنی چند کنیزوں کے ہمراہ موجود تھی۔ وہ ایک بارعب اور دبنگ عورت تھی۔ وہب اس کی پاک سرشت

عبادت گزاری، سخاوت، فیاضی اور ریاضت سے بھی بخوبی واقف تھا۔

''محل؟ یہ کیسا محل ہے؟'' زبیدہ نے پوچھا۔

''یہ بہشت کا محل ہے ملکہ!'' وہب کے اس جواب پر زبیدہ کو یکدم ظرافت سوجھی۔

''کیا تم یہ محل فروخت بھی کرتے ہو؟''

''جی ہاں! اگر کوئی خریداری کا متمنی ہو تو۔'' وہب نے نپے تلے سے انداز میں کہا۔ وہ اپنے جذبات کو گویائی نہیں دینا چاہتا تھا بصورتِ دیگر زبیدہ سے یہ بھی کہتا کہ اس کی ذاتی رائے میں ملکہ نے بہشت میں محل تو تب ہی اپنے نام کر لیا تھا جب حجاج کرام کے لیے ذاتی دلچسپی سے آسائشات فراہم کی تھیں۔ اس دور میں حجاج کو مکہ المکرمہ کے سفر میں پانی کی کمی کا سامنا رہتا تھا۔ ایک مشک پانچ دینار کے عوض حاصل ہوا کرتی۔ زبیدہ نے بغداد سے مکہ جانے والے راستے پر جا بجا کنوئیں کھدوا کر کارواں سرائے بھی تعمیر کروائے تھے۔

''میں یہ بہشت خریدنا چاہتی ہوں۔ کتنے میں دو گے؟'' وہب کو زبیدہ کی آواز نے خیالات سے چونکایا۔

''آپ کے لیے صرف سو دینار میں۔''

''ٹھیک ہے! میری کنیز تمہیں ابھی سو دینار لادے گی۔'' وہ فراخدلی سے بولی۔

''محل کا قبالہ تو اپنے نام کروالیں۔'' وہب نے کہا۔

''جب فرصت ملے تو کسی وقت محل میں دے جانا۔'' اس نے بے نیازی سے کہا اور واپس شاہی محل کی جانب بڑھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد کنیز نے سو دینار لاکر اسے تھما دیے۔ وہب یہ دینار لیے بغداد کے ان ضرورت مندوں کے پاس نکل کھڑا ہوا جن کے لیے اس نے اپنا بہروپ قائم رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ رات بہت پُرسکون تھی۔ حاجت مندوں کے چہرے کی خوشی اور سرشاری نے اس کے لیے کسی لوری کا سا کام کیا تھا۔ کچھ روز بعد اسے ہارون الرشید کی جانب سے دربار میں طلب کر لیا گیا۔

''کیسے ہو وہب بن عمرو! میں نے سنا ہے کہ تم نے ملکہ کو ایک محل فروخت کیا ہے۔'' خلیفہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''جی ہاں! بالکل درست سنا ہے۔''

''کیا مجھے یہ محل فروخت نہیں کرو گے؟'' وہ مسکرایا۔

''اس سے قبل بس کچھ سوال پوچھنے کی اجازت چاہوں گا۔'' اس کے استفسار پر خلیفہ نے فراخدلی سے اجازت دے دی۔

''کیا ملکہ نے خلیفہ کو محل کے متعلق بتایا تھا؟''

اس سوال پر ہارون لمحاتی تذبذب میں مبتلا ہوا لیکن سنبھل کر باوقار انداز میں بولا۔

''ہاں! لیکن میں نے ان سنی کر دی تھی۔''

''پھر خلیفہ کے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟''

''میں نے ایک خواب دیکھا کہ سرخ یاقوت کے محل کے باہر کھڑا ہوں۔ وہاں ملکہ زبیدہ کا نام کندہ تھا۔ محل کی دلکشی بیان سے بالاتر تھی۔ فضائیں، چمن، کیاریاں، لطافت، نفاست، دلکشی، تابانی نظریں خیرہ اور حواس مسحور کیے دے رہی تھی۔ میں نے محل میں قدم رکھنا چاہا تو دربان نے روک دیا کہ اس کے حقوق صرف ملکہ کے نام ہیں۔'' ہارون الرشید کے انداز میں ایک عجیب سی حسرت تھی۔

''یہ سن کر ہی خلیفہ کے دل میں بھی محل خریدنے کی جستجو بیدار ہوئی ہوگی؟'' وہب نے اگلا سوال کیا۔

''ہاں! بولو کیا قیمت لگاتے ہو؟''

''قیمت ادا کرنا اب خلیفہ کے بس میں ہی نہیں۔ اپنی پوری سلطنت بھی دے دیں تو بھی قیمت کے متوازی نہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''ملکہ نے جنت کا ان دیکھا سودا کیا تھا۔ خلیفہ نے تو جان لیا کہ اس کی تابانی کا کیا عالم ہے۔ اب خریداری کی تو کیا کی؟''

وہب بن عمرو کے اس سوال کا خلیفہ کے پاس اب کوئی جواب نہ تھا۔ اس حاضر دماغی نے خلیفہ کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکایا۔ اسے اپنے ایک مسئلے کا عملی حل نظر آگیا تھا۔

''بغداد میں آنے والا ایک سیاح دربار میں کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہے۔ کیا تم اسے مطمئن کرو گے وہب؟'' ہارون نے کہا۔

''اگر وہ سیاح خلیفہ کے درباریوں، وزراء اور امراء کو لاجواب کر چکا ہے تو یہ دیوانہ اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لے گا کہ خلیفہ کی عزت پر کوئی آنچ نہ آئے۔'' اس کی صاف گوئی نے ہارون کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ سیاح کے سوالات کے تسلی بخش جواب نہ دینے پر درباریوں کو سخت سست سنا چکا تھا۔

سیاح کو دربار میں طلب کیا گیا تو وہ وہب کا حلیہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا۔

''کیا یہ شخص میرے سوالات کے جواب دے گا؟''

''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔'' وہب نے مضبوط لہجے میں کہا۔

سیاح نے نگاہِ غلط اس کی جانب دوڑائی اور اپنی چھڑی سے زمین پر ایک دائرہ کھینچ دیا۔ وہب نے اپنے

عصا سے اس دائرے کے درمیان ایک لکیر کھینچ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔
سیاح کے چہرے پر حیرانی جھلکی تاہم اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ایک اور دائرہ کھینچ دیا۔ وہب نے بلا تامل اسے چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے پر چھڑی رکھ کر کھٹکھٹا دی۔ سیاح کے تاثرات دیدنی تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ الٹی جانب زمین پر رکھے انگلیاں آسمان کی سمت اٹھا دیں۔ وہب نے ہاتھ اس طرح زمین پر رکھا کہ اس کی ہتھیلی نچلی سمت تھی۔ سیاح کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں۔ وہ ایک نظر وہب کے حلیے اور دوسری نگاہ اس دائرے کی سمت دوڑانے لگتا۔
''آفرین...... میں نے تسلیم کرلیا کہ بغداد کے متعلق بالکل درست سنا تھا یہاں عالم و فاضل موجود ہیں۔'' وہ گہری سانس لیے بولا۔ اس کی آنکھوں میں وہب کے لیے احترام ہلکورے لے رہا تھا۔
''کیا تمہیں سب سوالات کے درست جواب مل گئے مسافر؟'' ہارون نے فخر سے پوچھا۔
''جی ہاں عالی جاہ! اس شخص نے مجھے بالکل مطمئن کر دیا ہے۔'' سیاح نے کہا۔
''میرے درباریوں کو بھی بتاؤ کہ تمہارے ان اشاروں میں اصل معما کیا تھا؟'' ہارون نے حکم دیا۔
''عالی جاہ! میں نے زمین پر جو دائرہ کھینچا تھا وہ درحقیقت زمین کا کرہ دکھانے کے لیے تھا۔ اس شخص نے دائرے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مجھے یہ باور کروایا کہ اس کے خیال میں زمین گول ہے اور شمالی و جنوبی کروں میں منقسم ہے۔ دوسرے دائرے میں چار حصوں کے ذریعے اس بات کا جواب تھا کہ زمین کا تہائی حصہ پانی اور ایک حصہ خشکی پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے زمین پر اگنے والی نباتات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس عالم نے اپنے ہاتھ سے بارش اور سورج کی نشاندہی کردی جو نباتات کی بالیدگی کے لیے ضروری ہے۔ اس نے یقیناً کسی عظیم درسگاہ سے تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔'' سیاح نے اسے احترام سے دیکھا۔
''درست کہا تم نے! میری درسگاہ واقعی بہت عظیم تھی۔'' وہب نے ہارون کی جانب دیکھتے ہوئے بوجھل سانس لی۔
اس کا اشارہ موسیٰ بن جعفر کے والد ''امام جعفر صادق'' کی طرف تھا۔ ہارون نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔ وہ بظاہر سیاح کی مہمات اور تجربات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا لیکن ذہن میں اب بھی وہب بن عمرو کی دماغی حالت ہی اودھم مچا رہی تھی۔ اس نے داروغہ سعد سے مزید تفصیل جاننے کا فوری فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

کچھ روز بعد وہب ایک بار پھر خلیفہ کے دربار میں موجود تھا۔ ہارون الرشید کو سعد نے کینہ پروری اور منتقم مزاجی پر مشتمل خبریں پہنچائی تھیں۔ سعد نے اسے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ وہب کی دانشمندی، ذہانت اور باریک بینی کسی بھی عالم دین سے کمتر نہیں ہے۔ اس نے وہب کی دیوانگی کے متعلق بھی شبہات کا آغاز کر کے خلیفہ کے شکوک کو مزید تقویت دی تھی۔ ہارون الرشید کی نظروں اور تجسس دیکھ کر ابو وہب نے اپنی بے نیازی سوا تر کردی۔
''مجھے تمہارے متعلق سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے وہب!'' خلیفہ نے بالآخر اسے مخاطب کیا۔
''ایک اچھے حکمران کو ہمیشہ ساری رعایا کے لیے ہی دکھی ہونا چاہیے اے ہارون!'' اس نے کہا۔
''اگر تم اس لکڑی کے گھوڑے پر سوار ہو کر دیوانوں جیسی حرکتیں نہ کرو تو کوئی بھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ تم بہلول ہو۔''
''یہ گھوڑا میرے لیے خدا کی دی گئی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔'' وہب ہنسا۔
''اچھا! ایسی کیا حکمت ہے اس نعمت میں؟'' ہارون مزید متجسس ہوا۔
''جب میں اس پر سواری کرتے ہوئے بغداد کے بازاروں میں گھومتا ہوں تو اپنے اردگرد استحصال زدہ، غربت اور جبر کی چکی میں پستے عوام نظر آ جاتے ہیں۔ ایسے سرمایہ دار دکھائی دیتے ہیں جو کردار کے لحاظ سے فقیروں سے بھی بدتر ہیں اور ایسے فقیر دکھائی دیتے ہیں جن کے پاس خودداری، عزتِ نفس اور کردار کا کثیر سرمایہ ہے۔''
''مجھے ان کی نشاندہی کرواؤ ابو وہب! میں ان کے حالات تبدیل کر دوں گا۔ میں راتوں میں اپنا گشت بڑھا کر شہر میں انتظامی عہدیداروں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دوں گا۔'' ہارون نے فوراً کہا۔
''وہ تمہیں کبھی بھی دکھائی نہیں دیں گے اے خلیفہ! تمہارے متعین کردہ نگہبان ان کا وجود نظر آنے ہی نہیں دیں گے۔ اگر یہ طبقہ تمہارے سامنے عیاں کر دیا گیا تو ان کے استحصال اور اس جبر کے ذمے دار بھی عیاں ہو جائیں گے۔ ان کے ذاتی مفادات پر شدید ضرب پڑے گی۔ وہ تمہارے سامنے کبھی نہیں آئیں گے۔ اس کے برعکس تمہاری توجہ کہیں نہ کہیں دوسری جانب مبذول کروا دی جاتی رہے گی۔ اپنے نگرانوں اور اپنے فیصلوں کا محاسبہ کروائے

ہارون! جب چمک دمک بہت زیادہ بڑھ جائے تو اندھیرا دکھائی نہیں دیتا۔ تاریکی کالمس محسوس کرو۔ تاریکی کی مہک سونگھو۔ تاریکی بہت خوددار ہوتی ہے۔ اسے نظر انداز کیا جائے تو بڑی سرعت سے غلبہ حاصل کرلیتی ہے۔ پھر چمک دمک کام آتی ہے نہ ہی نگران۔ اس تاریکی میں اپنی سزا خود ہی بھگتنی ہوتی ہے۔"

"میری شدید خواہش ہے وہب کہ تم دربار سے منسلک ہو جاؤ۔ امور سلطنت میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ میری سلطنت بہترین ہوتی چلی جائے گی۔" ہارون کے انداز میں اپنی ملکیت کے لیے ایک غیر محسوس تفاخر تھا۔

"ایک بات پوچھنا چاہوں گا خلیفہ! اجازت ہے؟" اس کے استفسار پر ہارون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر خلیفہ کسی جنگل بیابان میں راستہ بھٹک جائے' پیاس سے دم نکل رہا ہو' پانی کہیں بھی میسر نہ ہو تو ایک گھونٹ پانی کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کروگے؟"

"عجیب سوال ہے ویسے! ظاہری بات ہے میں اپنے پاس موجود سبھی مال و متاع دینے کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"اگر پانی کا مالک اس بات پر راضی نہ ہوا اور آدھی سلطنت طلب کرلی تو کیا کروگے؟"

"میں آدھی سلطنت اس کے نام کردوں گا۔" ہارون نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے! اس کے بعد اگر ایسا ہو کہ ایک گھونٹ پانی سے زندگی تو بچ جائے لیکن پیشاب رکنے کی بیماری لاحق ہو کر جان پر بن آئے تو کیا کروگے؟"

"ظاہری بات ہے میں کسی ایسے شخص یا طبیب کو تلاش کروں گا جو اس مرض کا علاج کرسکے۔" اس نے کہا۔

"اور اگر وہ معاوضے میں آدھی سلطنت طلب کرلے تو؟" وہب مسکرایا۔

"دے دوں گا۔" خلیفہ نے بے اختیار کہا۔

"تو ایسی بادشاہت یا سلطنت پر کیسا مان و غرور جس کی قیمت پانی کے صرف دو گھونٹ ہیں۔ میں ایسی بے ثبات شے کا حصہ کیوں بنوں خلیفہ؟" اس نے اپنی مخصوص بے نیازی سے جواب دیا۔

وہب کی باتیں سن کر ہارون الرشید وقتی طور پر اپنی گویائی ہی کھو بیٹھا۔ ابو وہب نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی در گھڑ سواری کرتے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہب کی یہ مبہم اور ذو معنی باتیں ہارون کے دل میں خار بن کر پیوست ہو چکی تھیں۔ اس نے سلطنت میں انتظامی امور کے حامل افراد کا ازسرِنو احتسابی جائزہ لینے کا آغاز کیا تو قاضی جنید کی چند متنازعہ حرکات سامنے آگئیں۔ ہارون الرشید نے طیش و غضب میں اسے اپنے پاس طلب کرلیا۔ جنید کو اپنے پاؤں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہونے لگی۔

"تمہیں ایک بار تنبیہہ اور سزا سے عبرت نہیں ہوئی تھی جنید؟ تمہاری شکایات پھر سے موصول ہونے لگی ہیں۔" اس نے کڑکتے ہوئے کہا۔

"امیر المومنین! پروردگار آپ کا اقبال ہمیشہ بلند رکھے۔ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رہے۔ آپ جیسا عظیم حکمران مسلم امت کو کبھی نصیب ہی نہیں ہوا۔" قاضی کی زبان فراٹے بھرنے لگی۔

"مجھے اس چاپلوسی کی ضرورت نہیں جنید! صرف کارکردگی درکار ہے۔" خلیفہ نے بیزاری سے کہا۔

"میری کارکردگی میں کوئی سقم نہیں امیر المومنین! میں شریعت اور آئین کی روشنی میں ہی فیصلے کرتا ہوں۔" جنید نے صفائی دی۔

"لیکن مجھے علم ہوا ہے کہ تم ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے ہو۔" ہارون کا جارحانہ انداز جنید کی سٹی گم کر رہا تھا۔

"میرے آقا! ایسی اطلاعات یقیناً بدخواہوں اور حاسدین نے آپ تک پہنچائی ہیں۔ وہ امیر المومنین کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ آپ داروغہ سعد کو طلب کرکے استفسار کرلیں۔ میں اپنے فرائض ایمانداری سے ہی سر انجام دے رہا ہوں۔" وہ گھگھیایا۔

"تو کیا یہ بات بھی غلط ہے کہ سود خوری' منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کے لیے دلائل دے کر ان کے حق میں فیصلہ دے دیا کرتے ہو۔" ہارون الرشید کے کامل اندازے پر اسے اپنا انجام ہولناک دکھائی دینے لگا۔

"میرے آقا! میں جان گیا ہوں کہ یہ آگ بہلول کی لگائی ہوئی ہے۔ وہ ریاست کا بہت بڑا دشمن ہے۔ وہ خلیفہ کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔" جنید نے زہر اگلا۔

"میں اس بات کو تسلیم نہیں کرسکتا۔" ہارون قطعیت سے بولا۔

"آقا! وہ شخص بازاروں میں لوگوں کے معاملات میں اس طرح دخل اندازی کرتا ہے کہ وہ خلیفہ سے متنفر ہو کر اس کے گن گانے لگتے ہیں۔ وہ عوام میں اپنا تاثر کسی نجات دہندہ کی طرح قائم رکھے ہوئے ہے۔ وہ آپ کے دشمنوں

کے ہاتھ مضبوط کر کے عوام کو خلیفہ سے بدظن کر رہا ہے۔"

"میں تمہاری بات ٹھوس ثبوتوں کے بغیر تسلیم نہیں کر سکتا۔ تمہیں اپنے اس دعوے کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔" خلیفہ نے دوٹوک جواب دیا۔

"میں بہت جلد ثبوت اور گواہ آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔" جنید نے فوراً کہا۔

"میں اس وقت کے انتظار میں تمہیں زیادہ مہلت نہیں دے سکتا۔ اس دعوے کی سچائی یا کذب کے بعد ہی تمہارے خلاف ان شکایتوں کا کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔" خلیفہ کی اس تنبیہہ پر جنید کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے اپنا مستقبل بہت مخدوش نظر آ رہا تھا۔

دربار سے نکلتے ہی اس نے داروغہ سے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے مشترکہ دشمن وہب کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے کے علاوہ اسے اپنے حق میں مضبوط گواہ کے طور پر بھی پیش کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔

"میں تمہاری ہر آزمائش میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں قاضی! فکر نہ کرو۔ ہم بہتر طور پر اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔" داروغہ نے تسلی دی۔

"ہمیں بہلول کے خلاف بھی ثبوت اکٹھے کرنے ہوں گے جس سے وہ خلیفہ کا بدخواہ ثابت ہو سکے۔" قاضی نے یاد دہانی کروائی۔

"بغداد میں ایسے بہت سے افراد مل جائیں گے جنہیں بہلول زچ کر کے نقصان بھی پہنچا چکا ہے۔ وہ خوشی سے اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔" سعد مطمئن تھا۔

"کیا ایسا کوئی معتبر شخص تمہارے علم میں ہے؟"

"ہاں! بازار کرخ کی مسجد کا سابقہ پیش امام ابوعبیدہ ہماری مدد کے لیے کبھی انکار نہیں کرے گا۔ بہلول نے اسے بھرے دربار میں رسوا کر کے امامت و عزت سے محروم کر دیا ہے۔ مجھے مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ ابوعبیدہ آج کل روزگار کے لیے خواری میں مبتلا ہے۔ اس کے گھریلو حالات بھی نہایت دگرگوں ہیں۔ سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ اس کی اہلیہ بے روزگاری پر اپنا ضبط کھو چکی ہے۔ وہ اسے ہر وقت طعن و تشنیع کرتی ہے۔ ابوعبیدہ کھانا مانگے تو برتنوں میں اس کی کتابوں سے کاغذات نکال کر سامنے لا رکھتی ہے کہ گھر میں ان کے سوا اور کچھ موجود نہیں۔" سعد نے معنی خیزی سے ہنستے ہوئے بتایا۔

"تمہیں ان باتوں کا کیسے علم ہوا؟" قاضی حیران ہوا۔

"ارے میرے پیارے دوست! لگتا ہے خلیفہ کے پاس طلبی نے تمہیں ذاتی طور پر سپاٹ کر دیا ہے۔" سعد نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "جب زوجین آپس میں لڑتے ہیں تو انہیں آوازیں بلند ہونے کا احساس ہی کہاں ہوتا ہے؟ ایسے میں ہمسائے ان کی چپقلش کا مکمل لطف لے کر وجۂ تنازعہ اپنے شناساؤں تک بھی منتقل کر دیتے ہیں۔" سعد خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"بغداد میں بہت سے افراد بے روزگار ہیں سعد! ان میں سے اکثر کی بیویاں بھی حالات کی تنگی سے اپنا ظرف کھو بیٹھتی ہیں۔ گھریلو ماحول میں تلخیاں بھی رچ جاتی ہیں۔ اس میں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔" جنید نے منہ بنایا۔

"لیکن ان میں سے کتنے افراد کی بیویاں بہلول سے ٹوکریاں بنانے کا ہنر سیکھتی ہیں؟ گھر میں ٹوکریوں کی بنائی کرتی ہیں۔ شوہر کو صبح دیر سے اٹھنے اور روزگار کی تلاش میں کامیاب نہ ہونے پر طنز سے چھلنی کر دیتی ہیں۔ ٹوکریاں فروخت کر کے حاصل کی گئی رقم سے کھانا بنا کر دسترخوان پر ہر لقمے کے بعد شوہر کو کوستی ہیں کہ وہ درحقیقت اس کی کمائی کھا رہا ہے۔ پھر بہلول کی اعلیٰ ظرفی کے حوالے دے کر یہ جتاتی ہیں کہ اگر وہ اپنا ہنر اسے نہ سکھاتا تو آج وہ بھوکوں مر رہے ہوتے۔ ان میں سے کتنی بیویاں یہ کہتی ہیں کہ خلیفہ سے کہیں برتر یہ دیوانہ شخص ہے۔ لوگ عقیدت کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں جبکہ خلیفہ اور شاہی ہرکاروں سے خوف کی وجہ سے نفرت کا رشتہ استوار ہے۔"

"اوہ...... بہت خوب...... یہ سب اس ابوعبیدہ کی اہلیہ کہتی ہے؟ اس کی انا اور مردانگی تو پارہ پارہ ہو جاتی ہو گی۔" قاضی جنید نے چٹخارہ لیا۔

"بالکل درست اندازہ لگایا میرے عزیز! وہ شخص نہایت زہریلا ہو چکا ہے۔ وہ بہلول سے مزید نفرت کرنے لگا ہے۔ ایسی نفرت کہ کل بازار کرخ میں وہ بہلول سے بری طرح الجھ بیٹھا۔ اسے دیوانہ، احمق اور عقل کا دشمن قرار دیتے ہوئے سبق چکھانے کی دھمکیاں دیتا رہا۔"

"بہلول نے کوئی جوابی ردعمل نہیں دیا کیا؟" جنید کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"وہ حسب معمول ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے اسے مزید چڑاتا رہا۔ اپنے گھوڑے پر سوار اس کے گرد چکر لگاتا رہا۔ یہ تماشا بازار کرخ میں سب نے دیکھا ہے۔"

"وائے ہو ابوعبیدہ پر! اسے اپنے رتبے اور علمیت کا بھرم رکھنا چاہیے تھا۔ اس نے تو الٹا خود کو ہی بھرے بازار میں رسوا کر لیا۔" قاضی نے بے اختیار کہا۔

''وائے ہو تم پر اے قاضی! اگر وہ ایسا کر لیتا تو آج ہم اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کا کیسے سوچتے؟ اس کی انہی غلطیوں اور شخصی خامیوں کو اپنے حق میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' داروغہ نے اسے آئینہ دکھایا۔

قاضی جنید کے ہونٹوں پر آسودہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کی سوچ مسلسل ابوعبیدہ کے تصور اور ذات پر ہی بھٹک رہی تھی۔

☆☆☆

ابوعبیدہ کتابیں ہاتھ میں تھامے بازار کرخ میں موجود تھا۔ اس کا مزاج سخت مکدر دکھائی دے رہا تھا، شکستگی، آزردگی اور کروفر پر لگنے والی پے در پے ضربات کی اذیت آنکھوں میں گویا ثبت ہو چکی تھی۔ یہاں آمد سے قبل اہلیہ سے ہونے والی بحث اور تلخی نے اسے شدید غم و غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ شب و روز بہلول کے قصیدے پڑھتی تھی۔ ابوعبیدہ کے زخم ہر بار ایک نئے سرے سے ہرے ہو کر اذیت دینے لگتے۔

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ کوئی بھی روزگار حاصل کرنے میں مسلسل ناکام ہو رہا تھا۔ بہلول سے ہونے والے اس مناظرے نے اسے لوگوں کی نظروں میں سخت بے اعتبار کر دیا تھا۔ کسی بھی تعلیمی منصب پر فائز ہونا اب ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ دیگر کام مشقت طلب تھے اور ابوعبیدہ کا جسمانی مشقت سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑا تھا۔ وہ ہر روز اسی طرح ڈھیروں کتابیں تھامے بازاروں میں گھومتا رہتا تاکہ عوام کو اپنی علمیت سے مرعوب کر سکے تاہم کامیابی دور، بہت دور منہ چڑاتی محسوس ہوا کرتی۔

انہی خیالات میں غلطاں ابوعبیدہ پژمردگی سے قدم اٹھاتا آگے بڑھتا رہا۔ یکدم اسے ٹھوکر لگی اور وہ اپنی کتابوں سمیت زمین بوس ہو گیا۔ گھٹنوں اور کہنیوں پر لگنے والی رگڑوں سے بے اختیار زبان سے مغلظات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ان مغلظات میں بہلول اور اپنی اہلیہ کے نام بھی ڈھیروں حصہ تھا۔ اسی لمحے اسے اپنے پاس کسی گھڑسوار کی آمد کا احساس ہوا۔ ابوعبیدہ نے فوری طور پر اپنی زبان کو لگام دے کر خاموش کروایا اور چہرے پر مسکینیت طاری کر لی۔ گھڑسوار فوری طور پر گھوڑے سے اترا اور کتابیں جھاڑ کر اکٹھی کرتے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں لگی آپ کو محترم؟'' گھڑسوار کا انداز نرم اور لہجہ بے حد شائستہ تھا۔

ابوعبیدہ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے سامنے وزیر ابن ربیع موجود تھا۔ ابوعبیدہ نے فوری طور پر متانت و بردباری کا لبادہ اوڑھ لیا۔

''پروردگار آپ کو سلامت رکھے۔ جب انسان صراطِ مستقیم پر گامزن ہو تو ایسی ٹھوکریں آزمائش بن کر ضرور سامنے آتی ہیں۔'' اس نے فلسفہ جھاڑا۔

ابن ربیع بھی اس کی بات پر چونک گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش دکھائی دینے لگا تھا۔

''کیا آپ صراط مستقیم کی حقیقت اور نوعیت سے واقف ہیں؟'' ابن ربیع نے دریافت کیا۔

''جی ہاں! بہت اچھی طرح۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ چہرے کی متانت اور اپنی علمیت کا کروفر کچھ مزید دبیز ہو گیا۔

''بہت خوب! پروردگار نے آپ کو مجھ سے ملوا کر میری ایک مشکل آسان کر دی ہے۔ آپ اگر کہیں مصروف نہیں ہیں تو میرے ساتھ دربار میں چلیے۔ خلیفہ کو ایک فوری سوال کا جواب درکار ہے۔'' ابن ربیع پُرجوش ہوا۔

''خلیفہ کا اقبال ہمیشہ بلند رہے۔ وہ کچھ حاسدین کی سازشوں کے باعث مجھ سے بدگمان ہیں۔ کیا وہ میرا تعاون قبول فرما لیں گے؟'' ابوعبیدہ نے دانستہ بے بسی ظاہر کی۔

''وہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں محترم! میں سب سنبھال لوں گا۔ دراصل خلیفہ نے ایک خواب دیکھا ہے کہ وہ کسی بیابان میں مقید ہیں۔ بھوک اور پیاس نے ان پر شدید ستم ڈھا رکھا ہے۔ صیاد کا کہیں کوئی نام و نشان نظر نہیں آرہا۔ ان کی گھبراہٹ اور اضطراب بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اسی وحشت میں انہیں غیب سے ایک آواز سنائی دیتی ہے جو ان سے مخاطب ہو کر کہتی ہے اے ہارون! صراط مستقیم اختیار کر لو تو ایسی ہر مشکل سے رہائی پا لو گے۔ صراطِ مستقیم بہر صورت اختیار کرنا ہوگا ورنہ تمہارے مصائب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ خلیفہ یہ خواب دیکھنے کے بعد بہت بے سکون ہیں۔ انہیں صراط مستقیم کی وضاحت درکار ہے...... مکمل اور بھرپور وضاحت۔'' ابن ربیع نے بتایا۔

''کیا دربار سے منسلک علماء میں سے کسی نے ان کی مشکل آسان نہیں کی؟'' ابوعبیدہ کو حیرانی ہوئی۔

''خلیفہ کو مطمئن کرنا کیا بہت آسان سمجھتے ہیں آپ؟ کوئی بھی جواب، فلسفہ یا دلیل انہیں مطمئن ہی تو نہیں کر پا رہی ہے۔ اگر آپ نے ان کی یہ مشکل آسان کر دی تو انعام و اکرام ہی نہیں بلکہ دربار میں کوئی اعلیٰ عہدہ بھی دلوا دوں گا۔'' ابن ربیع نے اسے ترغیب دی۔

ابوعبیدہ کی آنکھوں میں ایک ہی پل میں ڈھیروں خواب اتر آئے۔ دربار سے انعام حاصل کرنے کے بعد وہ

اپنی بیوی کی پُرزور فرمائشیں پوری کرسکتا تھا۔ بہترین کھانا' مشروب اور قیمتی لباس لے کروہ یقیناً بہلول کی مدح سرائی بھول جاتی۔ ایک بار اگر خلیفہ کو متاثر کرنے میں کامیابی مل جاتی تو مستقبل میں دونوں شہزادوں کا اتالیق بھی مقرر ہوسکتا تھا۔ خوابوں کا قافلہ آنکھوں میں اترتا رہا۔ ابوعبیدہ دل میں ڈھیروں ارمان لیے ابن ربیع کے ہمراہ دربار میں پہنچ گیا۔ ابن ربیع نے خلیفہ کو قائل کرکے ابوعبیدہ سے گفتگو کے لیے راضی کر لیا۔ خلیفہ نے اپنا سوال اس کے سامنے رکھ دیا۔

''صراطِ مستقیم کیا ہے ابوعبیدہ؟''

''امیر المومنین!صراطِ مستقیم حق اور باطل کے درمیان ایک حد بندی ہے۔'' اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

''اس بات کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟ مجھے وہ خواب کیوں دکھائی دیا؟''

''کیونکہ امیر المومنین حق پر ہیں۔ آپ کی راہ' سوچ اور نظریات شفاف ہیں۔'' اس نے متانت کا دامن تھامے رکھا۔

''تو تمہارا مطلب ہے کہ میں حق پر ہوں اور میرا دشمن باطل ہے۔'' ہارون نے پوچھا۔

''اس بات میں کوئی شک ہی نہیں عالی جناب!'' وہ فوراً بولا۔

''حق اور باطل میں اگر معرکہ ہو تو فاتح کون رہتا ہے؟'' خلیفہ نے اگلا سوال کیا۔

''تاریخ گواہ ہے امیر المومنین!فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے اور باطل شکست کھا کر نابود ہوجایا کرتا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو سیبین میں ولید شیبانی نے ہمیں شکست کیوں دے دی؟''

''ایسا کئی ایک بار ہوجایا کرتا ہے میرے آقا!حق کی آزمائش کے لیے کبھی اسے شکست کا مزہ بھی چکھنا پڑتا ہے۔ آپ کی آزمائش ختم ہوچکی ہے۔ اب فتوحات ہی فتوحات آپ کی منتظر ہوں گی۔'' اس نے سوچ کر جواب دیا۔

''نہیں ابوعبیدہ!تمہارے دلائل مجھے مطمئن نہیں کر پا رہے۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ تمہاری حیثیت کسی کمہار کی سی ہے جو ہر برتن کو اپنی مرضی کے مطابق سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ تم بھی اسی طرح ہر بات صرف میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کررہے ہو۔'' ہارون جھنجلا کر بولا اور اسے وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کردیا۔

''وہب دربار میں آئے تو اسے میرے پاس لازمی لے کر آنا۔ مجھے لگتا ہے اس بات کو گھما پھرا کر' میری خوشنودی کے حصول کا رتی بھر احساس نہ کیے بغیر صرف وہی حقیقت واضح کرسکتا ہے۔'' ہارون نے ابن ربیع کو حکم دیا۔

وہب کچھ ہی دیر بعد اپنے گھوڑے پر سوار وہاں چلا آیا۔ خلیفہ نے اپنی الجھن بیان کی تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں سر کھجاتے ہوئے کسی چوڑے اور قدرے گہرے برتن میں پانی گرم کرکے لانے کی فرمائش کردی۔ اس کا مطالبہ پورا کردیا گیا۔ اس نے اپنا گھوڑا ایک جانب رکھا اور برہنہ پاؤں پانی میں کھڑا ہوگیا۔ اس کے قدموں اور وجود میں پانی کی حدت سے لغزش بھی پیدا ہوئی تاہم اس نے حیران کن قوتِ ارادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سنبھال لیا۔

''میرا نام وہب ابن عمرو ہے۔ میری خوراک کھجور اور جو کی روٹی ہے۔ میرا مشروب سادہ پانی اور لباس اون سے بنا ہوتا ہے۔'' اس نے ہارون کی سوالیہ نظروں کو نظرانداز کرکے برتن سے پاؤں باہر نکالے اور سنجیدگی سے بولا۔

''اب آپ کو بھی یہی عمل دہرانا ہوگا۔''

ہارون نے تذبذب سے پاؤں برتن میں رکھے اور پانی کی حدت سے بلبلا کر رہ گیا۔ کچھ لمحوں میں خود کو سنبھالنے کے بعد وہ دوبارہ اس برتن میں کھڑا ہوگیا۔

''میرا نام ہارون الرشید ہے۔ میری خوراک......'' و اتنا کہہ کر اس برتن سے باہر آ کھڑا ہوا۔ چہرے پر اذیت کرب کے آثار نمایاں تھے۔

''رک کیوں گئے؟ عمل مکمل کرنا ہوگا۔'' ابو وہب مسکرایا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کھولتے ہوئے پانی میں کھڑے ہوکر میں اپنے دوسو اقسام کے کھانوں' بیسیوں اقسام کے مشروبات اور تیس اقسام کے ملبوسات کا ذکر کروں۔'' جھنجلا کر بولا۔

''یہی صراطِ مستقیم ہے اور یہ ردِعمل اس کی حقیقت۔ اگر انسان دنیاوی خواہشات کے بوجھ سے لدا ہوگا تو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار پل صراط پر ڈگمگا جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔ اس دنیا میں تمنائیں کچل کر جو ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اور یہی راہِ آخرت میں بھی کامیابی ذریعہ ہے۔''

وہب کی اس سادہ سی منطق پر خلیفہ کی الجھن مکمل دور کر ایک اور نئی تشویش میں ڈھل گئی۔ اسے صراطِ مستقیم حقیقت ہولا رہی تھی۔

☆☆☆

قاضی جنید بازار کرخ میں موجود تھا۔ اس کی توجہ بظا مختلف دکانوں اور دکانداروں پر تھی لیکن ذہنی ارتکاز بہلول جانب ہی تھا۔ اسے داروغہ کا مشورہ بے حد پسند آیا تھا تاہم اس معاملے میں صرف اسی پر اکتفا کرکے نہیں رہ سکتا تھا۔

نے اپنے طور پر بھی بہلول کے خلاف مختلف افراد کی معاونت حاصل کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس ضمن میں کوئی مربوط حکمتِ عملی تو ذہن میں نہ تھی البتہ اس کی انصاف پسندی اور منطق سے متاثرہ افراد کو اسی کے خلاف استعمال کرنے کا تہیہ ضرور تھا۔

بازار میں پھرتے پھراتے وہ خزیم ابن عامر کی دکان پر جا نکلا۔ خزیم اور بہلول نے اسے کچھ عرصہ قبل ہی یادگار چوٹ پہنچائی تھی۔ خزیم نے اپنے کاروباری حالات میں مندی کے باعث ایک یہودی سے سود پر قرض لیا تھا۔ وہ اس رقم سے اپنی دکان میں مال بھرنا چاہتا تھا لیکن بصرہ سے واپسی پر ایک حادثے میں وہ سارا مال پانی کی نذر ہو گیا۔ حرملہ نے رقم کی واپسی کی ضمانت میں خزیم کا بدن گروی رکھا ہوا تھا۔ اس نقصان کے بعد جب رقم کی واپسی کی کوئی امید نہ رہی تو وہ اس کے بدن سے گوشت کا ٹکڑا حاصل کرنے کے درپے ہو گیا۔ معاملہ جنید تک پہنچا۔ اقرار نامے پر قرض لیتے وقت خزیم کے کیے گئے دستخط دیکھنے کے بعد جنید نے حرملہ کو گوشت لینے کی اجازت دے دی۔ اس موقع پر وہب نے اپنی منطق سے وہ اقرار نامہ باطل ثابت کر دیا۔ اس کا کہنا تھا حرملہ اس انداز میں گوشت بدن سے الگ کرے کہ خون کا ایک بھی قطرہ نہ نکل پائے۔ شرط نامے پر گوشت کاٹنے کی شق درج تھی۔ اس میں خون کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

اس کے بعد کچھ عرصہ تو خزیم بہلول کے گن گاتا اس پر اعتماد کا اظہار بھی کرتا رہا تاہم اپنی بدنیتی کے باعث وہ بہلول کی منطق، انصاف پسندی اور دلائل کی تیز دھار چھری تلے آہی گیا۔ اس نے اپنے پڑوسی کی التجا پر اس کے زیتون کا درخت اپنے آنگن میں پروان چڑھایا۔ آبیاری میں پڑوسی کی مدد بھی کی لیکن درخت پر پھل آتے ہی نیت میں کھوٹ آ گیا۔ وہب نے اس معاملے کا فیصلہ پڑوسی کے حق میں ہی صادر کیا تھا۔

اس حالیہ واقعے کے بعد خزیم بہلول سے خار کھانے لگا تھا۔ قاضی جنید کو اپنی دکان میں دیکھ کر خزیم نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے اس کا خوشدلی سے استقبال کیا۔ قاضی بھی چرب زبانی اور شیریں بیانی سے اس کا احوال دریافت کرنے لگا۔

”تمہارا کاروبار کیسا چل رہا ہے ابن عامر؟“ قاضی نے بڑی محبت سے پوچھا۔

”بس دو وقت کی روٹی ہی پوری ہو پاتی ہے۔“ خزیم بے دلی سے بولا۔

”کسی نئے کاروبار کا کیوں نہیں سوچتے؟“

”مجھے سرمایہ کون فراہم کرے گا؟ بازار کرخ میں کاروباری طور پر بدنصیب ترین شخص میں شمار ہوتا ہے میرا۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالوں نقصان ہی اٹھاتا ہوں۔“ وہ سخت دکھی تھا۔

”سرمایہ... میں فراہم کر دیتا ہوں۔ میں بھی ایک نیا کاروبار کرنے کا سوچ رہا ہوں۔ ایک سے بھلے دو۔ لوہے کے کاروبار کی بغداد میں بہت مانگ ہے۔ تم چاہو تو اپنی یہ دکان فروخت کر کے ذاتی سرمایہ بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

”یہ دکان مجھے ورثے میں ملی تھی۔ میں اسے کیسے فروخت کر دوں؟ اسی کام کا تو تجربہ ہے بس مجھے۔“ اس کی ہٹ دھرمی قاضی کو طیش میں مبتلا کرنے لگی۔

”کچھ دن اچھی طرح سوچ بچار کر لینا۔ اس کام میں بے حد منافع ہے۔“ وہ اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے دکان سے نکلتے ہی ایک گاہک چلا آیا۔ خزیم اس کا چہرہ دیکھ کر حیرت و خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے سامنے ایک دیرینہ دوست جعفر ابن درید کھڑا تھا۔

”تم تو عید کا چاند ہی ہو گئے تھے جعفر! کتنے عرصے بعد گرگان سے لوٹے ہو۔“ خزیم اس سے بغلگیر ہوا۔

”بس وہاں بھیڑ بکریاں پالتے اور اون، گوشت، دودھ کا کاروبار کرتے وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ کچھ روز پہلے ہی بغداد آیا ہوں۔“ جعفر نے اسے بتایا اور پھر اپنے ذہن میں در آنے والی الجھن کو گویائی دیتے ہوئے بولا۔

”یہ قاضی جنید تمہارے پاس کیا کر رہا تھا؟ مجھے تو لگتا تھا کہ اتنے برسوں میں شاید اس کی حرکات میں کوئی تبدیلی آ گئی ہو لیکن یہ تو آج بھی اتنا ہی متکبر ہے۔“ جعفر نے ناگواری سے پوچھا۔ وہ اس کا دیرینہ ہمسایہ تھا اور اسی کی زمین پر ناجائز قبضے کی بدولت قید خانے کی سیر بھی کر چکا تھا۔

”میرے پاس لوہے کے کاروبار میں شراکت داری کی پیشکش لے کر آیا تھا۔ میں نے انکار کر دیا اس لیے لوٹ گیا۔“ خزیم نے بیزاری سے بتایا۔

”لوہے کا کاروبار تو میں نے بھی شروع کرنا ہے میرے دوست!“ جعفر نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔ ”میں نے ایک تاجر سے کافی بھاری مقدار میں لوہا خریدا ہے۔ ابھی مجھے کچھ ضروری معاملات نمٹانے اور گرگان والے مکان کی فروخت کے لیے مختصر عرصے کے لیے وہاں جانا ہو گا۔ میں اپنا یہ سامان تمہارے پاس بطور امانت رکھوانا چاہوں گا۔“

”بے فکر ہو کر جاؤ میرے عزیز! اور کامیابی سے واپس لوٹو۔ تمہارا سامان میرے پاس محفوظ رہے گا۔“ خزیم نے اسے بھرپور یقین دلانے کے بعد رخصت کر دیا۔ اس کے

ذہن میں انتشار برپا ہو چکا تھا۔ جعفر کی سابقہ غربت اس سے
پوشیدہ نہ تھی۔ اس لیے قدرے خوشحالی اور نئے کاروبار کے
لیے ذخیرہ دیکھ کر وہ فطری طور پر جلن محسوس کرنے لگا۔

جعفر نے اگلے ہی روز اپنا مال اس کے حوالے کیا
اور گرگان کے لیے پر تولنے لگا۔ روانگی سے کچھ دیر پہلے
اس کی وہب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے محسن و کرم
فرما کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور حالیہ فیصلے سمیت تمام
تر حالات اس کے گوش گزار دیے۔

''خزیم پر اعتبار کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے اے
جعفر! وہ شخص اب کافی بدل گیا ہے۔'' وہب نے اس کی بات
کے اختتام پر اتنا ہی کہا۔

''مجھے اس کی ایمانداری پر کوئی شک نہیں۔ وہ میری
امانت میں بالکل خیانت نہیں کرے گا۔'' جعفر پُراعتماد تھا۔
وہب نے خاموشی پر ہی اکتفا کیا۔

جعفر کے گرگان روانہ ہوتے ہی اس کے خدشات مجسم
صورت اختیار کر گئے۔ خزیم نے اس کا مال تھوڑی
مقدار میں اپنی دکان پر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ گاہکوں کا
تانتا بندھنے لگا۔ قاضی جنید اس کا یا پلٹ پر حیران تھا کہ خزیم
کے پاس گاہکوں کا جم غفیر کیوں آنے لگا ہے۔ حقیقت سے
آگاہی پر اسے غصہ تو آیا لیکن مصلحت کا مظاہرہ ہی بہتر سمجھا۔
خزیم نے لوہے کی فروخت میں اس کا بھی معقول حصہ مقرر کر دیا۔
دونوں فریقین راضی خوشی وقت بسر کرنے لگے۔ اس لالچ اور
بھاگ دوڑ میں قاضی کو خلیفہ کی جانب سے ملنے والی مہلت کا وقت
بھی بیت گیا۔ جنید کو فوری طور پر دربار میں طلب کر لیا گیا۔

''تمہاری تحقیق اور ثبوت کیا ہوئے قاضی جنید؟ ابھی
تک اپنے دعوے کا ایک بھی گواہ پیش نہیں کر سکے تم۔'' خلیفہ
نے اپنے سامنے کھڑے لرزاں و خائف جنید سے کہا۔ ''جبکہ
مجھے مصدقہ اطلاعات ملی ہیں کہ تم نے کسی دکاندار کے ساتھ مل
کر گرگان کے رہائشی جعفر کا مال ہڑپ کیا ہے۔ تم خزیم نامی
دکاندار سے اس مال کی فروخت میں حصہ لیتے رہے ہو۔''

''امیر المومنین! میں ابو عبیدہ مصری کو آپ کے
سامنے......'' اس نے فوراً وضاحت کرنی چاہی۔

''کون ابو عبیدہ؟ اچھا وہ احمق جس نے پہلی بار وہب
سے مناظرے میں شکست کھائی تھی اور پھر میرے سامنے
صراطِ مستقیم کے متعلق ناقص دلائل پیش کرتا رہا۔ تمہیں لگتا ہے
کہ ہم اس فاسق کی گواہی قبول کر لیں گے؟''

خلیفہ کے تاثرات پر قاضی بے بسی سے بل کھا کر رہ
گیا۔ اسے کوشش کے باوجود کوئی معتبر گواہ نہ مل پایا تھا۔ اس

پر مستزاد جعفر ابن درید کا مال ہڑپنے کی خبر نے اسے مزید
معتوب ٹھہرا دیا۔ وہ اپنے بچھائے گئے جال میں پھنس کر...
کھودے گئے گڑھے میں خود ہی جا گرا تھا۔

''امیر المومنین! آپ کا اقبال سدا بلند رہے۔ آپ کی
سلطنت وسعت اختیار کرے۔ مجھے بس ایک موقع عطا
کیجیے۔ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دوں گا۔'' اس نے
گھگیا کر کہا۔

''بالکل نہیں! تمہارا ٹھکانا ہمارا زندان ہے اور یہی ہمار
حتمی فیصلہ ہے۔'' ہارون الرشید نے مسرور کو اشارہ کیا۔ وہ اسے
گھسیٹتا ہوا قید خانے میں لے گیا۔

☆☆☆

قاضی جنید کی گرفتاری اور قید داروغہ سعد کے لیے ذاتی
صدمہ ثابت ہوئی۔ اسے بھی اپنے خوابوں کا شیش محل بر
طرح چکنا چور ہوتا محسوس ہوا۔ بہلول کے لیے غصہ اور نفرت
اپنے اصل ماخذ سے کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ اس شخص کو کسی بھی طرح
نیچا دکھا کر خلیفہ کی نظر میں معتوب ٹھہرانا چاہتا تھا۔ سعد
وہب کے تعاقب میں اضافہ کر دیا۔ وہ اپنے دیگر امور او
ذمے داریاں ترک کیے کسی سائے کی طرح اس کے پیچھے
رہتا۔ وہب سعد کے عزائم اور حرکات سے واقف تھا لیکن
دانستہ طور پر نظر انداز کیے اپنے روزمرہ کے معاملات میں
مشغول رہتا۔ سعد خلیفہ کو اس کے بارے میں کوئی نہ کو
متنازعہ خبر فراہم کرنے کے درپے تھا۔

عین ممکن تھا کہ سعد کو اس مقصد میں کسی طرح کامیابی
ہی جاتی لیکن بغداد کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ خود خلی
کا ذہن بھی اس نئی صورتِ حال کی طرف مبذول ہو گیا۔ ہارو
الرشید کے لیے ناک کا بال سمجھے جانے والے ''جعفر برمکی''
بارے میں کوئی انتہائی فیصلہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

ہارون الرشید کے دورِ اقتدار میں برمکی خاندان کا
حد عمل دخل تھا۔ فارس سے تعلق رکھنے والا یہ خاندان اصلاً آ
پرست تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد جعفر بن جاماس نے
منتقلی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ جعفر کے فرزند خالد
نے بغداد کو حقیقی معنوں میں عروج بخشا۔ بغداد کی
درحقیقت خالد ہی کے ذوقِ تعمیر کا نتیجہ تھا۔ عالی شان عمار
دیدہ زیب محل، قصر الذہب، قبۃ الخضر، جامع مسجد جیسی شا
عمارات خالد برمکی ہی کی پانچ سالہ ان تھک محنت کا نتیجہ
اس کے بعد یحییٰ برمکی، فضل برمکی اور پھر جعفر برمکی نے بھی
سلطنت کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔
محلات کا خزانچی، محاسب اور گوناگوں خصوصیات کا مالک

سلطنت کے عہدیداران کے نام شاہی احکام وفرامین پر اسی کے دستخط ثبت ہوتے تھے۔ خلیفہ کے اس خاندان پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ امین الرشید فضل بن یحییٰ اور مامون الرشید جعفر برمکی کے زیر تربیت تھا۔ برسہابرس سے ہارون الرشید کے لیے خدمات سرانجام دیتے برمکی خاندان ''بادشاہ گر'' کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ ان کے اختیارات اور دولت وجاگیر کی کوئی حد نہ تھی۔ اقتدار کے خمار میں جعفر نے مامون الرشید کو ولی عہد بنانے کی راہیں ہموار کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس خواہش کا ایک پس منظر بہرحال مامون کی والدہ مراجل کا فارسی النسل ہونا بھی تھا۔ دھیرے دھیرے عرب وعجم کا تنازعہ بھی پروان چڑھنے لگا۔ جعفر کی من مانیاں بڑھتی گئیں۔ ہارون الرشید خود کو عضوِ معطل بھی محسوس کرنے لگتا۔ اس پر مستزاد امین الرشید کی والدہ زبیدہ کا دباؤ اس سے سوا تھا۔ حالات بہت تیزی سے ابتری کی طرف مائل تھے۔ ہارون کے لیے مسائل میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ بے بسی اور لاچاری کی یہ کیفیات اس وقت شدید غضب میں ڈھل گئیں جب جعفر نے یحییٰ بن عبداللہ الحسنی نامی ایک باغی قیدی کو ہارون کی لاعلمی میں آزاد کر دیا اور بعدازاں اس سے غلط بیانی کرتا رہا کہ یحییٰ تا حال قید میں ہے۔ ہارون الرشید کی ذہنی کشمکش بڑھتی گئی۔ جعفر کی خدمات' کارنامے' وفاداری اور اخلاص بالآخر اس بدگمانی اور غیظ وغضب میں فراموش ہو گئے اور مسرور نے خلیفہ کے حکم پر اس کا سر قلم کر دیا۔ جعفر کی ہلاکت کے بعد برمکی خاندان کے دیگر افراد کو بھی پابند سلاسل کر دیا گیا۔ مکانات اور مال و اسباب بھی ضبط کر لیے گئے۔ اس اسباب، نقدی اور جاگیرات کی ضبطی سے تین کروڑ چھہتر ہزار دینار وصول ہوئے۔

جعفر برمکی کا قتل اور دیگر اہلِ خانہ کی قید کوئی معمولی واقعہ ہرگز نہیں تھی۔ اس نئی صورتِ حال نے ہارون الرشید کو اس قدر الجھایا کہ دیگر سبھی امور ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ مملکت کے متعدد مقامات پر بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ بغاوتیں صرف برمکیوں کی حمایت میں نہ تھیں بلکہ کئی دیگر عوامل بھی شاملِ حال تھے۔ مملکت کا رقبہ وسیع تر تھا۔ سازشیں' شکایات معمول سے زیادہ ہو چکی تھیں۔ متعدد صوبے پایہ تخت سے دوری کے باعث سرکشی و بغاوت کی زد میں آگئے۔ ان بغاوتوں کی آتش سرد کرنے میں ہارون الرشید کو دانتوں پسینا آیا۔ اس کا دھیان وہب بن عمرو سے قدرے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

وہب اپنے معمول کے گشت پر بازار کرخ میں موجود تھا۔ گزشتہ برسوں نے اس کے معمولات اور عوامی خدمت کے جذبات پر رتی بھر فرق نہیں ڈالا تھا۔ وہ مملکت کے منتشر حالات کے باوجود اپنے مشاغل میں تندہی سے ہی مصروف رہا تھا۔ اسی گھڑسواری میں اس کے سامنے اقسم چلا آیا۔

''مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے بہلول!''

''پھر کسی گاہک سے تو نہیں الجھ بیٹھے؟'' وہب نے شرارتاً کہا۔

''ارے نہیں! میں نے یہ راستہ ترک کر دیا ہے اب۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''خبر نا قابل یقین سہی لیکن خیر کی ہے۔ پروردگار یہ توفیق داروغہ اور منکش ابن مظاحم کو بھی عطا فرمائے۔'' وہب نے گہری سانس لی۔

''میں نے ایک شخص کو تمہارے بارے میں تفتیش کرتے دیکھا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے شاید۔'' اقسم نے بتایا۔

''مجھ سے کون ملنا چاہے گا بھلا؟ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' وہب نے بے نیازی سے کہا۔

''اس کا نام جابر کوفی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ کوفہ میں برسوں قبل وہب بن عمرو سے ملاقات ہوئی تھی اور اب اس سے دوبارہ ملنے کا خواہشمند ہے۔'' اقسم اب بھی پُر یقین تھا۔

وہب کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرا گیا۔ اسے اپنے اس دیرینہ دوست کے تصور نے ہی بے چین کر دیا تھا لیکن وہ اقسم کے سامنے کوئی بھی ردعمل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ہوگا کوئی۔ کسی اور کو ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میں اب چلتا ہوں۔ میرے گھوڑے کے گھاس کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا اور اپنی رہائش گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا ارتکاز جابر کوفی کی طرف ہی تھا۔ کوفہ میں اس کے سنگ بیتے لمحات خوشگوار اور یادگار تھے۔ افسردگی اور بے چینی سے گھر کی مسافت طے کرتے ہوئے وہ ایک اجنبی کی آمد سے چونک گیا۔

''وہب؟ یہ تم ہو...... میرے خدا! کیا یہ واقعی تم ہو؟'' ایک شناسا آواز نے ساکت قدم مزید جکڑ لیے۔ اس کے سامنے جابر کوفی کھڑا تھا۔ وہب اپنا بہروپ قائم رکھنے کی اداکاری جاری نہ رکھ سکا۔ اس کا ضبط ایک ہی پل میں بکھر گیا تھا۔

''ہاں میرے دوست! یہ واقعی میں ہی ہوں۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

''کیا حالت بنالی ہے تم نے اپنی؟'' جابر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''محبت ایسی ہی ہوتی ہے میرے عزیز! وہ بس ایسے

ہی خراج مانگتی ہے۔" وہب مسکرایا اور قرب وجوار کا جائزہ لیتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ایک قبرستان لے گیا۔

"یہ کہاں لے آئے ہو مجھے؟" جابر ایک بار پھر حیران ہوا۔

"صرف یہی ایک جگہ ہے جہاں ہم آرام سے بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔ ورنہ بغداد میں میرے عقب میں ہمہ وقت نگراں آنکھیں اور سماعتیں منتظر ہوتی ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"مجھے تمہیں دیکھ کر بصارت پر یقین ہی نہیں آرہا کہ تم وہی وہب بن عمرو ہو۔" جابر نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

"مجھے خود بھی علم نہیں کہ میں وہی ہوں یا اس کی کوئی پرچھائیں لیکن اب یہی زندگی ہے اور مجھے ایسے ہی جینا ہے۔" وہب نے دھیرے سے کہا اور اپنے اس سفر کے پس منظر کی بابت بلا کم وکاست بتا دیا۔ جابر کوئی گنگ ہو چکا تھا۔

"برمکی خاندان کے ساتھ بھی برا ہوا بہر حال۔" جابر نے کہا۔

"یہی اصول فطرت ہے۔ بادشاہوں کی نوازشیں کب عتاب میں بدل جائیں علم ہی نہیں ہوتا۔ ہر عروج کو زوال ہے۔ برمکیوں کے اقتدار کا سورج کبھی نہ کبھی تو غروب ہونا ہی تھا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"ہارون الرشید آج کل بغداد میں نہیں ہے کیا؟"

"نہیں! خراسان میں بغاوت جاری ہے۔ شنید ہے کہ وہاں کا گورنر بے رحمانہ استحصال اور بدعنوانی کا مرتکب ہوا ہے۔ اسی کی سرکوبی کے لیے گیا ہے۔" وہب نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"اس مسکراہٹ کی کیا وجہ ہے میرے دوست؟" جابر آج حیرت کے پے در پے جھٹکے برداشت کر رہا تھا۔

"ان بادشاہوں کی قسمت پر ہنسی آتی ہے۔ خود کو مطلق العنان سمجھتے ہیں اس کے باوجود بھاگ دوڑ بے چینی اور اضطراب سے فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ ہارون الرشید کی بھی یہی قسمت ہے۔ بے شمار جنگیں لڑیں۔ روم میں نقفوز سے جنگ کی۔ بغداد میں برمکیوں کے حمایتیوں سے الجھتا رہا۔ اب خراسان گیا ہے۔ مستقبل میں بھی جانے کتنے فتنے برپا ہوتے رہیں گے اور وہ انہیں کچلنے کے لیے یونہی بھاگ دوڑ کرتا رہے گا۔ ان سب سے اگر کبھی فرصت ملی تو اپنے جاسوسوں سے تفتیش کرے گا کہ انہیں میرے متعلق کیا خبر ملی ہے۔" وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔

"اور اگر کبھی اسے علم ہو گیا کہ تم نے یہ بہروپ دانستہ طور پر اختیار کر رکھا ہے تو......؟" جابر نے پوچھا۔

"تو قید یا موت میرا مقدر ہو گی۔ اس سے زیادہ کیا نقصان ہو سکتا ہے مجھے؟"

"تمہیں ایسی صورت حال سے کبھی خوف محسوس نہیں ہوتا؟" جابر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں! خوف کیسا؟ یہ تو تمہیں بھی علم ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم اچھی اور بری تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ میری تقدیر میں جو بھی ہوا ل جائے گا۔ ابھی میں صرف اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر بغداد کی تاریکی دور کرنا چاہتا ہوں۔" وہب اب بھی بے نیاز تھا۔

وہ رات قطرہ قطرہ پگھلتی رہی۔ جابر اور وہب اپنے خوشگوار دنوں کی یادیں تازہ کرتے طلوع فجر تک وہیں بیٹھے رہے اور پھر ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

بغداد کے گلی کوچوں میں وہب بن عمرو کی گھڑسواری اور شرپسند عناصر کی سرکوبی یونہی جاری رہی۔ بہلول بغداد کا ایک ہر دلعزیز کردار بن چکا تھا۔ بچے بوڑھے جوان سبھی کے دلوں میں عقیدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک سال بعد ہی اسی بھاگ دوڑ اور تندہی کے دوران 190ھ میں موت کا آہنی شکنجہ اس کی روح دبوچ کر اپنے ہمراہ لے گیا۔ اسے کرخ ہی کے ایک قبرستان "طور" میں دفنایا گیا۔

☆☆☆

اس کے بارے میں چند روایات بہر حال یہ بھی موجود ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید خراسان کی مہم پر روانگی سے قبل اس کی حقیقت اور بہروپ سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اس نے وزیر ابن ربیع کی زیر نگرانی میں وہب کو اسی کے گھر میں نظر بند کروا دیا تاکہ خراسان سے واپسی پر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ ان روایات کے تسلسل کی کڑی مربوط نہیں۔ محمد بن اسحاق النہوی نے کتاب الفاول فی صنعا الاداب الکامل میں وہب بن عمرو کی وفات خلیفہ ہارون الرشید کے انتقال سے چار سال بعد 197ھ میں لکھی ہے۔

ماخذات:

بہلول دانا...پیام ٹی وی۔ بہلول دانا...سیدہ عابدہ نرجس۔ خلیفہ ہارون الرشید اور ان کا عہد...رئیس احمد جعفری۔ ہارون رشید...پامر۔ تاریخ اسلام عہد عباسیہ... ابن تاثیر۔ البرامکہ...اعلام الناس

مارتھر پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ تیز رفتاری سے آگے بڑھے مگر جس پہاڑی علاقے میں وہ محوِ سفر تھا وہاں اس وقت دس فٹ سے بھی زیادہ برف کی تہ موجود تھی اس لیے تیز رفتاری سے آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ آگے بڑھتے وقت اس کے پیر بار بار زمین میں دھنس رہے تھے۔ اگر اس نے برفانی علاقے میں چلنے والے مخصوص جوتے نہ پہن رکھے ہوتے تو شاید چند قدم چلنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ اس وقت وہ جس علاقے میں سفر کر رہا تھا وہاں کا درجۂ حرارت مائنس بیس ڈگری تھا۔ وہ ایک کوہ پیما تھا یہ درجہ حرارت برداشت کرنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہ تھا مگر اصل مشکل تو کچھ دیر بعد شروع ہونے والی تھی جہاں اسے انتہائی تیزی سے بدلنے والے ٹیمپریچر کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ جس

جنوں

شاکر لطیف

عشق میں اکثر انسانوں نے بڑی بڑی یادگار مثالیں قائم کی ہیں... خوش نصیبی ہے ان لوگوں کی جن کے حصول کے لیے کوئی اپنی جان کی بازی لگادے... اس کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا جن کی جنوں خیزی کسی کو حیران اور کسی کو پریشان کردیتی ہے۔

حبیب اور حریف کے مابین محبت اور سازشوں کی معرکہ آرائی

علاقے میں داخل ہونے والا تھا، اس جگہ کا شمار دنیا کے بلند ترین پہاڑی مقامات میں تو نہیں کیا جاسکتا تھا تاہم دنیا کے چند سرد ترین پہاڑی مقامات میں ضرور کیا جاسکتا تھا۔ مارتھر یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ جس علاقے میں داخل ہونے والا ہے وہاں کا درجۂ حرارت مائنس ساٹھ ڈگری سے بھی نیچے ہوگا اور تقریباً سو کلومیٹر تک اسے اسی درجۂ حرارت کا سامنا کرنا پڑے گا چنانچہ اسے مسلسل آگے بڑھتے رہنا ہوگا کیونکہ رکنے کا مطلب تھا موت......!

اگر وہ اس علاقے میں کچھ دیر کے لیے ستانے کے لیے رک جاتا تو اس کی رگوں میں موجود خون منجمد ہو جاتا جس کے بعد اس کا کیا انجام ہوتا وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اس سے پہلے وہ اپنے سفر کے دوران ٹھہر کر آرام کرتا رہا تھا اور اس نے آگ جلا کر خود کو حرارت بھی پہنچائی تھی مگر اب وہ جس علاقے میں داخل ہو رہا تھا، وہاں تیز برفانی ہوا کی وجہ سے آگ جلانا ہی ناممکن تھا اس لیے مسلسل سفر کے سوا اس کے پاس کوئی دوسرا چارہ نہ تھا۔ بظاہر یہ ایک مشکل بلکہ ناممکن کام لگ رہا تھا مگر مارتھر کی زندگی کا دارومدار اسی ایک نکتے پر تھا کہ وہ اپنے سفر کو جاری رکھتا۔ اسے تقریباً چھ سو کلومیٹر کا علاقہ پار کرنا تھا۔ اس سفر پر روانہ ہوئے اسے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ ایک ایسے کام کو پورا کرنے نکلا تھا جسے آج تک کوئی پورا نہیں کر پایا تھا۔ آج تک جس نے بھی اس علاقے کو پیدل پار کرنے کی کوشش کی تھی وہ یا تو اپنی جان گنوا بیٹھا یا پھر اگر اسے ریسکیو کر بھی لیا گیا تھا تو پھر بھی شدید سرد علاقے کی وجہ سے اسے اپنے جسم کے کسی عضو سے محروم ہونا پڑا تھا۔

کچھ افراد کی لاشیں بھی دستیاب نہیں ہو سکی تھیں۔ مہم جوئی کے شوقین بہت سے افراد اس پہاڑی علاقے میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے تھے۔ مارتھر بھی ایک مہم جو تھا اور وہ ایک ایسی مہم پر روانہ ہوا تھا جسے لوگ پاگل پن کا نام دیتے تھے۔ اگر وہ اس علاقے کو پار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ تاریخ کا پہلا آدمی ہوتا۔

مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کا یہ سفر آف دی ریکارڈ تھا اس لیے کامیابی کی صورت میں بھی یہ بات بس چند لوگوں تک ہی محدود رہنی تھی۔ حکومت کی جانب سے اس جان لیوا راستے پر جانے کی کافی عرصہ پہلے ہی پابندی لگا دی گئی تھی۔

اتنے دنوں کے پُرخطر اور کٹھن ترین سفر کے بعد بھی وہ ابھی تک آدھا سفر ہی طے کر پایا تھا اور اصل پُرخطر سفر کا آغاز تو اب ہو رہا تھا اب جلد ہی اسے مائنس ساٹھ ڈگری کی ٹھنڈ کا سامنا ہونے والا تھا۔ اگرچہ اس نے سردی سے بچنے کے لیے کوہ پیماؤں والا مخصوص لباس پہن رکھا تھا تاہم وہ جانتا تھا کہ اس کے باوجود وہ مائنس ساٹھ ڈگری والے علاقے میں کسی جگہ ستانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ اسے اس حقیقت کا بخوبی ادراک تھا کہ جب تک اس کا جسم حرکت میں رہے گا اس کے جسم میں خون کی روانی برقرار رہے گی اور کسی جگہ بیس پچیس منٹ ٹھہرنے کی صورت میں موت کا سامنا کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی آپشن نہیں ہوگا۔

وہ اپنے دوستوں کی شدید مخالفت کے باوجود اس مہم پر نکلا تھا۔ وہ اس مہم کو سر اس لیے کرنا چاہتا تھا تاکہ لارڈ جارڈن کا دل جیت سکے۔ وہ لارڈ جارڈن کی بیٹی فلاور سے شدید محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ فلاور کے دلی جذبات بھی اس کے بارے میں اسی جیسے تھے۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی مگر ان کے عشق میں ایک رکاوٹ تھی اور اس رکاوٹ کا نام تھا لارڈ جارڈن۔

لارڈ جارڈن خاصی سخت گیر طبیعت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مغرور اور ضدی انسان بھی تھے۔ انہیں اپنی دولت اور خاندانی حسب نسب پر بڑا غرور تھا، شاید اسی وجہ سے وہ مارتھر کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ مارتھر نہ تو ان کی طرح اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور نہ ہی وہ کوئی دولت مند شخص تھا۔ وہ بس لارڈ جارڈن کی اکلوتی بیٹی فلاور کا بچپن کا دوست تھا۔

جب تک یہ بات دوستی تک محدود رہی لارڈ کو کوئی خاص اعتراض نہ تھا مگر جیسے ہی بچپن کی یہ دوستی محبت میں بدلی، لارڈ جارڈن نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا۔

وہ مارتھر جیسے قلاش آدمی کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے پر کسی صورت بھی آمادہ نہ تھے اس لیے انہوں نے فلاور اور مارتھر کی ملاقاتوں پر پابندی لگا دی۔ ایک دو دفعہ لارڈ نے مارتھر کی غنڈوں کے ذریعے پٹائی بھی کروائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ پٹنے کے بعد مارتھر فلاور کا پیچھا چھوڑ دے گا مگر یہ ان کی غلط فہمی تھی انہیں محبت کی طاقت کا ادراک ہی نہیں تھا۔ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ یہ منہ زور جذبہ بسا اوقات انسان کو خوف اور ڈر جیسے خیالات سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

فلاور، مارتھر کا جنون تھی اور لارڈ جارڈن کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ محبت کا جنون کیا ہوتا ہے۔

لارڈ جارڈن اپنی بیٹی کی شادی اس کے بچپن کے ایک دوسرے دوست سے کرنا چاہتے تھے جس کا نام لارنس تھا۔ لارنس صرف فلاور کے بچپن کا ہی دوست نہیں تھا، وہ

مارتھر کا بھی بچپن کا دوست تھا۔ وہ اس کی فلاور سے محبت سے بھی بخوبی آگاہ تھا اور اُس سے کئی بار اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ اگرچہ لارڈ جارڈن اس کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کے خواہش مند ہیں مگر وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ان دونوں کی محبت میں ولن کا رول ادا کرنے کا خواہش مند نہیں ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں اس پر اس کے ماں باپ کا بہت دباؤ تھا۔ اس کے باپ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے فلاور سے شادی سے انکار کیا تو وہ اسے اپنی جائداد سے عاق کر دیں گے۔

مارتھر جواباً اسے یہی کہتا تھا کہ وہ اس کی مجبوریوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ زیادہ دیر تک اس دباؤ کے سامنے نہیں ٹھہر پائے گا تاہم وہ فکر نہ کرے۔ جلد ہی اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا جائے گا۔

مارتھر یہ بھی جانتا تھا کہ لارنس کو اپنے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں خاصی بڑی جائداد ملنے والی تھی۔ وہ اس جائداد سے عاق ہونے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ابھی تک تو وہ اپنے والدین کو ٹال رہا تھا مگر ایک دن اُسے ان کی بات تسلیم کرنا ہی پڑتی۔

مارتھر اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ اگر ابھی تک لارنس اور فلاور کی شادی نہیں ہوئی تھی تو اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ فلاور نے اپنے باپ کے سامنے سرینڈر نہیں کیا تھا، وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

لارنس کو اِس دھمکی سے اثر پڑتا تھا کہ اس کا باپ اُسے جائداد سے عاق کر دے گا مگر فلاور کو لارڈ جارڈن کی جائداد سے عاق کرنے کی دھمکی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے دوٹوک انداز میں اپنے ڈیڈ سے کہہ دیا تھا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف مارتھر سے ورنہ مرتے دم تک کنواری ہی رہے گی۔ اگر وہ اسے عاق کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں، اسے کوئی پروا نہیں ہے۔

لارڈ جارڈن اب اپنی جوان اولاد کے ساتھ زیادہ سختی بھی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ باغی اولاد کے ساتھ سختی اسے مزید سرکش بنا دے گی اس لیے انہوں نے مارتھر کے سامنے فلاور سے شادی کی ایک انوکھی شرط رکھ ی۔ انہوں نے مارتھر کو کہا کہ اگر وہ فلاور سے محبت کرتا ہے ور اگر واقعی فلاور اُس کا جنون ہے تو پھر وہ اس مہم کو پورا کر کے دکھائے جسے آج تک کوئی پورا نہیں کر پایا تھا۔ خود ارڈ جارڈن بھی اِسی مہم کو سر کرنے کی کوشش میں اپنی ایک انگ سے محروم ہوچکے تھے اور اب ان کی ایک ٹانگ مصنوعی تھی۔

مارتھر نے لارڈ جارڈن کی یہ شرط قبول کر لی تھی اور اب اُسے اس کٹھن سفر پر روانہ ہوئے کافی دن ہوگئے تھے۔

مارتھر کو بوقت روانگی ایک عدد ٹرانسمیٹر بھی دیا گیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو کسی بھی وقت ہار مان کر لارڈ جارڈن کا ذاتی ہیلی کاپٹر طلب کرسکتا تھا مگر اس صورت میں اسے لارڈ جارڈن سے ہونے والی ڈیل کے تحت فلاور سے ہمیشہ کے لیے دستبردار ہونا پڑتا اور یہ اُسے کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ یا تو وہ اس پہاڑی علاقے کو سر کر لے گا یا ان پہاڑوں میں ہی ہمیشہ کے لیے کھو جائے گا۔ فلاور کے بغیر زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ وہ موت کو گلے لگا لیتا۔

اس سرد ترین مقام پر صرف سردی ہی مارتھر کی دشمن نہیں تھی، یہاں کا راستہ بھی انتہائی دشوار گزار تھا۔ کسی بھی وقت اس کے پیروں تلے برف کھسک سکتی تھی اور وہ ہمیشہ کے لیے کسی کھائی میں گر کر غائب ہوسکتا تھا۔

اس راستے کو سرد جہنم یا بلیک وے کہا جاتا تھا اور اسے حکومتی سطح پر بھی ناقابل عبور قرار دیا جا چکا تھا۔ لارڈ جارڈن اسے عبور کرنے کی کوشش کرنے والے اور زندہ بچ جانے والے آخری آدمی تھے اور یہ کوشش بھی انہوں نے بیس سال پہلے اپنی جوانی میں کی تھی۔

اب بیس سال بعد مارتھر نے یہ چیلنج قبول کیا تھا۔ فلاور کو جب اس بات کا علم ہوا کہ وہ اس کے ڈیڈ کی باتوں میں آکر ایک خطرناک مہم جوئی کا ارادہ کر بیٹھا ہے تو اس نے مارتھر کو روکنے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ اس کے ڈیڈ نے اسے راستے سے ہٹانے کے لیے بس ایک چال چلی ہے، وہ اسے ہرگز نہیں جانے دے گی۔ رہ گئی شادی کی بات تو وہ دونوں کورٹ میرج بھی کرسکتے ہیں۔ وہ اس شہر کو چھوڑ کر چلے جائیں گے اور کہیں دور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

مارتھر نے فلاور کی یہ بات تسلیم نہیں کی تھی، اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک ماہر کوہ پیما ہے، اس کی زندگی پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے گزری ہے، وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گا۔ وہ لارڈ جارڈن کے ساتھ اسے حاصل کرنے کے لیے ڈیل کر چکا ہے۔

فلاور کے کہنے پر ان دونوں کے بچپن کے دوست لارنس نے بھی اُسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مارتھر کو یقین دہانی بھی کروائی تھی کہ اگرچہ اُس پر اس کی فیملی اور لارڈ جارڈن کی جانب سے شادی کے لیے بہت دباؤ ہے مگر وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ ان دونوں کی محبت میں حائل

نہیں ہوگا۔

مارتھر اپنے بزدل دوست لارنس سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لارنس یہ باتیں صرف فلاور کے سامنے ہی کررہا ہے ورنہ اکیلے میں وہ اس سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ اب اپنی فیملی کا مزید دباؤ برداشت نہیں کرسکے گا اور فلاور سے شادی پر مجبور ہوجائے گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مارتھر نے لارڈ جارڈن کا چیلنج قبول کرلیا تھا۔ لارڈ خاندان کے ایک اصول سے تو وہ بھی اچھی طرح واقف تھا اور وہ یہ کہ یہ لوگ وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ کامیاب رہتا تو پھر لارڈ جارڈن کے پاس اس کی اور فلاور کی شادی کروانے کے سوا دوسرا کوئی آپشن ہی باقی نہیں رہ جاتا۔

اب اس کے بچپن کے جنون کا امتحان تھا۔ اسے اپنی کوہ پیمائی کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنی محبت کے سچے جذبے پر بھی پورا یقین تھا اور ابھی تک اسی جذبے نے اسے ہارنے نہیں دیا تھا ورنہ ٹرانسمیٹر اسے ہار تسلیم کرنے کے لیے ہی دیا گیا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، سردی کی شدت میں یکلخت اضافہ ہونے لگا تھا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کا خون اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ان پہاڑوں پر بڑی کھائیوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے زمینی ہولز بھی موجود تھے، جو بظاہر برف سے ڈھکے رہتے تھے اور جیسے ہی کسی انسان کا پیر اس برف پر پڑتا تھا، وہ اپنے زور میں اس ہول میں جاگرتا تھا۔ سرتوڑ کوشش کے بعد بھی نکلنے میں ناکامی پر یہی ہول اس کی قبر بن جاتا تھا۔

کچھ سوراخ زیادہ گہرے نہیں ہوتے تھے مگر کچھ سوراخوں کی گہرائی کسی کھائی سے کم نہیں ہوتی تھی اس لیے گرنے والے کی سلامتی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ اگرچہ یہ ہولز باہر سے دیکھنے پر دکھائی نہیں دیتے تھے تاہم برف کے نیچے چھپے ہوئے ان ڈیتھ ہولز کو باہر سے جانچنے کی کچھ نشانیاں بھی تھیں۔ عموماً ایسے سوراخوں کے اوپر موجود برف پکی ہونے کی وجہ سے قدرے مٹیالے رنگ میں ہوتی تھی جبکہ سخت برف ہلکی سی نیلاہٹ مائل دکھائی دیتی تھی۔

مارتھر ان نشانیوں سے بخوبی آگاہ تھا مگر اب اس کی ہمت آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگی۔ ایسے میں اس کی نگاہوں کے سامنے فلاور کا پھول کی طرح مہکتا ہوا چہرہ گھومنے لگا۔ فلاور کا خیال آتے ہی اس کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوگیا اور وہ ایک نئے جنون کے ساتھ آگے بڑھنے لگا مگر اسی لمحے اس کے پیروں تلے سے گویا زمین کھسک گئی۔

فلاور کے خیالوں میں مگن ہوکر وہ وقتی طور پر احتیاط کو بالائے طاق رکھ بیٹھا تھا۔ مارتھر کا پیر بھی چلتے چلتے اچانک ایسی ہی ایک جگہ پر آگیا تھا جہاں برف کے پیچھے ایک سوراخ اسے نگلنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ غنیمت بس یہ تھی کہ نیچے گرتے وقت اس کا ہاتھ کنارے پر ٹک گیا تھا اور وہ اس سوراخ پر جھولنے لگا تھا مگر اسے اس بات کا بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس حالت میں نہیں رہ پائے گا۔ اس ناگہانی افتاد نے اسے شدید مشکل میں مبتلا کردیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اب اس کے اور موت کے درمیان بس کچھ ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ اس کا ہاتھ چھوٹنے کی دیر تھی اس کے بعد کھیل ختم مگر وہ اتنی آسانی سے ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے سوراخ کے کناروں پر جمائے اور اوپر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی پہلی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔ برف کی وجہ سے کافی پھسلن ہورہی تھی اس لیے فوری طور پر اوپر اٹھنا بہت مشکل تھا۔ اس نے نیچے کا جائزہ لیا گھپ اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ لگتا تھا کہ یہ سوراخ کافی گہرا تھا یعنی اگر مارتھر کے ہاتھ چھوٹ جاتے تو اس کی موت یقینی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اوپر اٹھنے کی کوشش کی مگر اسے ایک بار پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے کندھوں سے سامان کا بیگ لٹک رہا تھا اور اس کے وزن کو لے کر اوپر اٹھنا محال تھا مگر وہ اس بیگ کو خود سے علیحدہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بیگ میں اس کے کھانے کے لیے ڈرائی فروٹ اور پہاڑوں پر سفر کرنے کے لیے دیگر ضروری سامان موجود تھا۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ اس بیگ کو بھی بچانا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے فلاور کے بارے میں سوچا...... وہ اس کے جانے سے کتنی پریشان تھی۔ اس نے اسے روکنے کی کتنی کوشش کی تھی۔ مارتھر نے بھی اسے کتنی تسلیاں دلاسے دیے تھے کہ وہ لوٹ آئے گا، وہ کامیاب رہے گا۔ اس کے ذہن میں وہ منظر گھومنے لگا جب وہ اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ اسے الوداع کہنے کے لیے فلاور اور ان دونوں کے بچپن کا سب سے قریبی دوست لارنس موجود تھا۔ ساتھ ہی ساتھ لارڈ جارڈن خود بھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ کچھ دیگر کوہ پیما... کھڑے تھے جنہوں نے ایک مخصوص جگہ تک مارتھر کا تعاقب کرکے لارڈ کو یہ رپورٹ دینا تھی کہ وہ واقعی اس پہاڑی سفر پر روانہ ہوا ہے یا محض ان کے ساتھ بلف کررہا ہے اور یہاں سے روا

کے کچھ دن بعد آ کر یہ دعویٰ کر دے کہ اس نے بلیک وے کو پار کر لیا ہے۔
ان افراد کو شاید لارڈ نے پیسوں کے عوض ہائر کیا تھا۔ انہوں نے کم از کم دو سو کلو میٹر تک مارتھر کا تعاقب کر کے اسے چیک کرتے رہنا تھا۔ اس کے بعد ان کو واپسی کی اجازت تھی کیونکہ دو سو کلو میٹر کے بعد خطرناک راستے شروع ہو جاتے تھے۔

جب وہ روانہ ہو رہا تھا تو اس نے سب کے تاثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ان کوہ پیماؤں کے چہروں پر کسی رنج یا خوشی کے تاثرات نہیں تھے جنہوں نے اس کا ایک مخصوص ایریا تک تعاقب کرنا تھا۔ ان کی کون سی اس کے ساتھ کوئی رشتے داری یا تعلق تھا۔

لارنس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ فلاور کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات نمایاں تھے جبکہ لارڈ جارڈن کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی شاید اس لیے کہ انہیں پورا یقین تھا کہ اب مارتھر کی موت یا شکست یقینی ہے۔
اپنی شکست کا خیال بڑا کربناک تھا۔ مارتھر کے اندر گویا لاوا سا کھولنے لگا۔ اس نے اس بار اوپر اٹھنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور وہ اس ڈیتھ ہول سے باہر نکلنے میں کامیاب رہا۔ باہر نکلتے ہی اس نے گہری گہری سانسیں لینی شروع کر دیں۔ اس مختصری مشقت نے اس کو بری طرح تھکا دیا تھا اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا پورا جسم اکڑ گیا ہو۔ وہ زیادہ دیر تک اس طرح نہیں بیٹھ سکتا تھا ورنہ اس کا خون جمنا شروع ہو جاتا۔ اسے اپنے خون کی روانی برقرار رکھنے کے لیے مسلسل حرکت میں رہنا تھا۔ اس سرد جہنم کا یہ سو کلو میٹر کا ایریا سب سے خطرناک تھا کیونکہ یہاں آرام کرنے کی گنجائش نہیں تھی خون کو جمنے سے روکنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا اور وہ طریقہ تھا حرکت میں رہنا۔ اس نے پھر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔
آج مارتھر کو صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا کہ آج تک بلیک وے کوئی کیوں نہیں پار کر پایا تھا اور اس وادی کو سرد جہنم کا نام کیوں دیا گیا ہے۔
خون منجمد کر دینے والی سردی، برف سے ڈھکے ہوئے ڈیتھ ہولز اور ایسی گہری کھائیاں جن میں گرنے کے بعد کسی انسان کی لاش صدیوں تک دریافت نہ ہو پائے۔
ابھی وہ اس مشکل سے نکلنے کا حل سوچ ہی رہا تھا کہ سخت برفانی ہوا کے تھپیڑوں نے اسے اپنی جگہ پر رکنے پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ اس جگہ پہلے بھی خاصی تیز برفانی ہوا چل رہی تھی مگر مارتھر ایک منجھا ہوا کوہ پیما تھا۔ اس نے برفانی ہوا کی شدت میں اچانک انتہائی اضافہ فوراً محسوس کر لیا تھا۔
اس نے بغور اپنے سامنے موجود پہاڑ کا جائزہ لیا اور پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ تیز برفانی ہوا تو بس وارننگ تھی ورنہ اصل برفانی طوفان تو اس کی جانب بڑھ رہا تھا اور مارتھر اچھی طرح اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ یہ برفانی طوفان جیسے ہی اس تک پہنچے گا، وہ اس کی تیز ہوا کا زور برداشت نہیں کر پائے گا۔ برفانی ہوا کے جھکڑ اُسے تنکوں کی طرح اُٹھا کر کسی گہری کھائی کی نذر کر دیں گے۔
وہ اناڑی آدمی نہیں تھا، خطرے کی بو سونگھ چکا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ وہ جس ہول میں گرنے سے بال بال بچا تھا، وہ ابھی اس سے زیادہ دور نہیں آیا تھا۔ اگر وہ اپنا پورا زور لگاتا تو طوفان کی شدت میں اضافہ ہونے سے پہلے اس جگہ تک پہنچ سکتا تھا۔
وہ پیچھے کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا مگر برفانی علاقے میں اس کا یہ دوڑنا عام علاقے میں چلنے کے برابر تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ موت کے بہت قریب پہنچ چکا ہے مگر وہ اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنا چاہتا تھا۔ آخری وقت تک مقابلہ کرنے کا خواش مند تھا۔ اپنی پوری طاقت سے دوڑنے کے بعد وہ کچھ ہی منٹ میں دوبارہ اُس ہول کے پاس پہنچ گیا جہاں وہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔
ہوا کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا تھا۔ پہاڑی آدمی ہونے کی وجہ سے اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ طوفان اس سے چند منٹ کی دوری پر رہ گیا ہے۔ اسے بادلوں کے غول اپنی جانب آتے دکھائی دے رہے تھے اور یہ بادل ہوا کی شدت کی وجہ سے اس علاقے کی جانب بڑھ رہے تھے۔
اس نے پھرتی سے اپنے کندھے سے لٹکا ہوا بیگ اتارا اور پھر بیگ میں سے رسی کا ایک بڑا گچھا نکال لیا۔ اس کے بعد اس نے پہاڑی ہول کے بالکل ساتھ موجود ایک چھوٹی سی چٹان کے ساتھ وہ رسی باندھ دی اور پھر اپنا بیگ دوبارہ کندھے سے لٹکاتے ہوئے رسّی کے سہارے اس ہول میں اترنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس ہول کی گہرائی کتنی ہے۔ اسے اپنے نیچے گھپ اندھیرا دکھائی دے رہا تھا مگر اس وقت اس برفانی طوفان کی قدم اکھاڑ دینے والی ہوا سے بچنے کا اس سے بہتر طریقہ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس طرح وہ کم از کم قدم اکھاڑ دینے والی برفانی ہوا کی

زد میں براہِ راست آنے سے تو بچ سکتا تھا۔
وہ رسّی کے سہارے نیچے اترتا چلا گیا اور پھر اس کے پیر زمین سے ٹکرا گئے۔ گویا وہ ہول اس کی توقع سے کم گہرا تھا۔ اس نے اوپر کی جانب نگاہ دوڑائی شاید برفانی طوفان اُس علاقے تک پہنچ گیا تھا۔ اوپر سے اچانک ہی برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مارتھر خود کو برفانی ہوا کی زد میں آنے سے تو بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر اب وہ ایک نئی اور عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا، اگر وہ وہاں سے باہر نکلتا تو برفانی ہوا اس کے قدم اکھاڑ دیتی اور اگر اسی جگہ رہتا تو برف باری کی شدت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے اسی گڑھے میں دفن ہو جاتا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر اسی طرح برف باری جاری رہی تو یہ چھوٹا سا گڑھا جلد ہی برف سے بھر جائے گا مگر اس مصیبت کے ساتھ ایک اور مصیبت بھی موجود تھی۔
وہ جس علاقے میں تھا، وہاں کا درجۂ حرارت مائنس ساٹھ ڈگری تک چلا جاتا تھا اور اس برفانی طوفان کی آمد کے بعد تو شاید مزید نیچے گر گیا تھا۔ ہول میں کھڑے ہونے کے بعد مارتھر کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی رگوں میں خون کے جمنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔
اس نے اپنے کندھے سے لٹکے بیگ کو کھولا اور پھر ایک ٹارچ نکال کر اس جگہ کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی ایک چھوٹا سا پہاڑی سوراخ ہی تھا یا پھر شاید اس کی متوقع قبر...... یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ لرز گیا۔
نہیں...... میں ہار نہیں مانوں گا، ابھی میں زندہ ہوں، ابھی میری سانسیں چل رہی ہیں۔ مجھے آخری وقت تک لڑنا ہے، اب تو میں کامیابی کے بہت نزدیک ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے بیگ میں سے ایک ڈبا نکال لیا اور پھر اس ڈبے کو کھول کر اُس کا جائزہ لینے لگا۔ ڈبے میں چند انجکشن اور کچھ سرنجز وغیرہ موجود تھیں۔
مارتھر نے اپنے بازوؤں میں دو انجکشن لگائے، اس کے پاس اپنے خون کو پتلا رکھنے کا یہی ایک طریقہ تھا تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب اس کے پاس مزید دو انجکشن ہی رہ گئے ہیں۔
وہ خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا حالات کی ستم ظریفی پر غور کرتا رہا۔ سوراخ میں برف تو پہلے ہی موجود تھی مگر اب اوپر سے برف باری کی وجہ سے مزید مصیبت کا سامنا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مارتھر کو اندازہ ہو گیا کہ آخر برف باری کے باوجود یہ سوراخ خالی کیوں رہ جاتے تھے۔ اس سوراخ کے اوپر اب برف کی ہلکی سی تہ جمنا شروع ہو گئی تھی اور مارتھر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد ہی اوپری حصے پر برف کی ایک چادر سی جم جائے گی جو مزید برف کو نیچے نہیں آنے دے گی مگر اس کے ساتھ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس حالت میں نہیں رہ سکتا تھا۔ انجکشن کا اثر بھی ایک گھنٹے کے بعد زائل ہو جانا تھا اور اس کے بعد فوری طور پر دوسرا انجکشن بھی نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ چار گھنٹوں کا وقفہ لازمی تھا۔
ایک ہی حل تھا کہ اس کا جسم حرکت میں رہتا اور اس چھوٹی سے بند جگہ پر یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اسی حالت میں کھڑا رہا۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد اسے ایک دفعہ پھر سردی کی وجہ سے جسم میں خون کے منجمد ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اب کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔
اس نے اوپر کی جانب دیکھا، برف باری جاری تھی اور ہول کی سطح کے کچھ حصے پر برف کی تہ بھی جمنا شروع ہو گئی تھی۔ یعنی کچھ ہی دیر میں یہ ہول مکمل طور پر بند ہونے وا[لا] تھا اور یہ جگہ اس کی قبر بننے والی تھی۔ ابھی اس ہول کے اوپری حصے پر برف کی تہ نرم تھی تاہم کچھ دیر میں جم کر سخت ہو جاتی اور اس سخت برف کو توڑنا بھی مشکل ہو جاتا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اس ہول کے اندر آگ جلا سکتا ہے کیونکہ یہاں تیز ہوا نہیں تھی مگر پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ آگ جلانے سے اس چھو[ٹے] سے ہول میں دھواں بھر سکتا تھا جس سے وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہو سکتا تھا۔ اس بلند مقام پر آکسیجن کی ویسے بھی کمی تھ[ی] آگ جلانے سے مزید کمی واقع ہو جاتی۔
اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ک[ہ] باہر نکل کر طوفان کا سامنا کرتا، اگرچہ یہ تیز برفانی ہوا اس کے قدم اکھاڑ سکتی تھی مگر وہ زمین پر گھسٹتے ہوئے آگے بڑ[ھ] سکتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے جسم کو حرکت میں رکھ کر اپنے خو[ن] کو منجمد ہونے سے بھی بچا سکتا تھا۔
فیصلہ کرتے ہی اس نے رسی کی مدد سے اوپر چڑ[ھنا] شروع کر دیا۔ ہول سے باہر نکلتے ہی انتہائی تیز ہوا [کے] تھپیڑوں نے دوبارہ اس کا استقبال کیا۔ لمحہ بھر کے [لیے] اسے یوں لگا کہ اس کے قدم زمین سے اکھڑ جائیں گے [مگر] پھر وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہا۔ اس نے رسی کھو[ل کر] اپنے بیگ میں منتقل کی، بیگ اپنے کندھے سے لٹکایا او[ر] زمین پر گھسٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ برفانی ہوا کی ش[دت] سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر وہ چند لمحوں کے لیے بھی [کھڑا] ہوا تو یہ ہوا اس کے قدم زمین سے اکھاڑ دے گی مگر اس

ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس پوزیشن میں بھی نہیں رہ پائے گا۔ اس طرح کرالنگ پوزیشن میں آگے بڑھنے سے اس کا جسم بہت جلدی تھکاوٹ کا شکار ہو سکتا تھا۔

وہ خود کو بہت بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ روانگی کے وقت اسے کامیابی کا پورا یقین تھا مگر برفانی طوفان کی اچانک آمد نے اُسے شدید مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اس طرح کے برفانی طوفان کا سامنا کیا تھا۔ اگرچہ پہاڑوں پر ایڈونچر کرتے اس کی عمر گزر گئی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ موت اس سے اب چند قدم کی دوری پر ہی رہ گئی ہے۔

کچھ دیر گھسٹتے ہوئے آگے بڑھنے کے بعد مارتھر کی ہمت جواب دینے لگی مگر اسی وقت اُسے احساس ہوا کہ ہوا کی شدت میں کچھ کمی آ گئی ہے۔ یہ طوفان تھمنے کی نشانی تھی۔ اگر اس کا یہ خیال درست تھا کہ یہ طوفان طویل دورانیے کا نہیں تھا اور جلد ہی سنبھلنے والا تھا تو یہ اس کے لیے زندگی کی نوید تھی۔

مارتھر کا خیال غلط ثابت نہیں ہوا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہی طوفان کی شدت میں اتنی کمی آ گئی کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اگرچہ ہوا اب بھی خاصی تیز تھی مگر اتنی تیز نہیں تھی کہ اس کے قدم اکھاڑ دیتی۔ طوفان کی شدت میں واضح کمی واقع ہو گئی تھی اس پورے سفر میں پہلی مرتبہ قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے ایک بار فلاور کے بارے میں سوچا اور پھر ایک نئے جنون اور عزم سے اس سرد جہنم میں آگے بڑھنے لگا۔ طوفان رفتہ رفتہ مکمل طور پر تھم گیا مگر وہاں چلنے والی معمول کی ہوا بھی کسی طوفان سے کم نہیں تھی اور اب شام بھی ہونے لگی تھی۔ یہ صورتِ حال زیادہ خطرناک تھی، اس نے اپنی جیب سے ٹرانسمیٹر نکال لیا۔

اس ڈیوائس کی لائٹ جل رہی تھی۔ گویا وہ درست حالت میں تھا۔ اس سے سگنل بھی نشر ہو رہے تھے۔ اسی لمحے اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی تو وہ اپنی جگہ سے بے اختیار اچھل پڑا۔

☆☆☆

رابن کو آسٹریلیا سے لوٹے ایک دن ہی گزرا تھا۔ پہلے دن تو اس نے اپنے گھر پر ہی آرام کیا تھا مگر آج وہ اپنے پرانے دوست لارنس سے ملنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے لارنس کو کال کی تھی، وہ اپنے گھر پر ہی موجود تھا۔

لارنس اور رابن کی دوستی تقریباً پانچ برس پرانی تھی تاہم یہ بھی حقیقت تھی کہ لارنس جتنا اعتماد اس پر کرتا تھا، اتنا شاید ہی کسی اور پر کرتا ہو۔ وہ اس سے اپنے دل کی ہر وہ بات کہہ لیتا تھا جو وہ کسی اور سے نہیں کہہ سکتا تھا حتیٰ کہ اپنے بچپن کے دوستوں فلاور اور مارتھر سے بھی نہیں......

پچھلے سال رابن کو اپنی ملازمت کے سلسلے میں آسٹریلیا جانا پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کا اور لارنس کا تعلق بس فون تک ہی محدود رہ گیا تھا تاہم اب واپس آتے ہی اس نے لارنس سے رابطہ کیا تھا اور لارنس نے بھی اس سے فوری ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ آج وہ اس کے سامنے ایک ایسے راز کو ظاہر کرنے والا ہے جو آج سے پہلے اس نے کسی کے سامنے نہیں کھولا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز ہے۔

لارنس کی بات سن کر رابن کو خاصا تجسس لاحق ہو گیا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ لارنس کا سب سے بڑا رازدار ہے اور اس سے لارنس کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے مگر اب پتا چلا تھا کہ ایک راز ایسا بھی تھا جو لارنس نے آج تک کسی سے شیئر نہیں کیا تھا تاہم آج اس سے ڈسکس کرنے والا تھا۔

اس نے لارنس کے عالیشان بنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا تو گیٹ پر موجود دربان نے فوراً ہی گیٹ کھول دیا۔ شاید اسے لارنس کی جانب سے پہلے ہی اس کی آمد کے بارے میں ہدایات جاری کر دی گئی تھیں۔

لارنس نے پُرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا اور پھر اسے لیے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے ایک ملازم کو کافی لانے کا بھی کہہ دیا۔

''وہ کون سا راز ہے جو تم مجھ سے ڈسکس کرنے والے ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ مجھ سے تمہاری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔'' رابن نے لارنس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہی پوچھا۔

''ہاں میں آج تم سے وہ راز کی بات کہنے والا ہوں جو آج تک میں نے کسی سے نہیں کی مگر اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم سے یہ بات شیئر کروں کیونکہ اب میری منزل زیادہ دور نہیں رہی۔ جلد ہی میرا وہ مقصد پورا ہونے والا ہے جس کے خواب میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔'' لارنس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کون سا مقصد کون سا خواب؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔'' رابن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''فلاور...... میرے دوست! میرے خواب کا نام

فلاور ہے اور میں تمہیں اس بات سے بھی آگاہ کرنے والا ہوں کہ جلد تم میری اور فلاور کی شادی میں بھی شرکت کرو گے۔'' لارنس نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''مطلب؟'' رابن نے چونکتے ہوئے کہا۔

لارنس کی بات سن کر اس کے چہرے پر شدید حیرت کے تاثرات بھی نمودار ہو گئے تھے اگرچہ اس کی گہری دوستی لارنس کے ساتھ ہی تھی تاہم اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فلاور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ نہ صرف فلاور کو جانتا تھا بلکہ اس کے اور مارتھر کے تعلق کے بارے میں بھی بخوبی آگاہ تھا۔ آج سے پہلے اس نے لارنس کے منہ سے بھی ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی جس سے اُسے محسوس ہوا ہو کہ وہ فلاور کے بارے میں اپنے دل میں محبت بھرے جذبات رکھتا ہے بلکہ جہاں تک اسے یاد تھا تو لارنس فلاور اور مارتھر کی محبت کی حوصلہ افزائی بھی کرتا رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ فلاور کے ڈیڈ لارڈ جارڈن اس کی شادی لارنس کے ساتھ ہی کروانے کے خواہش مند تھے مگر لارنس نے اس بات کا اظہار کبھی بھی فلاور یا مارتھر کے سامنے نہیں کیا تھا، حتیٰ کہ اس نے یہ بات کبھی رابن کو بھی نہیں بتائی تھی کہ اس کے دل میں فلاور کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود ہے اس لیے جب اس نے یہ کہا کہ عنقریب وہ اس کی اور فلاور کی شادی میں شرکت کرے گا تو اس کا حیرت زدہ ہونا بجا تھا۔

''بھئی میری بات کا وہی مطلب ہے جو تم سمجھے ہو۔ میں نے تم سے کوئی پہیلی تو بیان نہیں کی جو تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔'' لارنس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے واقعی تم پر حیرت ہو رہی ہے۔ تم فلاور کو پسند کرتے ہو یہ بات تم نے آج تک اپنے دل میں چھپائے رکھی، مجھے بھی نہیں بتائی۔ بہرحال کسی کو پسند کرنا یا اس سے محبت کرنا ایک الگ بات ہے اور اس سے شادی ہو جانا بالکل دوسری بات ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ فلاور دل و جان سے مارتھر پر فدا ہے اور وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی پھر وہ تم سے شادی کرنے پر کیسے آمادہ ہوگی؟ اور تم مارتھر سے بھی اچھی طرح واقف ہو...... کیا وہ یہ شادی ہونے دے گا؟ اگرچہ میرا اس کا ساتھ زیادہ پرانا نہیں ہے مگر میں اس کی فلاور کے بارے میں محبت اور جنون سے بخوبی آگاہ ہوں۔ وہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔'' رابن نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

''تم ابھی صرف مارتھر کے جنون سے واقف ہو میرے جنون سے نہیں۔'' لارنس پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''رہ گئی مارتھر کی بات تو وہ زندہ رہے گا تبھی مجھے فلاور سے شادی کرنے سے روک سکے گا اور اس کی موت کے بعد تو فلاور کے پاس بھی مجھ سے شادی کرنے سے انکار کا کوئی جواز باقی نہیں رہے گا۔ میں نے یہ باتیں تم سے اس لیے کی ہیں تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ میں فلاور کے لیے سیکنڈ آپشن ہوں گا، یہ احساس زندگی بھر میرے دل میں کسی پھانس کی طرح چبھتا رہے گا مگر فلاور کی محبت کی خاطر میں اس درد کو بھی سہہ لوں گا۔''

''تمہاری باتیں مبہم اور ناقابلِ فہم ہیں۔'' رابن پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''تم نے کہا کہ مارتھر زندہ رہے گا تو ہی وہ تمہارے راستے کی رکاوٹ بن سکتا ہے۔ کیا وہ مر گیا ہے؟''

''اگر نہیں مرا تو جلد ہی مر جائے گا۔'' لارنس زہرخند لہجے میں بولا۔ ''اس نے مجھ سے میری بچپن کی محبت چھین کر جتنا بڑا جرم کیا تھا اس کی سزا موت کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔''

''مگر اس کی موت کیسے ہوگی؟'' رابن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تم آسٹریلیا چلے گئے تھے اس لیے یہاں کے حالات سے ناواقف ہو۔ یہ واقعہ ابھی حال ہی میں پیش آیا ہے اس لیے میں تمہیں فون پر بھی کچھ نہیں بتا پایا، بہرحال میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ لارڈ جارڈن میری اور فلاور کی شادی کروانے کے خواہش مند تھے مگر انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مارتھر کو راستے سے کیسے ہٹائیں۔ انہوں نے ایک دو بار میری تجویز پر مارتھر کو غنڈوں سے پٹوایا بھی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح شاید مارتھر ڈر کر پیچھے ہٹ جائے مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مارتھر پر اس مار کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ بدستور فلاور سے خفیہ رابطے میں رہا۔ اگرچہ لارڈ جارڈن نے اس کی اور فلاور کی ملاقاتوں پر پابندی عائد کر دی تھی مگر وہ اپنی جوان اولاد کو گھر میں تو قید نہیں کر سکتے تھے اس لیے مارتھر اور فلاور چھپ چھپ کر ملتے رہتے تھے اور میں ان کی ان ملاقاتوں پر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔''

اتنا کہہ کر لارنس کچھ دیر...... کے لیے خاموش ہو گیا۔ رابن نے اس کی گفتگو میں کوئی مداخلت نہ کی وہ خاموشی سے اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا۔

''اور پھر ایک دن میرے ذہن میں مارتھر کو راستے سے ہٹانے کی ایک انوکھی ترکیب آئی۔ فلاور ہم دونوں کا ہی جنون تھی مگر میں اس کی طرح بے وقوف عاشق نہیں تھا۔ میں عقل سے کام لینا جانتا تھا۔ میں اپنی ترکیب پر عمل درآمد کروانے کے لیے لارڈ جارڈن کے پاس گیا۔ کچھ دیر کی

بحث کے بعد میں انہیں اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے رضامند کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔ انہوں نے میری تجویز کے مطابق فلاور سے کہا کہ وہ مارتھر سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ اسے کل کھانے پر بلالے مگر اس ملاقات میں فلاور موجود نہیں ہوگی۔

''فلاور نے اپنے ڈیڈ کی یہ بات اس لیے تسلیم کرلی کہ وہ جانتی تھی کہ اس ملاقات میں ہونے والی تمام باتوں کا اسے بعد میں مارتھر کے توسط سے علم ہو ہی جائے گا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ لارڈ جارڈن نے شاید بیٹی کی محبت میں اس کے سامنے سرنڈر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے شاید انہیں احساس ہوگیا ہے کہ وہ مارتھر کے علاوہ کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔ وہ اپنے باپ کی اس چال سے لاعلم تھی جو میں نے انہیں سمجھائی تھی۔ فلاور کے کہنے پر مارتھر لارڈ جارڈن سے ملنے پر تیار ہوگیا اور اسی ملاقات میں لارڈ نے اس کے سامنے میری تجویز کے مطابق فلاور سے شادی کے لیے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ واقعی ان کی بیٹی سے جنون کی حد تک محبت کرتا ہے تو اپنے جنون کو ثابت کرے اور فلاور سے شادی کے لیے ان کی یہ شرط ہے کہ اسے بلیک وے کے اس پہاڑی سلسلے کو پیدل عبور کرنا ہوگا جسے آج تک کوئی مہم جو پار نہیں کرسکا۔ اگر وہ کامیاب رہا تو وہ اس کی شادی فلاور سے کرادیں گے بصورتِ دیگر اسے ہمیشہ کے لیے فلاور کی زندگی سے نکل جانا ہوگا۔

''میں جانتا تھا کہ مارتھر ایک بے وقوف عاشق ہے اس لیے وہ رضامند ہوجائے گا۔ ویسے بھی وہ ایک ماہر کوہ پیما ہے اس لیے اس نے میری توقع کے عین مطابق فلاور کو حاصل کرنے کے لیے لارڈ کی یہ شرط منظور کرلی۔

''فلاور کو جب اس بات کا علم ہوا تو اسے اپنے باپ کی چال سمجھ میں آگئی۔ وہ اس حقیقت سے تو واقف نہیں تھی کہ لارڈ جارڈن کو یہ راستہ دکھانے والا میں تھا تاہم اس نے ارتھر کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر مارتھر نے اس پر واضح کر یا کہ ایک دفعہ ہامی بھرنے کے بعد وہ اب پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اب یہ اس کی انا کا مسئلہ ہے......''

''مگر تمہیں اتنا یقین کیوں تھا کہ مارتھر لارڈ کی اس رط کو قبول کرلے گا؟'' رابن نے قطع کلامی کرتے ہوئے وال کیا۔

''کیونکہ میں اس کی فطرت سے واقف ہوں۔ ہم ونوں ہی فلاور کے عاشق ہیں، فرق بس یہ ہے کہ میں ذرا قل مند قسم کا عاشق ہوں اور وہ ذرا بے وقوف قسم کا۔''

لارنس نے ناصحانہ لہجے میں جواب دیا۔

''محبت کے جنون میں انسان کو عقل سے بالکل عاری ہوکر نہیں سوچنا چاہیے۔ مارتھر ایک جذباتی آدمی تھا۔ میں کیونکہ اسے بچپن سے جانتا ہوں اس لیے مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس بار بھی وہ جذبات کے تحت ہی فیصلہ کرے گا۔ میں نے بھی فلاور کے ساتھ مل کر اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ قصۂ مختصر میری یہ چال کامیاب رہی اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ اب اسے گئے کافی دن ہوگئے ہیں، اس علاقے میں آگے بڑھنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اطراف میں گہری کھائیاں ہیں اس لیے اس کے پاس آگے بڑھنے کے علاوہ ایک ہی آپشن تھا کہ وہ واپس آجائے مگر ابھی تک وہ اس راستے سے واپس نہیں آیا۔ لارڈ کے آدمیوں نے دو سو کلومیٹر تک اس کا تعاقب بھی کیا۔ اس کے بعد بھی ممکن حد تک دوربین کی مدد سے اُسے آگے بڑھتے دیکھتے رہے۔ ان کا بھی یہ کہنا ہے کہ اس کا رخ آخری وقت تک اسی علاقے کی طرف تھا جہاں مائنس ساٹھ ڈگری کی سردی پڑتی ہے۔ اب دو دن مزید گزر گئے ہیں مگر اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے۔ بلیک وے کے دوسری طرف لارڈ جارڈن نے اپنے ذاتی ہیلی کاپٹر کی مدد سے پہلے ہی آدمی پہنچا دیے تھے تاکہ اگر وہ کسی طرح اس علاقے کو عبور کرلے تو اترتے وقت بھی مارک کرلیا جائے۔ ابھی تک دونوں اطراف پر موجود آدمیوں میں سے کسی نے کوئی اطلاع نہیں دی جس سے یہی گمان ہوتا ہے کہ مارتھر راستے میں ہی مرچکا ہے۔''

''مگر ضروری تو نہیں کہ ناکامی کی صورت میں اس کی جان بھی چلی جائے؟'' رابن مضطرب لہجے میں بولا۔

''ہر کوہ پیما کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے ٹرانسمیٹر ہوتا ہے، وہ ٹرانسمیٹر کال کے ذریعے اپنی ناکامی کے اعتراف کے ساتھ لارڈ جارڈن سے اس کے ذاتی ہیلی کاپٹر کی مدد بھی طلب کرسکتا ہے اور میں تمہیں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ زندہ واپس آگیا تو ناکامی کے باوجود فلاور اسی سے شادی کرے گی۔''

''وہ ٹرانسمیٹر کال نہیں کر پائے گا۔ میں نے اس کی موت کا پورا بندوبست کرلیا ہے۔ دراصل وہ ٹرانسمیٹر اسے میں نے دیا تھا اور اس میں ایک فنی خرابی بھی میں نے ہی پیدا کردی تھی۔ وہ ڈیوائس تین کلومیٹر کی رینج سے زیادہ دوری پر کام ہی نہیں کر پائے گی اس لیے اب اس کی موت یقینی ہے۔ ویسے اگر ابھی تک وہ زندہ بھی ہوا تو اب سے ایک گھنٹے قبل میڈیا پر یہ خبر چل رہی تھی کہ بلیک وے پر شدید

قسم کا طوفان آیا ہوا ہے اگرچہ میڈیا کے مطابق یہ طوفان شدید ہونے کے باوجود مختصر دورانیے کا تھا تاہم مجھے یقین ہے کہ اس برفانی طوفان نے مارتھر کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہوگی۔ اب تک اس کی قلفی جم چکی ہوگی۔'' یہ کہہ کر لارنس ہذیانی انداز میں ہنسنے لگا۔

رابن کو اس کی یہ ہنسی بہت خوفناک لگی۔ آج سے پہلے وہ اسے ایک عام سا نوجوان سمجھتا تھا جو اپنے باپ کی دولت پر بس عیش کرنا جانتا تھا مگر آج اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس کا یہ دوست کتنا شاطر تھا اور ساتھ ہی کتنا گھٹیا بھی۔ فلاور اس کی محبت تھی، اس کا جنون تھی...... کسی سے محبت کرنا کوئی جرم نہیں تھا مگر اسے پانے کی خاطر وہ اس حد تک گر سکتا تھا، یہ رابن سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے گھٹیا پن کا یہ عالم تھا کہ وہ اسے مارتھر کو اپنے راستے سے ہٹانے کی مکارانہ چال کے بارے میں آگاہ کرنے کے بعد داد طلب نگاہوں سے بھی تک رہا تھا۔ شاید اس نے رابن کو بھی اپنی طرح گھٹیا سمجھ رکھا تھا۔ رابن کو اس سے گھن محسوس ہونے لگی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے بڑے کمینے ہو کہ محض فلاور کو پانے کے لیے اپنے بچپن کے دوست کی زندگی داؤ پر لگا دو گے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں پانچ سال تک تمہارے ساتھ رہا۔'' رابن نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب تمہارا؟'' لارنس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میرا تو خیال تھا کہ تم میری ذہانت کی داد دو گے۔''

''میں تمہاری اس گھٹیا ذہانت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ تم نے خراب ٹرانسمیٹر دے کر مارتھر کی زندگی سے جو کھیل کھیلنے کی کوشش کی ہے، وہ قانوناً جرم ہے۔ اگر میں تمہاری اس حرکت کی اطلاع پولیس کو یا فلاور کو کر دوں تو اپنا انجام سوچ لو۔'' رابن غصیلے لہجے میں بولا۔

رابن کا جواب اور لب ولہجہ سن کر لارنس کے چہرے کی حیرت مزید گہری ہوگئی۔ وہ کچھ دیر تک اسے بغور دیکھتا رہا اور پھر ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ''شاید مجھ سے تمہیں پہچاننے میں غلطی ہوگئی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم ہر معاملے میں میرے ہمنوا ہو مگر آج پتا چلا کہ میرا یہ خیال غلط ہے، رہ گئی پولیس کو یا فلاور کو اطلاع کرنے کی بات تو تم یہ بات بھول گئے ہو کہ میرا تعلق یہاں کے لارڈ خاندان سے ہے۔ اگر میں اپنے موجودہ بیان سے انکار کر دوں تو تم کیسے ثابت کرو گے کہ جو الزامات تم عائد کر رہے ہو وہ سچ پر مبنی ہیں؟ مجھ پر کوئی الزام لگانے سے پہلے تمہیں ثبوت پیش کرنا ہوگا ورنہ میں بھی تم پر جھوٹی الزام تراشی کے جواب میں ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دوں گا اور تم یہ بھی جانتے ہی ہو کہ میں کتنے مہنگے وکیلوں کو ہائر کر سکتا ہوں، ویسے تمہاری دو بہنیں اور ایک بہنوئی میرے ڈیڈ کی کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر انہیں ملازمت سے فارغ کیا جا سکتا ہے۔ جس کمپنی میں تم آسٹریلیا میں ملازمت کر رہے ہو اس کے مالک سے بھی میرے ڈیڈ کے کافی اچھے تعلقات ہیں۔''

لارنس کی بات سن کر رابن کے چہرے پر کبیدگی کے تاثرات ابھر آئے تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے محض خالی دھمکی نہیں دے رہا تھا، وہ اپنے کہے پر عمل کرنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اس نے واضح اور دوٹوک انداز میں اسے اپنے ردعمل سے آگاہ کر دیا تھا۔ ویسے اس کی یہ بات بھی درست تھی کہ اگر رابن پولیس کے پاس جاتا اور لارنس ان الزامات کی تردید کر دیتا تو رابن کے پاس اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔

''تم جا سکتے ہو، تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کافی پی سکو۔'' رابن کو خاموش دیکھ کر لارنس سخت لہجے میں بولا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں آج تک تمہیں اپنا سب سے قریبی اور رازداں دوست سمجھتا رہا۔ آج بھی میں نے تمہیں اسی مغالطے میں یہاں بلا کر یہ سب کچھ بتایا تھا مگر تم تو مجھے قانون سکھانے بیٹھ گئے۔''

''مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے تم جیسے گھٹیا اور ر[illegible] آدمی کو اپنا دوست سمجھا۔ گھٹیا ہونے کے ساتھ ساتھ تم ایک بلیک میلر بھی ہو، تم نے میری زبان بند رکھنے کے لیے میری جن مجبوریوں کا ذکر کیا ہے ان کی وجہ سے شاید واقعی میری زبان بند رہے گی۔ ویسے اگر میں اس وقت یہاں ہوتا جب تم نے مارتھر کو اس سرد جہنم کی طرف روانہ کیا تھا تو میں اسے روکنے کی کوشش ضرور کرتا مگر اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب تک تو وہ مر چکا ہوگا، اس علاقے کو آج تک کوئی عبور نہیں کر پایا۔ تم نے تو اس بے چارے کو خراب ٹرانسمیٹر دے کر اس سے اپنی زندگی بچانے کی آخری امید بھی چھین لی۔ تم جیسے بے حس انسان کو تو یہ بھی احساس نہیں کہ مارتھر اس سرد جہنم میں کس قدر اذیت ناک موت کا شکار ہوا ہوگا۔ میں اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میری بہنوں اور بہنوئی کی نوکریاں چلی جائیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کے بعد میں تم سے دوبارہ نہیں ملنا چاہوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے رابن اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈرائنگ روم کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا

لارنس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی، وہ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر ہلکے سے غصے کے تاثرات بھی تھے۔ شاید اس لیے کہ اسے رابن سے اس ردعمل کی امید نہیں تھی۔ اس کا تو خیال تھا کہ رابن اس کی ذہانت کی داد دے گا، اس کی تعریفوں کے پل باندھ دے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ بہرحال اسے رابن کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ فلاور کے بارے میں سوچنے لگا جو جلد ہی اس کی زندگی کا حصہ بننے والی تھی۔

رابن اپنے گھر واپس آ گیا تاہم وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ آئندہ لارنس سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھے گا۔ اسے مارتھر کے انجام پر بھی افسوس تھا مگر وہ اب اس کی خاطر کچھ نہیں کر سکتا تھا، شاید اس کے اس انجام میں لارنس کے ساتھ ساتھ مارتھر کا اپنا بھی کچھ نہ کچھ قصور ضرور تھا، ورنہ اس قدر پُرخطر مہم پر روانہ ہونے کی حماقت کوئی عقل سے عاری انسان ہی کر سکتا تھا۔

رابن ایک مہینے کی چھٹی پر آیا تھا مگر اس رات ایک ایمرجنسی کی وجہ سے اسے اگلے دن ہی واپس جانا پڑا۔ اسے اس کی کمپنی کی جانب سے فون پر اطلاع دی گئی تھی کہ چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے کمپنی نے اپنے کچھ ملازمین کو نوکری سے نکال دیا ہے جس کی وجہ سے اسٹاف کی قلت کا سامنا بھی ہے اس لیے اس کی چھٹیاں کینسل کی جا رہی ہیں۔

رابن کو یہ نوکری بڑی مشکل سے ملی تھی۔ اس کے پاس کسی حیل وحجت کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ اگلے دن کی فلائٹ سے ہی آسٹریلیا روانہ ہو گیا۔ وہاں اسٹاف کی قلت کی وجہ سے اسے تین ماہ تک مسلسل کام کرنا پڑا۔ اس کے پاس سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں تھی تاہم تین ماہ بعد حالات معمول پر آ گئے تو اس نے دوبارہ اپنی چھٹی کو ری شیڈول کرنے کی درخواست دے دی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی یہ درخواست قبول کر لی جائے گی اس لیے جانے سے پہلے اس نے کچھ شاپنگ وغیرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس شام وہ اسی مقصد کے لیے ایک بڑے شاپنگ مال گیا۔ وہ کچھ کپڑوں کی خریداری میں مصروف تھا جب کسی نے اُسے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو لارنس کو کھڑے پایا۔ رابن لارنس سے قطع تعلق کر چکا تھا اس لیے اسے لارنس کو دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تاہم اس سے ہیلو ہائے کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں تھی۔

''ارے لارنس تم اور یہاں آسٹریلیا میں؟'' اس نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔

''ہاں، میں آج کل آسٹریلیا میں ہی ہوں۔ لارنس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ویسے تو ہم دونوں دوستی کا رشتہ ختم کر چکے ہیں مگر تمہیں دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار تم سے مل لوں۔ میں یہاں شاپنگ کرنے آیا ہوں۔ میری بیوی بھی میرے ساتھ ہے۔ ہماری شادی ابھی پچھلے ماہ ہی ہوئی ہے۔ وہ ذرا آگے کہیں گھوم رہی ہے۔''

''اوہ......'' رابن نے ایک طویل سانس خارج کی اور کہا...''تمہیں فلاور سے شادی مبارک ہو۔''

''میری بیوی کا نام فلاور نہیں ہے۔'' لارنس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' اس بار رابن کے چہرے پر حیرت کے تاثرات عود آئے۔

''کیا مارتھر کی موت کے بعد بھی فلاور نے تم سے شادی سے انکار کر دیا؟''

''مارتھر کی موت واقع ہوتی تو اس کے بعد ہی میری اور فلاور کی شادی ہو سکتی تھی مگر وہ نہیں مرا۔''

''میں تمہاری بات کا مطلب اب بھی نہیں سمجھا؟'' رابن نے کہا۔

''مطلب یہ میرے دوست کہ مارتھر نے وہ کر دکھایا جو آج تک کوئی نہیں کر پایا۔ اس نے اس ناقابل عبور رستے کو عبور کر لیا۔ وہ کام جو کسی نے نہیں کیا وہ مارتھر نے کر دیا۔ اس پہاڑی علاقے پر سفر کرنے پر حکومت کی جانب سے پابندی لگ چکی ہے اس لیے مارتھر کا کارنامہ آف دی ریکارڈ تھا ورنہ وہ تاریخ کا پہلا آدمی ہے جس نے اس سرد جہنم کو عبور کیا ہے۔ اگر اس کا یہ سفر حکومتی اجازت سے ہوتا تو ہر جگہ ایک شور مچ جاتا۔ میڈیا میں بھی اس کے نام کا ڈنکا بج جاتا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اس نے یہ کارنامہ کیسے سر انجام دیا ہے۔ شاید اس کا جنون میرے جنون سے زیادہ طاقت ور تھا۔ بہرحال اس کی واپسی کے بعد لارڈ جارڈن نے اپنے خاندان کے رواج کے مطابق اسے دی گئی زبان کی پاسداری کی اور فلاور اور اس کی شادی کروا دی۔ میں نے ان کی شادی میں شرکت نہیں کی اور نہ اس کے بعد ان سے کبھی ملا ہوں۔ میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا ہے۔ میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے لارنس آگے بڑھ گیا۔

''مارتھر نے واقعی ایک کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ کاش دنیا اس کے کارنامے کے بارے میں جان سکتی۔ تم

جیسے گھٹیا انسان کا جذبہ بھلا اس جیسے بڑے دل والے انسان کے جنون کا مقابلہ کہاں کرسکتا تھا مجھے خوشی ہے کہ وہ جیت گیا۔'' رابن نے دور جاتے لارنس کی طرف نفرت بھرے انداز میں دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر شاپنگ کے لیے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

یہ ایک بہت خوبصورت جزیرہ تھا اور مارتھر وہاں اپنی بیوی فلاور کے ساتھ ایک طویل ہنی مون کے لیے آیا ہوا تھا۔ انہیں یہاں آئے ہوئے تقریباً تین ماہ کے قریب کا عرصہ ہوگیا تھا تاہم اس خوب صورت جزیرے سے جانے کو ان کا اب بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت وہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''آج صبح ڈیڈی کی کال آئی تھی۔'' فلاور نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ اب ہمیں واپس آجانا چاہیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب ان کا کاروبار ہم دونوں مل کر سنبھال لیں۔''

''ٹھیک ہے ویسے بھی ہمیں یہاں آئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔'' مارتھر نے جواب دیا۔ ''ویسے مجھے یہ ہنی مون کسی خواب کی طرح لگتا ہے، تمہیں پانا کسی خواب سے کم نہیں ہے۔''

''اور تم نے تو میری خاطر اپنی جان کو بھی جوکھوں میں ڈال دیا تھا۔'' فلاور ہنستے ہوئے بولی۔

''میں نے اپنی جان کو اسی حد تک جوکھوں میں ڈالا تھا جس حد تک کوئی کوہ پیما... ڈال سکتا ہے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اگر تم میری مدد نہ کرتیں تو شاید میں کبھی بھی اس سرد جہنم کو عبور نہ کرپاتا۔ دراصل اس سارے علاقے کو پیدل عبور کیا جاسکتا ہے مگر راستے میں سو کلومیٹر کا جو ایریا ہے اسے کسی صورت بھی عبور نہیں کیا جاسکتا۔ میں تم سے طے شدہ پروگرام کے مطابق وہاں تک پہنچنے میں تو کامیاب ہوگیا تھا مگر اس سے آگے کا راستہ میں کسی صورت بھی عبور نہیں کرسکتا تھا۔'' مارتھر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اس راستے کو تم تو کیا آج تک کوئی کوہ پیما... بھی عبور نہیں کرسکا۔ اس لیے جب مجھے پتا چلا کہ تم نے میرے ڈیڈ کی اس شرط کو قبول کرلیا ہے تو میں بہت پریشان ہوئی۔ میرے اصرار کے باوجود تم نے بھی پیچھے ہٹنے سے انکار کردیا تھا اس لیے مجھے یہ سارا پلان ترتیب دینا پڑا۔'' فلاور نے جواب دیا۔

''مگر تمہیں اس بات کا اندازہ کیسے ہوا کہ تمہارے ڈیڈ نے میرے سامنے تم سے شادی کی جو شرط رکھی ہے اس کے پیچھے لارنس کا ہاتھ ہے؟'' مارتھر نے سوال کیا۔

''میں ایک عورت ہوں اور عورت کو مرد کی نظروں کی بڑی پہچان ہوتی ہے۔ میں لارنس کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بہت پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ میرے ڈیڈ سے تمہارے بارے میں بھی بات چیت کرتا رہتا ہے تمہیں غنڈوں سے پٹوانے کا مشورہ بھی اسی نے ڈیڈ کو دیا تھا مگر میں نے یہ بات اس لیے تم سے چھپائے رکھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم لارنس سے جھگڑا کرو۔ دوسری بات یہ تھی کہ یہ بات صرف لارنس ہی جانتا تھا کہ تم میرے معاملے میں کتنے جذباتی ہو اس لیے اسے یقین تھا کہ تم یہ شرط قبول کرلوگے، ورنہ یہ بات میرے ڈیڈ کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ بہرحال بعد میں میرے شبہے کی تصدیق اس طرح بھی ہوگئی کہ مجھے اس بات کا علم ہوگیا کہ اس نے تمہیں بوقت روانگی جو ٹرانسمیٹر دیا تھا اس میں فنی خرابی موجود تھی اور یہ بات میں نے تمہیں بھی بتادی تھی۔''

''تم درست کہہ رہی ہو۔'' مارتھر نے تفہیمی لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے مجھے دوسرا ٹرانسمیٹر نہ دیا ہوتا تو میں شاید واقعی اس سرد جہنم میں کہیں برف کی طرح جم چکا ہوتا مگر مجھے تمہاری ایک بات کی سمجھ نہیں آئی تھی اور وہ یہ کہ تم نے میری مدد کے لیے ہیلی کاپٹر پہلے کیوں نہ بھیجا۔ اس کے لیے اس سو کلومیٹر والے علاقے تک پہنچنے کی شرط ہی کیوں عائد کی؟'' مارتھر نے سوال کیا۔ پچھلے تین مہینوں سے وہ فلاور کے سحر میں کچھ اس طرح سے کھویا ہوا تھا کہ اس قصے کو ہی بھلا بیٹھا تھا تاہم آج فلاور نے ذکر چھیڑا تھا تو اس نے اپنے ذہن میں موجود سوالات کو اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''میرے ڈیڈ کو ڈاج دینا اتنا آسان نہیں ہے مائی ڈیئر!'' فلاور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہاری روانگی کے وقت انہوں نے بلیک وے کے دونوں اطراف میں اپنے آدمی تعینات کردیے تھے۔ کچھ آدمیوں نے دو سو کلومیٹر تک پہاڑوں میں تمہارا تعاقب کر کے ڈیڈ کو یہ کنفرم بھی کیا کہ تم واقعی اپنے سفر میں آگے بڑھ رہے ہو۔ اس کے علاوہ جب تک ممکن ہوسکا وہ دوربین کی مدد سے بھی تمہارا جائزہ لیتے رہے تھے۔ میرے ساتھ اصل مسئلہ یہ تھا کہ دوربین کی مدد سے کسی انسان کو پہاڑوں میں زیادہ دور تک مارک کرنا تو ممکن نہ تھا مگر اگر میں کسی ہیلی کاپٹر کو فوراً بھیج دیتی تو وہ ہیلی کاپٹر بہرحال مارک ہوسکتا تھا، اس لیے میں نے تم سے جو لوکیشن طے کی وہ علاقہ نیچے سے

اتنی دوری پر تھا کہ ہیلی کاپٹر کے دیکھ لیے جانے کا اندیشہ نہیں تھا۔ تم ایک منجھے ہوئے کوہ پیما... ہو اس لیے مجھے یقین تھا کہ تم طے شدہ لوکیشن تک پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے میرا بھیجا ہوا ہیلی کاپٹر تمہیں لے کر اس سو کلومیٹر والے خطرناک علاقے کو پار کرا دے گا، جہاں سے تمہیں پھر پیدل آگے بڑھنا تھا کیونکہ اس سرد جہنم کے دوسرے سرے کے نیچے بھی میرے ڈیڈ نے تمہیں مارک کرنے کے لیے اپنے آدمی پہنچا رکھے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور منصوبے کے مطابق ہی تھا... مگر عین وقت پر اس برفانی طوفان نے سارا پلان خطرے میں ڈال دیا۔ تم نے مجھے وہاں کے جو حالات بتائے تھے ان کے مطابق تم واقعی انتہائی خطرے میں گھر گئے تھے۔ اگر وہ برفانی طوفان طویل دورانیے کا ہوتا تو پھر تمہارا زندہ بچنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہی ہوتا۔“

”یہ بات تو ٹھیک ہے۔“ مارتھر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ برفانی طوفان بہت اچانک اور غیر متوقع تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی اور پھر اگر وہ طوفان جاری رہتا تو تمہارا بھیجا ہوا ہیلی کاپٹر اس علاقے میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ بس اسی جگہ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ میں جب اس علاقے میں طوفان سے بچ کر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو مجھے یہی خطرہ تھا کہ اگر پائلٹ سے طے شدہ مقام پر پہنچنے میں کوئی غلطی ہوگئی تو میں زندہ نہیں بچ پاؤں گا مگر جب میں نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی تو خوشی سے بے اختیار اچھل پڑا۔ پائلٹ سے ایگزیکٹ لوکیشن پر پہنچنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی، باقی میں نے اس سے تمہارے دیے ہوئے دوسرے ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ کر کے اسے اپنی ٹارچ کے ذریعے سگنل بھی دیے دیے۔ اس وقت تک اندھیرا پھیلنے کی شروعات ہو چکی تھی اس لیے اس نے میرے سگنل دیکھتے ہوئے میرے بالکل اوپر آکر بانس کی سیڑھی نیچے لٹکا دی جس کے سہارے میں ہیلی کاپٹر کے اندر پہنچ گیا اور پھر اس نے مجھے وہ علاقہ پار کروانے کے بعد نشیبی علاقے کے تقریباً دو تین سو کلومیٹر دور دوبارہ بانس کی سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتار دیا جہاں سے مزید نیچے پہنچنے میں مجھے تین دن لگ گئے مگر نیچے لارڈ کے آدمی میرے منتظر تھے۔ ہیلی کاپٹر ان کی نگاہوں میں نہ آجائے میرا اتنی دوری پر اترنا ضروری تھا ویسے بھی میرے لیے اصل مشکل وہ سو کلومیٹر والا ناقابلِ عبور راستہ ہی تھا جسے ہیلی کاپٹر نے پار کرا دیا تھا۔ میں جب نیچے پہنچا تو تمہارے ڈیڈ کے آدمیوں کے منہ مجھے دیکھ کر حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں نے اس سرد جہنم کو عبور کر لیا ہے۔ اب انہیں ہمارے کھیل کا تو علم ہی نہیں تھا۔ ویسے مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ تم نے اس پائلٹ کو کیسے قائل کر لیا کہ وہ لارڈ کا ذاتی ہیلی کاپٹر لے کر مجھے لینے کے لیے آجائے۔ مجھے اس کی مہارت کی بھی داد دینی پڑے گی۔ اگرچہ اس کی آمد سے کچھ دیر پہلے تک طوفان تھم گیا تھا مگر پھر بھی وہاں بہت تیز ہوا تھی اور اتنی تیز ہوا میں کچھ دیر کے لیے بھی میرے سر پر ہیلی کاپٹر معلق کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔“ مارتھر نے کہا تو فلاور کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

”اس پورے علاقے میں کوئی ایسی کمپنی نہیں ہے جو کرائے پر ہیلی کاپٹر دیتی ہو اور پھر رات کے وقت تو یہ ممکن ہی نہیں تھا ایسے میں میرے پاس یہی ایک آپشن تھا کہ میں ڈیڈ کے علم میں لائے بغیر ان کا ذاتی ہیلی کاپٹر استعمال میں لے آتی۔“ فلاور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہیلی پیڈ والی جگہ ہمارے گھر سے بہت دور ہے اس لیے ہیلی کاپٹر کی روانگی کا تو ڈیڈ کو پتا نہیں چل سکتا تھا مگر وہاں موجود عملے کی نگاہوں سے تو نہیں بچا جا سکتا تھا اس لیے میں نے کافی بڑی رقم دے کر ہیلی پیڈ پر تعینات چھ افراد پر مشتمل عملے اور پائلٹ کو خرید لیا۔ پائلٹ نے مقررہ اوقات پر تمہیں مطلوبہ مقام سے اٹھایا اور کافی آگے لے جا کر اتار دیا اور پھر واپس آگیا۔ اس ہیلی کاپٹر نے اس دن وہاں سے پرواز کی تھی اس کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے اس لیے میرے ڈیڈ کو بھی علم نہیں ہو سکے گا کہ ہم نے کیا کھیل کھیلا تھا، اور وہ لارنس تو آج تک اپنے زخم چاٹ رہا ہوگا۔ اب تو ہم سے ملا بھی نہیں۔ ہماری شادی پر بھی نہیں آیا دھوکے باز کہیں کا۔“ بات کرتے وقت فلاور کے چہرے پر غصے کے تاثرات عود آئے۔

”اسے بھول جاؤ۔“ مارتھر نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ”ایسے لوگوں کی اتنی اوقات بھی نہیں ہوتی کہ انہیں نفرت سے یاد کیا جائے، اب بس اپنی آگے کی زندگی کو یاد رکھو، ویسے ایک بات تو ہے، اگر تمہارے ڈیڈ کو یہ علم ہو جائے کہ اس سرد جہنم کو میں نے درحقیقت پیدل عبور نہیں کیا تھا بلکہ یہ کام میں نے انہی کے ذاتی ہیلی کاپٹر کے توسط سے سرانجام دیا تھا تو نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔“ مارتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”محبت کا جنون اپنی جگہ درست ہے مگر اس کے ساتھ ذہانت کا امتزاج ہو جائے تو ہی کامیابی ملتی ہے۔“ فلاور نے ہنستے ہوئے کہا تو اس کی ہنسی میں مارتھر کی ہنسی بھی شامل ہوگئی۔

⌘⌘⌘

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

قسط :10

شہ زور

اسما قادری

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
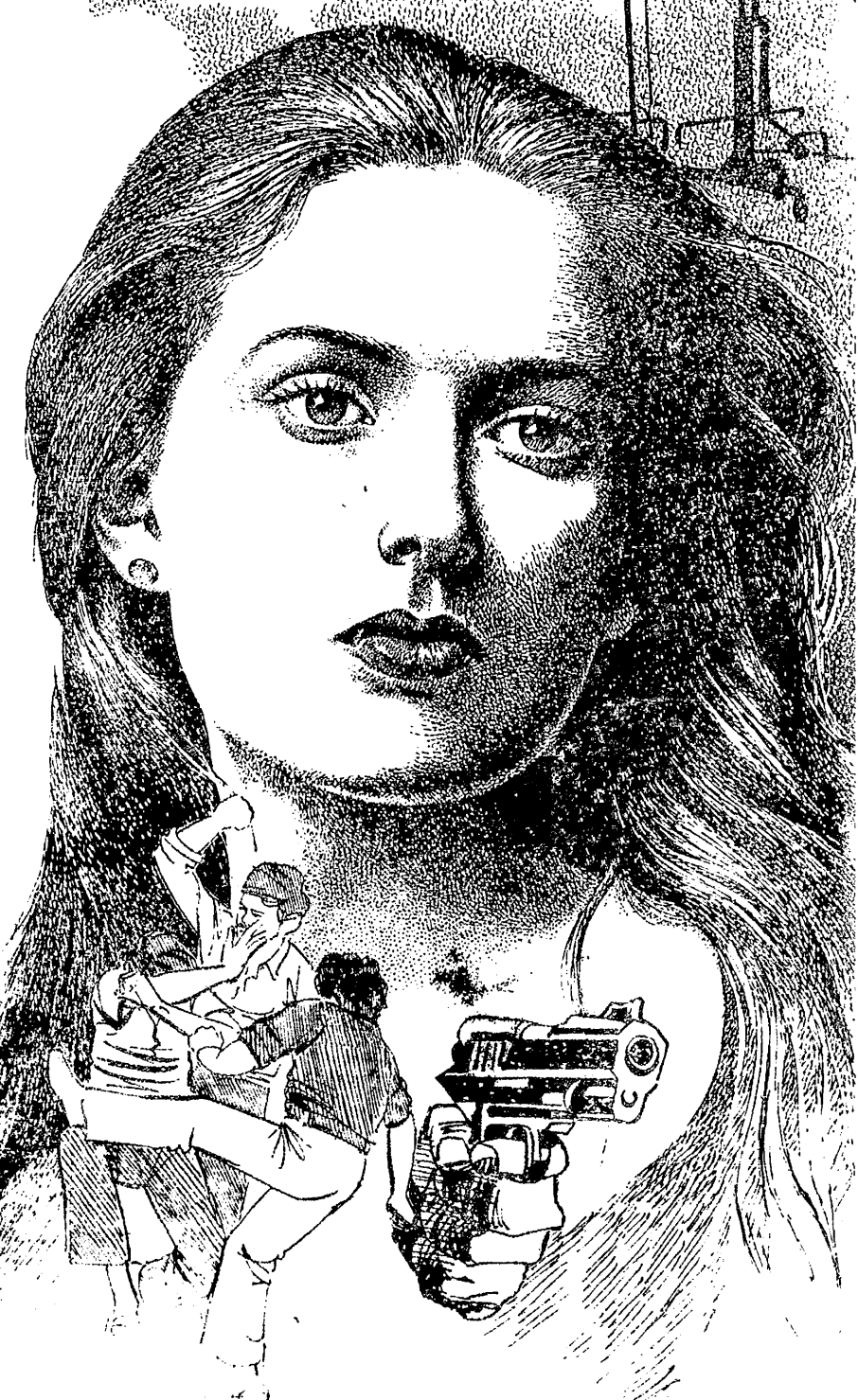
معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کردیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بےخبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیرقانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کررہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ خاموش بیٹھنے کے بجائے فوراً کیس کے انویسٹی گیشن افسر سے رابطہ کرکے اپنے شک کا اظہار کرتی ہے اور اس واقعے سے بھی آگاہ کرتی ہے جو معاذ اور کامران کے درمیان دشمنی کا باعث بنا۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بےآبرو کرکے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ بشریٰ کو بہت مایوسی ہوتی ہے لیکن وہ اپنے طور پر جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کرتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بےآبرو کردیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باذل کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہوجاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کرکے اسے ان کے حوالے کردیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہوجاتی ہے۔ معاذ کو بچانے والا لڑکا وقاص اپنے گروکے ساتھ ایک پارٹی میں جاتا ہے۔ وہاں اسے معاذ کے حوالے سے مشکوک ایک شخص نظر آتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے جاتا ہے مگر اسے گھیر لیا جاتا ہے۔ بہرحال وقاص کو تنبیہ کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کردیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کرلیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کرکے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیفو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ بشریٰ، کامران کو چھاپنے کا پروگرام بناتی ہے۔ ادھر عالم شاہ سراغ لگالیتا ہے کہ اس کے بہنوئی کا قتل کس نے کیا۔ وہ قاتل کو گھیرتا ہے اور اپنے تئیں اسے گولیاں مار کر قتل کردیتا ہے تاہم اچانک وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے اور فائرنگ شروع ہوجاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایک فٹ لمبے اور آدھا فٹ چوڑے اس ہوادان میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگا کر اس کے صیاد نے اس بات کا ثبوت دیا تھا کہ وہ اپنی تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود اس کے فرار سے خوف زدہ ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ معاذ اپنے پیاروں کی محبت کی زنجیروں سے اتنی بری طرح بندھا ہوا تھا کہ وہ یہاں سے فرار کا سوچ کر ان لوگوں کو خطرے میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا کہ حالات خود ہی ایک نہ ایک دن اسے بقا کا راستہ دکھادیں گے۔ چھوٹے سے ہوادان والا یہ نیا قید خانہ بھی اس کے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔ رات کی تاریکی میں جب وہ اپنے کمرے میں بالکل تنہا ہوتا تھا تو کمرے کی تمام روشنیاں بجھا کر ایسے زاویے سے بیٹھ جاتا جہاں سے ہوادان کے باہر آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا رہتا تھا۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے پر چمکتے تارے اس کی توجہ کا مرکز ہوتے تھے۔ پروفیسر وکٹر کے جال میں پھنسنے سے بچنے کے لیے اس نے ستارہ بینی کی مشق نہایت سنجیدگی سے کرنا شروع کردی تھی اور فیضو کے سکھائے سارے اسباق پر تندہی سے عمل کر رہا تھا۔ اپنی ان مشقوں کا مثبت نتیجہ بھی اسے ملنا شروع ہوگیا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر ایک نئی توانائی اور تبدیلی رونما ہونے لگی ہے۔ اس کے لیے اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ وکٹر آج کل منظر سے غائب تھا اور اسے اس بات کا موقع مل رہا تھا کہ وہ اس کے دوبارہ منظر پر آنے تک اپنے بچاؤ کے لیے زیادہ سے زیادہ اقدامات کرلے۔ جس قید اور جبر سے وہ گزر رہا تھا وہ تو اپنی جگہ اذیت ناک تھے ہی لیکن یہ احساس اس کی اذیت کو دوچند کردیتا تھا کہ کوئی اس کے دماغ پر اس طرح قابض ہوجائے گا کہ اس کا ہر عمل اس کے حکم کے تابع ہوا کرے گا۔

یہ لوگ کون تھے اور ان کے مقاصد کیا تھے؟ یہ تو وہ ابھی تک نہیں جان سکا تھا لیکن یہ بات اپنی جگہ طے شدہ تھی کہ وہ ایسے خطرناک لوگوں کے ہتھے لگ چکا ہے جو معمولی جرائم پیشہ نہیں بلکہ کسی نہایت منظم تنظیم سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے کچھ ایسے خطرناک عزائم تھے جو اس کے جذبۂ حب الوطنی اور جذبۂ دینی سے لازماً متصادم ہوتے۔ وہ خود کو ایسے لوگوں کا کھلونا بنانے سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ اسے جو تربیت دی گئی تھی اس کے نتیجے میں وہ خود ایک خطرناک ہتھیار بن چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اگر اس کا ذہن مسخر ہوگیا تو وہ اپنے قوم و مذہب کے لیے ہی ناسور بن جائے گا۔ اپنے آپ کو دشمن کا ہتھیار بننے سے بچانے کے لیے وہ اتنی دل جمعی سے مصروفِ عمل تھا کہ اپنی اندرونی کیفیات پر بھی دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس نے غور کرنا چھوڑ دیا تھا کہ اس کا دل کیوں پہلے سے بھی زیادہ مضطرب رہنے لگا ہے۔ کیوں سجل شاہ بار بار اس کے خوابوں میں آتی ہے؟ کیوں وہ اسے اس کی خوبصورت کڑھائی دار عنابی چادر کے بجائے سفید خون آلود دوپٹے کے حصار میں دیکھتا ہے۔ ہر پریشانی اور فکر کو جھٹک کر وہ اپنی توجہ ذہنی مشقوں پر مرکوز رکھ رہا تھا اور یہ اس کی بے حد محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ جب آٹھ دن کے وقفے کے بعد وکٹر واپس آیا تو وہ اس لائق تھا کہ اس کے مقابل ڈٹ سکے۔ وکٹر نے اسے اپنے غیاب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا اور کیوں اس سے ملنے نہیں آیا تھا لیکن معاذ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور، عمر رسیدہ اور رنجیدہ دکھائی دے رہا ہے۔ معاذ سے ملاقات کے وقت بھی وہ قدرے کھویا کھویا سا نظر آیا اور صاف محسوس ہوا کہ وہ صرف اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہاں آیا ہے۔ معاذ نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اسے ٹال گیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ میڈم کی ہدایات کے مطابق اس کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے۔ معاذ نے اسے اثبات میں جواب دیا تو اس نے اپنی کارروائی شروع کردی اور کمرے میں مخصوص رنگوں اور زاویوں کی روشنیوں کی مدد سے ایک ایسا ماحول بنادیا کہ ماحول میں موجود افراد خود کو پُرسکون محسوس کریں لیکن معاذ کا معاملہ الٹ تھا۔ اسے خود کو پُرسکون ظاہر کرنے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ اسے آرام دہ کاؤچ پر لٹاتے ہوئے یہ بات پروفیسر وکٹر نے بھی محسوس کرلی اور نرم لہجے میں بولا۔

''اپنے اعصاب کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دو۔ میں تمہارے ساتھ کچھ برا نہیں کرنے والا۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے تمہیں دوسرے کاموں کی تربیت دی گئی ہے، ویسے ہی یہ بھی تمہاری تربیت کا ایک حصہ ہے۔'' اپنی بات کہنے کے بعد اس نے معاذ کی نظروں کے عین سامنے ایک شمع روشن کرکے اسے اس پر توجہ مرکوز رکھنے کی ہدایت دی۔ معاذ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ پروفیسر وکٹر دھیمے دھیمے لہجے میں مزید ہدایات بھی دیتا رہا جس پر عمل کرتے ہوئے معاذ کو محسوس ہوا کہ وہ غنودگی کی کیفیت میں جارہا ہے۔ اس نے اس کیفیت کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا اور روشن شمع سے اپنی توجہ ہٹا کر اس کی جگہ روشن تارے کو اپنے تصور میں لے

آیا۔ اس تصور کے ساتھ ہی اس نے اپنے ذہن کو جاگتا ہوا محسوس کیا لیکن ضروری تھا کہ وکٹر کو اس بات کا احساس نہ ہو سکے، اس لیے اس نے ظاہراً خود کو اس کا معمول ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ وکٹر نے ابتدا چھوٹی چھوٹی باتوں سے کی۔ بچپن کی چند باتوں کو دہرانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ یزدانی بلڈرز والے معاملے پر آ گیا۔ دوسری ساری باتوں کا سرسری ذکر کرنے کے بعد اس نے اس واقعے کو چھیڑا جب معاذ کے والد سلطان کے خلاف ایک ثبوت لے کر تھانے گئے تھے اور وہاں نہ صرف انہیں دھوکا دیا گیا تھا بلکہ بعد میں بدسلوکی بھی کی گئی تھی۔ اس بدسلوکی کو وکٹر نے کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیا کہ معاذ اپنے اندر طیش کی لہریں سی اٹھتی محسوس کرنے لگا۔

''حق پر ہوتے ہوئے بھی اس رشوت خور پولیس آفیسر نے تمہارے والد کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی معاذ! اصل میں وہ اس کرپٹ سسٹم کا حصہ ہے جو اس ملک میں ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت میں اب یہ ملک شریف اور ایماندار لوگوں کے رہنے کے لائق ہی نہیں رہا ہے۔ یہاں رہنے سے بہتر ہے کہ بندہ کہیں اور چلا جائے یا پھر کچھ ایسا کرے کہ یہاں سب کچھ تبدیل ہو جائے۔ سب کچھ ایسے ہی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اس تبدیلی کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کا سہارا لیا جائے جو اپنے سسٹم کو اچھے طریقے سے چلا رہے ہیں۔ تم جن لوگوں کے درمیان موجود ہو، وہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ اگر تم ان لوگوں کی ہدایات اور احکامات پر عمل کرو تو تنہا بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ کیا تم ان لوگوں کا ساتھ دو گے معاذ......؟'' اپنی بات کہہ کر اس نے آخر میں سوال کیا تو معاذ نے اثبات میں جواب دیا اور غنودہ سی آواز میں بولا۔

''ہاں! میں ان لوگوں کا ساتھ دوں گا۔''

''گڈ! اب تمہیں یاد رکھنا ہوگا کہ ساتھ دینے کا مطلب ہے ہر حکم پر بے چون و چرا عمل کرنا، چاہے وہ حکم تمہیں کتنا ہی غلط محسوس ہو رہا ہو۔ کیا تم ایسا کر سکو گے؟''

''ہاں! میں ایسا ہی کروں گا۔'' معاذ نے ایک بار پھر اسے اثبات میں جواب دیا لیکن اندر ہی اندر وہ اپنے دماغ کو ہدایت دے رہا تھا کہ اسے ان لوگوں کی کسی ہدایت یا حکم پر عمل نہیں کرنا ہے۔ یہ ایک نہایت محنت طلب کام تھا۔ اسے وکٹر کی ہر سجیشن کو یاد بھی رکھنا تھا اور دماغ کو باور بھی کروانا تھا کہ وہ ان میں سے کسی بات پر عمل نہیں کرے گا۔ اس کشمکش نے اسے اتنا تھکا دیا تھا کہ اس کو ٹھنڈے پسینے آنا

شروع ہو گئے تھے۔

''اب تم تھک گئے ہو۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ گہری اور پُرسکون نیند سو جاؤ۔'' وکٹر نے اس کی حالت د[illegible] تو اسے نئی سجیشن دی۔ اس ہدایت کے ملتے ہی معاذ نے [illegible] کو پُرسکون کرنا شروع کر دیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا ذ[illegible] آہستہ آہستہ غنودگی کی طرف جا رہا ہے لیکن اس نے کوش[illegible] کی کہ وہ آنکھیں تو بے شک بند رکھے لیکن سونے نہ پا[illegible] وہ کسی دوسرے کی ہدایت پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے سو[illegible] جاگنے کا خواہاں تھا۔ اپنی اس کوشش میں اسے جز[illegible] کامیابی حاصل ہوئی اور وہ نیم غنودگی کی سی کیفیت کا [illegible] ہو گیا۔ اسی کیفیت میں اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں [illegible] دوسرا فرد داخل ہوا ہے۔ اونچی ایڑی کی ٹک ٹک نے [illegible] باور کروا دیا کہ وہ کوئی نسوانی وجود ہے۔ اس نے کوشش [illegible] کہ آنکھوں کو نیم وا کر کے آنے والی کو دیکھ سکے لیکن ا[illegible] اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اور ایسا لگا کہ پو[illegible] بھاری بوجھ تلے دبے کھلنے سے قاصر ہوں۔ مجبوراً وہ [illegible] بے سدھ سی کیفیت میں پڑا رہا۔

''کیسے ہو پروفیسر؟'' اس نے نسوانی آواز کو پرو[illegible] سے مخاطب ہوتے سنا۔

''جو کچھ کھو کر آیا ہوں، اس کے بعد کیسا ہو[illegible] ہوں؟'' جواب میں پروفیسر وکٹر کی افسردہ اور تھکی [illegible] آواز سنائی دی۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔ ایک باپ کے لیے [illegible] اکلوتی بیٹی کو کھو دینے سے بڑا غم کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ میں کس کرب سے گ[illegible] ہوں۔ میری اتنی لائق فائق ماہر سرجن بیٹی صرف ایک [illegible] سے مر گئی۔ وہ ایک زخمی میجر کا آپریشن کرنے اسپتال جا[illegible] تھی کہ راستے میں مخالف لوگوں کے پتھراؤ میں پھنس گئی [illegible] ڈاکٹر تھی لیکن زخمی ہوئی تو خود اسے ڈاکٹر میسر نہیں آیا۔ جگ[illegible] ہونے والے احتجاج کی وجہ سے اسے وقت پر اسپتال [illegible] نہیں پہنچایا جا سکا۔'' معاذ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کا د[illegible] بار بار ڈوب ابھر رہا ہے یا پروفیسر کی آواز جو وہ گفتگو کو پو[illegible] طرح سننے میں ناکام ہے لیکن مفہوم بہرحال کافی حد تک [illegible] آ رہا تھا۔

''مجھے کچھ مت بتاؤ پروفیسر۔ میں سب جانتی ہو[illegible] مجھے معلوم ہے کہ اس روز ہمارا بہادر میجر کئی مخالف کتو[illegible] موت کی نیند سلانے کے بعد اتفاق سے خود بھی زخمی ہو گ[illegible] اور قوم کی بہادر بیٹی ربیکا خراب حالات کے باوجود اسپ[illegible]

سے فون آنے پر میجر کی خاطر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ ربیکا کی حیثیت ہمارے نزدیک شہید سپاہی کی سی ہے اور ہم اپنی قوم کے شہیدوں کو کبھی نہیں بھلاتے۔ ربیکا کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لینا ہم پر لازم ہے اور حساب لینے والوں میں تم بھی شامل ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ شدید غم کے باوجود تم اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئے اور ربیکا کی آخری رسومات سے فارغ ہوتے ہی اپنی ڈیوٹی پر واپس آگئے ہو۔ کہو کیسا چل رہا ہے تمہارا کام۔ کچھ کامیابی ملی؟'' معاذ کے کانوں میں پڑنے والی نسوانی آواز اسے شناسا سی محسوس ہو رہی تھی لیکن فی الوقت دماغ تجزیہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ آواز کس کی ہے اور اس نے پہلے کہاں سنی ہے؟

''کام چل پڑا ہے۔ آج اس نے میری دی ٹیکنیشن ایکسیپٹ کی ہے۔ بہت جلد یہ اپنے ملک وقوم کے لیے ایک چلتا پھرتا بم بن جائے گا۔'' پروفیسر نے جو جواب دیا اسے سن کر معاذ کے دل نے ''کبھی نہیں'' کا نعرہ لگایا لیکن دماغ اب بہت تھک چکا تھا اور وہ چاہنے کے باوجود مزید جاگتے رہنے سے قاصر تھا۔ ایک دھندسی تھی جو بار بار حواس پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ آخرکار اس نے ہار مان لی اور وہاں جاری گفتگو سے بے نیاز گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

کامران یزدانی کے ساتھ اس کی شاندار گاڑی میں کیا جانے والا طویل سفر باربی کے لیے کسی طور خوش گوار نہیں تھا لیکن اس نے اپنے چہرے سے اپنی ناگواری کا احساس نہیں ہونے دیا اور ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے سب کچھ نہایت حوصلے سے برداشت کرتی رہی۔ کامران اس کے ساتھ کی وجہ سے اتنے خوش گوار موڈ میں تھا کہ اس نے راستے میں بھی شغل جاری رکھا تھا۔ اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر براجمان باربی اس کے منہ سے اٹھتے شراب کے بھبکوں کو کیسے برداشت کر رہی تھی، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ ائرکنڈیشنڈ گاڑی کی وجہ سے سارے شیشے بھی بند تھے اور اسے کہیں کھل کر سانس لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس پر اسے کامران یزدانی کی بے ہودہ حرکات برداشت کرنے کے جبر سے بھی گزرنا پڑ رہا تھا۔ اپنے تئیں وہ اس کے ساتھ عشق بگھار رہا تھا لیکن یہ تو وہ ہی جانتی تھی کہ وہ کس اذیت سے گزر رہی ہے۔ خدا خدا کر کے طویل سفر اپنے اختتام کو پہنچا اور وہ لوگ خاصی حد تک ویران پڑے ایک علاقے میں تعمیر شدہ ریسٹ ہاؤس نما عمارت میں پہنچے۔ عمارت میں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ باربی نے راستے میں اتار دیا جانے والا اپنا جالی دار ہیٹ ایک بار پھر پہن لیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہاں ان کا استقبال کرنے والے لوگ کون ہیں لیکن وہ خود کو زیادہ لوگوں کی نظروں میں آنے سے بچانا چاہتی تھی اس لیے یہ تکلف کیا تھا۔

''خوش آمدید۔ خوش آمدید سائیں کامران! تمہیں یہاں دیکھ کر اچھا لگا۔ سائیں حیات یزدانی ہمارے دوست ہیں اور دوست کے پُت کو اس کا بازو بنتے دیکھنا اچھا لگا ہے۔'' وہ لوگ گاڑی سے نیچے اترے تو ایک پستہ قامت اور فربہ شخص نے پُرجوش انداز میں ان کا استقبال کیا اور کامران سے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

''شکریہ سومرو صاحب! ڈیڈی نے مجھے آپ کے متعلق بتایا تھا کہ آپ میرے ساتھ تعاون کرنے کے لیے یہاں موجود ہوں گے اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آپ رات کے اس پہر بھی پوری طرح چاق و چوبند میرے استقبال کے لیے موجود ہیں۔'' کامران نے بھی جواباً اخلاق سے کام لیا اور سومرو کی تعریف کی جس پر اس کی باچھیں کھل گئیں اور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''مہمان کے لیے اپنی جان بھی نچھاور کر دینا ہماری روایت ہے سائیں کامران! اور آپ کے ساتھ تو بزنس کا معاملہ ہے۔ ہماری آپس میں ساجھے داری ہے۔ ہمارا نفع نقصان ایک ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کے لیے اپنی نیند قربان نہ کروں۔'' وہ کامران سے مخاطب تھا لیکن دزدیدہ نظروں سے بار بار ساتھ کھڑی باربی کو بھی دیکھ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟ کامران نے اس کی نظروں کو محسوس کر لیا اور خود ہی تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

''یہ میری دوست مس باربی ہیں۔ آج ان کے ساتھ ملاقات طے تھی تو میں نے سوچا دونوں کام ایک ساتھ نمٹالوں۔'' بات کے اختتام پر اس نے بائیں آنکھ کا کونا معنی خیز انداز میں دبایا تو لطیف سومرو ہنس دیا اور بولا۔

''تم تو اپنے پیو سے بھی اوپر کی چیز دکھائی پڑتے ہو کامران سائیں!'' کامران جواباً زبان سے کچھ نہیں بولا اور ہنستا ہوا اس کے ساتھ اندر پہنچ گیا۔ باربی اس کے ساتھ تھی اور یوں اپنے چہرے کو سپاٹ کر رکھا تھا جیسے اسے وہاں ہونے والی گفتگو قطعی سمجھ نہیں آ رہی ہو۔

''سب ٹھیک ہے نا، کہیں کوئی خطرہ وغیرہ تو نہیں ہے؟'' اندر پہنچ کر ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے

کامران نے سومرو سے پوچھا۔ باربی نے بھی اس کے قریب ہی جگہ سنبھال لی تھی۔

"خطرہ کیسا؟ سب جگہ معاملات طے ہیں۔ پارٹی خود یہاں تک آکر ڈیلیوری دے گی اور آگے ہم مال کو طے شدہ طریقے کے مطابق سپلائی کردیں گے۔ میں نے تو سائیں حیات یزدانی سے کہا تھا کہ اگر وہ نہیں آسکتے تو کوئی گل نہیں ہے، میں سب سنبھال لوں گا لیکن پھر بھی انہوں نے آپ کو بھجوا دیا۔"

"ڈیڈی چاہ رہے تھے کہ مجھے بھی کام کا تجربہ ہوجائے، اس لیے اس بار انہوں نے مجھے بھجوادیا۔" کامران یزدانی نے اس سے بہانہ بنایا۔ حقیقتاً وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے آنے والے مال کی وصولی کے لیے نہیں بلکہ اس چیز کی وصولی کے لیے بھیجا ہے جو اس مال کی آڑ میں لائی جارہی ہے اور جس کی ہوا سومرو کو بھی نہیں لگنے دینی ہے۔

"جیسی ان کی خوشی۔ آپ بتاؤ، آپ کی کیا خاطر کریں۔ کوئی مانی ٹکر، کوئی سوڈا یا بوتل شوتل؟" سومرو ایک بار پھر میزبانی کے فرائض انجام دینے لگا۔

"کھانا وانا تو ہم نے کھالیا تھا۔ پینے کو اگر ولایتی ملے تو چل جائے گی۔" کامران نے اسے جواب دیا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ ادھر ایک سے بڑھ کر ایک ولایتی ملتی ہے۔ دیسی کو تو ہم منہ ہی نہیں لگاتے۔" سومرو نے فخر سے جواب دیا اور ملازم کو آواز دینے لگا۔

"سپلائی ملنے میں کتنی دیر ہے؟" کامران نے ملازم کے آرڈر لے جانے کے بعد دریافت کیا۔

"بس پون گھنٹا لگے گا۔ میرے آدمی علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہمیں اطلاع دے دیں گے۔" سومرو نے جواب دیا۔ اسی وقت اس کا ملازم شراب نوشی کے جملہ لوازمات سے سجی ٹرالی دھکیلتا ہوا وہاں لے آیا۔ یقیناً ٹرالی پہلے سے تیار تھی اور محض برف کے کیوبز کے اضافے کے ساتھ پیش کردی گئی تھی۔ شہر سے اتنی دور آبادی سے بالکل الگ تھلگ جگہ پر اتنی سہولیات کی موجودگی محض پیسے کا کھیل تھا۔ بجلی نہ ہونے کے باوجود وہاں جنریٹر سے بلاتعطل بجلی کی فراہمی جاری تھی اور آرام سے جنگل میں منگل منایا جاسکتا تھا۔

"کبھی کسی طرف سے یہاں موجود افراد کو چیک کرنے یا ان کی موجودگی پر اعتراض کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی کیا؟" کامران نے اپنے لیے ایک پیگ تیار کیا اور سومرو سے پوچھا۔

"بتایا ناکہ ہر طرف سیٹنگ ہے۔ کبھی کسی طرف سے چیکنگ ہو بھی تو کہہ دیتے ہیں کہ شکاری ہیں اور شکار کرنے آئے ہیں۔ ادھر آس پاس چھوٹا شکار اچھا مل جاتا ہے اس لیے کوئی زیادہ شک نہیں کرتا۔ کسی سرپھرے سے واسطہ پڑجائے تو اسے بھی راستے میں تھوڑا بہت مال پکڑوا کر مطمئن کردیتے ہیں۔ اس جگہ پر کبھی کسی کو شک نہیں پڑنے دیا اور سارا دھندا بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔" کامران کے سوال پوچھنے پر وہ جواب تو دے رہا تھا لیکن گاہے بگاہے باربی پر بھی یوں نظر ڈال لیتا تھا کہ جیسے کنفیوژ ہو کہ اس کی موجودگی میں یہ ساری باتیں کرنی بھی چاہئیں یا نہیں۔

"اس کی طرف سے بےفکر رہیں سومرو صاحب! اول تو یہ انگریزی کے سوا کوئی زبان سمجھتی نہیں ہے، دوسرے میری دوست ہے اس لیے اس سے کسی نقصان کا ڈر نہیں ہے۔" کامران نے اس کی بےچینی بھانپ کر اسے تسلی دی۔

اسی وقت سومرو کے موبائل کی بیل بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ جوں جوں وہ سنتا جارہا تھا، اس کے چہرے کی رنگت بدلتی جارہی تھی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ سیاہ محسوس ہورہا تھا۔ بات سننے کے دوران اس نے تند و تیز لہجے میں دو تین سوالات بھی کیے۔ گفتگو کے اختتام پر اس نے موبائل بند کیا تو اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں اور وہ بری طرح مضطرب محسوس ہورہا تھا۔

"خیریت تو ہے سومرو صاحب؟" کامران، جس نے یکطرفہ گفتگو سے تھوڑا بہت اندازہ قائم کرلیا تھا، ہمدردی سے دریافت کرنے لگا۔

"خیریت نہیں ہے۔ کراچی میں میرے بیٹے کی کوٹھی میں گھس کر کچھ لوگوں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور وہ بےحد زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔" سومرو نے بھرائی ہوئی آواز میں اسے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہوا، کیا وہاں گارڈ نہیں تھے؟" کامران نے حیرت سے دریافت کیا۔

"سب تھے، لیکن حملہ آوروں نے سب کو بےبس کردیا۔ ابھی یہاں آنے کے بعد تو میری اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھا اور کہیں کوئی گڑبڑ محسوس نہیں ہورہی تھی۔ پھر نہ جانے اچانک کیسے یہ سب ہوگیا۔" سومرو نے اپنا سر تھام لیا۔

"حوصلے سے کام لیں سومرو صاحب اور چاہیں تو ابھی یہاں سے روانہ ہوجائیں۔ یہاں میں سب سنبھال لوں گا۔

آپ کا فی الحال اپنے بیٹے کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' کامران نے اس سے ہمدردی کا مظاہرہ کیا۔

''یہی ٹھیک رہے گا۔ میرے بندے یہاں موجود ہیں اور جانتے ہیں کہ انہیں کب کیا کرنا ہے۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔ تم چاہو تو اندر بیڈروم میں آرام بھی کرسکتے ہو۔'' سومرو نے اسے جواب دیا اور جلدی جلدی مزید ایک دو باتیں کہہ کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد کامران نے خود کو زیادہ ریلیکس محسوس کیا اور انگریزی میں باربی کو ساری تفصیل بتانے کے بعد شوخ لہجے میں بولا۔

''اچھا ہوا، بڈھا چلا گیا۔ خوامخواہ کباب میں ہڈی بن کر بیٹھا ہوا تھا۔ اب ہم صبح تک آرام سے عیش کریں گے۔''

''پہلے جس کام سے آئے ہو، اسے نمٹالو۔ میں بھی اتنی دیر میں ایزی ہوجاتی ہوں۔ بیٹھے بیٹھے کمر ہی اکڑ گئی ہے۔'' باربی اسے ٹوکتے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''اوکے اوکے! جاؤ ایزی ہوجاؤ۔ یہ لمبا گاؤن اور چہرے پر پڑی جالی دیکھ کر تو میں بھی بور ہوگیا ہوں۔'' کامران نے اسے جواب دینے کے ساتھ وہاں موجود ملازم کو حکم دیا کہ اسے بیڈروم میں پہنچا دیا جائے۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہاں وہ ہلچل مچ گئی جو کسی کام کی انجام دہی کے دوران خود بخود ہی پیدا ہوجاتی ہے۔ فریش ہونے کے بہانے بیڈروم میں جانے والی باربی نے بھی اس ہلچل کو محسوس کرلیا اور چپکے سے باہر نکل آئی۔ بیڈروم والے حصے میں کوئی موجود نہیں تھا اور باہر کی جانب سے مدھم مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے ایک کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تاریکی میں اسے ایک گاڑی اور چند متحرک انسانی ہیولے نظر آئے۔ وہ ہیولے نہایت خاموشی سے ویگن نما اس گاڑی سے کوئی سامان اتار اتار کر اندر لارہے تھے۔ وہ سامان کیا تھا، اسے اندھیرے میں قطعی اندازہ نہیں ہوا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہوجانے والی گاڑی اسٹارٹ ہوکر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ وہ متجسس سی ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی لیکن دروازے سے سیدھا اندر داخل ہونے کے بجائے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ حسبِ توقع کامران یزدانی وہیں موجود تھا اور کمرے میں موجود ایک دوسرے شخص کی طرف متوجہ تھا۔ وہ شخص کہہ رہا تھا۔

''میں آپ سے پھر کہوں گا سائیں کہ آپ نے یہاں مال اتروا کر ٹھیک نہیں کیا۔ سائیں سومرو کبھی ایسا رسک نہیں لیتے اور باہر ہی سے دوسری گاڑیوں میں مال لوڈ کروا کر جہاں بھجوانا ہو، فوراً بھجوا دیتے ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ یہ جگہ کبھی کسی کی نظروں میں آئے۔''

''میں پہلے بھی تمہاری یہ بات سن چکا ہوں یار! اور تمہیں بتا بھی دیا ہے کہ مال اتروانے کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔ ویسے بھی ضروری نہیں کہ جو کچھ تمہارا سائیں کرے وہی میں بھی کروں۔ میرا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے اور میں اسی طریقے کے مطابق کام کروں گا۔ اب تم یہاں سے جاؤ اور دس منٹ بعد ان گاڑیوں کو منگوالو جن پر مال آگے جانا ہے۔'' کامران نے اس شخص کو درشت لہجے میں جواب دے کر حکم صادر کیا تو وہ ایک پل کی ہچکچاہٹ کے بعد وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی کامران اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازہ بند کرنے کے بعد ایک قطار میں رکھے کارٹنز کی طرف بڑھا۔ وہ جس طرح ایک ایک کارٹن کو بغور دیکھ رہا تھا، اس سے صاف اندازہ ہورہا تھا کہ اسے کسی مخصوص کارٹن کی تلاش ہے۔ پھر شاید اسے وہ کارٹن مل گیا۔ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر ناخن تراش کے ساتھ منسلک ننھا چاقو نکالا اور احتیاط سے کارٹن پر چڑھا کاغذ اتارنے لگا۔ کاغذ کا ایک حصہ اتارتے ہی اس نے اندر سے ایک ننھی سی سیاہ چیز نکالی اور نکال کر اپنے پرس میں رکھ لی۔ پھر نہایت نفاست سے پورا کاغذ اتارنے کے بعد اس کاغذ کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرکے اسے وہیں رکھے ایک بڑے سے آرائشی گل دان میں ٹھونس دیا۔ کارٹن پر اندر بھی ویسا ہی کاغذ چڑھا ہوا تھا جیسا کامران نے ابھی اتارا تھا اور اس کارٹن کو دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی کارروائی کی گئی ہے۔ اپنی اس کارروائی سے فارغ ہوکر کامران نے دروازہ کھول دیا اور اطمینان سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے انتظار کے بعد وہی شخص دوبارہ اندر آیا جسے باربی نے کامران سے بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

''گاڑیاں آگئی ہیں سائیں۔'' اندر آکر اس نے کامران کو اطلاع دی۔

''ٹھیک ہے تم مال لوڈ کروادو، میں اب کچھ دیر آرام کروں گا۔ تھوڑی ہی رات باقی رہ گئی ہے۔ صبح مجھے واپس بھی جانا ہے۔'' اس نے بے نیازی سے اس شخص کو حکم دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی باربی بھی اپنی جگہ سے حرکت میں آئی اور بلی کی چال چلتی ہوئی واپس اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں اسے ٹھہرایا گیا تھا۔ یہاں اس نے آرام کے بہانے آکر کچھ انتظامات پہلے ہی کرلیے تھے۔ کامران کمرے میں آیا تو وہ اسے ایک چوتھائی سنہری مشروب سے بھرا جام ہاتھ میں لیے بیٹھی دکھائی دی۔ اس

وقت اس کے جسم پر لمبا گاؤن تھا اور نہ ہی سر پر جالی دار ہیٹ۔ اسے دیکھ کر کامران یزدانی کی رال ٹپکنے لگی لیکن بظاہر متانت سے مسکرایا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔
''اکیلے اکیلے شغل چل رہا ہے۔''
''اور کیا کروں؟ تم نے تو یہاں لاکر مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے اور خود نہ جانے کہاں مصروف ہو؟'' اس نے ایک ادا سے شکایت کی۔
''ساری مصروفیت ختم ہوگئی ہے۔ اب سارا ٹائم تمہارا ہے۔'' کامران مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
''تمہارے لیے جام بناتی ہوں۔'' باربی نے ایسی سگھڑ بیوی کی طرح کہا جو ملازمت سے تھکے ہارے آنے والے شوہر کے لیے چائے تیار کرنے جارہی ہو۔
''بنادو۔ ویسے آج بہت زیادہ پی لی ہے۔''
''زیادہ پی کر بھی تمہارا کیا بگڑا ہے۔ اتنے آرام سے ہو جیسے شراب کی جگہ سوفٹ ڈرنک پیتے رہے ہو۔'' باربی کا یہ تبصرہ سن کر کامران نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔
''میرے لیے شراب سوفٹ ڈرنک جیسی ہی ہے۔ سولہ سال کی عمر سے پی رہا ہوں اس لیے عادی ہوگیا ہوں۔''
''پی کر بہک جانے والے کم ظرف ہوتے ہیں۔'' باربی نے تبصرہ کیا اور ایک ڈبل پیگ تیار کرکے اس کی طرف بڑھایا۔ کامران جو ہلکے ہلکے سرور میں تھا، مسکرایا اور جام کے ساتھ ساتھ اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔
''ترتیب سے چلو مسٹر! پہلے شراب اور پھر شباب۔'' باربی نے اسے ٹوکا اور آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑوالیا۔
''اب صبر نہیں ہوتا۔'' کامران نے کہا اور ایک سانس میں پورا جام چڑھا گیا۔ ایسا کرنے سے اس کا سینہ یقیناً جل اٹھا ہوگا لیکن اس نے پروا نہیں کی اور پہلے سے کئی گنا زیادہ سرخ ہوجانے والی آنکھوں سے باربی کے جسم کو ٹٹولتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے ایک جھٹکے سے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔
''یہ کیا کررہے ہو؟'' اس نے ہلکا سا احتجاج کیا لیکن کامران نے پروا نہیں کی اور اسے لے جاکر بیڈ پر ڈالنے کے بعد خود اس کے اوپر گر گیا۔ اس کے منہ سے خارج ہوتے بدبو کے بھبکوں سے باربی کا جی متلانے لگا لیکن وہ برداشت کرگئی کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے اکثر ناگوار باتوں کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھی کامران یزدانی کے کریہہ وجود کو اپنے قریب برداشت کررہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں اور ہونٹوں سے اس کے خوبصورت و نازک بدن کو ٹٹولتا اس کے شباب کا سرور اپنے وجود میں منتقل کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ ذرا دیر میں وہی ہوا جو ہونا تھا۔ کامران یزدانی کی حرکات وسکنات سست پڑنے لگیں اور دھیرے دھیرے وہ مکمل مدہوش ہوگیا۔ باربی نے ابھی تک خود پر لٹکا اس کا بازو نفرت سے جھٹکا اور بستر سے اتر کر سب سے پہلے اس کا والٹ اپنے قبضے میں لیا۔ والٹ کی تلاشی لینے پر وہ ننھی سی سیاہ شے اس کے ہاتھ میں آگئی جسے اس نے کامران یزدانی کو کارٹن کی پیکنگ سے نکالتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اصل میں ایک میموری کارڈ تھا جو اسے اپنی مددگار ہستی کے تعاون کے بدلے اس تک پہنچانا تھا۔ اس میموری کارڈ کو اپنے پاس محفوظ کرنے کے بعد اس نے اپنے کلچ میں سے وہ ننھی سی ٹیوب نکالی جس میں کامران یزدانی کی موت کا سامان موجود تھا۔ دھاتی باریک سوئی نے وہ موت اس کے جسم میں منتقل کی، تب بھی وہ مزے سے سوتا رہا اور کسمسایا تک نہیں۔ شراب میں شامل بے ہوشی کی دوا نے اس کی سدھ بدھ ہی ختم کردی تھی۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد باربی نے اٹیچڈ باتھ کا رخ کیا اور خوب رگڑ رگڑ کر غسل کرنے لگی۔ اس طرح وہ اپنے جسم سے اس نادیدہ گندگی کو مٹانے کی کوشش کررہی تھی جو کامران یزدانی کے لمس کا نتیجہ تھی۔ طویل غسل لے کر نکلنے کے بعد وہ خود کو کافی تازہ دم اور ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔ سورج طلوع ہوکر ہر طرف اپنی روشنی پوری طرح پھیلا چکا، تب اس نے کامران کو جگانے کی کوشش شروع کی لیکن جگانے جانے پر بھی وہ مدہوشی کی کیفیت میں تھا۔ اس نے وہاں موجود ملازم کو بلایا اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔
''تمہیں پی کر مدہوش ہوجانے والوں کو ہوش میں لانے کا تجربہ ہوگا۔ اسے بھی کوئی لیمن جوس، بلیک کافی وغیرہ پلا کر ہوش میں لانے کی کوشش کرو تاکہ ہم واپس جاسکیں اور دیکھو جب تک یہ ہوش میں آئے، میرے لیے ناشتا لے آؤ۔ میں ڈائننگ روم میں انتظار کررہی ہوں۔'' ملازم انگریزی دان نہیں تھا لیکن اکثر بڑے لوگوں کی خدمت کرتے رہنے کی وجہ سے انگریزی کے چند الفاظ ضرور سمجھ لیتا تھا۔ کچھ بات اس نے لیمن جوس اور بریک فاسٹ کے الفاظ سے سمجھی اور زیادہ اندازہ صورت حال کو سمجھ کر لگایا کہ وہ اس سے کیا چاہتی ہے چنانچہ تیزی سے حرکت میں آگیا۔ پندرہ منٹ کے اندر ڈائننگ روم میں بیٹھی باربی کو ناشتا بھی

مل گیا اور کامران یزدانی کو ہوش میں لانے کی تدبیریں بھی شروع ہوگئیں۔ ان تدبیروں کے نتیجے میں وہ ایک گھنٹے بعد اس لائق ہو چکا تھا کہ سفر کر سکے لیکن تھکن اور سستی کی شکایت اپنی جگہ تھی۔

''تم ضرورت سے زیادہ پی گئے تھے اس لیے اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکے۔ گھر جا کر آرام کرنا تو سستی اور تھکن دور ہو جائے گی۔ میں اب مزید اس جگہ رک کر بور نہیں ہونا چاہتی۔'' باربی نے روٹھے لہجے میں اس سے یہ سب کہا تو وہ شرمندہ ہو گیا اور وضاحت دینے والے انداز میں بولا۔

''شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور سفر کی تھکن بھی ہوگئی ہے جب ہی ایسا ہوا ورنہ میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں جو پی کر اپنے حواس کھو دیتے ہیں۔''

''میرے تجربے نے تمہارے دعوے کو جھٹلا دیا ہے مسٹر کامران یزدانی! بہرحال نقصان تو تمہارا ہی ہوا کہ تم نے اپنا چانس مس کر دیا۔ اب کبھی میں تمہیں دستیاب نہیں ہوں گی۔'' کامران سے یہ الفاظ کہتے ہوئے باربی کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس سفاک مسکراہٹ چمکی تھی۔

''ہاں! اس کا تو مجھے بھی افسوس ہے لیکن کہتے ہیں نا کہ یار زندہ صحبت باقی۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں پھر کبھی ہماری ایک، دوسرے سے ملاقات ہو جائے۔'' کامران نے گویا خود ہی کو دلاسا دیا۔

''اب تو شاید ہمارا سامنا روزِ حشر ہی ہو سکے۔'' باربی زیرلب بڑبڑائی پھر بلند آواز میں بولی۔ ''میرے خیال میں یہاں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ سفر لمبا ہے اور مجھے ہوٹل پہنچ کر آرام کرنے کے بعد نائٹ شو کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔'' اس کی اس بات کے بعد وہ لوگ فوراً ہی روانہ ہوگئے۔ گاڑی حسب سابق ڈرائیور ہی چلا رہا تھا اور کامران یزدانی اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اب اس کی طبیعت میں وہ پہلی سی چونچالی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سست اور نڈھال سا محسوس ہو رہا تھا۔ آدھا سفر گزرا تو قریب بیٹھی باربی نے اس میں آنے والی تبدیلی کو محسوس کیا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا اور چہرے اور آنکھوں کی سرخی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے مسٹر کامران؟'' اس نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ میں بہتر محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے بخار چڑھ گیا ہے۔'' کامران نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''خاصے نازک مزاج لگتے ہو۔ خیر گھر پہنچ کر بخار کے لیے کوئی میڈیسن لے کر سو جانا۔ ایک دو دن آرام کرو گے تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔'' باربی نے طنزیہ لہجے میں اسے مشورہ دیا تو وہ پہلو بدل کر رہ گیا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کی یہ خاموشی باقی ماندہ سفر کے دوران بھی قائم رہی بلکہ آخر میں تو اس نے پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں ہی بند کر لیں۔

''اگر آپ کہیں سر تو پہلے کسی اسپتال چلتے ہیں!'' گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو ڈرائیور نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''نہیں! پہلے میڈم کو ان کے ہوٹل ڈراپ کر دو۔ میں گھر جا کر شاور لوں گا اور تھوڑی دیر آرام کروں گا تو طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔'' کامران نے انکار کرتے ہوئے سخت لہجے میں ڈرائیور کو ہدایت دی تو وہ مزید اصرار کی ہمت نہیں کر سکا۔ باربی جیسے لمبے گاؤن اور جالی دار ہیٹ میں کافی حد تک خود کو چھپائے کامران کے ساتھ ہوٹل سے روانہ ہوئی تھی، ویسے ہی اس کی واپسی بھی ہوئی اور کامران اس پر حسرت زدہ سی نظر ڈال کر ہی رہ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر باربی نے ہیٹ اور گاؤن اتار کر پھینکا اور جلدی سے اپنے پاس محفوظ میموری کارڈ باہر نکالا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس میموری کارڈ میں ایسا کیا ہے جو مونا باؤ کی سرحد سے اسمگل ہو کر آنے والے مال کے ساتھ اسے خفیہ طور پر یہاں بھیجا گیا ہے اور جس کے حصول کے لیے سونیا خان بھی بے چین ہے۔ ابھی وہ میموری کارڈ نکال کر اسے لیپ ٹاپ میں لگانے ہی جا رہی تھی کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر سونیا خان کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی کال کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً ہی سہی اس کال کو ''یس'' کرنا پڑا۔

''کیسی ہو ڈارلنگ! کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی سفر میں؟ تم آرام سے واپس آگئی ہو نا؟'' سونیا خان کے جملوں نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ اس کی واپسی سے آگاہ ہے اور وہ کسی بہانے اسے ٹال نہیں سکتی۔

''ایوری تھنگ از او کے۔'' اسے جواب دینا پڑا۔

''گڈ! اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے اور ہمارے مشن میں کامیاب لوٹی ہو۔ ابھی سفر کی تھکن اتارنے کے لیے آرام کرو، پھر کامیابی کا جشن منانا۔ تمہارا آج کا شو میں نے کینسل کروا دیا تھا اس لیے آج تم فری ہو گی۔'' سونیا خان کے الفاظ نے اسے اطمینان دلایا کہ آج وہ فارغ ہے اور

چاہے تو آرام سے بھی اس میموری کارڈ میں موجود مواد کو دیکھ سکتی ہے لیکن اس کا اگلا ہی جملہ اس کے لیے دھما کا ثابت ہوا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''اوکے! اب میں فون بند کرتی ہوں۔ ابھی تمہارے کمرے کے دروازے پر دستک ہوگی۔ تم کامران سے حاصل ہونے والا میموری کارڈ باہر موجود شخص کے حوالے کر کے خود ریلیکس ہوجانا۔''

سونیا خان کے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی کال منقطع ہوئی اور دروازے پر زوردار دستک دی گئی۔ وہ اپنے پیروں کو گھسیٹتی ہوئی دروازے تک گئی۔ میموری کارڈ اس کے ہاتھ میں ہی تھا جو اس نے میکانکی انداز میں باہر کھڑے شخص کے ہاتھ میں تھما دیا اور خود بوجھل دل کے ساتھ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ سونیا خان کی اتنی پھرتی نے اسے مایوس سا کر دیا تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر اس کی مدد لینے کے لیے تیار ہوئی تھی کہ اپنا کام بھی نکالتی رہے گی اور ایسا مواد حاصل کر کے قانون نافذ کرنے والے اداروں تک بھی پہنچاتی رہے گی جو سونیا خان اور داراب جیسے لوگوں کی بیخ کنی میں مددگار ثابت ہو لیکن سونیا خان نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے اور اس کے لیے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کر گزرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس معاملے میں اپنی بے بسی کا احساس اپنی جگہ تھا اور کامران یزدانی کے ساتھ جو کچھ کر آئی تھی اس کی خوشی اپنی جگہ۔ سو متضاد کیفیات میں گھرے گھرے کسی نہ کسی طور اسے نیند آ ہی گئی۔ تھکن اور شب بیداری نے اس نیند کو گہرا بھی کر دیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ اس نے روم سروس کو چائے کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دیا اور خود فریش ہونے باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تک دونوں چیزیں آ چکی تھیں۔ ریموٹ سے ایل ای ڈی کھول کر وہ مختلف نیوز چینلز سرچ کرنے لگی۔ زیادہ تر چینلز سے ایک جیسی ہی خبریں پیش کی جارہی تھیں۔ ایک چھوٹے چینل پر آ کر اس کی انگلیوں کی حرکت رک گئی۔ اسکرین پر حیات یزدانی کی شکل دکھائی دے رہی تھی اور نیوز ریڈر بتا رہی تھی۔

''معروف بلڈر حیات یزدانی کے بیٹے کامران یزدانی پراسرار بیماری سے ہلاک۔ ذرائع کے مطابق کامران یزدانی کسی نجی کام کے سلسلے میں گزشتہ روز اندرون سندھ کے ایک گاؤں گئے تھے جہاں سے ان کی آج صبح واپسی ہوئی تو انہیں تیز بخار تھا۔ بخار کو سفر کی تھکن کا نتیجہ سمجھتے ہوئے کامران یزدانی گھر پر ہی بخار کی ٹیبلٹ لے کر اپنے کمرے میں سونے چلے گئے۔ چار پانچ گھنٹے بعد ان کی والدہ خبر گیری کے لیے ان کے کمرے میں گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ کامران یزدانی کے منہ، ناک اور کانوں سے خون بہہ رہا ہے۔ فوری طور پر انہیں اسپتال منتقل کیا گیا جہاں ڈاکٹروں نے طبی امداد دے کر ان کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے اور کامران یزدانی انتقال فرما گئے۔ اسپتال ذرائع کے مطابق خون کے نمونوں کے تجزیے سے پتا چلا ہے کہ کامران یزدانی کانگو وائرس یا اس سے ملتے جلتے وائرس کا شکار ہوئے تھے۔ وائرس کا حملہ اتنا شدید تھا کہ انہیں مہلت ہی نہیں مل سکی۔ کامران یزدانی کی موت نے محکمۂ صحت کی کارکردگی پر کئی سوالیہ نشان لگا دیے ہیں......'' نیوز ریڈر بولتی جارہی تھی لیکن اسے مزید کچھ سننے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ساکت بیٹھی اسکرین پر نظر آنے والے مناظر دیکھ رہی تھی۔ وہ حیات یزدانی جو فرعون کی طرح گردن اکڑائے گھومتا تھا اور جس نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ اس کے مفادات کے حصول کے لیے کتنی انسانی جانیں داؤ پر لگائی جاتی ہیں، سفید چادر کے نیچے موجود اپنے جوان بیٹے کی لاش کے ساتھ غمزدہ سا کھڑا تھا۔ وہ کبھی ایسی سخت دل نہیں رہی تھی لیکن آج حیات یزدانی کے غم نے اسے خوشی بخشی اور ہلکی سی ''ہونہہ'' کے ساتھ چینل بدل کر کافی اور سینڈوچز سے لطف اندوز ہونے لگی۔

☆☆☆

عالم شاہ کی تڑپ یونہی نہیں تھی۔ جانے کہاں سے ایک گولی اس فرض شناس شخص کو لگی تھی۔ عالم شاہ وہاں سے نکل آیا تھا اور اب اپنے بندے سے سوال و جواب میں مصروف تھا۔

''کیا پتا چلا سرمد؟'' قدرے بے چینی سے عالم شاہ نے سرمد کی صورت دکھائی دیتے ہی اس سے سوال کیا۔

''خبر ٹھیک تھی سائیں! وہ خبیث بچ گیا ہے۔ ہے تو ابھی آئی سی یو میں ہی لیکن ڈاکٹرز اس کی زندگی کے لیے بہت پُرامید ہیں۔'' سرمد نے بجھے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''کمال ہے۔ میں نے اسے اتنے نازک مقامات پر گولیاں ماری تھیں پھر بھی وہ بچ گیا۔ بڑی ہی ڈھیٹ شے ہے۔'' جواب سن کر عالم شاہ بڑبڑایا۔

''آپ کہیں تو اسپتال میں ہی اسے خاموشی سے ختم کروانے کی کوشش کروں۔ ہوش میں آنے کے بعد تو وہ سب اُگل دے گا اور ہمارے لیے مشکل ہوجائے گی۔''

سرمد نے پریشانی سے پوچھا۔
''نہیں۔ جب قدرت نے اسے زندہ رہنے کا ایک موقع دیا ہے تو یوں اسے بستر پر مروانا ٹھیک نہیں ہے۔ اسے پوری طرح ہوش میں آنے دو، پھر جو حالات ہوں گے، ان کے مطابق ایکشن لیں گے۔ ابھی تو ہمیں اور دوسرے اہم کام بھی انجام دینے ہیں۔''
''کون سے کام سائیں؟'' سرمد چونکا۔
''مجرموں کی لسٹ شکیل سومرو پر تو ختم نہیں ہوگئی نا۔ ابھی مجھے اور دوسرے لوگوں سے بھی حساب لینا ہے۔ منشی کی بیٹی کو ورغلانے والا بندہ تنویر، ادا معظم کے اغوا اور قتل میں شکیل سومرو کا ساتھ دینے والے ڈاکو چاچڑ کا گروہ اور شکیل سومرو سے میرے یار معاذ کا سودا کرنے والے یزدانی اور عرفان اللہ سب سے حساب کتاب کرنا ہے ابھی۔'' عالم شاہ نے اسے جواب دیا۔
''آپ خود کو خطروں میں جھونک رہے ہیں سائیں۔ بڑے سائیں کو خبر ہوئی تو مجھ پر سخت خفا ہوں گے۔'' سرمد اس کے ارادے جان کر پریشان ہوا۔
''تم چاہو تو خود کو ان خطروں سے الگ کر سکتے ہو۔'' عالم شاہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
''ایسے تو مت بولیں سائیں۔ میری جان آپ پر قربان۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ خود کو خطرے سے دور رکھیں۔ باقی جو کچھ کرنا ہے اس کے لیے میں حاضر ہوں۔'' سرمد اس کی بات پر تڑپ ہی گیا اور التجا کرنے والے انداز میں بولا۔
''بندے کی جان جانی ہو تو بیٹھے بٹھائے بھی مرجاتا ہے اور زندگی بچنی ہو تو جنگ کے میدان سے بھی زندہ سلامت لوٹ آتا ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ اللہ نے بندے کی کتنی زندگی لکھ رکھی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ شکیل سومرو تین گولیاں کھا کر بھی بچ گیا کہ نہیں۔'' اس نے اپنی دلیل سے سرمد کے لیے بحث کی راہ بند کردی۔ ویسے بھی سرمد زیادہ بحث تکرار کرنے والا بندہ نہیں تھا اور اس کے حکم کی تعمیل کو اپنا سب سے اہم فرض سمجھتا تھا۔
''پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟ لسٹ میں موجود کس نام پر سب سے پہلے کام کرنا ہے؟'' حسبِ امید وہ فوراً ہی قائل ہوگیا۔
''تنویر تو صرف ایک مہرہ تھا، اس لسٹ میں اس کی اہمیت سب سے کم ہے اس لیے اسے تو فی الحال رہنے ہی دو۔ ابھی ہمیں چاچڑ، یزدانی اور عرفان اللہ وغیرہ میں سے کسی کی سلیکشن کرنی ہے کہ کس سے پہلے نمٹا جائے۔ میں تو سب سے پہلے یزدانی اور عرفان اللہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔ شکیل سومرو نے معاذ کا سودا ان لوگوں سے کیا تھا اور مجھے ان سے معلوم کرنا ہے کہ اب معاذ کہاں ہے۔ دوستی کا فرض اپنی جگہ، میں تو اپنی جگہ مقروض بھی ہوگیا ہوں کہ معاذ نے سجل اور ادا معظم کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نکالنے کے لیے خود اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا۔'' عالم شاہ کا دل معاذ کا ذکر کرتے ہوئے بوجھل سا ہوگیا تھا۔ ان کی دوستی کا دورانیہ زیادہ نہیں تھا لیکن معاذ کے لیے اس نے ہمیشہ اپنے دل میں خاص جگہ محسوس کی تھی اور ہمیشہ اس بات پر افسردہ رہتا تھا کہ وہ معاذ کے لیے اتنا کچھ نہیں کرسکا تھا جتنا اسے کرنا چاہیے تھا۔
''یزدانی اور عرفان اللہ معمولی لوگ نہیں ہیں سائیں! باہر نکلتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کی سیکیورٹی بھی ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ہمیں فول پروف پلان بنانا ہوگا۔ کل ہی یزدانی کا بیٹا مرا ہے۔ اس کے اردگرد تو ویسے ہی لوگوں کا ہجوم لگا ہوگا۔ عرفان اللہ کی میں ریکی شروع کروا دیتا ہوں، پھر دیکھتے ہیں کہ کیا راہ نکلتی ہے۔ چاچڑ کے لیے بھی مخبر لگانے ہوں گے۔ وہ جنگل اور شہر میں سے کسی بھی جگہ پایا جاسکتا ہے۔''
''جو کرنا ہے کرو۔ مجھے صرف نتائج سے مطلب ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ شکیل سومرو کے ہوش میں آنے کے بعد کیا صورت حال ہوتی ہے اس لیے ہمیں جو بھی کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔'' عالم شاہ نے اسے ہدایت دی۔
''بہتر سائیں! میں کرتا ہوں۔'' سرمد نے ہمیشہ کی طرح تابعداری سے سر جھکا دیا اور عالم شاہ کو سوچوں میں غرق چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے اسے عجیب سی اجنبیت اور گھبراہٹ کا احساس ہوا۔ یہ اس کا اپنا شہر تھا لیکن اسے اسی شہر میں اجنبی کر دیا گیا تھا۔ اس شہر کے گلی کوچوں میں اس کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی یادیں بکھری ہوئی تھیں اور اسے اسی شہر کی تباہی کا کام سونپ کر میدان میں اتار دیا گیا تھا۔ بہترین تھری پیس سوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں قیمتی بریف کیس تھامے کھڑا وہ کوئی معزز بزنس مین لگ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی ایک ٹیکسی کے ذریعے اس بڑے سے شاپنگ مال کے سامنے اترا تھا جس کی روشنیاں شہر میں اتری رات کو دن سے زیادہ خوبصورت منظر بخش رہی تھیں۔ شاپنگ مال کی پارکنگ میں اتنی ساری گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا کہ آدھے شہر کی آبادی

نے اس شاپنگ سینٹر پر دھاوا بول رکھا ہو۔ ہنستے مسکراتے، خوش باش اور چہکتے ہوئے جوڑے اور خاندان مسلسل عمارت کے اندر باہر آجا رہے تھے۔ زیادہ تعداد اندر جانے والوں کی تھی۔ باہر بہت کم لوگ نکل رہے تھے اور اسے اس بات سے مزید گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی اونچی جگہ کھڑا ہو جائے اور چیخ چیخ کر لوگوں سے کہے کہ غدارو! اپنے گھروں کی محفوظ پناہ گاہ میں لوٹ جاؤ۔ یہ جگہ جہاں تم اپنے تئیں خوشیاں خریدنے آئے ہو، موت نے اپنے رقص کے لیے منتخب کر لی ہے اور میں موت کا وہ ہرکارہ ہوں جو اپنی مرضی کے بغیر تم لوگوں میں موت بانٹنے آیا ہوں۔ ہاں اسے اسی لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ یہ اس کا ٹیسٹ کیس تھا۔ وکٹر اپنے تئیں اس کے دماغ میں ملک، قوم اور مذہب کے خلاف زہر بھرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس لیے میڈم ایکس نے اسے یہ ذمے داری سونپی تھی کہ وہ اس بڑے شاپنگ مال میں ٹائم بم نصب کر کے آجائے۔ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس جگہ سے نکالا گیا تھا جہاں وہ اتنے عرصے سے قید تھا۔ شہر کی ایک مصروف شاہراہ پر اسے اتارنے سے قبل اس کی آنکھوں کی پٹی اتار دی گئی تھی اور اسے کچھ رقم کے ساتھ بذریعہ ٹیکسی شاپنگ مال پہنچنے کی ہدایت دے کر وہ لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ شاید انہیں اعتماد تھا کہ وہ ڈاکٹر وکٹر کے عمل کے زیر اثر کسی حکم سے سرتابی نہیں کرے گا اور نہ ہی کہیں بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ یہ اور بات کہ وہ اس مصروف شاہراہ پر کھڑا شدت سے ان دونوں کاموں کی خواہش کر رہا تھا لیکن ایک طرف اپنے پیاروں کی محبت نے ہاتھ پیر باندھ رکھے تھے تو دوسری طرف اسے یقین تھا کہ اسے یوں آزاد چھوڑ دینے کا محض ڈراما کیا گیا ہے اور اصل میں نگرانی کا پورا انتظام موجود ہوگا۔ ایسے میں اسے جو بھی کرنا تھا، بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا اور ان لوگوں کو یقین دلانا تھا کہ وہ پوری طرح ڈاکٹر وکٹر کے اثر میں ہے۔

ڈاکٹر وکٹر ملک، قوم اور مذہب کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو زہر بھرنے کی کوشش کرتا رہا تھا، اس نے اس پر ان لوگوں کے عزائم پہلے ہی واضح کر دیے تھے اور وہ کیرتھر کی انوکھی دنیا میں بسنے والے فیغو کا احسان مند تھا کہ اس نے اسے ایک ایسا علم سونپ دیا تھا جس نے اسے وکٹر کے جال میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ وکٹر کی کوششوں کے دوران اس پر یہ انکشاف بھی ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے ہپناٹزم سکھانے کا محض جھانسا دے رہے تھے تاکہ وہ اس لالچ میں ان کے ساتھ مکمل تعاون کرے۔ حقیقت میں وہ اسے ایسا کوئی علم سکھا کر اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مار سکتے تھے۔ وکٹر ایک روایتی ہپناٹسٹ تھا جسے اپنے عمل کے بہترین نتائج کے لیے معمول کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ وہ کیرتھر کے پہاڑوں میں بسنے والا غیر معمولی فیغو نہیں تھا جو ماں کے بطن سے ہی غیر معمولی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کی نمو فطرت کرتی ہے۔ اس غیر معمولی فیغو کا فیض تھا کہ وہ وکٹر کو جھانسا دینے میں کامیاب رہا تھا لیکن اب ایک امتحان سے دوچار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے جو کام سونپا گیا ہے وہ کروانے والوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسا کام کسی بھی عام سے تربیت یافتہ شخص سے بھی کروایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے اسے یہ کام سونپا تھا تو صرف اس کی آزمائش کے لیے اور وہ اس آزمائش سے بہت خوبی سے گزر جانا چاہتا تھا۔

ذہنی کشمکش سے گزرتے ہوئے ہی اس نے ٹیکسی سے اس شاپنگ مال تک کا سفر طے کیا تھا اور چند لمحے باہر کھڑے رہنے کے بعد سیڑھیاں چڑھ کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ اندر رنگ، خوشبوؤں اور چہکتی آوازوں کا ایک سیلاب سا امڈ رہا تھا۔ اس نے مسرت سے چمکتے، زندگی کی رعنائیوں سے پُر ان چہروں کو دیکھا اور سوچا کہ کیا میں ان افراد کو اپنے ہاتھوں موت کی آغوش میں دھکیل سکتا ہوں؟ جواب یقیناً نفی میں تھا لیکن جس کام کے لیے بھیجا گیا تھا اس کی تکمیل سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ خودکار زینے کے ذریعے شاپنگ مال کی دوسری منزل پر پہنچ کر بھی وہ اس سلسلے میں غور کرتا رہا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے یہ ٹائم بم وہاں چھوڑنا ہی ہوگا۔ اس شاپنگ مال کو تباہی سے بچانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس کی عقابی نظروں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور بچوں کے آئٹمز سے سجے ایک ریک کے سائڈ میں اس خلا کو تاڑ لیا جہاں اس کا بریف کیس بہ آسانی سما سکتا تھا۔ اس ریک کے پاس رک کر اس نے بریف کیس اپنے پیروں کے پاس رکھا اور ریک میں سجی اشیا ایک ایک کر کے یوں اٹھا کر دیکھنے لگا جیسے ان میں سے کسی شے کو خریدنا چاہتا ہو۔ سیلز مین اس وقت کچھ سجی سنوری خواتین اور ان کے ساتھ موجود نٹ کھٹ بچوں کے ساتھ بری طرح الجھا ہوا تھا اس لیے اس کی طرف اس کی توجہ نہیں تھی۔ اس نے چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے ہی نہایت ہوشیاری سے بریف کیس کو پیر سے اس خلا میں دھکیل دیا اور ٹہلتا ہوا اس جگہ سے دور ہٹ گیا۔ اب اس کا رخ پبلک واش رومز کی طرف تھا۔ یہ بہت مہنگا شاپنگ مال تھا اس لیے واش رومز صاف

ستھرے تھے۔ اس نے ایک واش روم میں گھس کر اندر سے کنڈی بند کی اور پھرتی سے اپنے کپڑے اتار کر ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ کپڑوں کی تہوں اور جیبوں میں اسے کوئی مشکوک شے نہیں ملی۔ جیب میں پڑے چند کرنسی نوٹوں کے سوا اس کے پاس اگر کوئی شے موجود تھی تو وہ ایک عدد کلائی پر بندھی گھڑی تھی۔ اس نے وہ گھڑی اتار کر فلیش ٹینک پر رکھ دی اور ہاتھوں سے اپنے پورے جسم کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ یہ کام وہ قید کے دوران بھی کئی بار کر چکا تھا لیکن ایک بار پھر اس عمل کو دہرا کر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ ان لوگوں نے اس کے جسم میں کوئی چپ وغیرہ تو نہیں لگا رکھی۔ تسلی ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے کپڑے اور جوتے پہنے اور باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظروں نے ایک سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لڑکا ہنستے ہوئے کسی کو موبائل پر گڈ بائے کہہ رہا تھا۔ گڈ بائے کہہ کر اس نے موبائل اپنی ہپ پاکٹ میں رکھا تو اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا اس لڑکے کے قریب پہنچا۔ لڑکا اب ایک جگہ لٹکی چمڑے کی خوبصورت بیلٹوں کی طرف متوجہ تھا۔ وہ معمولی سا اس لڑکے سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا۔ اب لڑکے کا جدید اسمارٹ فون اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ اسمارٹ فون کو تیزی سے اپنی جیب میں منتقل کر کے وہ فرسٹ فلور پر واپس پہنچا اور وہاں قائم مردانہ کپڑوں کے سیکشن میں جا کر ایک شرٹ منتخب کرنے کے بعد اسے لے کر ٹرائل روم میں چلا گیا۔ چھوٹے سے ٹرائل روم میں پہنچ کر اس نے شرٹ ایک طرف رکھی اور کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا۔ خوش قسمتی سے فون پر سیکیورٹی لاک نہیں لگا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی ایمرجنسی کا نمبر ڈائل کیا اور بتانے لگا کہ شہر کے فلاں شاپنگ مال کے سیکنڈ فلور پر ایک ٹائم بم نصب کیا گیا ہے جو ٹھیک پندرہ منٹ بعد پھٹ جائے گا اس لیے شاپنگ مال کو فوری طور پر خالی کروالیا جائے۔ دوسری طرف موجود شخص اس سے سوال جواب کرنے لگا لیکن اس نے ہر سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"پلیز! سوال جواب میں ٹائم ویسٹ مت کریں اور فوری طور پر کوئی ایکشن لیں ورنہ سیکڑوں انسانی زندگیاں ضائع ہونے کا بوجھ آپ پر ہوگا۔" یہ جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے فون ہی بند کر دیا اور شرٹ اٹھا کر باہر نکل آیا۔ شرٹ خرید کر اسے کیا کرنا تھا چنانچہ پسند نہ آنے کا بہانہ کر کے وہاں سے نکل گیا۔ اب اس کا رخ خارجی راستے کی طرف تھا۔ باہر نکلتے نکلتے اس نے ایک طرف رکھے بڑے سے ڈسٹ بن میں اپنے پاس موجود موبائل کو اس پھرتی اور صفائی سے پھینکا کہ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوسکا ہوگا کہ ہزاروں کا قیمتی موبائل ایسی ناقدری کا شکار ہوا ہے۔ اس موبائل سے جو کام لیا جانا تھا، وہ لے چکا تھا اور اسے اپنے ساتھ باہر لے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ فوراً ہی ایک ٹیکسی رینگتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"بیٹھو صاحب! کدھر جانا ہے، ہم مناسب کرائے میں چھوڑ دے گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے بہ اصرار اس سے کہا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسے خود بھی اندازہ تھا کہ اس کے ارد گرد پہرے ہیں۔ وہ خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اس مکان کا نام لیا جہاں اسے پہنچنے کا کہا گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دس منٹ کے اندر اسے مطلوبہ مقام تک پہنچا دیا۔ وہاں مخصوص گاڑی اس کی منتظر تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"تم نے ہمارے اندازے سے کچھ زیادہ ٹائم لے لیا۔" گاڑی ڈرائیو کرنے والے شخص نے سرسری لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ مجھے واش روم جانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔" اس نے ذرا جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"تمہاری کلائی پر تمہاری گھڑی بھی موجود نہیں ہے۔" دوسری تبدیلی بھی اس کی تیز نظروں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

"گھڑی.....!" اس نے چونک کر اپنی کلائی کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔ "اوہ شٹ..... یہ کیسے گر گئی؟"

اس آدمی نے جواب میں کچھ کہے بغیر ڈیش بورڈ پر پڑا موبائل اٹھا کر اسکرین پر چند بار انگلی پھیری۔ اسپیکر کھلا ہوا تھا اس لیے معاذ کے کانوں تک بھی چلنے والے نیوز بلیٹن کی آواز پہنچنے لگی۔ یہ معمول کی خبریں تھیں جنہیں سناتے سناتے اچانک اینکر نے ذرا سا توقف کیا اور بریکنگ نیوز کے اعلان کے ساتھ بتانے لگی کہ شہر کے مصروف ترین شاپنگ مال میں بہت زبردست بم دھماکا ہوا ہے۔ دھماکے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ تقریباً پوری عمارت ہی زمین بوس ہوئی لیکن کسی جانی نقصان کا اندیشہ اس لیے نہیں ہے کہ انتظامیہ نے دھماکے سے چند منٹ قبل ہنگامی صورت حال کا اعلان کر کے شاپنگ مال کو خالی کروالیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ساتھ اینکر اور بھی بہت کچھ بتا رہی تھی لیکن معاذ کے لیے صرف ایک اطمینان کافی تھا۔ حادثے میں جانی نقصان

نہیں ہوا تھا اور وہ بہت بڑے بوجھ سے بچ گیا تھا۔

☆☆☆

”میں معاذ کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں وکٹر!“ بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین کے سامنے کھڑی طرح دار عورت نے اپنے پیچھے کھڑے پروفیسر وکٹر سے یہ جملہ کہا تو وہ حیرت زدہ نظر آنے لگا اور ایک بار پھر اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہاں تباہ شدہ شاپنگ مال کی فوٹیجز دکھائی دے رہی تھیں اور یہ فوٹیجز اس بات کا ثبوت تھیں کہ معاذ نے اپنا کام بہترین طریقے سے انجام دیا ہے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا میڈم! میرے خیال میں تو معاذ نے خود کو سونپا گیا کام بہت اچھے طریقے سے انجام دیا ہے۔“ اس نے اپنی حیرت کو زبان دی۔

”پھر وہاں ایسا کیا ہوا تھا کہ دھماکے سے صرف چند منٹ قبل ہنگامی صورتِ حال کا اعلان کر کے منٹوں میں مال خالی کروالیا گیا۔ میرے ذرائع کے مطابق یہ پولیس کو ملنے والی گمنام کال کا نتیجہ تھا۔ مجھے شک ہے کہ یہ گمنام کال معاذ نے کی ہوگی۔“ میڈم نے اپنا شک ظاہر کیا۔

”مگر کیسے میڈم؟ معاذ کے پاس کوئی موبائل نہیں تھا اور شاپنگ سینٹر میں بھی کنٹرول روم میں بیٹھا ہمارا آدمی اس کی ہر حرکت کو مانیٹر کررہا تھا۔ معاذ نے بریف کیس بہت مناسب مقام پر چھپایا تھا۔ اس کے شاپنگ مال میں داخل ہونے کے بعد صرف دو مقامات پر اسے نہیں دیکھا جاسکا۔ ایک واش روم اور دوسرا ٹرائل روم کیونکہ ان دونوں جگہوں پر کیمرے نہیں لگائے جاتے۔“

”اور مجھے خدشہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک مقام پر اس نے اپنا کام دکھایا ہے۔“ اس کے ماتھے کے بل اپنی جگہ قائم رہے اور سوچتی ہوئی نظریں اسکرین پر جمی رہیں۔

”تم جانتے ہونا کہ ہم نے اسے جو تربیت دی ہے، اس کے بعد اس کے لیے کسی موبائل فون تک رسائی ناممکن نہیں تھی۔ وہ مال میں گھومتے سیکڑوں لوگوں میں سے کسی سے بھی موبائل حاصل کرسکتا تھا اور شاید اس نے ایسا ہی کیا۔ مجھے تمہیں یہ بتاتے ہوئے افسوس ہورہا ہے کہ کنٹرول روم میں ڈیوٹی دینے والا لڑکا مانیٹر سے زیادہ وہاں موجود آپریٹر لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔ اس لڑکے سے اس کی اس کوتاہی کا اعتراف کروالیا گیا ہے۔“

”ایسی صورت میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اپنے طور پر تو میں اپنے کام سے پوری طرح مطمئن ہوں۔“ وکٹر نے اپنے ہاتھ آپس میں مسلے۔

”میں تمہاری کارکردگی کو چیلنج نہیں کررہی ہوں لیکن میری چھٹی حس مجھے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی ہے۔ جس نمبر سے پولیس کو بم کے سلسلے میں اطلاع دی گئی تھی اس نمبر کو استعمال کرنے والے لڑکے تک بھی پولیس نے رسائی حاصل کرلی ہے۔ لڑکے نے ایسی کسی کال سے انکار کرتے ہوئے پولیس کو بیان دیا ہے کہ اس کا موبائل اس کے پاس نہیں ہے اور اس کا خیال ہے کہ موبائل شاپنگ مال میں ہی کہیں گر گیا تھا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ دھماکے میں کنٹرول روم بھی پوری طرح تباہ ہوگیا ہے اور ہم وہ فوٹیجز حاصل نہیں کرسکے ہیں جو معاذ کی حرکات و سکنات کا مکمل ثبوت ہمیں فراہم کرسکتیں۔“ وہ بے چینی سے ہاتھ مسلنے لگی۔

”ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا ہے میڈم کہ کسی نے معاذ کو وہاں بم رکھتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ شاید اس فون والے لڑکے نے ہی اور پھر وہ لڑکا پولیس کو کال کرنے کے بعد جان بوجھ کر اپنا موبائل وہیں مال میں پھینک گیا ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں لوگ پولیس سے کتنا ڈرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ پولیس سے دور رہیں۔“ وکٹر نے قیاس آرائی کی تو وہ تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلانے لگی، پھر بولی۔

”تمہاری دلیل میں دم ہے وکٹر! لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں کسی معاملے میں شک میں مبتلا ہوجاؤں تو اتنی آسانی سے قائل نہیں ہوتی۔ میرے حساب سے یہ معاملہ ابھی ففٹی ففٹی ہے۔ معاذ پر مکمل بھروسا کرنے سے پہلے میں اسے ایک اور ٹیسٹ کیس سونپنا چاہتی ہوں۔ یہ کافی اہم کیس ہے اس لیے تم اس کیس سے پہلے اس کی مزید برین واشنگ کردینا۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی میڈم! آپ بس مجھے اس کیس کے بارے میں بریف کردیں۔“ وکٹر نے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

”ہمارے دوستوں کا ایک ساتھی یہاں جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوگیا ہے۔ گرفتاری کے بعد اس نے اعترافِ جرم بھی کرلیا ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف اس شخص کو سزائے موت دینے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے تو دوسری طرف ہمارے دوست ملک کی بدنامی ہورہی ہے۔ ویسے تو وہ لوگ مسلسل واویلا کررہے ہیں کہ ان کے شہری روشن ماتھر کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے اور اسے غلط الزام میں پکڑ کر ناحق سزا دی جارہی ہے لیکن دنیا جانتی ہے کہ ان کا واویلا جھوٹا ہے۔ اب وہ لوگ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھی کی رہائی کے لیے کوشش کریں۔ میرے حساب سے معاذ کی صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے یہ ایک بہترین

کیس ہوگا۔“
”بالکل میڈم! آپ بے فکر رہیں۔ میں معاذ کو مینٹلی اس کام کے لیے اچھی طرح تیار کردوں گا۔ باقی ذمے داری آپ کی فیلڈ ورک کرنے والی ٹیم کی ہوگی۔“
”میری ٹیم اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرے گی۔ بس اصل کام معاذ کو سنبھالنا ہے۔ معاذ پوری ذہنی تیاری کے ساتھ اس کام میں ہاتھ ڈالے گا تو کوئی اس کی راہ نہیں روک پائے گا۔“ وہ اپنی جگہ پُراعتماد تھی لیکن جب ملبے کا ڈھیر بنے شاپنگ مال پر نظر پڑی تو جبین شکن آلود ہوگئی۔ کہیں کچھ غلط تھا جو گرفت میں نہیں آرہا تھا لیکن اس کی چھٹی حس بہرحال سگنل دے رہی تھی۔

☆☆☆

وہ سو کر اٹھی تو خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کررہی تھی۔ عرصے بعد اسے ایسی گہری اور پُرسکون نیند نصیب ہوئی تھی اور اس نیند کے مثبت اثرات وہ اپنی طبیعت پر محسوس کررہی تھی۔ روم سروس کو بیس منٹ بعد ناشتا پہنچانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ غسل خانے میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لینے پر اس نے خود کو کچھ اور بھی زیادہ تازہ دم محسوس کیا اور ٹھیک وقت پر پہنچ جانے والے ناشتے سے انصاف کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے اس پروگرام کے بارے میں سوچنے لگی جو اس نے رات کو سوتے وقت بنایا تھا۔ کامران یزدانی کی موت کے بعد اس کا حوصلہ مزید بلند ہوگیا تھا۔ کامران کی موت طبعی قرار پائی تھی اس لیے کہیں کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں ہوا تھا اور وہ بھی اپنی جگہ سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ میموری کارڈ کے غیاب کے حوالے سے اسے اندیشہ تھا کہ کامران کے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید اس سے پوچھ گچھ کی جائے لیکن ابھی تک اسے کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ شاید بیٹے کی موت کے غم سے نڈھال حیات یزدانی کو ابھی اس میموری کارڈ کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ بات جو بھی تھی وہ فی الحال فرصت میں تھی اور اپنی اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر ایک کام نمٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ گھنٹے بھر کی محنت کے بعد اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو وہاں اس باربی سے بہت مختلف لڑکی کھڑی ہوئی تھی جو اس فائیو اسٹار ہوٹل کے نائٹ شو میں ڈانسنگ فلور پر حرکت کرتے ہوئے کتنوں کے دلوں کی دھڑکنیں تھم جانے کا سبب بنتی تھی۔ اس کے سامنے موجود آئینے میں نظر آنے والی لڑکی کے سنہری ڈیانا کٹ بال تھے۔ اس نے گھٹنوں

تک آتا سرمئی اسکرٹ اور سرمئی ہی منی کوٹ زیب تن کر رکھا
تھا۔ منی کوٹ سے جھانکتی سفید قمیص اور ہونٹوں پر لگی میٹ
ڈارک براؤن لپ اسٹک اس کے ورکنگ لیڈی ہونے کے
تاثر کو مضبوط کر رہے تھے۔ پیروں میں موجود لمبے موزوں
کی وجہ سے ان کی عریانی تقریباً چھپ گئی تھی اور کم ہیل کے
سیاہ پمپ شوز میں وہ خاصی باوقار لگ رہی تھی۔ اپنی شخصیت
کے اس تاثر سے مطمئن اس نے فلاپی نما گول ہیٹ اپنے سر
پر رکھا اور ہاتھوں پر خوبصورت سفید دستانے چڑھا کر شولڈر
بیگ ٹانگ کر اپنے سوئٹ سے باہر نکل گئی۔ سابقہ تجربے کی
بنیاد پر اسے شک تھا کہ اس کی مستقل نگرانی کی جاتی ہے اس
لیے لفٹ کا رخ کرنے کے بجائے ہنگامی زینے کا استعمال
کیا اور چھ فلور نیچے پہنچ گئی۔ اتنی ڈھیر ساری سیڑھیاں چڑھنا
ہی نہیں، اترنا بھی مشقت طلب کام ہوتا ہے لیکن وہ بالکل
پُرسکون تھی اور اس کی سانسیں ذرا بھی غیر متوازن نہیں ہوئی
تھیں۔ ہوتیں بھی تو کیسے کہ اس نے عرصہ ہوا زندگی کے
آرام و آسائش سے لطف اندوز ہونا چھوڑ کر اس کی سختیوں
سے مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد اختیار کر لی تھی اور اس
جدوجہد نے اسے سخت جانی کا تحفہ دیا تھا۔

گراؤنڈ فلور پر پہنچنے کے بعد بھی اس نے احتیاطاً
پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف رخ نہ کیا اور پیدل
چلتی ہوئی ہوٹل سے باہر نکلتی چلی گئی۔ باہر نکلنے کے بعد بھی
اس کو کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا تب کہیں جا کر ایک ٹیکسی
دکھائی دی۔ ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی رکوانے کے بعد وہ
اس میں بیٹھی اور ڈرائیور کو اپنا مطلوبہ پتا بتایا۔ ٹیکسی اس کے
جانے پہچانے راستوں پر دوڑنے لگی۔ وہ خاموشی اور توجہ
سے اپنے آس پاس کا جائزہ لینے لگی۔ جیسے ہی ڈرائیور نے
ٹیکسی کو اس کے مطلوبہ پتے والی گلی کی طرف موڑا، اس نے
ٹیکسی رکوا دی اور کرایہ ادا کرکے پیدل ہی اس کوٹھی نما
عمارت کے بڑے سے گیٹ کے سامنے پہنچ گئی جسے نام نہاد
ویمن ہاسٹل کا نام دیا گیا تھا۔ ہاسٹل کے گیٹ پر موجود نمائشی
چوکیدار نے اس کی آمد کا مقصد جان کر اس کے اندر داخل
ہونے پر ذرا تعرض نہیں کیا اور اس کمرے کی نشاندہی کر دی
جسے میڈم نازلی اپنے آفس کے طور پر استعمال کرتی تھی۔
اسے اس ہاسٹل کے بارے میں کسی کی راہنمائی کی ضرورت
نہیں تھی کہ وہ خود اس کے چپے چپے سے پوری طرح واقف
تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت میڈم ذرا ریلیکس
موڈ میں ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ اوقات تھے جن میں لڑکیوں کی
آمد و رفت کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ ملازمت
پر جانے والیاں صبح روانہ ہو چکی ہوتی تھیں اور کہیں ڈیوٹی مار
کر آنے والیاں چھٹی لے کر لمبی تان کر سو رہی ہوتی تھیں۔
میڈم کی اصل مصروفیت تو شام ڈھلے شروع ہوتی تھی کہ اس
وقت یا تو کوئی چھمک چھلو بنی باہر جا رہی ہوتی تھی یا کسی کا
پیارا... دلدار تشریف لا رہا ہوتا تھا۔ میڈم ہر دو طرح کے
گروپ کی خواتین سے چونچالی کرتی انہیں اپنے قیمتی
مشوروں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اپنے براہِ راست ی
خاموش تعاون کا کمیشن وصول کرتی رہتی تھی۔

اس نے اس سارے ماحول کو بہت قریب سے دیکھ
اور سمجھا تھا اس لیے ایسے وقت میں وہاں آئی تھی جب میڈم
کے اکیلے اور فارغ مل جانے کا بھرپور امکان تھا۔ اس کی ی
توقع غلط ثابت نہیں ہوئی اور اس نے دروازے پر سے ہی
دیکھ لیا کہ میڈم نازلی دونوں ٹانگیں ایک تپائی پر لٹکائے آرام
... کرسی کی پشت سے سر ٹکائے مزے سے خراٹے لے رہی
ہے۔ اس کے بھاری بھرکم وجود سے برآمد ہونے والے
خراٹے بھی خاصے بھاری بھرکم تھے۔ اس نے پہلے
دروازے پر دستک دے کر مہذبانہ طریقے سے اسے
جگانے کی کوشش کی لیکن اس موٹی بھینس پر اس مہذب
دستک کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مجبوراً وہ اندر داخل ہوئی اور اس
بار ذرا زور سے اس کی میز بجائی۔ قریب سے آنے والی
زوردار آواز پر میڈم کے خراٹوں کا سلسلہ رک گیا اور اس
نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔

''سوری! میں نے آپ کی نیند خراب کر دی لیکن میں
مجبور تھی۔'' اس نے شائستگی سے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں۔ میں تھکی ہوئی تھی اس لیے ذرا
آنکھ لگ گئی۔ آپ بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی
ہوں؟'' میڈم نے اس کے حلیے سے ہی اس کے ورکنگ
لیڈی ہونے کا اندازہ کر لیا ہو گا اس لیے اسے اپنا متوقع کسٹمر
سمجھ کر اخلاق سے پیش آئی۔

''میں یہاں ایک قریبی دفتر میں ملازمت کرتی
ہوں۔ میری جس ہاسٹل میں رہائش ہے، وہ دفتر سے بہت
دور پڑتا ہے اور روزانہ لیٹ ہونے کی وجہ سے باس سے
ڈانٹ کھانی پڑتی ہے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ دفتر سے
نزدیک کسی ہاسٹل میں رہائش اختیار کی جائے۔ ہاسٹل کی
تلاش مجھے آپ تک لے آئی ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک جگہ پہنچی ہیں۔ اس علاقے میں
آپ کو میرے ہاسٹل جتنا اچھا دوسرا کوئی ہاسٹل نہیں ملے گا۔
رہائش کی تمام سہولیات کے ساتھ ساتھ میرے ہاں لوگوں

کی پرائیویسی کا پورا خیال رکھا جاتا ہے اور کوشش ہوتی ہے کہ کسی قسم کی دخل اندازی کے بغیر یہاں رہنے والی خواتین مکمل آزادی کے ساتھ رہ سکیں۔"

میڈم نے اس کا مدعا جان کر فوراً اپنے ہاسٹل کی تعریفیں شروع کر دیں۔ وہ کھاگ عورت ہونے کے باوجود اسے شناخت نہیں کر سکی تھی۔ وہ بدل بھی تو بہت گئی تھی۔ آنکھوں اور بالوں کی رنگت کے ساتھ ساتھ نقوش میں کی گئی ہلکی پھلکی تبدیلیوں نے اس کی پوری شخصیت کا تاثر بدل دیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے رہائش کے لیے اوپری منزل کا کوئی کمرا عنایت کر دیں۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہو سکے گا؟"

"کیوں نہیں۔ کمرا موجود ہے۔ چلیں میں آپ کو دکھا دیتی ہوں۔" میڈم کی ساری نیند بھاگ چکی تھی اور وہ خالص کاروباری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اخلاق کا پیکر بنی ہوئی تھی۔ اس کی فرمائش پر فوراً ہی اسے کمرا دکھانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتے ہوئے بھی وہ مسلسل اپنے ہاسٹل کی تعریف خصوصاً یہاں حاصل آزادی کا ذکر کرتی رہی۔ کوریڈور میں ایک قطار میں بنے ہوئے کمروں میں سے ایک کمرے کے سامنے رک کر میڈم نازلی اس کمرے کا دروازہ کھولنے لگی تو اسے اندازہ نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ آنے والی کسٹمر کا رنگ کتنی تیزی سے بدلا ہے۔ وہ بھلا کیسے بھول سکتی تھی کہ اس کمرے میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اپنی اذیت کے اس احساس پر قابو پانے کے لیے اسے خود پر کڑا ضبط کرنا پڑا اور خاموشی سے میڈم کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئی۔

"یہ میرے ہاسٹل کا سب سے صاف ستھرا کمرا ہے کیونکہ حال ہی میں اس کمرے میں نیا کلر کروانے کے ساتھ ساتھ اس کا فرنیچر بھی بدلا گیا ہے۔" میڈم نازلی دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے کمرے کی ان خصوصیات سے آگاہ کر رہی تھی جنہیں اس نے اندر قدم رکھتے ہی نوٹ کر لیا تھا۔

"یہ ساری تبدیلیاں کیوں کی گئیں میڈم؟" سوال عام سا تھا لیکن ایسے لہجے میں کیا گیا تھا کہ میڈم کو لگا کسی نے اس کی پیٹھ پر چابک رسید کر دیا ہو۔ وہ چونک کر پیچھے پلٹی۔ وہ خوبصورت اور نازک سی لڑکی عین اس کی پشت پر اس طرح سے کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے پیچھے موجود دروازہ لاک تھا اور اس نے دروازے کے ساتھ اپنی کمر ٹکا کر نگاہیں اس کی ذات پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ میڈم نازلی نہ تو بند دروازے سے خوف زدہ تھی نہ ہی اس کی نگاہوں سے بلکہ

اقوال خلیل جبران

سات مرتبہ میں نے اپنے نفس کو حقیر سمجھا۔

1- جب میں نے اسے عظمت و اقتدار کے لیے امارت و ریاست کا لباس پہنتے دیکھا۔

2- جب میں نے اسے مخلصوں کے سامنے شتر غمزے کرتے پایا۔

3- جب اسے آسان اور دشوار میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے آسان کو پسند کیا۔

4- جب اس نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا اور یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اس طرح دوسرے بھی گناہ کرتے ہیں۔

5- جب اس نے اپنی کمزوری کی بنا پر ہر اس مصیبت کو برداشت کیا جو اس پر نازل ہوئی اور کہا یہ کہ وہ قوت کے مقابلے میں صبر سے کام لے رہا ہے۔

6- جب اس نے کڑکھائی صورت سے ذلت کا برتاؤ کیا جو حقیقت آشنا نگاہوں میں اسی کا ایک نقاب ہے۔

7- جب اس نے اپنی مدح و ثنا کے راگ گائے اور انہیں فضیلت سمجھا۔

☆☆☆

مجھے کس قدر تعجب ہوتا ہے جب میں خود کو اس رنج و الم کی شکایت کرتے دیکھتا ہوں جو میرے لیے سرمایۂ لذت ہے۔

☆☆☆

لوگ جاگتے میں کہتے ہیں۔

"تو اس دنیا میں جو تیری کارگاہِ حیات ہے، لاانتہا سمندر کے لاانتہا ہی ساحل کا ایک ذرہ ریگ ہے اور بس۔"

اور میں سوتے میں کہتا ہوں۔

"میں لاانتہا ہی سمندر ہوں اور سارے عالم، میرے ساحل کے ذرّہ ہائے ریگ ہیں اور بس!"

مرسلہ: حمیرا اقبال، کوٹری

اس کے خوف کی وجہ وہ سائلینسر لگا پسٹل تھا جس کے نشانے پر یقیناً اس کی اپنی ذات تھی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتی ہو؟'' خود کو ذرا سنبھال کر اس نے سوال کیا۔

''میرے سوال کا جواب! بتاؤ اس کمرے میں کیوں اتنی تبدیلیاں کی گئیں؟'' وہ اس طرح غرائی کہ اس کے نازک نقوش سے بھی درندگی جھلکنے لگی۔

''عجیب سوال کر رہی ہو تم۔ یہ میرا ہاسٹل ہے۔ میں اس کی مالکن ہوں اور یہ میری مرضی ہے کہ میں اس کے جس حصے میں جب چاہے جو بھی تبدیلی کروالوں۔'' میڈم نے اس بار منہ بنا کر بیزار اور بے خوف نظر آنے کی اداکاری کرنے کی کوشش کی۔

''میں جانتی ہوں کہ یہ ہاسٹل تمہاری ملکیت ہے اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے تمہاری مرضی سے ہوتا ہے، تو پھر کیا تم مانو گی کہ اس شام بشریٰ گلزار کے ساتھ جو بربریت کا کھیل کھیلا گیا تھا، تم بھی اس کا ایک کردار تھیں اور اسی بربریت کی نشانیوں کو مکمل طور پر مٹانے کے لیے اس کمرے سے سب کچھ ہٹا کر اسے بالکل تبدیل کر دیا گیا ہے؟'' میڈم نازلی سے یہ سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایسی آنچ تھی جس کی بنیاد میں کرب بھی اپنی موجودگی کا پتا دے رہا تھا۔

''تت ...... تم ...... کون ہو؟'' میڈم نازلی کی آواز خوف سے کانپ گئی۔

''نہیں میڈم نازلی...... سوال اب تم نہیں، صرف میں کروں گی۔ بتاؤ کیا تم بھی بشریٰ گلزار کے ساتھ ہونے والے اس ظلم میں شامل تھیں؟'' اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے میڈم نازلی سے پوچھا۔ جواب میں اس نے ایک بالکل غیر متوقع حرکت کی اور اپنے دائیں جانب موجود سائڈ ٹیبل پر رکھا بڑا سا آرائشی گلدان نہایت پھرتی سے اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا۔ نشانہ یقیناً اس کا پسٹل تھا لیکن اس نے میڈم سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا اور گلدان کو دوسرے ہاتھ سے نہایت خوبصورتی سے ہوا میں ہی کیچ کرلیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آس پاس کے کتنے کمرے آباد ہیں اور اس وقت کن کن کمروں میں لڑکیاں موجود ہیں اس لیے یہ احتیاط ضروری تھی کہ شور شرابا نہ ہونے پائے۔ دوسری طرف میڈم نازلی جارحانہ موڈ میں آگئی تھی اور گلدان پھینکنے کے بعد خود بھی کسی تیز رفتار گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی اس کی طرف چلی آرہی تھی۔ اس جیسے جثے کی عورت سے اتنی پھرتی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی لیکن یہ بھی تھا کہ وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ اس کا ہاسٹل کافی حد تک عیاشی کے اڈے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور ایسا بزنس چلانے والی عورت کے پاس لازماً کچھ خصوصیات ہونا چاہئیں تھیں تاکہ وہ بھانت بھانت کے لوگوں سے نمٹ سکے۔ تعلقات کا بہترین استعمال بزنس کو چلانے کے لیے ایک اہم گُر سہی لیکن موقع پر بھی تو کچھ لوگوں سے نمٹنا ہی پڑتا تھا اس لیے اگر یہ عورت مردمار کا مظاہرہ کررہی تھی تو یہ ایسی تعجب کی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ ہوتی کہ وہ اس عورت سے مات کھا جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس نے میڈم نازلی کو اپنے صرف اتنے قریب آنے کی مہلت دی کہ وہ اس کی ٹانگ کی ''حد'' میں آجائے۔ جیسے ہی ایسا ہوا اس نے بہت سکون سے اپنی بائیں ٹانگ کو حرکت دی اور اگلے ہی لمحے اس کی پمپی میڈم کے موٹے پیٹ میں یوں دھنستی چلی گئی جیسے اس نے کسی فوم کے گدے پر طبع آزمائی کی ہو۔ میڈم کے گلے سے نکلنے والی ''اوغ'' کی آواز نے ثبوت دیا کہ ضرب گدے پر نہیں، اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اس سے قبل کہ میڈم پیٹ پکڑ کر مزید واویلا کرتی، اس نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے حرکت کی اور دائیں پیر کا استعمال کرتے ہوئے اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی۔ یہ ضرب کھا کر میڈم نازلی دھب سے زمین پر گر گئی اور اس کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں۔ اس نے میڈم کے فربہ جسم پر منڈھی ساڑی کھینچ کر اتاری اور اس کے پورے وجود کو اس ساڑی میں اس طرح لپیٹ دیا کہ اب وہ اپنی مرضی سے معمولی سی بھی حرکت نہیں کرسکتی تھی۔ ساڑی کے اس استعمال کے بعد اس نے تکیے پر چڑھا غلاف اتار کر اسے میڈم نازلی کے منہ میں ٹھونس دیا اور پھر اسے ہوش میں لانے کے لیے اس کے چہرے پر تھپڑ برسانے لگی۔ چوتھے تھپڑ پر اس کو ہوش آگیا۔ ہوش میں آکر جیسے ہی اسے اپنی ہیئت کذائی کا احساس ہوا، وہ شدید بے چین اور خوف زدہ نظر آنے لگی۔ اس خوف کو مزید مضبوط کرنے کے لیے اس نے میڈم کے سینے پر دائیں ٹانگ رکھ کر اس پر دباؤ ڈالا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا لیا۔ میڈم کے چہرے کی تیزی سے بڑھتی ہوئی سرخی نے اسے بتایا کہ وہ شدید تکلیف میں ہے اور شاید اس کا فشارِ خون بلند ہونا شروع ہوگیا ہے۔

''یہاں اس حال میں، میں تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گی اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس شام بشریٰ گلزار پر گزرنے والی قیامت کا کسی کو علم نہیں ہوا تھا،

سوائے تمہارے......''

آخری دو الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک بار پھر سانپ کی سی پھنکار در آئی تھی۔ میڈم نے اس کی بات سن کر یوں زور زور سے دائیں بائیں سر پٹخا جیسے خود پر لگائے جانے والے الزام سے انکار کر رہی ہو۔ اس انکار نے اسے مزید مشتعل کر دیا اور اس نے بغیر کسی تکلف کے نہایت بے دردی سے میڈم کے منہ پر دو گھونسے رسید کر دیے۔ ایک گھونسا میڈم کے دائیں جبڑے پر لگا جبکہ دوسرے نے اس کی موٹی ناک کا مزاج پوچھا۔ فوراً ہی ناک سے خون پھوٹ پڑا۔ میڈم کے چہرے پر ابھرنے والے پُراذیت تاثرات نے بتایا کہ اگر اس کے منہ میں تکیے کا غلاف نہ ٹھنسا ہوا ہوتا تو وہ لازماً کسی ذبح کیے جانے والے بکرے جیسی آواز حلق سے برآمد کرتی، لیکن فی الحال مجبور تھی۔

''میں تمہارے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ دوں گی اور تمہارا سارا وجود تمہارے اپنے خون میں نہلا دوں گی، اگر تم اسی طرح میرے سوال کا جواب دینے سے انکار کرتی رہیں۔'' میڈم کی اذیت نے اس کے غصے کو کم کرنے کے بجائے جنون میں مزید اضافہ کر دیا اور اس نے کسی درندے کی طرح غرا کر ایسے دھمکی دی کہ میڈم جیسی دبنگ عورت کا بھی پتا پانی ہو گیا اور وہ لٹکے ہوئے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے کام لے کر اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ اپنی زبان کھولنے کے لیے تیار ہے۔

''یاد رکھنا کہ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہ جانے پائے۔ اگر آواز بلند ہوئی تو تمہاری روح بھی آسمانوں کی طرف پرواز کر جائے گی۔'' میڈم نازلی کے منہ میں ٹھنسا تکیے کا غلاف نکالنے سے پہلے اس نے اسے دھمکی دی اور پھر ایک جھٹکے سے غلاف باہر کھینچ لیا۔ نازلی یوں کھانسی اور گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے اتنی دیر سے سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع رہا ہو۔

''میرے پاس تمہارے یہ ڈرامے دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ جلدی سے بتاؤ کہ اس شام بشریٰ گلزار کے ساتھ جو ہوا تم اس سے باخبر تھیں یا نہیں؟'' وہ ایک بار پھر اپنا پسٹل ہاتھ میں لے چکی تھی اور نازلی کے سینے سے پیر ہٹا کر اس کے دائیں جانب گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوئی تھی۔

''میرا یقین کرو، جو ہوا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ شخص بالکل اچانک ہی یہاں آیا تھا اور جانے سے پہلے مجھے دھمکی دے کر گیا تھا کہ اگر میں نے اس کے بارے میں کسی کے سامنے زبان کھولی تو میری خیر نہیں ہو گی۔ اس نے مجھے صاف بتا دیا تھا کہ اس کے مالک بہت بڑے لوگ ہیں اور ان کے کاموں میں ٹانگ اڑانے کا مطلب اپنی جان گنوانا ہو گا۔ جان کوئی بھی گنوانا نہیں چاہتا اس لیے میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی اور میں نے پولیس کو وہ بیان دیا جس سے اس کی نشاندہی نہیں ہو سکتی تھی۔'' میڈم نازلی روتے سسکتے ہوئے اس کے سامنے اپنا جرم تسلیم کرنے لگی۔ رونے کے باوجود اس نے اس بات کا دھیان رکھا کہ اس کی آواز زیادہ بلند ہو کر اسے اشتعال نہ دلانے پائے۔

''تمہیں دھمکی دینے والے اس بندے کا حلیہ کیا تھا؟'' اس نے اپنے غصے کو اپنے اندر ہی دبایا اور متوازن لہجے میں میڈم سے یہ سوال کیا۔

''وہ درمیانے قد کاٹھ کا سانولا سا آدمی تھا جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ وہ مسکراتا تھا تو اس کے پتلے ہونٹوں پر سفاکی سی دوڑتی محسوس ہوتی تھی اور اس کی آنکھیں......اف خدا......اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ مجھ جیسی ساری عمر مردوں سے سودے بازی کرنے والی عورت بھی بوکھلا گئی۔ میں سچ کہتی ہوں، وہ آنکھیں کسی انسان کی نہیں عفریت کی آنکھیں لگتی تھیں اور ان آنکھوں کی وجہ سے ہی اس پر کسی گندی مخلوق کا گمان ہوتا تھا۔'' میڈم نازلی جو حلیہ بتا رہی تھی اس کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہاں آنے والا شخص بازل تھا۔

''وہ کتنے لوگوں کے ساتھ آیا تھا؟''

''باہر گاڑی میں اس کا کوئی آدمی بیٹھا ہوا تھا لیکن اندر وہ اکیلا ہی آیا تھا۔'' نازلی بہت شرافت سے اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

''پھر کیوں تم نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا؟ تم اتنی کمزور عورت تو نہیں ہو۔ جس وقت وہ اوپر اس کمرے میں بشریٰ گلزار کی زندگی برباد کر رہا تھا، تم اسے بچانے کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں......'' وہ ایک بار پھر کرب کا شکار ہوئی۔

''میں......ڈر گئی تھی۔ میری ہمت نہیں ہوئی۔'' نازلی نے اس سے نظر چراتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''جھوٹ مت بولو خبیث عورت۔ تم ڈر نہیں گئی تھیں، تم بک گئی تھیں۔ تم نے بشریٰ گلزار کی عزت کا سودا کر لیا تھا۔'' وہ اتنے غصے سے بولی کہ میڈم نازلی کا خون خشک ہو گیا اور اس کی ہمت نہیں ہو سکی کہ وہ اپنی صفائی میں کوئی جھوٹ بول سکے۔

''تم جیسی عورتیں، عورت کے نام پر دھبا ہوتی ہیں۔ تمہاری ہوس کا خانہ کبھی نہیں بھرتا اور تم اپنے گندے وجود

سے دوسروں کو بھی گندا کرتی چلی جاتی ہو۔ تم جیسی عورتوں کے شر سے نجات کا صرف ایک طریقہ ہے۔ صرف ایک طریقہ......''

وہ نازلی کے خوفزدہ تاثرات سے بے نیاز دھیرے دھیرے بڑبڑا رہی تھی۔ نازلی نے کچھ بولنے کی کوشش میں اپنا منہ کھولا تو اس نے پستول کی نال جو سائلینسر کی موجودگی کی وجہ سے خاصی لمبی لگ رہی تھی، اس کے منہ میں گھسادی اور جنونی لہجے میں بولی۔

''جب یہ منہ حق اور سچ بولنے کے لیے نہیں کھلا تو اب اسے کھولنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرلو اسے۔'' جملہ مکمل کرتے ہی اس نے لبلبی دبادی۔ میڈم نازلی کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور لمحے بھر میں زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ اس نے میڈم کی ساڑی سے ہی پسٹل صاف کیا اور شولڈر بیگ میں ڈالنے کے بعد کھڑی ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں پر موجود خوبصورت سفید دستانے بھی خون کے چھینٹوں سے آلودہ ہوگئے تھے۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر دوبارہ دروازہ بند کیا اور پھر دستانے بھی اتار کر اپنے بیگ میں ڈال لیے۔ آج اس نے اپنے مجرموں میں سے ایک اور مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچادیا تھا اور مطمئن تھی کہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت یا نشانی نہیں چھوڑ کر جارہی ہے۔

☆☆☆

''تسی نہ جاؤ جی!'' سانولی سلونی معمولی نقوش کی لڑکی نے سفر کے لیے تیار کھڑے سیمسن سے کچھ اس ادا سے کہا کہ اس کا دل چاہا اس پر نثار ہوجائے۔ نئی نئی شادی کا نشہ ہی اور ہوتا ہے۔ معمولی عورت بھی حور سے کم نہیں دکھائی دیتی اور سیمسن کی بیوی تو اس کی بچپن کی محبوبہ تھی جسے پانے کے بعد اسے اس کے ساتھ رہنے کے لیے فقط ایک ہفتہ ملا تھا۔ ایک ہفتے میں ان دو چاہنے والوں کی پیاس تو کیا بجھتی، الٹا مزید آتش بھڑک اٹھی تھی۔ سیمسن خود بھی اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی کہ اسے بس اتنی ہی چھٹیاں ملی تھیں اور اب اسے ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔

''ایسے کرے گی تو میرا جانا سچ مچ مشکل ہوجائے گا اور تجھے معلوم ہے کہ میرا جانا ضروری ہے۔ خوشی نال رخصت کر مجھے۔ کوشش کروں گا کہ وڈے افسر سے سفارش لگوا کر جلد ہور چھٹیاں لے لوں، فیر تجھے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا، ہور خوب سیریں کرواؤں گا۔'' اس نے بیوی کو الوداع کہنے کے لیے گلے لگایا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور وہ بے چارگی سے اسے سمجھانے لگا۔

''مینوں خالی خولی سیریں کرنے کے لیے تیرے ساتھ نہیں جانا ہے۔ مینوں تیرے نال رہنا ہے۔ اب آئے تو ادھر میرے رہنے کا ٹھکانا کر کے آنا۔'' نئی نویلی دلہن نے فوراً اپنی فرمائش بیان کردی۔

''وہ بھی ہوجائے گا، پہلے تو مجھے چنگی طرح رخصت تو کردے۔ تیری یہ رونی صورت آنکھوں میں بسا کر جاؤں گا تو سارا ٹیم اداس ہی رہوں گا۔'' اسے ہر حال میں بیوی کا مزاج خوشگوار کرنے کی فکر تھی۔ اسے بھی بات سمجھ آگئی اور اپنی چمکیلی اوڑھنی سے آنسو صاف کر کے مسکرانے لگی۔

''چل تے فیر اجازت......؟'' اس نے بیوی کا الوداعی بوسہ لیا اور اس کی شرمیلی سی مسکراہٹ آنکھوں میں بسائے کمرے سے باہر نکلا۔ کچے صحن میں ماں چارپائی پر بیٹھی اس کا انتظار کررہی تھی۔ ماں کے ساتھ بھی الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور وہ اپنے چھوٹے سے گھر سے نکل کر پیدل گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی سمت بڑھ گیا۔ اس کا گاؤں بہت پسماندہ تھا اور یہاں تک ایسی کوئی سڑک تعمیر نہیں ہوئی تھی جس پر سواریاں چلتیں، اس لیے گاؤں سے باہر کہیں جانے کے لیے یہاں کے رہائشیوں کو چک پینتالیس تک پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ اتفاق سے کسی بیل گاڑی وغیرہ میں لفٹ مل جاتی تو سفر تھوڑا آسان ہوجاتا تھا ورنہ سیمسن سمیت گاؤں سے باہر کا سفر کرنے والے اس مشقت کے عادی تھے۔

سیمسن پیشے کے اعتبار سے خاکروب تھا اور اقلیتوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو پاکستان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا جینا مرنا سب یہیں تھا۔ جن کی وفاداریاں غیر مشروط طور پر پاکستان کے ساتھ تھیں اور جو پاکستان کو چھوڑ کر کہیں بھی جانے کا تصور نہیں رکھتے تھے۔ جنم بھومی سے یہ محبت سیمسن کو پاک فوج تک لے گئی تھی اور وہ نہایت نچلی سطح پر بھی خدمات انجام دے کر خوش تھا۔ بچپن سے گزاری گئی سخت کوش زندگی نے اسے اپنی موجودہ ملازمت سے ہم آہنگ ہونے میں بڑی مدد دی تھی اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے ملازمتی فرائض ادا کرتا تھا۔ ماں نے بھی اکلوتے بیٹے کی دوری کو اس لیے قبول کرلیا تھا کہ اسے امید تھی سیمسن ان کی آئندہ نسل کے لیے اوپر کی جانب سفر کی راہیں نکال لے گا اور اس کے بچے ایک پسماندہ گاؤں کے بجائے کسی اچھی جگہ پرورش پا کر بہتر ملازمتیں حاصل کرسکیں گے۔ وہ غریب لوگ تھے اور ان کے بس یہی چھوٹے چھوٹے خواب تھے جن کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ سیمسن کی ذات

تھی۔ پچیس سالہ صحت مند اور توانا سیمسن ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا عزم دل میں لیے زمین پر مضبوطی سے قدم جماتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا آج کا پورا دن اور رات کا کچھ حصہ سفر میں گزرتا تب کہیں جا کر وہ اپنی منزل پر پہنچ پاتا۔ کل کا دن سفر کی تھکاوٹ اتارنے کے بعد پرسوں صبح سے اسے اپنی ملازمت پر حاضر ہونا تھا۔ پیدل کچے پکے راستے پر چلتا ہوا وہ دل ہی دل میں ان کاموں کو بھی ترتیب دے رہا تھا جو کل تھکاوٹ اتارنے کے بعد اسے انجام دینے تھے۔ اپنے آپ میں مگن یونہی سفر طے کرتے ہوئے اسے پیچھے سے ہارن کی زوردار آواز سنائی دی تو بری طرح اچھل گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بڑی سی لینڈ کروزر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ایسی گاڑیاں سال چھ مہینے میں کبھی کبھار ان کے علاقے میں دکھائی دیتی تھیں۔ ان گاڑیوں میں اس علاقے کے ان داتا سوار ہوتے تھے جو کسی کی بھی طرف توجہ دیے بغیر تیزی سے اپنی گاڑیوں میں گزر جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اس علاقے سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ یہاں ان کی زمینیں تھیں اور وہ زمینوں کی نگرانی کے لیے مقرر افراد کو اپنے ساتھ کوئی بھی بے ایمانی کرنے سے روکے رکھنے کے لیے کبھی کبھار اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ سیمسن یا اس جیسے دوسروں سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ تب ہی تو سیمسن لینڈ کروزر کا ہارن بجنے اور پھر اس کی کھلی کھڑکی سے خود کو ہاتھ کے اشارے سے بلائے جانے پر حیران رہ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' وہ حیران سا کھڑکی کے کھلے شیشے کے قریب پہنچا تو اندر بیٹھے شخص نے اس سے دریافت کیا۔

''جی چک پینتالیس۔'' اس نے آہستہ سے جواب دیتے ہوئے مخاطب کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھا۔ علاقے کے بڑے زمیندار سے واسطہ نہ پڑنے کے باوجود وہ اس کا صورت شناس تھا اور اس کے دو تین بیٹوں کو بھی دور سے دیکھ رکھا تھا لیکن سنا تھا کہ زمیندار کے چھ بیٹے ہیں جو شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ شاید یہ زمیندار کا کوئی ایسا بیٹا تھا جس نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔'' سیمسن کو زیادہ غور و خوض کرنے کا موقع دیے بغیر اس شخص نے پیشکش کی تو وہ مزید حیران رہ گیا۔

''ایسے منہ کھولے کیوں کھڑے ہو یار! اندر بیٹھو تو میں بھی یہ کھڑکی بند کروں۔ خوامخواہ اے سی کی کولنگ ضائع ہو رہی ہے۔ میں نے تو بس ہمدردی میں گاڑی روک لی تھی کہ اتنی گرمی میں بندہ پیدل جا رہا ہے تو میں لفٹ دے دیتا ہوں اور تم ایسے مجھے گھور رہے ہو جیسے میں تمہیں اغوا کرنے لگا ہوں۔'' اس کی بے یقینی پر امیر زادے کی جبیں سلوٹ زدہ ہوگئی اور تیز لہجے میں بولا تو گڑبڑاتے ہوئے سیمسن نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ اتنی اچھی پیشکش کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت کے برابر تھا۔ وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی آگے بڑھی تو اسے اندازہ ہوا کہ پچھلی نشست پر بھی کوئی موجود ہے۔ اس شخص کو دیکھنے کی خواہش میں وہ اپنی گردن موڑنے ہی لگا تھا کہ ایک باریک سوئی اس کی گردن میں داخل ہوگئی اور یک دم ہی سارے منظر نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ صرف منظر ہی نہیں، وہ بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہونے والا ہے۔ بڑی بساط پر چھوٹے پیادے اسی طرح غائب ہوتے ہیں۔

☆☆☆

اس نے واٹس ایپ کے ذریعے اپنے سیل فون پر موصول ہونے والی تصویروں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور ہونٹ بھینچنے پر مجبور ہوگئی۔ ان ساری تصویروں میں وہ گرے اسکرٹ اور منی کوٹ کے ساتھ سفید موزے اور دستانے پہنے مختلف مقامات پر نظر آ رہی تھی۔ پہلی تصویر اس کے سوئٹ کے دروازے پر لی گئی تھی۔ دوسری ہوٹل کے سامنے، تیسری ٹیکسی سے اترتے ہوئے، چوتھی میڈم نازلی کے ہاسٹل کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اور پانچویں ہاسٹل سے نکلتے وقت کی تھی۔ ہر تصویر پر وقت واضح نظر آ رہا تھا اور واضح تھا کہ چھپ کر نکلنے کی کوشش کے باوجود وہ تمام وقت کسی کی نظروں میں رہی ہے۔ اس ''کسی'' کے بارے میں اسے زیادہ غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے خود اپنے لیے یہ جال منتخب کیا تھا جس میں اب بری طرح جکڑی جا چکی تھی۔ تصویروں کو ایک کے بعد ایک دوبارہ دیکھتے ہوئے وہ ان کے بھیجے جانے کے مقصد پر غور کر رہی تھی کہ اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جانا پہچانا نمبر دیکھ کر اس نے کال وصول کر لی اور سپاٹ لہجے میں واحد لفظ ''یس'' بولی۔

''اوہ مائی ڈارلنگ بے بی! تم اتنی سیریس کیوں لگ رہی ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ تم آج اپنی ایک اور اچیومنٹ پر بہت خوش ہوگی اور میں نے تمہارے ساتھ تمہاری خوشی شیئر کرنے کے لیے ہی کال کی تھی۔'' دوسری طرف وہی بظاہر کھنکھناتا اور سریلا لہجہ تھا جس کی مکاری سے وہ بتدریج بہت

اچھی طرح واقف ہوتی جارہی تھی۔
''اتنا خیال رکھنے کے لیے شکریہ۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
''خیال تو ہم تمہارا رکھتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ اگر ہم تمہارے ہاسٹل میں داخلے اور اخراج کی تصویریں تمہارے بجائے کہیں اور بھیج دیتے تو میڈم نازلی کے پوسٹ مارٹم کے بعد متعین ہونے والے قتل کے وقت کے ساتھ ساتھ قاتل کا تعین بھی پولیس کے لیے آسان ہوجاتا۔''
''آپ چاہیں تو پولیس کو اس بات کی بھی نشاندہی کرسکتی ہیں کہ کامران یزدانی کی موت طبعی نہیں تھی لیکن اس صورت میں میرے ساتھ ساتھ آپ کا بھی نقصان ہوگا اور مجھ پر کی گئی آپ کی سرمایہ کاری ضائع چلی جائے گی۔'' بجائے خوفزدہ ہونے کے اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
''اپنی سرمایہ کاری کا ہمیں بھرپور احساس ہے اور تمہیں بھی یہی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم سے الگ ہوکر کچھ کرنے کی حماقت مت کرو ورنہ نقصان اٹھا سکتی ہو۔ نازلی کے ہاسٹل کا چوکیدار بھرا ہوا سگریٹ پی کر بیٹھا ہوا تھا اس لیے پولیس کو ڈھنگ سے تمہارا حلیہ نہیں بتا سکا اور ہاسٹل کے گیٹ پر لگے کیمرے کی فوٹیج ہم نے بروقت غائب کروادی ورنہ تمہارا کیا گیا گیٹ اپ اتنا بھی اچھا نہیں تھا کہ پولیس ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تو ڈھونڈ نہ پاتی۔ نازلی کے بڑے چاہنے والے ہیں پولیس میں جنہیں اس کی موت سے تکلیف ہوئی ہے۔ اگر ہم تمہارے پیچھے کلیوز مٹانے کا انتظام نہیں کرتے تو پولیس والے تم تک پہنچ چکے ہوتے۔'' اب مخاطب کے لہجے کی شوخی غائب ہوگئی تھی اور نہایت سپاٹ لہجے میں اسے اس کی غلطیوں کا احساس دلایا جارہا تھا۔ بات ایسی تھی کہ وہ جواب میں کچھ سخت کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کی اپنی غلطی پکڑی گئی تھی چنانچہ خاموشی ہی بہتر تھی۔
''اس غلط فہمی کو بھی دل سے نکال دو کہ کامران یزدانی کی موت پر اس کے باپ کے دل میں شکوک و شبہات موجود نہیں ہیں۔ وہ غم کے شدید جھٹکے سے نکلنے کے بعد اس میموری کارڈ کی تلاش میں مصروف ہوچکا ہے جسے لانے کے لیے اس نے کامران کو بھیجا تھا۔ میموری کارڈ کا غیاب، کامران کی اچانک موت اور اتنے اہم سفر میں تمہاری اس کے ساتھ موجودگی بہت جلد اسے تمہاری طرف متوجہ کردے گی لہٰذا اب تمہیں بہت سنبھل کر رہنے کی ضرورت ہے۔ بلاوجہ ہرگز بھی ہوٹل سے باہر نہیں نکلنا اور نہ ہی کسی اجنبی ملاقاتی سے ملاقات کے لیے تیار ہونا۔ اس ہفتے تمہارا صرف ایک شو ہے جسے احتیاط سے نمٹا کر اپنے سوئٹ تک محدود رہنا۔'' وہ اسے ہدایات دے رہی تھی جن پر باربی کو نہ چاہتے ہوئے بھی عمل کرنا تھا۔ اس نے جن پانیوں میں چھلانگ لگائی تھی، وہ پانی اس کے آشنا نہیں تھے اور اسے اپنی بقا کے لیے بُرے بھلے جیسے بھی راہنما ملے تھے، ان کی ہدایات پر عمل کرنا ہی تھا اس لیے آخر کار اپنی ہار تسلیم کرلی اور دھیمے لہجے میں بولی۔
''اوکے میڈم! میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ اب آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''
''گڈ! ہمیں تم سے اسی رویّے کی امید ہے۔ آئندہ کے لیے بی کیئرفل۔'' ہلکی سی تنبیہ کے بعد سلسلہ منقطع کردیا گیا تو اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے موبائل ہاتھ سے رکھ دیا۔ ابھی انتقام کی لسٹ میں بہت سے نام باقی تھے اور وہ ان لوگوں کو خود سے ناراض نہیں کرسکتی تھی جن کے سہارے نے بقا کے مسئلے کو حل کرکے انتقام کے مراحل کو آسان بنادیا تھا۔ اس نے اپنے ماضی سے ناتا توڑ کر اپنے لیے باربی کا کردار قبول کیا تھا تو اب اسے کٹھ پتلی کی طرح دوسروں کی انگلیوں کے اشارے پر ناچنے کے لیے بھی تیار رہنا ہی تھا۔

☆☆☆

''میں نے کہا نا بابا سائیں! میں کسی الٹے سیدھے معاملے میں نہیں الجھا ہوا ہوں اور بالکل سیدھا سیدھا چل رہا ہوں۔ آپ اپنے منیجر سے اس بات کی تصدیق کرسکتے ہیں کہ میں روزانہ پابندی سے فیکٹری جارہا ہوں اور شام تک وہیں وقت گزارتا ہوں۔ فیکٹری میں کام شروع ہوگیا ہے اور اب میری پوری توجہ کام پر ہے۔''
عالم شاہ آرام دہ صوفے پر ٹانگ پھیلائے بیٹھا فون پر صداقت شاہ سے بات کررہا تھا۔ صداقت شاہ، شکیل سومرو کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو لے کر پریشان تھے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں پہلے بھی شک ظاہر کیا تھا کہ کہیں اس معاملے میں عالم شاہ کا تو کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ عالم شاہ پہلے بھی مکر گیا تھا اور اب بھی اپنے ملوث ہونے کا اقرار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ صداقت شاہ اس کے جذباتی پن سے ڈرتے تھے اور انہیں اندیشہ تھا کہ وہ جذبات میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھے جو ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن جائے۔ اسے ایسی کسی حرکت سے روکنے کے لیے وہ اس پر گاؤں واپس لوٹنے کے سلسلے میں زور دینے لگے تھے۔

اسے پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا اس لیے عرصے سے نظر انداز کی ہوئی فیکٹری کی طرف توجہ دینا شروع کر دی تھی اور اپنے اس کام کا شہر میں رکنے کا جواز بنا لیا تھا۔

''یاد رکھنا عالم شاہ کہ تم ہماری آخری پونجی ہو جسے ہم کسی صورت نہیں گنوا سکتے۔ ہمارے بوڑھے اور کمزور دل کے لیے معظم شاہ کی موت اور جوان بیٹی کی بیوگی کا بوجھ ہی کافی ہے۔ تم ہمیں کسی اور آزمائش میں مت ڈالنا۔'' صداقت شاہ نے گویا اس سے التجا کی۔

''آپ اتنے کمزور کیوں پڑ گئے ہیں بابا سائیں! آپ اتنے کم حوصلہ تو نہیں تھے۔ کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' اس نے ان کے لہجے کی کمزوری کو محسوس کر کے سوال کیا۔

''میرے پاس خبریں آ رہی ہیں کہ لطیف سومرو اپنے بیٹے کی حالت کا ذمے دار ہمیں ہی ٹھہرا رہا ہے اور اس کی طرف سے انتقامی کارروائی کا اندیشہ ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

''اس کو پیغام بھیجیں کہ پہلے بیٹے کے علاج معالجے کی فکر کرے۔ بیٹا ٹھیک ہو گیا تو خود اسے بتا دے گا کہ اسے اس حال تک کس نے پہنچایا۔'' عالم شاہ نے زہریلے لہجے میں مشورہ دیا۔ شکیل سومرو کے لیے اس کے دل میں کچھ ایسی ہی نفرت تھی کہ کسی صورت اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شکیل سومرو کے بارے میں جو اطلاعات موصول ہو رہی تھیں وہ باعثِ سکون تھیں۔ شکیل سومرو زندہ ضرور بچ گیا تھا لیکن اس کی حالت مُردے سے بھی بدتر تھی۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی اور ایک جبڑا بھی مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ منہ سے خوراک لینے سے محروم ہونے کے علاوہ بولنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔ اس کے اعصابی نظام کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا جس کے باعث وہ اپنے جسم کو حرکت دینے سے بھی قاصر تھا اور ایسا لگتا تھا کہ قدرت نے اسے صرف نشانِ عبرت بنانے کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔ سنا تھا لطیف سومرو علاج کے لیے اسے باہر بھجوانے والا ہے۔

''ہمیں کسی کو کوئی پیغام بھجوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم یہ یاد رکھو کہ تمہیں کوئی جذباتی قدم نہیں اٹھانا ہے اور ہر حال میں اپنی سلامتی کا خیال رکھنا ہے۔ دیکھا جائے تو سومرو خاندان کے ساتھ قدرت نے خود ہی انصاف کر دیا ہے اور ہمیں انتقام کے لیے کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر انتقام کا فیصلہ ہوا بھی تو اسے ہم بڑے پلان کریں گے۔ تم اس بارے میں کچھ کرنے کا سوچنا بھی

سگھڑاپا

☆ صابن جب ختم ہونے لگتا ہے تو اسے نئے صابن کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔

☆ ٹوتھ پیسٹ ٹیوب کو رول کر کے آخری قطرے تک استعمال کیا جاتا ہے۔

☆ گھر میں رکھی اچھی اور خوبصورت کراکری صرف مہمانوں کے لیے استعمال میں ہوتی ہے۔

☆ ٹی وی ریموٹ کے سیل تبدیل کرنے کے بجائے اس کو مار مار کر استعمال کرنے مجبور کرتا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد نعمان، بٹل ہزارہ

نہیں۔'' اس بار صداقت شاہ کے لہجے میں تحکم تھا۔ عالم شاہ نے ان سے اختلاف کی قطعی ضرورت نہیں سمجھی اور فرمانبرداری سے بولا۔

''جو آپ کا حکم بابا سائیں۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''جیتا رہ میرا پٹ! تُو میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ میں تیرا نقصان نہیں سہہ سکتا۔ لطیف سومرو کے پاس تو دو بیٹے اور ہیں جو چند سال میں جوان ہو کر اس کا بازو بن جائیں گے اور وہ شکیل کا غم بھول جائے گا لیکن ہمارے لیے تو تُو بس ایک ہی کل جہان ہے۔'' وہ بار بار اس کی اہمیت کا احساس دلا کر اسے باز رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔

''میں پوری کوشش کروں گا بابا سائیں کہ میری ذات سے آپ کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔'' اس نے انہیں یقین دہانی کروا کر فون بند ہی کیا تھا کہ سرمد پُرجوش چہرے کے ساتھ اس کے سامنے حاضر ہوا۔

''بڑی خبر ہے سائیں! چاچڑ کو یہاں شہر میں دیکھا گیا ہے۔ دیکھنے والے نے اس کا پیچھا کر کے اس کی رہائش کا بھی معلوم کر لیا ہے اور دو بندے اس جگہ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ آگے آپ جو حکم دیں وہی ہوگا۔''

''خبر تو واقعی زبردست لائے ہو سرمد! بس اب کسی انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈائریکٹ ایکشن کر کے چاچڑ اور اس کے ساتھیوں کو ان کے کیے کی سزا دینی ہے۔ جو کچھ معلوم کرنا تھا ہم نے شکیل سومرو سے معلوم کر لیا تھا۔ چاچڑ کے لیے تو ڈائریکٹ سزا ہی ٹھیک رہے گی۔'' وہ خبر سن کر خوش ہو گیا۔

''آپ حکم دیں سائیں، کب کارروائی کرنی ہے؟'' سرمد اس کے کسی فیصلے سے کہاں اختلاف کرسکتا تھا، فوراً حکم کی بجاآوری کے لیے تیار ہوگیا۔

''اس موذی کو مہلت دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم آج رات ہی کارروائی کریں گے۔'' عالم شاہ نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

''میں اور میرے ساتھی سب نمٹالیں گے سائیں! آپ دور رہ کر تماشا دیکھیں، آپ کے لیے یہی مناسب رہے گا۔'' سرمد کی وفاداری نے اس کی زبان سے یہ مشورہ ادا کروادیا۔

''نہیں سرمد! میں اس معاملے سے دور نہیں رہ سکتا۔ اپنی بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے ایک ایک فرد کو اپنے ہاتھ سے انجام تک پہنچائے بغیر مجھے سکون نہیں ملے گا۔'' عالم شاہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔

''جو حکم سائیں! میں تیاری کرواتا ہوں۔'' اپنے مشورے کے رد کیے جانے پر سرمد مایوس ہوگیا لیکن فرمانبرداری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اسی رات وہ لوگ رات کو تقریباً دو بجے اپنے ٹارگٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس بار پیشہ ور ڈاکوؤں سے مقابلہ تھا اس لیے سرمد نے پہلے سے زیادہ نفری کا انتظام کیا تھا۔ اس کے آدمی پہلے ہی الگ گاڑیوں میں اس بنگلے کے قریب پہنچ گئے تھے جہاں چاچڑ اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ حسبِ معمول عالم شاہ کو خود اپنے ساتھ لے کر نکلا تھا اور اپنے آدمیوں سے رپورٹ لیتا جارہا تھا۔

''بنگلے میں ابھی تک چہل پہل ہے اور صاف پتا چل رہا ہے کہ زیادہ تر افراد جاگ رہے ہیں۔'' ملنے والی یہ اطلاع اچھی نہیں تھی۔ انہیں صبح کی روشنی پھیلنے سے قبل اپنا کام نمٹا کر واپس لوٹ جانا تھا اور یہ خبیث ڈاکو ابھی تک جاگ رہے تھے۔ ان کے جاگتے ہوئے بنگلے میں داخل ہونے کا مطلب تھا زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا اور اپنے لوگوں کو نقصان سے دوچار کرنا۔

''ہم کچھ دیر مزید انتظار کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ بنگلے میں چہل پہل کم ہونے کے آثار نظر آئے تو ٹھیک ہے ورنہ کل دیکھیں گے۔ مجھے اپنے انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے اپنے لوگوں کی جان داؤ پر لگانا منظور نہیں ہے۔'' سرمد کو الجھن میں دیکھ کر عالم شاہ نے فیصلہ سنایا۔ اب وہ چاچڑ والے بنگلے کے کافی قریب پہنچ چکے تھے اور انہیں بنگلا دکھائی دینے لگا تھا۔

''وہ لوگ کہیں باہر جارہے ہیں سائیں۔ اندر سے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں آرہی ہیں۔'' یک دم ہی قدرے ہیجانی لہجے میں یہ دوسری اطلاع دی گئی۔

''گاڑیوں کو باہر آنے دو اور پھر سب کو بھون ڈالو۔ کوئی ایک بھی نہیں بچنا چاہیے۔'' سرمد کے کچھ بولنے سے قبل ہی اس نے حکم جاری کیا۔ اب ان کی گاڑی بنگلے کے اتنے قریب پہنچ چکی تھی کہ انہیں بنگلے کا گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ بڑا سا سرمئی گیٹ دھیرے دھیرے کھل رہا تھا۔ گیٹ کھلا تو اس میں سے یکے بعد دیگرے دو گاڑیاں برآمد ہوئیں۔ گاڑیوں کے برآمد ہوتے ہی نامعلوم سمتوں سے ان پر گولیاں برسنا شروع ہوگئیں۔ چاچڑ اور اس کے ساتھی جو شاید کسی نئے ڈاکے کے لیے جارہے تھے، لمحہ بھر کے لیے تو بوکھلائے لیکن پھر انہوں نے جوابی کارروائی شروع کردی۔ اندر بنگلے میں موجود رہ جانے والے ساتھیوں نے بھی انہیں کمک پہنچائی۔ یوں سارا علاقہ گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ بنگلے میں موجود ڈاکو اپنے ساتھیوں کو اچھا کور دے رہے تھے اور ان میں سے کئی گاڑیوں سے اتر کر ادھر اُدھر پناہ لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ابھی تک کوئی گولی نہ چلانے والے سرمد اور عالم شاہ دور اپنی گاڑی میں بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

''ان میں چاچڑ کون ہے سرمد؟'' عالم شاہ نے پناہ کے لیے ایک آڑ سے دوسری آڑ کی طرف بھاگتے ہوئے ڈاکوؤں کو دیکھ کر پوچھا۔

''وہ جو پیچھے والی گاڑی کے نیچے لیٹ کر فائرنگ کررہا ہے سائیں۔'' سرمد نے اسے آگاہ کیا تو وہ ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ سرمد سائیں، سائیں کرکے اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ وہ پہلے جھکا جھکا دوڑنے کے بعد یک دم زمین پر لیٹ گیا اور ہاتھوں پیروں پر رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس کی نظریں فقط اس مقام پر تھیں جہاں چاچڑ چھپا ہوا تھا اور وہ اس بات سے بالکل بے نیاز ہوگیا تھا کہ اس کے آس پاس سے گولیاں سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ پوری توجہ چاچڑ پر مرکوز رکھے وہ ایک خاص فاصلے پر رکا اور مخصوص زاویہ بناتے ہوئے اپنی گن سیدھی کی۔ لگاتار کیے جانے والے تین فائر بہت تباہ کن تھے۔ گاڑی کے نیچے موجود چاچڑ نے بوکھلا کر باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن دیر ہوچکی تھی۔ گولیوں نے اپنا کام دکھادیا تھا۔ گاڑی کے فیول ٹینک میں سوراخ ہوگیا تھا اور بہتے ہوئے پیٹرول نے آگ پکڑ لی تھی۔ پیٹرول کی آگ سے زیادہ خوفناک آگ شاید ہی کوئی ہو۔ آناً فاناً چاچڑ بھی اس آگ کی زد میں

آ گیا اور گولیوں کے شور کے باوجود اس کی دلدوز چیخیں واضح سنائی دینے لگیں۔ عالم شاہ کا مقصد پورا ہو چکا تھا اس لیے مزید وہاں رکنے کے بجائے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا لیکن شاید فیصلے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ کہیں سے ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور اسے اپنی پیٹھ میں اتنی زور کا جھٹکا لگا کہ خود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر اوندھے منہ گر گیا۔ اسی وقت ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا۔ پہلے صرف بہتے ہوئے پیٹرول میں آگ لگی تھی لیکن اب فیول ٹینک پھٹ گیا تھا اور گاڑی کئی پرخچوں میں تبدیل ہونے کے بعد اس کے کئی جلتے ہوئے ٹکڑے ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ ایک جلتا ہوا ٹکڑا اس کے قریب بھی آ کر گرا اور اس نے اس کی حدت اپنے جسم پر محسوس کی لیکن اس احساس کے اوپر دور سے سنائی دیتی پولیس کی گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں حاوی ہونے لگیں۔ سائیں صداقت شاہ جیسے معزز آدمی کا بیٹا پولیس کو اس جگہ زخمی حالت میں ملتا تو ان کے خاندان کی کتنی سبکی ہوتی۔

☆☆☆

اس نے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس کا نہیں تھا۔ وہ اپنے سامنے ایک قطعی اجنبی شخص کو دیکھ رہا تھا جو قد کاٹھ کے حساب سے تو اس جیسا ہی تھا لیکن رنگ روپ، نقش و نگار اور بالوں کے انداز کے حوالے سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے اس اجنبی عکس میں اپنی اصل شخصیت کھوجنی چاہی لیکن کہیں بھی تو اس اصل شخصیت کا عکس موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے نشانِ انگشت کہیں ثبت کرے گا تو وہ بھی اس کی شخصیت کا کھوج نہیں دیں گے ورنہ ہی گواہی ملے گی کہ وہ سیمسن ڈیلائٹ ہے۔ پنجاب کے ایک دور دراز اور پسماندہ گاؤں میں اپنی شادی کی چھٹیاں گزار کر واپس آنے والا سیمسن ڈیلائٹ جو اپنے ازمتی فرائض انجام دینے کے لیے واپس لوٹا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ بے چارے سیمسن کی واپسی اس کے لیے ہر حیات سے پروانۂ آزادی ثابت ہوئی تھی۔ ملک کے چپے چپے پر اپنے پنجے گاڑے بیٹھے دشمن سے سیمسن جیسا عام بے ضرر آدمی بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ سیمسن کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے قد کاٹھ اور ملازمت کی نوعیت کے سبب ان اریوں کی نظر میں آ گیا تھا جو اپنے مطلب کے حصول کے لیے کسی بھی حد سے گزر جاتے ہیں۔ سیمسن کی یہ بھی بدقسمتی تھی کہ اس نے شادی کی چھٹیاں ایسے موقع پر لی تھیں جب کچھ خاص لوگ روشن ماتھر کو آزاد کروانے کا مشن اپنے ذمے لے چکے تھے۔ روشن ماتھر کا پڑوسی ملک کا جاسوس ہونا اور ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہونا پوری طرح ثابت ہو چکا تھا اور حکومتِ پاکستان اس کے ملک اور اہلِ خانہ کی طرف سے دائر کردہ رحم کی اپیلیں مسترد کر کے اسے سزائے موت دینے کا حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔

روشن ماتھر کی اس کے اہلِ خانہ سے الوداعی ملاقات کروائی جا چکی تھی اور چند دنوں میں اس کی سزا پر عمل درآمد ہونے والا تھا۔ روشن ماتھر کی خدمات کے معترف اس کے آقاؤں نے اس کی جان بچانے کی کوششیں تیز کیں تو ان لوگوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جو آج کل معاذ کے جسم و جان کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ معاملات طے ہو گئے تو بے چارے سیمسن کو گاؤں سے واپسی میں چالاکی سے اغوا کر لیا گیا اور وہاں پہنچا دیا گیا جہاں معاذ کو اس سے بھی پہلے پہنچایا جا چکا تھا۔ معاذ کو ٹھیک طرح سے نہیں معلوم تھا کہ وہ ملک کے کون سے حصے میں ہے لیکن اتنا ضرور اندازہ تھا کہ اسے یہاں تک پہنچنے کے لیے اچھا خاصا طویل سفر طے کرنا پڑا ہے۔ اس کے ساتھ یہاں آنے والوں میں ڈاکٹر وکٹر بھی شامل تھا اور معاذ کے ساتھ سیشن کرتے ہوئے اس کے دماغ میں بہت کچھ انڈیلنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس نے اسے باور کروایا تھا کہ کچھ عرصے کے لیے اسے سیمسن کا کردار ادا کرتے ہوئے وہ کام کرنا ہے جو اس سے کہا جائے۔ سیمسن کا کردار ادا کرنے کے لیے اسے سیمسن کے سلسلے میں بہت سی معلومات بھی ذہن نشین کروائی گئی تھیں۔ اسے سیمسن کی آڈیو اور ویڈیو کالز بھی سنوائی گئی تھیں تاکہ وہ اپنا کردار بہتر طریقے سے ادا کر سکے۔ معاذ قدرتی طور پر ایک بہت اچھا نقال تھا اس لیے تھوڑی سی مشق کے بعد وہ سیمسن کے لب و لہجے کی بہت اچھی نقل اتارنے پر قادر ہو گیا تھا اور اپنی چال ڈھال کو بھی اسی کی شخصیت کے سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس ساری تربیت کے دوران ڈاکٹر وکٹر خصوصی سیشنز کے دوران اسے یہ باور کرواتا رہا تھا کہ روشن ماتھر ایک بے گناہ شخص ہے جسے پاکستانی اداروں نے محض پڑوسی ملک کا شہری ہونے کے جرم میں گھیر لیا ہے اور اس پر بے جا الزامات عائد کر کے بے قصور ہی سزائے موت دی جا رہی ہے۔ اسے روشن ماتھر کی بوڑھی بیوہ ماں اور جوان بیوی کے دکھوں کا بھی نہایت دلخراش نقشہ کھینچ کر دکھانے کے بعد یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اگر وہ روشن ماتھر کو قید سے نکال کر آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ نہ صرف ایک مظلوم کی مدد ہوگی

بلکہ دو بے سہارا خواتین پر بھی اس کا احسان ہوگا۔

روشن ماتھر کا قصہ نیا نہیں تھا۔ معاذ اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی اس شخص کے بارے میں خبروں وغیرہ کے ذریعے بہت کچھ سن چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کوئی بے قصور شخص نہیں بلکہ مبینہ غیر ملکی جاسوس ہے جس پر ایسے کئی دھماکوں کی ذمے داری عائد ہوتی ہے جن میں درجنوں افراد لقمۂ اجل بنے تھے اور ان درجنوں افراد سے وابستہ سیکڑوں افراد نے دکھ کی فصل کاٹی تھی۔ وہ ڈاکٹر وکٹر کی دی ہوئی سجیشنز پر اس شخص کے لیے کوئی ہمدردی بھلا کیسے محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے اس معاملے میں بھرپور مزاحمت کی تھی اور وکٹر کے مقابلے میں خود اپنے دماغ کو خصوصی ہدایات دیتا رہا تھا۔

روشن ماتھر کے لیے اس کے دل میں نفرت کے جذبات اس وقت اور بھی شدید ہوگئے تھے جب سیمسن کو یہاں لایا گیا تھا۔ سیمسن کے دونوں انگوٹھوں کی کھال نہایت مہارت سے اتار کر معاذ کے دونوں انگوٹھوں پر اس طرح منڈھی گئی تھی کہ عام نظر سے دیکھنے پر اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کیسی کاریگری دکھائی گئی ہے۔ اس عمل کے بعد اسے سر کے بالوں سے لے کر پیر کی انگلی تک سیمسن کے روپ میں ڈھال دیا گیا تھا اور وہ بھی اس مہارت سے کہ وہ خود اپنی جگہ حیران کھڑا تھا کہ وہ معاذ احمد ہے یا سچ مچ سیمسن ڈیلائٹ۔ وہ جن لوگوں کے درمیان تھا، ان کی خصوصیات ہر روز نئے انداز میں اس کے سامنے کھل کر آتی تھیں اور وہ حیران رہ جاتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں جو ہر فن میں اتنے یکتا ہیں اور جن کے اتنے بے شمار وسائل ہیں کہ جو چاہے کر گزرتے ہیں پھر بھی انہوں نے اس جیسے ایک عام یونیورسٹی کے طالب علم کو اپنے کچھ خاص مقاصد کے لیے چن لیا ہے۔

''ہیلو سیمسن! کیسے ہو تم اور کیسا فیل کر رہے ہو؟''

ابھی وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا نہیں تھا کہ ڈاکٹر وکٹر کمرے میں داخل ہوا اور اسے مخاطب کیا۔

''آئی ایم فائن سر! میں اپنی جاب پر جانے کے لیے بے چین ہوں۔'' معاذ نے اسے جواب دیا تو اس کی آواز قطعی بدلی ہوئی تھی اور بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے سیمسن بات کر رہا ہو۔

''گڈ! تم سے اسی کارکردگی کی امید تھی۔'' وکٹر نے بے ساختہ اسے سراہا اور ہاتھ کے اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اس دوران وہیل چیئر پر پتھرائی ہوئی حالت میں بیٹھے سیمسن اور اس ٹرالی کو وہاں سے ہٹایا جا چکا تھا جس پر میک اپ کے نہ جانے کون کون سے لوازمات سجے ہوئے تھے۔ وہ شخص اور اس کا اسسٹنٹ بھی ڈاکٹر وکٹر کی آمد کے بعد وہاں سے روانہ ہوگئے تھے جنہوں نے معاذ کے وجود کو اس تبدیلی سے گزارا تھا۔

''ہمارے ایکسپرٹ نے تمہیں اس مہارت سے سیمسن کا روپ دیا ہے کہ اسے پیدا کرنے والی ماں بھی اصل سیمسن اور تم میں فرق تلاش نہیں کرسکے گی۔ حلیے کی اس کامیاب تبدیلی کے بعد سارا دارومدار تمہاری صلاحیتوں پر ہے کہ تم کسی کو اپنی شخصیت پر شک نہ ہونے دو۔ اس گیٹ اپ سے متعلق تمام ضروری معلومات تمہیں ذہن نشین کروادی گئی ہیں پھر بھی اگر تمہارے ذہن میں کوئی سوال ہو تو پوچھ سکتے ہو۔'' وکٹر نے اس سے گفتگو کرتے ہوئے پیشکش کی۔

''نو سر! آل از کلیئر۔ میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پلان کیا ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''پلان سے پہلے ایک ویڈیو دیکھ لو۔ یہ ویڈیو تمہارے بہت کام آئے گی۔'' ڈاکٹر وکٹر نے اسے جواب دیا اور ریموٹ کی مدد سے دیوار پر لگا ایل ای ڈی آن کیا۔ ڈاکٹر وکٹر ہمیشہ مسلح افراد کی غیر موجودگی میں اس سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ یقیناً وہ بہت پُراعتماد تھا کہ معاذ مکمل طور پر اس کے ٹرانس میں ہے اور کسی صورت اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کبھی کبھی معاذ کا دل چاہتا تھا کہ اس کی گردن مروڑ کر اس کی یہ غلط فہمی دور کردے لیکن پھر مصلحت ہاتھ روک لیتی تھی۔ یہ بہت شاطر اور طاقتور لوگ تھے اور ان سے نمٹنے کے لیے جذبات کے بجائے عقل اور مصلحت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

''یہ اس جگہ کی ویڈیو ہے جہاں روشن ماتھر کو رکھا گیا ہے۔ تم اس ویڈیو کو ذہن نشین کرلو تو تمہارے لیے آسانی رہے گی۔'' وکٹر نے اسے مشورہ دیا تو وہ غور سے ویڈیو دیکھنے لگا۔ یہ کسی عمارت کے اندرونی پُرپیچ راستے تھے جن پر ایسا لگتا تھا کہ کوئی شخص کیمرا ہاتھ میں لیے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اس پُرپیچ راستے کا اختتام ایک کمرے پر ہوا جس میں ایک بینچ پر روشن ماتھر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اگرچہ ان ویڈیوز اور تصویروں کے مقابلے میں بہت مختلف لگ رہا تھا جو معاذ اس سے قبل ٹیلی ویژن اور اخباروں میں دیکھتا رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے اسے شناخت کرلیا تھا۔ معاذ نے صاف محسوس کیا کہ قدرے بیمار اور مایوس محسوس ہونے والے روشن ماتھر پر کیمرا فوکس ہوتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے اور وہ یوں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا جیسے

کسی کا استقبال کر رہا ہو۔ ویڈیو بس یہیں تک تھی، اس کے بعد اسکرین تاریک ہوگئی۔

"شاندار! تم لوگوں نے یہ ویڈیو کیسے حاصل کی؟" معاذ خود کو سوال کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

"اتفاق اور اچھی پلاننگ سے۔ اتفاق یہ تھا کہ روشن ماتھر کی ماں کی ایک آنکھ مصنوعی ہے۔ ہم سے اس کی آزادی کے سلسلے میں تعاون مانگا گیا تو ہم نے ایک خاص پلان پر کام شروع کردیا۔ روشن ماتھر کی فیملی کی طرف سے ملاقات کی درخواست بھجوانے سے قبل اس کی ماں کی مصنوعی آنکھ تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک ایسی مصنوعی آنکھ فکس کی گئی جو ایک کیمرے کی طرح بھی کام کرسکتی تھی۔ بے چارے پاکستانیوں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی۔ ساس بہو کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس عمارت تک لے گئے جہاں ماتھر کو رکھا ہے۔ عمارت میں داخلے سے قبل ساس بہو کے لباس اور جوتوں سمیت ان کے جسم پر سے ہر شے اتروالی گئی اور انہیں اپنے فراہم کردہ لباس اور جوتوں میں ماتھر تک لے جایا گیا تاکہ وہ جاسوسی کا کوئی آلہ اپنے ساتھ نہ لے جاسکیں لیکن ماتھر کی ماں کی مصنوعی آنکھ کی صورت کیمرا اندر چلا گیا اور انہیں کوئی خبر ہی نہیں ہوسکی۔ ماتھر بہت ذہین ایجنٹ ہے۔ اسے اندازہ ہوگا کہ ماں اور بیوی کے ساتھ لازماً جاسوسی کا کوئی آلہ موجود ہوگا اس لیے اپنی گفتگو میں اس نے بہت سے ایسے ہنٹ دیے جن سے اس تک پہنچنے میں مدد ملی۔ گفتگو کا وہ حصہ تمہارے لیے بے مصرف تھا اس لیے تمہیں صرف اتنی ویڈیو دکھائی گئی ہے جو تمہارے کام میں معاون ثابت ہوسکے۔" وکٹر نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ دل میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ انسانی ہمدردی کے جذبات کا مظاہرہ انسانوں تک ہی محدود رہے تو ٹھیک رہتا ہے۔ روشن ماتھر جیسے خونی بھیڑیے جو ملک و قوم کی تباہی میں براہ راست کردار ادا کرتے رہے ہوں، کسی ہمدردی کے لائق نہیں ہوتے۔

"میرے لیے کیا حکم ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"تمہیں فوری طور پر روانہ ہونا ہے۔ سیمسن اپنے پلان پر عمل کر پاتا تو ڈیوٹی جوائن کرنے سے ایک دن قبل ہی پہنچ چکا ہوتا۔ تم صبح سویرے اپنی ڈیوٹی شروع ہونے سے ذرا دیر پہلے وہاں پہنچو گے۔ اس لیے کسی کو تم سے زیادہ بات چیت کا موقع نہیں ملے گا۔ اندر تم اکیلے ہوگے اور اکیلے ہی تمہیں روشن ماتھر کو باہر نکالنے کا کام انجام دینا ہوگا۔ باہر نکلتے ہی تمہیں مددگار میسر آجائیں گے جو نہ صرف ماتھر کو بحفاظت سرحد پار کروادیں گے بلکہ تمہیں بھی ہمارے پاس واپس لے آئیں گے۔" اسے آگاہ کیا گیا۔

"اوکے! آئی ایم ریڈی۔" اس نے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب جو کچھ ہونا تھا، وہ ہونا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے۔

اس روز سیمسن کی جگہ وہ ملازمت پر پہنچا تو سیمسن کے ساتھ رہنے والے دو ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔

"اوئے یہ کیا، تُو تو ہمیشہ چھٹی ختم ہونے سے ایک دن پہلے واپس آجایا کرتا تھا، اب کے اتنی لیٹ کیسے ہوگیا؟" ایک ساتھی نے فوراً اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"لیٹ تو نہیں ہوا، ڈیوٹی سے پہلے پہنچ گیا ہوں۔" اس نے سیمسن کے لب و لہجے میں جواب دیا اور اپنے کام کے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

"اب اسے اُدھر کی ڈیوٹیاں بھی تو بھگتانی ہیں۔ اب تو ایسا ہی ہوا کرے گا۔" دوسرے ساتھی نے شوخ لہجے میں اسے چھیڑا تو وہ مسکرادیا۔ بے چارہ سیمسن اپنی ڈیوٹی پر پہنچا ہوتا تو اپنے ساتھیوں کی شرارت بھری چھیڑ چھاڑ کے جواب میں ایسے ہی ردعمل کا مظاہرہ کرتا۔

"ویاہ تو کر کے آگیا۔ اب ہم دوستوں کو کب دعوت کھلا رہا ہے؟" پہلے والے نے اس سے سوال کیا۔

"جب بولو تب۔" یہ جواب دیتے ہوئے اس کے دل نے سیمسن کے لیے اپنے دل میں خاص درد محسوس کیا۔ وہ امنگوں اور خوابوں سے بھرپور جوان ایک مجرم، قاتل اور دہشت گرد کی زندگی بچانے کے لیے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اس کے چاہنے والوں کو علم ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر گئی ہے۔

"یہ بات ہوئی نا۔ چل تو ڈیوٹی سے فارغ ہوکر آجا پھر شام میں پروگرام بناتے ہیں۔ ہم یاروں نے مل کر تیرے لیے شادی کا تحفہ بھی لیا ہے۔ اگلی واری چھٹیوں پر گھر جائے گا تو بھرجائی کے لیے ہماری طرف سے تحفہ ساتھ لے کر جانا۔" کہنے والا پورے خلوص سے کہہ رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ سیمسن اب کبھی اپنے گھر واپس نہیں لوٹ سکے گا اور اس کی بوڑھی بیوہ ماں اور ایک ہفتے کی بیاہتا بیوی اس کی راہ ہی تکتی رہ جائیں گی۔ اس صورت حال پر دل میں ابھرتے درد کو دبا کر وہ بہ مشکل مسکرایا اور اپنی ڈیوٹی کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسے جس جگہ ڈیوٹی کرنا تھی، وہ اصل میں ایک سیف ہاؤس جیسی جگہ تھی جسے ہائی لائٹ کیے بغیر خطرناک مجرموں یا اہم گواہوں کو خفیہ طور پر بحفاظت رکھنے

کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سیمسن ایک نچلے درجے کا ملازم تھا جو یہاں صفائی ستھرائی وغیرہ کے کام انجام دیتا تھا اور مخصوص اوقات میں اپنی ڈیوٹی پوری کر کے اصل عمارت سے ہٹ کر اس جگہ واپس آجاتا تھا جہاں اسی کی طرح کے دوسرے ملازمین رہائش پذیر تھے۔ اصل عمارت کے اندر جانے والوں میں صرف سیمسن اور ایک بوڑھا کُک شامل تھے۔ کُک ریٹائرمنٹ کے قریب تھا اور سیمسن کے مقابلے میں اندر زیادہ وقت گزارتا تھا لیکن ایک تو وہ قد میں سیمسن کے مقابلے میں چھوٹا تھا دوسرے سیمسن کی شادی کی چھٹیاں اسے جال میں پھنسانے کا بہترین موقع ثابت ہوئی تھیں اس لیے وہ بے چارہ کام آگیا تھا اور اب معاذ اس کی جگہ ڈیوٹی پر جا رہا تھا۔

انگوٹھے کا نشان اور معمول کی تلاشی لینے کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اسے یہاں ایک بڑی کارروائی کرنا تھی لیکن وہ اپنے ساتھ کوئی اسلحہ یا بارودی مواد نہیں لایا تھا۔ اس کی جیب میں صرف ایک لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ پڑا ہوا تھا جس سے کسی نے تعرض نہیں کیا تھا۔ سیمسن سگریٹ نوشی کا عادی تھا اور اسے یہ چیزیں اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت تھی۔ پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوا اور مخصوص جگہ سے صفائی کا سامان اٹھا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ سیمسن کو لانے والوں نے جزئیات کے ساتھ اس سے ایک ایک بات کی تفصیل معلوم کر کے اسے ذہن نشین کروائی تھی اس لیے اسے اس جگہ کے اجنبی ہونے کے باوجود کچھ اجنبی نہیں لگ رہا تھا۔ صفائی کا کام انجام دیتے ہوئے وہ ایک ہال نما کمرے میں پہنچا۔ سیمسن نے بتایا تھا کہ اسے اس کمرے سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے اور کبھی کبھار مسلح افراد کی موجودگی میں ہی اندر کے حصوں کی صفائی کے لیے بھیجا جاتا ہے، وہ بھی اس طرح کہ اس کی وہاں کبھی کسی فرد سے ملاقات نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ بتا سکتا ہے کہ وہاں کتنے افراد موجود ہوتے ہیں۔ سیمسن نے اس جگہ کیمرے کی موجودگی کا بھی انکشاف کیا تھا۔ کیمرا ایک آرائشی بلب کے شیڈ کی آڑ میں چھپایا گیا تھا جسے دوران صفائی دریافت کر لینے کے باوجود سیمسن نے خود کو انجان ہی ظاہر کیا تھا۔ اسے اپنی ملازمتی ذمے داریوں کا احساس تھا اور وہ زبان بند کر کے رہنے میں ہی اپنے لیے بھلائی محسوس کرتا تھا۔

معاذ نے بھی اس کیمرے کو تاڑ لیا اور اس سے نجات کے لیے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے دیواروں اور چھتوں سے جالے صاف کرنے کا کام کرنے لگا۔ اس کام کے لیے اس کے پاس پلاسٹک کا ایک برش موجود تھا۔ برش ڈنڈے پر لگا ہوا تھا اور ڈنڈے کی لمبائی ضرورت کے مطابق کم زیادہ کی جا سکتی تھی۔ اس نے ڈنڈے کی لمبائی میں اضافہ کیا اور چھت کے جالے صاف کرنے لگا۔ یہ کام کرنے کے دوران وہ تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے یہ تاثر دے رہا تھا کہ اسے بہت سا کام کرنا ہے اس لیے وہ ذرا عجلت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس تیزی کو برقرار رکھتے ہوئے جب وہ اس آرائشی بلب والی دیوار تک پہنچا جس میں کیمرا چھپایا گیا تھا تو بلب کے قریب کا حصہ صاف کرتے ہوئے ڈنڈے کو یوں حرکت دی جیسے اچانک ہی ڈنڈا اس کی گرفت سے نکل گیا ہو۔ ڈنڈا جو بلب کے شیڈ کے عین اوپر حرکت کر رہا تھا پوری قوت سے شیڈ سے ٹکرایا اور شیڈ کا رنگین شیشہ ٹوٹ کر گرنے کے ساتھ ہی کیمرے کا تار بھی نکل گیا۔ مائیکرو کیمرا لمحہ بھر میں ہی نیچے فرش پر آن گرا۔ وہ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹوٹ کر گرنے والی اشیا کو دیکھنے لگا جیسے اس صورت حال پر گھبرا گیا ہو۔ توقع کے مطابق فوراً ہی ردعمل ظاہر ہوا اور ایک مسلح شخص اندر داخل ہوا۔ وہ سادہ پوش تھا لیکن اس کا کاٹھ، ہیئر اسٹائل اور چلنے کا مخصوص انداز اس کے آرمی کا ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''وہ جالے صاف کرتے ہوئے ڈنڈا اس بلب پر لگ گیا اور......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور ہاتھ سے نیچے گری ہوئی اشیا کی طرف اشارہ کیا۔

''اٹس اوکے۔ تم اپنا کام نمٹاؤ۔ یہ میں خود دیکھ لوں گا۔'' اس نے نرمی سے کہا اور نیچے گرا ہوا کیمرا اٹھانے کے لیے جھکا۔ معاذ کے لیے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود ڈنڈا نپے تلے انداز میں اس طرح اس کے سر پر رسید کیا کہ وہ ایک ہی وار میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ معاذ نے سب سے پہلے اس کی گن پر قبضہ کیا اور پھر محتاط انداز میں پلٹ کر باہر نکلا۔ سیمسن سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق اس برآمدے میں کوئی کیمرا نصب نہیں تھا پھر بھی اس نے گن اپنے لباس کے اندر چھپا لی اور صفائی کا سامان ہاتھ میں رکھا۔ اب وہ ہال سے دور برآمدے کے آخری سرے پر موجود کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ کمرا دفتری انداز میں سجا ہوا تھا لیکن ابھی وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے ایک کھڑکی کا پردہ کھینچ کر اتارا اور میز کے اوپر

گیا۔ اس میز کے عین اوپر سیلنگ فین لگا ہوا تھا۔ اس نے سیلنگ فین کو بجلی فراہم کرنے والے تار کو کھینچ کر اس طرح نکالا کہ اب وہ پنکھے کی پنکھڑی پر لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکی سے اتارا ہوا پردہ اس پنکھڑی پر رکھ کر اور لائٹر کی مدد سے سگریٹ جلانے کے بعد وہ جلتا ہوا سگریٹ پردے پر رکھ دیا۔ فوراً ہی کپڑا جلنے کی ہلکی سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ چھلانگ لگا کر میز سے نیچے اترا اور سوئچ بورڈ پر لگے تمام بٹن آن کر دیے۔ اسے معلوم تھا کہ جب پردہ باقاعدہ آگ پکڑ لے گا تو اوپر لٹکا ہوا تار فوراً اس آگ کو پکڑ لے گا۔ اس کے بعد بات کتنی آگے تک جاتی، وہ صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔ اس کام کو نمٹا کر وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس کا بوڑھے کُک سے سامنا ہو گیا۔ وہ فل یونیفارم میں ملبوس ایک ٹرالی کو دھکیلتا ہوا ڈائننگ ہال کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس پر نظر پڑنے پر وہ مسکرایا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"گڈ مارننگ سیمسن۔"

"گڈ مارننگ مسٹر اختر! آپ کے مزاج بخیر ہیں؟ آج مجھے بہت کام نمٹانا ہے۔ میری غیر موجودگی میں یہاں ٹھیک سے صفائی نہیں ہوئی ہے اور میں سب کچھ پہلے والی حالت میں لانے کے لیے بے چین ہوں۔" اس نے خود کو بہت زیادہ مصروف ظاہر کیا۔

"اوکے بوائے۔ جاؤ جا کر اپنا کام نمٹاؤ۔ انعام ہے، میں تمہیں اپنے ہاتھ سے تیار کردہ گرما گرم چائے کے ساتھ سموسے کھانے کے لیے دوں گا۔" شیف ٹرالی دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا ہوا واپس اس جگہ آیا جہاں ایک شخص بے ہوش حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اندر آ کر اس نے وقت دیکھا، سات بجنے میں چھ منٹ باقی تھے اور سیمسن کی اطلاع کے مطابق سات بجنے میں ٹھیک پانچ منٹ پر اندرونی حصے سے دو پہرے دار باہر نکلتے تھے اور آدھے گھنٹے میں ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھیک سات پچیس پر واپس اندر چلے جاتے تھے۔ ساڑھے سات بجے پھر دوسرے دو افراد باہر آتے تھے اور وہ بھی آدھے گھنٹے میں فارغ ہو کر اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے جاتے تھے۔ اسے جو کچھ کرنا تھا وہ اسی آدھے گھنٹے میں کرنا تھا۔

وہ بھول بھلیوں کی طرف جانے والے لاکڈ دروازے کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور دم سادھے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک سات بجنے میں پانچ منٹ کم تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور پھر دروازہ کھول کر بیک وقت دو وردی پوش افراد باہر برآمد ہوئے۔ معاذ کسی شکرے کی طرح ان کی طرف جھپٹا۔ نال کی طرف سے پکڑی ہوئی گن اس کے دائیں ہاتھ اور صفائی کے برش والا ڈنڈا بائیں ہاتھ میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بیک وقت دونوں کے سروں کو نشانہ بنایا۔ جس کے سر پر گن کا دستہ لگا، وہ تو فوراً ہی لہراتا ہوا نیچے آ گرا لیکن ڈنڈے کا نشانہ بننے والے کو شاید اس کی چھٹی حس نے خبردار کر دیا تھا جو وہ عین وقت پر جھک گیا اور ڈنڈا اس کے سر کے بجائے پیٹھ پر لگا۔ اس نے جھکی جھکی حالت میں ہی اپنی گن پھرتی سے نکالی اور معاذ کی طرف پلٹا۔ معاذ نہیں چاہتا تھا کہ گولی چلے اور کوئی اس طرف متوجہ ہو۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں موجود ڈنڈے کو حرکت دی اور گولی چلنے سے قبل ہی اس شخص کے ہاتھ سے گن نکل کر فرش پر گر گئی۔ معاذ نے کوئی مہلت دیے بغیر ڈنڈے کو ایک بار پھر حرکت دی اور اس کی گردن کو نشانہ بنایا۔ اس بار وہ شخص بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن بری طرح لہرانے لگا۔ معاذ ڈنڈا چھوڑ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اس کا منہ اور ناک دبا کر اتنی دیر تک اس کا سانس بند کر دیا کہ وہ مرے نہ لیکن بے ہوش ہو جائے۔ اس کارروائی کو نمٹا کر اس نے تینوں بے ہوش افراد کو باری باری دروازے کے اندر کی طرف دھکیلا اور اپنا صفائی کا سامان بھی اندر لے گیا۔ اب کوئی اس ہال میں آتا بھی تو اسے یہاں ہونے والی کارروائی کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جس وقت اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے برآمدے میں آگے بڑھ رہا تھا اس نے فائر الارم بجنے کی آواز سنی جس کا مطلب تھا کہ بجلی کے تاروں نے آگ پکڑ لی ہے۔ اب اسے تیزی سے اپنا کام نمٹانا تھا۔ دیکھی گئی ویڈیو نے پُرپیچ راستے پر آگے بڑھنے میں اس کی مدد کی۔ وہ ابھی اپنی منزل سے ذرا ہی دور تھا کہ ایک زوردار ہالٹ کی آواز نے اسے اپنے قدم روکنے پر مجبور کر دیا اور حکم ملنے پر وہ آواز کی سمت پلٹا۔

"تم یہاں کس کی پرمیشن سے آئے ہو؟" باوردی شخص کے لیے یقیناً سیمسن کا چہرہ شناسا تھا اس لیے اس نے قدرے تعجب سے لیکن تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"مجھے بھیجا گیا ہے سر! کیپٹن صاحب نے بولا ہے کہ اندر بہت دن سے صفائی نہیں ہوئی، جا کر صفائی کر دو۔ ان کا آرڈر نہ ہوتا تو میں یہاں کیسے آ سکتا تھا؟" اس نے اپنے اندر آنے کا جواز تراشنے کے ساتھ ساتھ دلیل بھی دی جس نے سامنے والے کو متاثر کیا کہ واقعی ہمہ وقت مقفل رہنے والے دروازے کو کھول کر وہ اپنی مرضی سے کیسے آ سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ خود اس کے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں تھی

کہ سیمسن کو اندر بھیجا جا رہا ہے۔ اندر مقیم افراد کو سیمسن کے سامنے بھی نہیں لایا جاتا تھا اور ان کے بیرکوں کی صفائی سے قبل انہیں دوسرے کمرے میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔ ایسے میں سیمسن کی اچانک آمد قابل قبول بھی نہیں تھی۔

''تم یہیں ٹھہرو۔ پہلے میں معلوم کرتا ہوں۔'' آخر اس نے درمیانی حل نکالا۔ وہ دیوار پر نصب انٹرکام کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے انٹرکام کو چھوا ہی تھا کہ معاذ تیزی سے حرکت میں آیا اور پھرتی سے اس کی گردن دبوچ لی۔ گردن پکڑے جانے پر وہ بری طرح بھڑکا اور اپنی دائیں کہنی معاذ کی پسلیوں پر رسید کی۔ ضرب کافی شدید تھی لیکن معاذ نے برداشت کر لی اور ایک جچا تلا گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ ان مخصوص ضربات میں اسے خاصی مہارت حاصل تھی کیونکہ اسے اس سلسلے میں بہت زیادہ مشق کروائی گئی تھی اور بہت اچھی طرح سمجھایا گیا تھا کہ انسانی جسم کے کس حصے پر کتنی قوت سے ضرب لگائی جائے تو وہ بے بس، بے ہوش یا مقتول بھی ہو سکتا ہے۔ اس سیف ہاؤس میں موجود افراد وطن کے محافظوں میں سے تھے اور معاذ ان میں سے کسی کو بھی شدید نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس لیے اس کی کوشش تھی کہ صرف انہیں بے ہوش کر کے اپنا کام چلا لے۔ انٹرکام پر رابطہ کرنے کی خواہش کرنے والا اس کے بازوؤں میں جھولا تو فوراً ہی اسے دوسرے کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ وہ شاید واش روم گیا ہوا تھا جب ہی ساری صورت حال سے بے خبر بہت مگن سا اس کی طرف چلا آیا۔ صفائی کرنے والے سیمسن کی بنا اطلاع آمد اور اپنے ساتھی کی بے ہوش حالت میں اس کے بازوؤں میں موجودگی نے اسے بری طرح ٹھٹکا دیا اور اس نے تیزی سے اپنے ہولسٹر میں سے ریوالور نکال کر اس کی طرف فائر جھونک دیا۔ معاذ بھی اس دوران حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے بلیچ ملے پانی سے بھری بالٹی کو اپنے پیر سے اتنی زوردار ٹھوکر ماری کہ بالٹی اڑتی ہوئی اس اہلکار کی طرف گئی۔ بالٹی سے پہلے بالٹی میں موجود پانی اس کے وجود سے ٹکرایا۔ بلیچ ملا پانی آنکھوں، ناک اور منہ میں داخل ہوا تو یقیناً شدید جلن کا سبب بنا۔ یہ عین وہ موقع تھا جب وہ لبلبی پر اپنی انگلی کا پورا دباؤ ڈال چکا تھا چنانچہ فائر ہوا لیکن نشانہ بہک گیا۔

اگلا لمحہ معاذ کے لیے تکلیف دہ تھا۔ گولی بے ہوش اہلکار کے بازو میں گھس گئی تھی اور اس کے جسم سے خون بہنا شروع ہو چکا تھا۔ اس نے ممکنہ احتیاط سے اس شخص کو نیچے لٹایا اور اس کے ساتھی کی طرف لپکا جو جلن کے باعث اپنی آنکھیں تو نہیں کھول پا رہا تھا لیکن مسلسل فائر کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چلائی ہوئی اندھی گولیاں اِدھر اُدھر دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں اور بند جگہ کی وجہ سے ہر فائر ایک دھماکے کے مانند محسوس ہو رہا تھا۔ خود کو فائر کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے معاذ فرش پر لڑھکتا ہوا اس تک پہنچا اور اس کی ٹانگ بازوؤں کی قینچی میں جکڑ کر اسے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اس کے لیے اسے بے ہوش کرنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ اس آخری بندے سے نمٹ کر وہ تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ باہر آگ لگنے کی وجہ سے کافی ابتری پھیلی ہوئی ہوگی۔ افراتفری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس بند جگہ پر جو کہ باہر سے بالکل کٹی ہوئی تھی، ہلکے ہلکے شور کی آوازیں پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور کوٹھریوں والی سمت بھاگا۔ روشن ماتھر نے جو اشارے دیے تھے ان سے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ تین نمبر کوٹھری میں قید ہے۔ اس نے اپنی گن سے سب سے پہلے اسی کوٹھری کے تالے کو نشانہ بنایا۔ تالا ٹوٹتے ہی لات مار کر دروازہ کھولا۔ روشن ماتھر فائر کی آواز پر ہی چونک گیا تھا اور اپنی تربیت کے تحت خود کو بچانے کے لیے دروازے کی ایک سائڈ پر چھپ گیا تھا لیکن دیوار میں نصب لمبی زنجیر نے معاذ کی اس تک راہنمائی کر دی۔

''ماتھر! سامنے آؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔'' بلند آواز میں یہ جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے ایک کوڈ نمبر بھی ادا کیا۔ یہ کوڈ نمبر ماتھر کے لیے اشارہ تھا کہ آنے والا واقعی اس کا ہمدرد اور نجات دہندہ ہے۔ وہ فوراً آڑ سے باہر نکل آیا۔ اس کے ایک پیر میں بیڑی پڑی ہوئی تھی جسے کھولنے کے لیے چابی درکار تھی۔

''کیا میں اس وطن دشمن کو آزادی دلوانے کے لیے اس کے پیر میں پڑی بیڑی کھولوں گا؟'' سامنے کھڑے روشن ماتھر کا چہرہ آزادی پالینے کے یقین کے تحت ہزار واٹ کے بلب کی طرح چمکنے لگا تھا اور معاذ کا دل خود سے یہ سوال کرتے ہوئے تاریکی میں ڈوبا جا رہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا اور اپنے ہاتھ میں موجود گن کا رخ روشن ماتھر کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔

دہشت سے اس کا چہرہ فق ہو گیا اور منہ چیخ مارنے کے انداز میں کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا، باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

''تو آپ ہیں ڈاکٹر ساجد؟'' انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

''جی ہاں۔ میں ہی ساجد ہوں۔'' میں نے پورے ادب کے ساتھ کہا۔

''خالدہ نے ذکر کیا تھا تمہارا۔'' انہوں نے پُرتکبر لہجے میں کہا تھا۔

''مگر اس نے تو کہا تھا کہ تمہاری والدہ آئیں گی؟'' انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''پتا نہیں اسے یہ غلط فہمی کیونکر ہوئی ..... جبکہ میں انہیں بتا چکا ہوں کہ میری والدہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''آپ اور خالدہ ایک ہی کلاس میں رہے؟'' انہوں

لفٹ

غلام قادر

ـض اوقات ایک ذرا سی ضد انسان کو کہاں سے کہاں
ـچادیتی ہے جس کا تصور بھی شاید وہ نہیں کرپاتا۔
الکل ایسے ہی اس نے بھی اسے حاصل کرلینے کی ضد
باندھی جس نے اسے کبھی ایک لمحے کی بھی لفٹ دینا
گوارا نہیں کی مگر.. تمام زندگی کا ساتھ اس نے
اپنے مقدر میں لکھوالیا۔

نے سوال کیا۔
''میں آپ کی بیٹی سے ایک سال سینئر ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔
''آپ نے اسے پروپوز کیا تھا؟'' انہوں نے سوال کیا۔
''مجھے اپنی اوقات کا اچھی طرح علم ہے۔'' میں نے کہا۔
''میں سمجھا نہیں۔'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''میرے والد مرحوم ایک ٹیچر تھے۔ پانچ برس میں موٹر سائیکل پر کالج جاتا رہا ہوں جس کے پیسے میں نے ٹیوشن دے کر جمع کیے تھے جبکہ آپ کی صاحبزادی آپ کی دی ہوئی مرسڈیز میں کالج آتی تھیں اور جب تک وہ کلاس میں ہوتی تھیں، آپ کا ڈرائیور ان کے انتظار میں ہوتا تھا۔ اس سے زیادہ جو بات ہے وہ یہ کہ میرا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں میرٹ کی بنیاد پر ہوا تھا لیکن آپ جیسے امیر آدمی نے اپنی بیٹی کے لیے میڈیکل کالج کی سیٹ خریدی تھی۔'' میں نے تفصیل سے انہیں سمجھایا کہ میں اپنی اوقات جانتا ہوں سے میرا کیا مقصد تھا۔
''تم نے بڑی خوبصورتی سے اپنی محنت اور مالی پوزیشن بتادی۔ اب میرے ایک سوال کا جواب بھی دے دو کہ ڈاکٹر تو تم بن گئے ہو، اب آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔
''میں نے پوسٹ گریجویشن کے لیے اپلائی کر دیا ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔
''کہاں اپلائی کیا ہے؟'' انہوں نے دوسرا سوال کیا۔
''نیو یارک یونیورسٹی میں کارڈیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں۔'' میں نے کہا۔
''کیا آپ اس کے اخراجات برداشت کر لیں گے؟'' حق صاحب نے سوال کیا۔
''شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اخراجات بہت زیادہ ہوں گے؟'' میں نے سوال کر دیا۔
''خالدہ نے بھی اپلائی کیا ہے لیکن میں اس کے اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔
''آپ یقینی طور پر برداشت کر سکتے ہوں گے کیونکہ آپ حق بلڈرز کے مالک ہیں اور خالدہ آپ کی صاحبزادی ہیں لیکن اخراجات تب برداشت کریں گے جب اس کا ایڈمیشن ہو جائے۔''
''تمہیں یقین ہے کہ تمہارا داخلہ ہو جائے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔
''میری فرسٹ پوزیشن ہے میڈیکل میں، اس لیے مجھے ایڈمیشن ملنے کا بھی یقین ہے اور اسکالرشپ ملنے کا بھی۔'' میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا۔

حق صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آیا اور گزر گیا۔
''میں تمہاری قابلیت اور محنت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔'' عبدالحق صاحب نے کہا۔ ''لیکن میرے پاس ایک دوسرا آپشن ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس پر بھی سنجیدگی سے غور کرو گے۔'' عبدالحق صاحب نے اپنی بات شروع کرنے سے پہلے تمہید باندھی۔ ''میرے نزدیک غربت کوئی برائی نہیں اور امیر ہونا بڑائی کی نشانی نہیں۔'' انہوں نے تمہید کو آگے بڑھایا۔
''میں تمہارے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اپنی بیٹی کے لیے تمہارا رشتہ منظور بھی کر سکتا ہوں، بس میری ایک چھوٹی سی شرط ہے۔''
''اور وہ شرط شاید یہ ہے کہ مجھے گھر داماد بننا پڑے گا؟'' میں نے کہا تو عبدالحق صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔
''تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟''
''آپ کی بیٹی نے۔'' میں نے جواب دینے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی اور وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔
''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تم نے خالدہ کو پروپوز نہیں کیا؟'' انہوں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔
''مجھے آپ کے پاس اسی نے بھیجا تھا اور یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ آپ یہ شرط رکھیں گے۔'' میں نے وضاحت کی۔
''تو اس نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ شرط ماننی ہے یا نہیں؟'' عبدالحق صاحب کا سوال تھا۔
''اس نے کہا تھا کہ کسی صورت میں یہ شرط قبول نہیں کرنا۔'' میں نے جواب دیا تو عبدالحق صاحب کی آنکھیں حیرت سے پھیل سی گئی تھیں۔
''تو کیا تمہارا فیصلہ وہی ہوگا جو خالدہ نے کہا تھا؟'' عبدالحق صاحب نے سوال کیا۔
''اس میں کیا شک ہے۔ ہر شریف آدمی اپنی بیوی کی بات مانتا ہے۔''
''لیکن خالدہ فی الحال تمہاری بیوی نہیں ہے۔'' انہوں نے مجھے جتایا۔
''آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کا ہونے والا داماد ابھی سے آپ کی بیٹی کی باتیں ماننے کی عادت ڈال رہا ہے۔'' میں نے کہا۔
''اگر تمہیں یہ شرط منظور نہیں تو میں بھی خالدہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔''
''وہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کا جو فیصلہ ہوگا، وہ اس کی بہتری کے لیے ہوگا۔'' میں نے کہا تو عبدالحق اپنی جگہ سے اٹھ گئے جیسے وہ مزید گفتگو کے لیے تیار نہ ہوں۔
میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا لیکن اسی وقت ڈرائنگ روم

کا پردہ ہلا اور اندر کی جانب سے خالدہ کی بہن ساجدہ کی جھلک نظر آئی۔ ساجدہ سے میری ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں جب وہ اپنی بہن کے ساتھ کالج آئی تھی۔

''پاپا! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟'' اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آپ بیٹھیں۔'' ساجدہ نے مجھ سے کہا اور میں گومگو کیفیت میں آ گیا۔ باپ کچھ کہہ رہا تھا اور بیٹی کچھ اور کہہ رہی تھی۔

''پاپا! جب آپ دیدی سے رات میں بات کر رہے تھے تو میں بھی سن رہی تھی۔''

''تمہیں اس طرح سننا نہیں چاہیے تھا۔'' عبدالحق نے بیٹی سے کہا۔

''مجھے دیدی مہینوں سے یہ باتیں بتاتی رہی تھیں۔'' ساجدہ نے کہا۔

''کیسی باتیں؟'' عبدالحق صاحب نے سوال کیا۔

''یہی کہ دیدی انہیں متوجہ کرنے کی مختلف کوششیں کرتی رہی تھیں لیکن کامیاب نہیں ہو سکیں۔'' ساجدہ نے کہا۔

''یہ صحیح کہہ رہی ہے؟'' مجھ سے سوال کیا گیا۔

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میرا جواب تھا۔

''میں نے ایسا کبھی محسوس نہیں کیا سوائے ایک بار کے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور وہ ایک بار کیا تھا؟'' انہوں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''خالدہ نے مجھے اپنی کار میں گھر چھوڑنے کی پیشکش کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اور تم نے انکار کر دیا؟'' عبدالحق صاحب نے وضاحت مانگی۔

''اس روز ٹھنڈ بہت تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

''خالدہ نے مجھ سے کہا تھا کہ ٹھنڈ بہت ہے۔ موٹر سائیکل پر جاؤ گے تو بیمار ہو جاؤ گے۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اور تم نے لفٹ لینے سے انکار کر دیا۔'' عبدالحق صاحب نے کہا۔

''پاپا! صرف انکار نہیں کیا بلکہ دیدی کو ایک طرح سے لیل بھی کیا۔'' ساجدہ نے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' عبدالحق صاحب پوچھے بنا نہیں رہ سکے۔

''انہوں نے کہا تھا۔'' امیر زادی! تمہیں شاید معلوم نہیں ہم غریب لوگ بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ یہ ہلکی پھلکی ٹھنڈ ہمیں بیمار نہیں کر سکتی اور اگر ہو بھی گئے تو دو دن لوٹ پوٹ کر صحیح ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگوں کی طرح نہیں کہ ہلکا سا بخار آ جائے تو ڈاکٹر گھر پر آ جاتا ہے اور اگر ٹھیک نہ ہوئے تو باہر ممالک کے اسپتال میں داخل ہو جاتے ہیں۔'' ساجدہ نے تقریباً وہی الفاظ دہرائے تھے جو میں نے کہے تھے۔

''یہ صحیح کہہ رہی ہے؟'' عبدالحق صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔

''کہہ تو ٹھیک رہی ہے لیکن یہ بات اسے کیسے معلوم ہوئی کیونکہ یہ تو وہاں نہیں تھی۔ اس وقت وہاں صرف میں اور خالدہ تھے۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے جب تم نے نہیں بتائی تو خالدہ ہی نے بتائی ہو گی۔'' عبدالحق صاحب نے کہا۔

''تمہیں اپنی غربت پر اتنا ناز کیوں ہے؟'' عبدالحق صاحب نے کہا۔

''آپ جسے غربت پر ناز کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ سے میں آج اس مقام پر ہوں کہ ایک ارب پتی بلڈر مجھ سے اپنی بیٹی کا ہاتھ دینے کی بات کر رہا ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تم نہیں سمجھتے کہ تم بدتمیزی کر رہے ہو۔'' عبدالحق صاحب نے تیکھے انداز میں کہا۔

''اگر آپ میرے لفظوں کو بدتمیزی سمجھے تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا لیکن ساجدہ نے میری بات بہتر طور پر آگے بڑھائی تھی۔

''پاپا! یہ ان کی خودداری ہے جو انہیں آسان راستہ چننے کے بجائے مشکل راستوں پر چلنے پر اکساتی ہے۔'' ساجدہ نے کہا۔

''اور اب تک ان مشکل راستوں پر چل کر کامیاب رہا ہوں۔'' میں نے ساجدہ کی بات آگے بڑھائی۔

''کبھی ان مشکل راستوں پر چلنے والے بڑا نقصان بھی اٹھا لیتے ہیں۔'' عبدالحق صاحب نے کہا۔

''میں جب تک نقصان نہیں اٹھا لیتا، اس راستے پر چلتا رہوں گا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''پاپا! اس خوددار شخص کو مایوس لوٹانا ہمارے لیے بہت بڑی غلطی ہو گی۔'' ساجدہ نے کہا۔

''تم یہ تو نہیں کہہ رہیں کہ میں خالدہ کے ساتھ اس کے بھی تعلیمی اخراجات برداشت کر لوں؟'' عبدالحق صاحب نے بیٹی سے سوال کیا۔

''کیا آپ کی دولت میں کوئی کمی آ جائے گی؟'' ساجدہ نے سوال کیا۔

''میں آپ سے کوئی مالی مدد نہیں چاہ رہا ہوں۔'' میں نے ان کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت

کرلو گے؟'' عبدالحق صاحب کا مخاطب میں تھا۔
''تعلیمی اخراجات کے لیے فورڈ فاؤنڈیشن سے ملنے والی اسکالر شپ کافی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''باقی اخراجات کے لیے چھوٹی سی کوئی نوکری کرلوں گا۔'' میں نے اپنے جواب کو آگے بڑھایا۔
''جب تم خالدہ کو پسند نہیں کرتے ہو تو اسے شریکِ حیات کیوں بنانا چاہتے ہو؟'' عبدالحق صاحب کا سوال تھا۔
''ایک بڑے آدمی نے کہا تھا کہ شادی اس سے نہیں کرنا چاہیے جسے تم چاہتے ہو بلکہ اس سے کرنا چاہیے جو تمہیں پسند کرتا ہو۔'' میں نے جواب دیا۔
''یہ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔'' ساجدہ نے پوری بات آگے بڑھائی۔
''ایک آخری سوال۔'' عبدالحق صاحب نے کہا۔
''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم میری نازوں پلی بیٹی کے اخراجات برداشت کرلو گے؟'' عبدالحق صاحب کا سوال تھا۔
''میں کارڈیالوجی میں پوسٹ گریجویشن کرنے جارہا ہوں۔'' میرا جواب تھا۔
''تو کیا اس کے بعد اس قابل ہو جاؤ گے کہ خالدہ اور اپنے گھر کے اخراجات اٹھالو گے؟'' عبدالحق صاحب کا سوال مجھ سے تھا لیکن جواب ساجدہ نے دیا تھا۔
''پاپا! آپ خود دل کے مریض ہیں اور یہ بات آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ کارڈیالوجسٹ کتنا کماتے ہیں۔'' اس نے کہا تو عبدالحق صاحب سوچ میں پڑ گئے۔
''باقی لوگوں سے تم چاہے جتنی فیس لو لیکن میرا علاج تمہیں مفت کرنا ہوگا۔'' عبدالحق صاحب نے کہا۔
ابھی ان کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ خالدہ کمرے میں آگئی۔ وہ پہلے ساجدہ سے گلے ملی اور پھر اپنے باپ کے گلے لگ گئی۔
''تھینک یو پاپا۔'' اس نے باپ کا شکریہ ادا کیا تھا۔
''میں بھی ہوں کمرے میں۔'' میں نے کہا تو خالدہ میری طرف آگئی۔
''تمہارا بھی شکریہ۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
''کس بات کا شکریہ؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''مجھے نہ جانے کتنی ہی بار محسوس ہوا تھا کہ ابھی تم اکھڑ جاؤ گے اور سب کچھ ختم ہو جائے گا۔'' خالدہ نے کہا تھا۔
''تمہاری بہن نے میری بہت مدد کی ہے۔'' میں نے ساجدہ کا شکریہ بھی ادا کیا۔
''ایک بات ہے دیدی!'' ساجدہ نے خالدہ کو مخاطب کیا۔
''وہ کیا؟'' خالدہ نے پوچھا۔
''آپ نے مجھے گلے لگایا۔ پاپا کے گلے لگیں لیکن......''
اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا مگر سب سمجھ گئے کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے کیونکہ ادھورے فقرے کا اختتام کرتے ہوئے اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔
''اس کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔'' خالدہ کے بجائے میں نے جواب دیا۔
اس کے بعد کی تفصیلات مختصر سی ہیں۔ عبدالحق صاحب کی فرمائش تھی کہ امریکا جانے سے پہلے ہمیں رشتے میں باندھ دیا جائے لیکن بات منگنی سے آگے نہ بڑھا۔
جس یونیورسٹی میں مجھے آسانی سے داخلہ مل گیا تھا، وہاں داخلے کے لیے خالدہ نے اپنے باپ کے تعلقات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے اپنے لیے گائنی کا شعبہ منتخب کیا تھا۔
جس روز ہماری منگنی ہوئی اس کے اگلے روز میں اور خالدہ امریکا کے لیے روانہ ہو گئے۔ ائرپورٹ پر خالدہ کے والد کے دوست ہمیں لینے آئے تھے۔ ان کے گھر میں خاصی گنجائش تھی۔ ان کی بیوی امریکن تھی اور نیوروسرجن تھی۔ ان کی ایک بیٹی تھی جس نے ماں باپ کی طرح ڈاکٹر بننا پسند نہیں کیا تھا اور وکیل بن گئی تھی۔ اس نے متعدد بار مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس میں کوئی انٹرسٹ نہیں تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ اس کے بوائے فرینڈز تھے جن میں سے اکثر گھر آتے تھے اور وہ اپنے والدین کی اجازت کے ساتھ ان کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی تھی۔
چار برس امریکا میں گزارنے کے بعد ہماری واپسی ہوئی۔ اس دوران ساجدہ کا رشتہ بھی عبدالحق صاحب نے طے کردیا تھا پھر دونوں بہنیں ایک دن ہی دلہن بنیں۔ عبدالحق صاحب نے دونوں بیٹیوں کو فرنشڈ مکان اور گاڑیاں دی تھیں۔
ایک فرق جو خالدہ میں امریکا جا کر آیا تھا کہ وہاں اس کی تمام توجہ تعلیم پر رہی تھی اور اسی وجہ سے وہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے میں کامیاب ہوئی تھی۔ شادی کی تقریب فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی تھی جس میں ہم دونوں کے کلاس فیلو آئے تھے اور وہیں خالدہ کی ایک کلاس فیلو نے انکشاف کیا کہ پہلے دن سے اس کی نظر تم پر تھی۔ وہ کہتی تھی چاہے کچھ بھی ہو جائے میں اسے حاصل کرکے رہوں گی اور دیکھ لیں اس نے آپ کو حاصل کر بھی لیا جبکہ پانچ برس آپ نے اسے کوئی لفٹ نہیں دی۔

⌘⌘⌘

مہربان آواز

فہمیدہ فرید

کچھ لمحات زندگی میں بہت قیمتی ہوتے ہیں جو ہاتھ میں ہوں تو بے معنی اور ہاتھ سے نکل جانے کے بعد انمول بن جاتے ہیں۔ وہ بھی گزرے پل کو ہر پل یاد کرکے ایک انجانی خوشی محسوس کرتا تھا مگر ساتھ ہی ایک کسک بھی اسے بے چین رکھتی تھی۔

ایک اجنبی مہربان کی سحر انگیز آواز کی جادوگری......

آپ کو یاد ہوگا ہمارے گھروں میں تار والا ٹیلیفون ہوتا یا باورچی خانے کی دیوار پر لٹکا ہوتا تھا جس سے متعلق یہ کہانی ہے اور مجھے اسے پڑھنا اچھا لگا۔

میں چھوٹا سا تھا جب میرے والد نے اپنے پڑوسی سے کہہ کر پہلا ٹیلیفون لگوایا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ بوسیدہ مگر پالش زدہ ٹیلیفون باورچی خانے کی دیوار پر اٹکایا گیا تھا جس پر اس کا چمک دار ریسیور دھرا تھا۔ میرا قد تب اتنا چھوٹا تھا کہ میں اس تک نہیں پہنچ پاتا تھا لیکن میری والدہ کسی سے گفتگو کر رہی

ہوتیں تو میں بہت شوق سے ان کی باتیں سنا کرتا تھا۔
یونہی ایک روز مجھے علم ہوا کہ اس حیرت انگیز آلے کے پیچھے ایک دلچسپ شخصیت ہے جس کا نام "انفارمیشن پلیز" تھا۔ ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ کسی کا بھی نمبر اور کال کا درست وقت بتا سکتی تھی۔
مجھے ذاتی طور پر اس کے "چراغ کے" جیسا تجربہ اس وقت ہوا جب میری والدہ ہمسائے میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ میں گھر کی نچلی منزل میں کھیل رہا تھا جب ٹول بکس اٹھاتے وقت ہتھوڑا میرے ہاتھ پر آن لگا۔ میری انگلی زخمی ہوگئی تھی اور مجھے شدید درد ہونے لگا لیکن رونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ گھر پر تسلی دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں اپنی سنسناتی ہوئی انگلی کو چوستے ہوئے گھر میں اِدھر اُدھر چکرانے لگا اور بالآخر سیڑھی کے پاس پہنچ کر رک گیا جس کے اوپر ٹیلیفون ٹنگا تھا۔
میں بھاگ کر بیٹھک سے تپائی اٹھا لایا اور اس پر چڑھ کر ٹیلیفون کے ریسیور تک رسائی حاصل کرلی۔
"مہربانی فرما کر معلومات فراہم کیجیے۔" میں نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔
کلک کی ایک دو آوازوں کے بعد میں نے ایک صاف آواز سنی۔ "معلومات۔"
"میری انگلی زخمی ہوگئی ہے اور مجھے درد ہو رہا ہے۔" میں فون پر رو پڑا۔ میری آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے کیونکہ مجھے سامع مل چکا تھا۔
"کیا تمہاری والدہ گھر پر نہیں ہیں؟" سوال ہوا۔
"گھر پر میرے علاوہ کوئی نہیں۔" میں بلبلا اٹھا۔
"کیا انگلی سے خون بہہ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میری انگلی پر ہتھوڑا لگا ہے اور بہت درد ہو رہا ہے۔"
"کیا آپ آئس باکس کھول سکتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
میں نے اثبات میں جواب دیا۔
"چلیں پھر برف کا ایک چھوٹا ٹکڑا لے کر اسے اپنی انگلی پر رکھیں۔"
اس دن کے بعد میں "انفارمیشن" کو ہر کام کے لیے فون کرنے لگا۔ میں نے اس سے جغرافیہ میں مدد لی۔ اسی نے مجھے بتایا فلاڈیلفیا کہاں ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ریاضی میں میری مدد کی۔
اس نے مجھے میری پالتو گلہری "چپمانک" کے بارے میں بتایا کہ اس کی خوراک پھل اور خشک میوہ جات ہیں۔ اس دھاری دار گلہری کو میں نے ایک دن پہلے ہی پارک [illegible] پکڑا تھا۔

جب میری پالتو زرد (گانے والی) چڑیا "پیٹے" مرگئی تب بھی میں نے "انفارمیشن" کو فون کرکے اسے یہ افسوسناک خبر سنائی۔ اس نے سارا ماجرا جان کر وہی باتیں کیں جو عموماً بڑی عمر کے لوگ کسی بچے کو پُرسکون کرنے کے لیے کہتے ہیں مگر وہ میرے زخموں پر پھاہے نہ رکھ سکیں۔ میں نے اس سے پوچھا جو پرندے اتنا خوبصورت چہچہاتے ہیں، ہمارے گھر کو اپنی سریلی آواز سے بھر دیتے ہیں، ان کا مدفن پنجرے میں اپنے پروں کے پیچھے کیوں بن جاتا ہے؟ تب جا کر اسے میرے حقیقی تاسف کا صحیح اندازہ ہوا۔ اس نے چپکے سے کہا۔
"وین! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اس دنیا کے بعد بھی اک جہاں اور ہے جہاں ان کے گانے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مرنے کے بعد ہم بھی وہیں رہیں گے۔"
جانے کیوں میں نے یہ الفاظ سن کر خود کو بہتر محسوس کیا۔ ایک دن میں نے اسے ٹیلیفون کیا۔ "انفارمیشن پلیز۔"
"معلومات لیجیے۔" وہ مخصوص آواز میں بولی۔
"اپنے حروفِ تہجی کیسے ٹھیک کروں؟" میں نے پوچھا۔
یہ سب بحرالکاہل کے شمال مغربی قصبے میں ہوا۔ اس وقت میں نو سال کا تھا جب ہم وہی علاقے سے بوسٹن منتقل ہوگئے۔ مجھے اپنی "انفارمیشن" والی دوست اکثر یاد آتی تھی۔
"انفارمیشن پلیز" میرے لیے چراغ کا ایسا جن تھا جو پرانے گھر میں لکڑی کے ایک ڈبے کی یادوں میں قید تھا۔ تاہم میں نے بیٹھک کی میز پر رکھے نئے چمکدار فون پر رابطے کی کوشش کرنے کا کبھی نہیں سوچا۔ جب میں جوانی کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا تب بھی بچپن کی ان یادوں نے مجھے کبھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ الجھن اور پریشانی کے لمحات میں مجھے اکثر "انفارمیشن پلیز" یاد آجاتی جس کے پاس میری ہر مشکل کا حل ہوا کرتا تھا۔ میں اس ہمدرد خاتون کے صبر و تحمل اور سمجھداری کا معترف تھا جو گھنٹوں اپنا وقت ایک چھوٹے سے لڑکے پر صرف کرتی تھی۔
چند برس بعد کالج کے کسی کام سے مغربی سمت جاتے ہوئے میرا طیارہ سیئاٹل اترا۔ مجھے تقریباً آدھ گھنٹے بعد دوسری پرواز لینا تھی۔ میں نے اپنی بہن سے فون پر کم و بیش پندرہ منٹ بات کی، جو تب وہیں رہتی تھی۔ پھر اچانک بنا سوچے سمجھے میں نے اپنے آبائی قصبے کے آپریٹر کو کال ملائی۔ "انفارمیشن پلیز۔"
معجزاتی طور پر وہی باریک چھنی ہوئی آواز میری سماعتوں میں اتری جس سے میں خوب اچھی طرح واقف تھا۔
"معلومات لیجیے۔"
میں نے کسی پیش بندی کے بغیر خود کو کہتے پایا۔ "ازراہِ کرم کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ ہجے ٹھیک کیسے کیے جاسکتے ہیں؟"

دوسری طرف سے کچھ دیر کے لیے سکوت چھا گیا۔ پھر اسی مخصوص نرمی سے جواب آیا۔ ”مجھے لگتا ہے اب تک آپ کی انگلی ٹھیک ہو چکی ہوگی۔“

میں ہنس پڑا۔ ”تو یہ واقعتاً آپ ہی ہیں۔ کاش آپ کو احساس ہو پاتا کہ اس وقت آپ میرے لیے کتنی اہمیت رکھتی تھیں؟“

”میں خود حیران ہوں۔ آپ کی کال میرے لیے بھی بہت اہمیت کی حامل تھی۔ میرے اپنے بچے نہیں تھے، اس لیے میں آپ کی کال کی منتظر رہتی تھی۔“

میں نے اسے بتایا گئے برسوں کے دوران میں نے کئی بار اس کے بارے میں سوچا۔ میں نے اس سے یہ کہہ کر اجازت چاہی کہ کچھ دن تک اپنی بہن سے ملنے آؤں گا تو کیا میں دوبارہ فون کرسکتا ہوں۔

”ضرور!“ اس نے کہا۔ ”میرا نام سیلی ہے۔ کسی بھی آپریٹر کو کہہ کر مجھے بلوا لینا۔“

تین ماہ بعد میں سیاٹل واپس آیا اور اپنے علاقے کے آپریٹر کا نمبر ملایا۔

ایک مختلف آواز نے جواب دیا۔ ”انفارمیشن پلیز۔“

میں نے سیلی کے بارے میں پوچھا۔

”کیا تم اس کے دوست ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں میں اس کا بہت پرانا دوست ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس نے بتایا۔ ”مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ سیلی پچھلے کچھ سالوں سے پارٹ ٹائم کام کر رہی تھی۔ وہ بیمار تھی اور پانچ ہفتے پہلے اس کی موت واقع ہوئی ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں ریسیور رکھتا، آپریٹر نے کہا۔ ”ایک منٹ کیا آپ کا نام وین ہے؟“

”جی ہاں میں وین ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ اچھا، سیلی نے آپ کے لیے ایک پیغام چھوڑا تھا۔ رکیں میں آپ کو پڑھ کر سناتی ہوں۔“

پیغام میں لکھا تھا....

”اسے بتانا کہ گنگنانے کے لیے اک جہاں اور ہے۔ وہ سمجھ جائے گا کہ میرا کیا مطلب تھا۔“

میں نے آپریٹر کا شکریہ ادا کر کے فون رکھ دیا۔ میں جانتا تھا سیلی کی بات کا مطلب کیا تھا۔

کبھی بھی دوسروں پر پڑنے والے اپنے تاثر کو حقیر نہ جانیں۔ ہوسکتا ہے آپ نے کبھی کسی کی زندگی کو متاثر کر دیا ہو؟

ꕤꕤꕤ

مشیتِ ایزدی

ملک صفدر حیات

محبت کی پگڈنڈیوں پر چلنے والے پیر جب سنگ ریزوں پر پڑتے ہیں تو یقیناً کچھ انہونی جنم لیتی ہے۔ وہ بھی بہت معصوم بہت کھرا انسان تھا مگر حالات نے اسے ایک ایسی دلدل میں دھکیل دیا تھا جس میں سے نکلنے کی تگ و دو اسے مزید زمین میں دھنساتی جارہی تھی حتیٰ کہ اس کے اندر جینے اور سنبھلنے کی خواہش نے ہی دم توڑ دیا کیونکہ رائی سے پہاڑ بن جانے والی بات نے ظالم کو کچھ یوں شہ دی کہ مظلوم بالآخر سراپا انتقام بن گیا اور پھر ملک صفدر جیسے قانون کے رکھوالے بھی اس مجرم کی بے بسی پر حیران رہ گئے۔

ظلم کی چکی میں پسنے والے ایک بے گناہ

انسان کی دلگیر تباہی کا منظر

موضع ظفر گڑھ میں ہونے والی انہونی نے ہر پیرو جواں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ظفر گڑھ کے آلے دوالے کے گاؤں دیہات کوٹ ضامن، کنگن پور اور ایوب نگر میں بھی جس نے اس ناقابل یقین واقعے کے بارے میں سنا، دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ روزِ روشن کی طرح واضح حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ رات کوئی نامعلوم شخص چودھری فیروز کی ایک ٹانگ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا......!

وہ ماہِ جنوری کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ شب خون مارنے والے نے بڑے تہور کا مظاہرہ کیا تھا۔ چودھری فیروز، ظفر گڑھ کی آن، بان اور شان تھا۔ اس کا رعب و دبدبہ دور دور تک مشہور تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ چودھری کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی کرے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ایسی جرأت بھی دکھا سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہونے والی بات ہو چکی تھی۔ کسی کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

ظفر گڑھ میرے تھانے سے محض دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ اس تھانے میں میری تعیناتی کو ابھی صرف تین ماہ ہی ہوئے تھے۔ ایک ٹھنڈی ٹھار صبح میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو یہی خبر میری منتظر تھی۔ میں نے اطلاع کنندگان کو فوراً اپنے پاس بلالیا۔

وہ دو افراد تھے جن میں ایک چودھری فیروز کا بڑا بیٹا چودھری اکرام اور دوسرا اس کا ایک نوکر شوکت تھا۔ چودھری اکرام نے مجھے اس سانحے کے بارے میں بتایا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''چودھری صاحب اس وقت کہاں ہیں؟''

''انہیں ہم رات ہی کو سمندری کے جنرل اسپتال لے گئے تھے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''اباجی کی ٹانگ میں سے خون کسی فوارے کی طرح خارج ہو رہا تھا۔ ہمیں اور کچھ نہیں سوجھا تو فی الفور انہیں تانگے میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ چھوٹا بھائی چودھری انعام اباجی کے پاس ہی ہے۔ میں بھی رات بھر ادھر ہی تھا۔ اباجی نے اصرار کیا کہ اس واقعے کی رپورٹ درج کرانا ضروری ہے۔ انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''چودھری صاحب ایک دانا و بینا انسان ہیں۔'' میں

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک اتفاق ہے کہ ابھی تک میری ان سے ملاقات نہیں ہوسکی لیکن میں نے ان کی دانش مندی اور بردباری کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ خیر......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''حملہ آور کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ابا جی نے بس اتنا ہی بتایا ہے کہ حملہ آور تین افراد تھے اور انہوں نے پیشہ ور ڈاکوؤں کی طرح ڈھاٹے لگا رکھے تھے۔ ابا جی کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہم نے زیادہ کریدا نہیں۔''

''یہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا۔'' میں نے تعریفی نظر سے چودھری اکرام کی طرف دیکھا۔ ''جو بھی پوچھنا ہے، اب میں ہی ان سے پوچھوں گا۔''

چودھری اکرام کی عمر بیس سال کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں نظر آرہی تھیں مگر مزاجاً وہ ٹھنڈی طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔

''تو میں سمجھ لوں کہ آپ نے اس واقعے کی رپورٹ درج کرلی ہے؟'' اس نے بوجھل لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں..... ابتدائی رپورٹ درج ہوگئی ہے جسے کچی ایف آئی آر بھی کہتے ہیں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''پکی رپورٹ میں چودھری صاحب کا بیان لینے کے بعد تیار کردوں گا۔''

''آپ ابا جی کا بیان لینے کب اسپتال جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''ادھر اسپتال والوں نے ہمارے اثر رسوخ کی بنا پر ابا جی کا علاج تو شروع کردیا ہے لیکن وہ پولیس کی رپورٹ مانگ رہے تھے......!''

''میں ابھی سمندری کے جنرل اسپتال روانہ ہو رہا ہوں۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اسپتال والوں کا مطالبہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اس نوعیت کے معاملات میں پولیس کی رپورٹ کے بغیر انہیں کسی کا بھی علاج کرنے کی قانوناً اجازت نہیں ہوتی۔''

''تو پھر آپ مجھے اجازت دیں۔'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''میں حویلی جارہا ہوں تاکہ امی جی کو سنبھال سکوں۔ اس واقعے نے امی جی کی حالت خراب کردی ہے۔''

''اکرام! تمہیں یاد سے ایک کام کرنا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، آپ حکم کریں......'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''جس کمرے میں یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے وہاں کی کسی شے کو اِدھر اُدھر نہیں کرنا بلکہ مذکورہ کمرے کا دروازہ اور تمام کھڑکیاں بند کروا دیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں اسپتال سے سیدھا حویلی آؤں گا۔ وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کرنا بھی ضروری ہے۔''

''ہم نے صرف ابا جی کو پلنگ سے اٹھایا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''باقی سب کچھ جوں کا توں ہے۔''

''میرے آنے تک وہ سب کچھ جوں کا توں ہی رہنا چاہیے۔'' میں نے چودھری اکرام کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم میری بات سمجھ رہے ہونا......؟''

''سمجھ گیا تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایات کا خاص خیال رکھوں گا۔''

چودھری اکرام کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل امجد علی کو اپنے ساتھ لیا اور اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

میرا تھانہ تحصیل سمندری، ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا ایک دور دراز علاقہ تھا۔ ظفر گڑھ کے علاوہ ایوب نگر، کنگن پور، کوٹ ضامن، نصیر آباد اور کرماں والا نامی گاؤں بھی میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے تاہم فی الحال مجھے ظفر گڑھ کا مسئلہ درپیش تھا جہاں کے باجبروت چودھری فیروز کی ایک ٹانگ کاٹ کر کوئی اپنے ساتھ لے گیا تھا اور چودھری زخمی حالت میں سمندری کے جنرل اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔

جب میں چودھری فیروز کے پاس پہنچا تو وہ اسپتال کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے فوری طبی امداد دے دی گئی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی بائیں ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے غائب تھی۔ اسپتال والوں نے نہایت ہی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے باقی ماندہ ٹانگ پر اطمینان بخش پٹی کردی تھی۔ چودھری کے بیڈ کے نزدیک ہی اس کا چھوٹا بیٹا انعام ایک چوبی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انعام اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

میں چودھری فیروز کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کا حال چال دریافت کیا تو وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ مجھے

دیکھنے آئے۔ میں نے پچھلے دنوں کئی بار ارادہ کیا کہ آپ سے ملاقات کرنے تھانے جاؤں مگر ہر بار کسی ضروری کام نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی۔ شاید قدرت کو ہماری ملاقات اسی حال میں منظور تھی......" لمحاتی توقف کرکے اس نے حسرت بھرے انداز میں اپنی ادھوری ٹانگ کو دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جان بچ گئی......!"

"حملہ آور جو کوئی بھی تھا وہ آپ کی جان کا دشمن نہیں تھا چودھری صاحب، ورنہ ٹانگ کاٹنے پر اکتفا نہ کرتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جانی دشمن بھلا جان لیے بغیر کہاں ٹلتے ہیں؟ باقی جہاں تک ہماری ملاقات کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں، میں آپ سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ میں نے بھی کئی بار آپ کی حویلی یاترا کے بارے میں سوچا لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے تین ماہ پہلے ہی اس تھانے کا چارج سنبھالا ہے۔ سابق انچارج صاحب کئی ایک کام ادھورے چھوڑ گئے ہیں، بس انہی میں سر کھپا رہا ہوں۔ آپ کی طرف آنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔"

میں چودھری سے وقوعہ کے بارے میں کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ ڈاکٹر وہاں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے سلام دعا کرنے کے بعد چودھری فیروز کا تفصیلی معائنہ کیا پھر تسلی بھرے لہجے میں بولا۔

"پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب۔ آپ کو مزید ایک دن اسپتال میں رہنا ہوگا۔ کل ہم دوبارہ آپ کے زخم کا جائزہ لینے کے بعد پکی پٹی کردیں گے۔ موسم ٹھنڈا ہے اس لیے زخم کے خراب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہفتے میں ایک بار اسپتال آکر پٹی کروالیا کریں۔ انشاء اللہ مہینے بھر میں آپ کا زخم ٹھیک ہوجائے گا۔ میں جو دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں وہ آپ نے نہایت پابندی کے ساتھ کھانا ہیں......" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"ملک صاحب! میں مانتا ہوں کہ یہ ایک پولیس کیس ہے لیکن رات کو دو بجے چودھری صاحب کو یہاں لایا گیا تھا اور ان کی حالت ایسی تھی کہ اگر اس واقعے کی ایف آئی آر کے اندراج کا انتظار کیا جاتا تو چودھری صاحب کی زندگی کو کوئی بھی خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ میں سے خون بڑی تیزی سے نکل رہا تھا۔ آپ ہماری مجبوری کو سمجھ سکتے ہیں......!"

"کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ڈاکٹر صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "آپ نے جو بھی کیا، خوب کیا۔ تمام قانون اور قاعدے انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں لہٰذا یہ انسان سے زیادہ اہم نہیں ہوسکتے۔ جب کسی انسان کی جان بچانے کے لیے حرام چیز کا استعمال بھی حلال قرار پاتا ہے تو یہ چھوٹی موٹی قانونی بے قاعدگیاں کیا معنی رکھتی ہیں؟ انسان اور انسانیت کی تقدیم ضروری ہے۔ باقی سب کچھ اس کے بعد......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

"میں ذرا چودھری صاحب سے ضروری پوچھ تاچھ کرلوں پھر فارغ ہوکر آپ کے پاس آتا ہوں تاکہ اگر کسی کاغذی کارروائی کی ضرورت ہو تو اسے پورا کرلیا جائے۔"

ڈاکٹر نے میرا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگیا۔

میں نے چودھری فیروز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب! اگر آپ کو بات چیت میں کوئی دقت یا دشواری محسوس نہ ہو رہی ہو تو میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ملک صاحب......" وہ ہمت دکھاتے ہوئے بولا۔ "آپ پوچھیں، جو بھی پوچھنا ہے۔"

"مگر...... میں آپ سے بالکل علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "امجد! تم باہر جاکر بیٹھو۔" میں نے اپنے کانسٹیبل سے کہا پھر چودھری انعام کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اور تم بھی برخوردار......!"

"میں اباجی کی اولاد ہوں۔ ان کا سگا بیٹا ہوں۔" چودھری انعام نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ "مجھ سے کیا پردہ؟"

"انعام!" چودھری فیروز نے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ملک صاحب جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو۔"

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے طوعاً و کرہاً کمرے سے نکل گیا۔ امجد اس سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ میں چودھری فیروز کی جانب متوجہ ہوگیا اور سرسری انداز میں کہا۔

"چودھری صاحب! میں آج صبح تھانے میں چودھری اکرام سے مل چکا ہوں اور ابھی چودھری انعام کا موڈ بھی دیکھ لیا۔ آپ کے دونوں بیٹوں کی فطرت اور مزاج میں زمین آسمان کا تفاوت ہے۔ اکرام پانی ہے اور انعام آگ...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں خود انعام کی وجہ سے فکرمند رہتا ہوں۔ یہ بڑی غصیلی طبیعت کا مالک ہے۔ ہر وقت لڑنے اور مارنے مرنے پر تلا رہتا ہے۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں، ایسے جذباتی اور جلد باز پستہ قامت

لوگوں کی مت گٹوں (ٹخنوں) میں بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی عقل سے کام ہی نہیں لیتے......!''

''جذباتی ہونا کوئی بری بات نہیں چودھری صاحب!'' میں نے کہا۔ ''یہ تو انسان کے زندہ ہونے کی دلیل ہے۔ بس جذبات پر قابو ہونا ضروری ہے۔''

چودھری فیروز نے انعام کو پستہ قامت اس لیے کہا تھا کہ اکرام کی بہ نسبت اس کا قد کافی کم تھا اور یہ اکرام کی طرح دبلا پتلا بھی نہیں بلکہ بھرے بھرے بدن کا مالک تھا تاہم گٹوں میں مت بیٹھ جانے والا محاورہ اس نے غلط بول دیا تھا۔ دراصل حد سے زیادہ طویل القامت ''لم ڈھینگ'' ٹائپ افراد کے لیے بولا جاتا ہے کہ ان کی عقل کھوپڑی میں نہیں، گٹوں میں ہوتی ہے۔

''بس جی، اللہ ہی انعام کو ہدایت دے......!'' چودھری نے میری بات کے جواب میں کہا۔ ''وہ اٹھتے بیٹھتے بس ایک ہی بات کر رہا ہے کہ کسی طرح اس بندے کا پتا چل جائے جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے پھر وہ اس بدبخت کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دے گا۔''

''چودھری صاحب! اللہ کا شکر کہ آپ زندہ سلامت ہیں۔'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ اس واقعے کو معمولی نہ سمجھیں۔ کوئی شخص آپ کی حویلی میں گھس کر آپ کی ٹانگ کاٹ لے گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بندہ آپ سے شدید نوعیت کی نفرت کرتا ہے۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے؟''

''یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ملک صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تو اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے کمرے میں تین افراد کو دیکھا۔ انہوں نے ڈھاٹوں سے اپنے چہروں کو چھپا رکھا تھا۔ دو کے ہاتھوں میں مجھے دونالی بندوقیں دکھائی دیں جبکہ تیسرے نے تیز دھار والا ایک خطرناک بُغدا پکڑ رکھا تھا، جیسا کہ قصابوں کے پاس ہوتا ہے جس سے وہ گوشت کا قیمہ بناتے ہیں۔ میرا خیال ہے اسی بُغدے کی مدد سے ان ظالموں نے میری ٹانگ کاٹی ہے......''

بات ختم کر کے چودھری نے ایک جھرجھری لی پھر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''آپ کا خیال کیوں ہے؟ آپ یقین سے کیوں نہیں کہہ رہے کہ ان لوگوں نے بُغدے ہی سے آپ کی ٹانگ کاٹی ہے؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔'' چودھری فیروز وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری جیسے ہی ان پر نگاہ پڑی، انہوں نے مجھے بالکل اندھا اور گونگا بنا دیا تھا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں چودھری صاحب......'' میں نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ ''ان لوگوں کے پاس ایسا کون سا جادو تھا کہ آپ دیکھنے اور بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے؟''

''وہ کوئی جادو نہیں بلکہ تکیے کے غلاف کی طرح کا ایک تھیلا تھا جس کے ایک سرے پر شلوار کے جیسا نیفا بنا ہوا تھا اور اس نیفے کے اندر ڈوری بھی ڈلی ہوئی تھی۔'' اس نے سمجھانے والے انداز میں بتایا۔ ''بس انہوں نے آناً فاناً وہ غلاف میرے سر پر چڑھایا اور اس کی ڈوری کو کس کر میرے حلق پر باندھ دیا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر دباد... اس کے بعد انہوں نے بڑی بے دردی سے بُغدہ استعمال کر کے میری ٹانگ کاٹی اور...... یہ جا، وہ جا!''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''کیا آپ اس کمرے میں اکیلے ہی سو رہے تھے۔ میرا مطلب ہے...... آپ کی اہلیہ کہاں تھیں؟''

''کبریٰ سے آج کل میری ان بن چل رہی ہے۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اسی وجہ سے ہماری خوابگاہیں بھی الگ ہو گئی ہیں۔''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''ٹھیک ہے کہ آپ ان تین حملہ آور افراد کے چہرے نہیں دیکھ سکے۔ ان لوگوں نے آپ کی قوتِ گویائی پر پہرے بٹھا دیے تھے لیکن آپ کے کان تو کھلے تھے۔ کیا اس دوران میں آپ نے انہیں آپس میں بات چیت کرتے سنا؟''

''ہاں، وہ ایک دوسرے سے بات تو کر رہے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ان لمحات میں تکلیف کی جس شدت سے گزر رہا تھا، اس نے مجھے ان کی طرف دھیان نہیں دینے دیا مگر......!''

وہ یکایک بولتے بولتے رک گیا اور الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

''مگر کیا چودھری صاحب؟ آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئے......؟''

''ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان تینوں میں۔

ایک کی آواز میری جانی پہچانی تھی......''

''جانی پہچانی آواز کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہیں۔'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے بتائیں آپ کا شک کس پر ہے۔ اس وقت ہم مکمل اندھیرے میں کھڑے ہیں چودھری صاحب۔ آپ روشنی کی کرن دکھائیں گے تو یہ تاریکی چھٹے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔''

''اگر میں غلط نہیں تو وہ ماجھا تھا......!'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''کون ماجھا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''ایک مفرور قیدی......'' وہ خوابناک انداز میں بولا۔ ''اس کا اصل نام معراج دین ہے لیکن سب اسے ''ماجھا'' ہی کہتے ہیں۔ وہ ظفر گڑھ ہی کا وسنیک تھا۔ دو سال پہلے اس نے گاؤں کے ایک بندے نیاز احمد کو قتل کر دیا تھا اور عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی تھی۔''

''جب ماجھا جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے تو پھر وہ ''مفرور قیدی'' کیسے ہوا چودھری صاحب؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ عرصہ پہلے سننے میں آیا تھا کہ ماجھا جیل سے رار ہو گیا ہے۔'' اس نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''میری معلومات کے مطابق ماجھا جیل میں شدید بیمار پڑ گیا تھا اور جیل کی ڈسپنسری میں اس کا علاج ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا اسے کڑی نگرانی میں جیل سے شہر کے اسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن راستے میں ماجھا کے حمایتی خیر خواہوں نے ن کے تانگے پر حملہ کیا اور سرکاری اہلکاروں کو زیر کرنے ے بعد وہ لوگ ماجھا کو چھڑا لے گئے۔ قانون نے ماجھا کو ش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ ایک اہ یہ بھی ہے کہ ماجھا نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں دلیت اختیار کر لی ہے......''

''ہوں......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ چودھری فیروز کے چہرے پر نگاہ جما کر سوال ا۔ ''چودھری صاحب! اگر یہ کہانی صد فیصد درست بھی ہو تو آپ کو بہ خوبی اندازہ ہونا چاہیے کہ ایک ڈاکو کی زندگی ارنے والے ماجھے نے آپ کی حویلی کو کیوں نشانہ بنایا؟ نے آپ کو نمونۂ عبرت بنا کر کون سی دشمنی نکالی ہے......؟''

میرے اس سنسنی خیز استفسار نے چودھری کے ے پر زلزلے کے آثار پیدا کیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ماجھے کے حوالے سے اس کے ذہن میں اچھا خاصا مواد موجود تھا۔

''میرا ذہن تو نیاز احمد کی طرف ہی جا رہا ہے ملک صاحب!'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ''ماجھا ایک خر دماغ انسان ہے۔ دل میں بے پناہ غل و غش رکھنے والا۔ یہ اس کی کدورت کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔''

چودھری فیروز کوئی بھی بات یقین کے ساتھ نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز پر شک گزرا لیکن میں نے اپنی سوچ کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور کریدنے والے انداز میں کہا۔

''آپ کا ذہن نیاز احمد کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ نیاز کا آپ سے ایسا کیا ناتا ہے کہ ماجھا کو یہ تنفر آمیز قدم اٹھانا پڑا؟''

''نیاز احمد میرا بندہ تھا ملک صاحب......'' وہ ایک بوجھل سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''ماجھا اور نیاز میں ادھر کھیتوں میں کام کرتے ہوئے ٹھکا فضیحتی ہو گئی تھی اور ماجھے نے طیش میں آ کر نیاز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب ماجھا کو گرفتار کیا گیا تو وہ مجھ سے یہ توقع کر رہا تھا کہ میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا لیکن میں نے حق کا ساتھ دیا۔ اس طرح ماجھا عدالت سے عمر قید کی سزا پا کر جیل چلا گیا تھا۔ بس یہی ایک نکتہ ہے کہ ماجھا اپنے دل و دماغ میں میرے لیے انتقامی سوچ رکھ سکتا ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے ملک صاحب جو کہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میں آپ سے چھپانا نہیں چاہتا تھا اس لیے سب بتا دیا......''

چودھری فیروز نے مجھے جو معلومات فراہم کیں اس کے پیچھے اس کے کیا مقاصد کارفرما تھے، مجھے اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کیونکہ نیت کا حال اور دل کا احوال صرف خدا جانتا ہے۔ بہرحال اس گفتگو سے مجھے سوچنے کے لیے ایک راستہ مل گیا تھا۔ میرے دماغ میں ایسی کھڑکی کھل گئی تھی جس سے جھانک کر میں حقیقت تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکتا تھا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں چودھری صاحب!'' میں نے تشفی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں بہت جلد حقائق کی تہ میں اتر کر اس معمے کو حل کر لوں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ آپ کے ساتھ زیادتی کرنے والا چاہے ماجھا ہو یا کوئی اور...... وہ قانون کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔''

جس طرح چودھری فیروز نے گھما پھرا کر بات کی تھی، میں نے بھی ویسے ہی اسے گھمن گھیریوں میں ڈال دیا تھا۔ اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! میں ایک وقیع اور خاندانی شخص

ہوں۔ گزشتہ کئی پشتوں سے ہمارا خاندان ظفر گڑھ پر راج کررہا ہے۔ اس گاؤں کا نام میرے دادا چودھری ظفر کے نام پر ہے۔ ظفر گڑھ اور اس سے باہر بھی ہر کوئی ہمارا احترام کرتا ہے۔ آج تک کسی کی اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ ٹیڑھی آنکھ سے ہماری طرف دیکھے اور...... اس نامراد نے میری حویلی میں گھس کر یہ قیامت ڈھائی ہے...... آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ وہ خبیث جب بھی آپ کے ہتھے چڑھے گا تو آپ اسے میرے حوالے کریں گے...... میں اس ذلیل انسان کو ایسی دردناک موت سے ہمکنار کروں گا کہ رہتی دنیا تک لوگ اس کے حشر کو یاد رکھیں گے اور...... اس سے عبرت پکڑیں گے......!''

میں چونکہ اس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا تھا اس لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ اپنے دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں۔ اس وقت آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس ظالم کو بہت جلد اپنی گرفت میں لے لوں گا پھر وہ بدبخت قرار واقعی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں اسے تسلی تشفی دے کر سمندری کے جنرل اسپتال سے نکل آیا۔

☆☆☆

وہ ایک کشادہ خواب گاہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کمرے کی پیمائش پندرہ بائی پندرہ فٹ رہی ہوگی۔ کمرے کے وسط میں ایک کنگ سائز پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر موسم کی مناسبت سے گرم بستر موجود تھا۔ مذکورہ بستر کے بیشتر حصے خون آلود تھے۔ پلنگ کے پہلو میں کمرے کے فرش پر بھی خون پھیلا ہوا تھا اور اسی خون میں مجھے ایک چوبی منڈھی (مڈی) بھی پڑی دکھائی دی جس کی بالائی سطح پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ چودھری فیروز کی بائیں ٹانگ کو اسی منڈھی (درخت کے تنے کا وہ گول حصہ، قصاب جس پر گوشت کو رکھ کر کاٹتے ہیں اسے منڈھی یا مڈی یا کٹنگ بورڈ بھی کہا جاتا ہے) پر رکھ کر بُغدے کی مدد سے کاٹا گیا تھا۔ بعدازاں حملہ آور چودھری کو کٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ بستر پر پھینک کر وہاں سے چلے گئے تھے۔

مذکورہ کمرے میں دو دروازے اور ایک بڑے سائز کی کھڑکی تھی۔ ایک دروازہ حویلی کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا جسے چودھری نے اندر سے بند کر رکھا تھا جبکہ دوسرے دروازے کے سامنے حویلی کا کشادہ صحن تھا۔ اسی دروازے والی دیوار میں سابق الذکر کھڑکی بھی تھی۔ اس کھڑکی کے تمام پٹ اندر سے بند تھے تاہم صحن کی جانب کھلنے والے دروازے کو باہر سے بند گیا تھا اور یہ کام چودھری اکرام نے میری ہدایت پر کیا تھ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ حملہ آور اسی دروازے گزرنے کے بعد چودھری فیروز تک پہنچے تھے۔ گویا حملہ آور کو اس امر کا بہ خوبی علم تھا کہ ان دنوں چودھری فیروز اس کمر میں سویا کرتا تھا اور...... میرے نزدیک یہ ایک اہم نکتہ تھا.. نہایت ہی قابلِ غور اور توجہ طلب۔

حملہ آوروں نے بڑی باریک بینی سے منصوبہ بندی تھی ورنہ چودھری فیروز کی دولی میں گھسنا کوئی آسان ک نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی حکمتِ عملی سے یہ مشکل کام کردکھ تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ تین ڈھاٹا پوش اس حویلی کی سیکیورٹی انگشتِ نرد کھا کر چلے گئے تھے۔ چودھری فیروز کی تولیت اس واقعے نے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ثبت کردیا تھا۔

جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد چودھری اکرام اور اس کی والدہ چودھرائن کبریٰ بیگم کو سا لے کر حویلی کی کشادہ بیٹھک میں آگیا۔ چودھری اکرام آج صبح تھانے میں میری ایک مختصر سی ملاقات ہوچکی تاہم ابھی بہت کچھ پوچھنا باقی تھا لہٰذا میں نے ان ماں کو اپنے سامنے بٹھالیا تھا۔

''چودھری صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔'' میں نے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے ''بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ ان کی جان بچ گئی۔ میں ا اسپتال میں ان سے طویل ملاقات کرکے آرہا ہوں۔ و گھر آجائیں گے۔''

''صرف مذمت کافی نہیں ہے تھانے دار صاحب..... کبریٰ بیگم نے میرے اظہارِ افسوس کے جواب میں ایک افس سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تک اثیم کو اس کے عمل سزا نہیں ملے گی، مجھے سکون نہیں آئے گا۔''

چودھرائن کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہو میری مصدقہ معلومات کے مطابق اس کی تین اولا تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی عالیہ تھی جس کی عمر چوبیس ار یب قریب تھی۔ عالیہ دو بچوں کی ماں تھی جن میں ایک اور ایک بیٹی تھی۔ عالیہ کی شادی جھنگ صدر کے ایک زمید گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کا نام چودھری تو احمد تھا۔ عالیہ سے چار سال چھوٹا اکرام اور اکرام سے سال چھوٹا انعام تھا۔ چودھری فیروز پچاس کا ہندسہ کرچکا تھا مگر وہ کبریٰ کے مقابلے میں عمر رسیدہ لگتا تھا۔

نانی بن چکی تھی تاہم وہ عالیہ کی بڑی بہن دکھائی دیتی تھی۔

"چودھرائن جی! میری دلی خواہش بھی یہی ہے۔" میں نے کبریٰ بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ "گناہ گار کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قانون کی گرفت میں آجائے اور یہ آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں......!"

ماں بیٹے نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بہ یک زبان ہوکر مجھ سے مستفسر ہوئے۔ "آپ ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں تھانے دار صاحب؟"

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں انہیں چودھری فیروز سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور آخر میں کہا۔ "چودھری صاحب کو شک ہے کہ ان تین حملہ آوروں میں ایک معراج دین عرف ماجھا بھی تھا لیکن وہ ماجھا سے اپنی دشمنی کی تسلی بخش وضاحت نہیں کرسکے۔ انہوں نے کسی نیاز احمد کی ہلاکت کا بھی ذکر کیا تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ میں ماجھا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ یہ تمام تر معلومات آپ ماں بیٹا مجھے فراہم کریں گے لیکن اس سے بھی پہلے......" میں نے براہِ راست چودھرائن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "آپ کو میرے چند سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوں گے......!"

"جی، آپ پوچھیں!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چودھری صاحب اس کمرے میں اکیلے کب سے سو رہے تھے؟"

"یہی کوئی چار پانچ دن سے۔" اس نے جواب دیا۔ "یا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے سے......"

"چودھری صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ اس علیحدہ شب بسری کا سبب آپ سے ہونے والی ناچاقی تھی؟" میں نے چودھرائن کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

"انہوں نے آپ کو غلط نہیں بتایا تھانے دار صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ "وہ جب بھی مجھ سے خفا ہوتے ہیں تو یہی کرتے ہیں۔ بات بڑی ہو یا چھوٹی، ان کا یہی وتیرہ ہے۔ وہ چند روز کے لیے الگ کمرے میں سونا شروع کردیتے ہیں۔"

"اب کی بار بات چھوٹی تھی یا بڑی؟"

"میری نظر میں تو معمولی ہی تھی۔" وہ سادگی سے بولی۔ "چودھری صاحب کے دل میں کیا ہے، یہ تو وہی بتاسکتے ہیں۔"

"کیا میں اس متنازع فیہ کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بتائیں۔ اس مرتبہ چودھری صاحب کس بات پر آپ سے ناراض ہوگئے تھے......؟"

"ہمارے درمیان اکرام کے رشتے کے حوالے سے بات ہورہی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میری خواہش ہے کہ میں اپنی بہن صغریٰ کی بیٹی فاخرہ کو بہو بنا کر اس حویلی میں لاؤں مگر چودھری صاحب میرے بہنوئی کو دل سے پسند نہیں کرتے اس لیے وہ اس رشتے کے حق میں بالکل نہیں ہیں۔ میں نے اپنی بات کے حق میں دلائل دینا شروع کیے تو بس وہ غصے میں آگئے اور اگلی رات سے انہوں نے اپنی خواب گاہ الگ کرلی۔ اب آپ بتائیں تھانے دار صاحب......میں کہاں پر غلط ہوں؟"

بات کے اختتام پر اس نے بال میری کورٹ میں پھینک دی تو میں نے اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں آپ قصوروار نہیں ہیں۔ ایسی ذرا ذرا سی باتوں پر اینڈنا، اینٹھنا اور روٹھنا انتہائی نامناسب اور غیر ضروری ہے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں مگر میری بات چودھری صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "اس حویلی میں صرف اور صرف انہی کا حکم چلتا ہے۔ جب کوئی انہیں اپنی مرضی کرنے سے روک نہیں سکتا تو پھر ناراضی دکھانے کی کیا تک ہے؟"

میں نے فروعی باتوں سے اجتناب برتتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ "کیا حویلی میں رہنے والے ہر شخص کو اس بات کا علم تھا کہ چودھری صاحب نے ان دنوں آپ سے عارضی افتراق قائم کررکھا ہے اور وہ الگ کمرے میں سوتے ہیں؟"

"جی بالکل، سب جانتے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "حویلی کے وسنیک چودھری صاحب کی اس عادت سے بہ خوبی واقف ہیں کیونکہ مہینے، دو مہینے میں انہیں یہ تماشا دیکھنا پڑتا ہے......"

ہمارے درمیان سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ایک ملازم اشیائے خورونوش سے لدی پھندی ایک کنگ سائز ٹرے اٹھا کر وہاں پہنچ گیا۔ مذکورہ ملازم نے ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھا اور خاموشی کے ساتھ ڈرائنگ روم سے رخصت ہوگیا۔ اس کے بعد کبریٰ بیگم کے ہدایت نما حکم پر چودھری اکرام میری خاطرداری کے لیے سرگرم عمل ہوگیا۔

"چودھرائن جی! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر چھوٹے چودھری سے

مخاطب ہوتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ”اکرام! میرے لیے بس تھوڑے سے نمکین پستے نکال دو۔ میں چائے پیوں گا اور چند دانے پستے کے چگ لوں گا۔“

چودھری اکرام نے فوراً میری ہدایت پر عمل کردیا۔

”چودھرائن جی......“ میں نے گفت وشنید کے ٹوٹے ہوئے تسلسل کو بحال کرتے ہوئے کبریٰ بیگم سے استفسار کیا۔ ”حویلی کے وسنیکوں کی جان کاری کے بارے میں تو آپ نے بتادیا۔ حویلی سے باہر ظفر گڑھ میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟ کیا انہیں بھی اس راز سے آگاہی حاصل تھی؟ میں آپ سے یہ سوال ایک خاص مقصد سے کررہا ہوں......!“

”میں دعوے اور یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہوسکتا ہے چند پنڈ والے بھی یہ بات جانتے ہوں۔“

”اکرام! تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے چھوٹے چودھری کی طرف دیکھا۔

”دیکھیں تھانے دار صاحب......!“ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ”چونکہ یہ ابا جی کی بہت پرانی عادت ہے اس لیے عین ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کا علم ہو۔“

”آپ نے کس خاص مقصد سے یہ سوال کیا تھا؟“ چودھرائن نے مجھ سے پوچھا۔

”حویلی کے اندر رہنے والے لوگ ہوں یا حویلی سے باہر ظفر گڑھ میں بسنے والے افراد، اگر ان میں سے کچھ کو یا بہت سوں کو چودھری صاحب کی اس ادائے خفگی کا علم ہے تو اس میں پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“ میں نے باری باری ان کے چہروں کو تکتے ہوئے کہا۔ ”خرابی کی بات یہ ہے کہ چودھری صاحب کی ٹانگ کاٹنے والے کو ٹھیک ٹھیک پتا تھا کہ آج کل چودھری اور چودھرائن میں ان بن چل رہی ہے اور چودھری فیروز الگ کمرے میں شب بسری کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ حملہ آور یہاں تک باخبر تھے کہ ان کا شکار کس کمرے میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا لہٰذا وہ سیدھے اسی کمرے میں پہنچے اور اپنا مزموم مقصد پورا کرنے کے بعد واپس چلے گئے......“ لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کام ماجھا کا ہے یا کسی اور کا، وہ ہر حال میں سخت ترین سزا کا مستوجب ہے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس کے مخبر کا پکڑا جانا بہت ضروری ہے۔ اب آپ لوگ مجھے بتائیں کہ ایسی گھٹیا حرکت کرنے والا کون ہو [illegible] ہے؟“

”مجھے تو کوئی اندازہ نہیں ہے......“ اکرام بے بسی سے بولا۔

کبریٰ بیگم نے کہا۔ ”میں بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”تو جاننے کی کوشش کریں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت ضروری ہے۔ جس کسی نے بھی چودھری صاحب کی ٹانگ کاٹی ہے، اسے یہ خوبی یہ علم تھا کہ ان دنوں چودھری صاحب بالکل الگ تھلگ ایک کمرے میں اکیلے سوتے ہیں۔ اگر ہم حملہ آوروں کے مخبر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر چودھری صاحب کے دشمن کو پکڑنا بہت آسان ہوجائے گا۔“ میں نے ذرا دیر کو رک کر باری باری ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر معتدل انداز میں پوچھا۔

”میری بات آپ لوگوں کی سمجھ میں تو آگئی ہے نا؟“

”جی...... میں سمجھ گئی۔“ کبریٰ نے اثبات میں جواب دیا۔

اکرام نے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! ہم آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔“

”ٹھیک ہوگیا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب آپ لوگ مجھے ماجھا کے بارے میں بتائیں۔“

وہ شروع ہوگئے۔ اس روز چودھری اکرام اور اس کی والدہ چودھرائن کبریٰ بیگم کی زبانی مجھے معراج دین عرف ماجھا کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

ماجھا کا باپ سراج دین موضع ظفر گڑھ کا پرانا وسنیک تھا۔ اس کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا ماجھا اور ایک بیٹی شاداں۔ ماجھا، شاداں سے پانچ سال بڑا تھا جس کی عمر اس وقت پچیس سال تھی۔ سراج دین کی بیوی صفیہ ایک نابینا عورت تھی۔ وہ پیدائشی اندھی نہیں تھی۔ اوائل عمری میں آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری نے اس کی بینائی چھین لی تھی۔

سراج دین کے پاس پانچ ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ ماجھا اپنے باپ کے ساتھ اس زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ آوارگی کے لیے بھی کافی وقت نکال لیا کرتا تھا۔ ماجھا گاؤں ہی کی ایک لڑکی تاجی سے محبت بھی کرتا تھا۔ واضح رہے کہ میں اس وقت آپ لوگوں کی خدمت میں اکرام اور کبریٰ کا نقطۂ نظر پیش کررہا ہوں......!

ان ماں بیٹے کے مطابق سراج دین نے چودھری صاحب سے کچھ رقم ادھار لے رکھی تھی مگر وہ حسب وعدہ رقم

نہیں لوٹا پایا تھا جس پر چودھری صاحب نے پہلے تو خفگی کا اظہار کیا پھر ایک روز اسے خوب ڈانٹا ڈپٹا۔ چودھری صاحب نے اس پر واضح کر دیا کہ وہ کچھ بھی کرے مگر ایک ماہ میں ان کی رقم لوٹا دے۔

ابھی ایک ماہ کا عرصہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ کھیتوں میں ماجھا کی چودھری کے ایک ملازم نیاز احمد سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ماجھا اپنی زمین کو پانی لگانا چاہتا تھا اور نیاز احمد اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ نیاز احمد کا کہنا یہ تھا کہ وہ یہ سب کچھ چودھری صاحب کے حکم پر کر رہا ہے۔ چودھری صاحب نے کہا ہے کہ جب تک سراج دین ان کا قرضہ واپس نہیں کر دیتا، اسے اپنی زمین میں کاشت کاری کی اجازت نہیں۔

دونوں کے بیچ تلخ کلامی کا سلسلہ آگے بڑھا اور ہرزہ سرائی تک جا پہنچا پھر وہ ہزلیات پر اتر آئے۔ ماجھا نے اس وقت ہاتھ میں کسّی (پھاوڑا) پکڑ رکھی تھی۔ جب نیاز نے ماجھا کی ماں اور بہن کو مغلظات میں تولنا شروع کیا تو اس کی برداشت جواب دے گئی اور پھر اس کا کسّی والا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ اس نے طیش کے عالم میں نیاز کے سر پر کسّی کے کئی وار کیے۔ نتیجتاً نیاز کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمیں بوس ہو گیا اور موقع پر ہی اس کی موت واقع ہوگئی۔ نیاز کے قتل کے جرم میں ماجھا عمر قید کی سزا پا کر جیل چلا گیا تھا۔ یہ واقعہ دو سال پہلے کا تھا۔

آئندہ دو سالوں میں ماجھا کا خاندان تین تیرہ ہو گیا۔ وہ خود تو عمر قید کی سزا کاٹنے جیل کی بلند و بالا سنگلاخ دیواروں کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں پہلے اس کے باپ کی موت ہوئی۔ اس کے بعد ان کے گھر پر ایک رات ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔ اس گھر میں لوٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ ڈاکو دراصل ماجھا کی بہن شاداں کو اٹھانے آئے تھے۔ نابینا ماں نے مزاحمت کی برائے نام کوشش کی تو ڈاکوؤں نے اس کے سینے میں برچھی اتار کر اسے موقع پر ہی ٹھنڈا کر دیا۔ شاداں اپنی جان بچانے کے لیے مکان کی چھت پر پہنچ گئی مگر ڈاکوؤں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ شاداں ان لمحات میں ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال میں گھر گئی تھی۔ اپنی جان اور عزت کو بچانے کے لیے اسے موت کا راستہ ہی نظر آیا۔ بس پھر وہ چھت سے کود گئی تھی......!

میں مزید دس منٹ تک حویلی میں رکا پھر اکرام اور کبریٰ کو ضروری ہدایات دے کر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

ان ماں بیٹے سے حاصل ہونے والی معلومات کی صحت کو چیک کرنا ضروری تھا لہٰذا تھانے پہنچ کر میں نے حوالدار خادم حسین کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ خادم حسین ایک سمجھ دار اور سنجیدہ طبع پولیس اہلکار تھا اور اپنے کام کا ماہر بھی......!

خادم حسین نے کمرے میں آ کر مجھے سلام کیا پھر میرے اشارے پر وہ میز کی دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''خادم حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''چودھری فیروز کو پیش آنے والے واقعے کے حوالے سے مجھے ایک اشارہ ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس پر روشنی ڈالو......''

''آپ حکم کریں ملک صاحب۔'' وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں حاضر ہوں جناب۔''

''چودھری کو یہ شک ہے کہ ان حملہ آوروں میں ایک ماجھا بھی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''وہی ماجھا جو کچھ عرصہ پہلے جیل سے اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں فرار ہو گیا تھا۔ میرا مطلب ہے، ماجھا کے حمایتی اسے پولیس کی تحویل سے چھڑا لے گئے تھے اور آج کل ماجھا اپنے انہی حمایتی ڈاکوؤں کے گروہ کا حصہ ہے.....!''

خادم حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! چھ ماہ پہلے ماجھا پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا تھا۔ اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن ایسی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی۔ اس علاقے میں کئی میل تک گھنا جنگل پھیلا ہوا ہے جو ڈاکوؤں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت کا حامل ہے۔ وہ لوگ قانون کی نگاہ سے بچنے کے لیے جنگل کے اندرونی حصے میں بہ آسانی مستور ہو جاتے ہیں۔ باقی جہاں تک ماجھا کا معاملہ ہے تو......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تو سننے میں آتا ہے کہ فرار ہونے کے بعد ماجھا نے ڈاکوؤں کے گروہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی لیکن ابھی تک اس کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔ آج میں پہلی بار آپ کی زبان سے سن رہا ہوں۔''

''یہ میری نہیں بلکہ چودھری فیروز کی زبان کے الفاظ ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس نے ماجھا کی اس بہیمانہ انتقامی کارروائی کا ایک سبب بھی بتایا ہے۔''

''کیا کہتا ہے چودھری فیروز؟'' حوالدار نے پوچھا۔
میں نے چودھری کے خیالات کو حوالدار تک پہنچانے کے بعد کہا۔ ''خادم حسین! میں ابھی حویلی میں چودھری فیروز کے بڑے بیٹے اور چودھرائن سے ایک تفصیلی ملاقات کر کے آ رہا ہوں اور انہوں نے مجھے ماجھا کی جو کہانی سنائی ہے وہ چودھری کی سوچ کی عکاسی کرتی ہے لیکن میں آنکھیں بند کر کے اس کہانی پر یقین نہیں کر سکتا۔ تمہیں یہاں بلانے کا مقصد یہی ہے کہ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ تم پچھلے بارہ سال سے اس تھانے میں ہو۔ سابق تھانہ انچارج فیض محمد صاحب کا زمانہ تم نے اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ ماجھا دو سال پہلے عدالت سے عمر قید کی سزا پا کر جیل گیا تھا، نیاز احمد کے قتل کے الزام میں۔ آپ لوگوں نے ہی ماجھا کو گرفتار کیا تھا اور پھر چالان تیار کر کے اسے حوالۂ عدالت کیا تھا لہٰذا اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ تم ماجھا اور اس کے پس منظر سے بہ خوبی آگاہ ہو......''
''ملک صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ چودھری اکرام اور اس کی ماں نے آپ کو ماجھا کی کون سی کہانی سنائی ہے۔ اس کے بعد ہی میں آپ کے سوال کا تسلی بخش جواب دے سکوں گا۔''
حوالدار کی بات میں وزن تھا چنانچہ آئندہ دس منٹ میں، میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔
''ملک صاحب! ان لوگوں نے آپ سے کئی ایک باتیں چھپائی ہیں۔'' خادم حسین نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور بعض واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب نیاز احمد کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا اس وقت تک ماجھا کا کوئی کرمنل ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ پہلی مرتبہ کسی قانونی معاملے میں پھنسا تھا لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید ٹھوس حقیقت تھی کہ ماجھا نے ہی نیاز احمد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا لہٰذا وہ سزا سے نہ بچ سکا اور اس کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔ نمبر ایک، قتیل نیاز کا مدعی چودھری فیروز جیسا طاقتور شخص تھا۔ نمبر دو، ماجھا نے اپنے بیان حلفی میں اقبالِ جرم کر لیا تھا......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
''ماجھا تھانے سے عدالت اور عدالت سے جیل چلا گیا تھا۔ اس نے جو جرم کیا تھا اس کی یہی سزا ہو سکتی تھی۔ فیض محمد صاحب نے ماجھا کے حوالے سے اپنے طور پر بھی بہت کام کیا تھا جس میں سے بہت سی باتیں ماجھا کی فائل کا حصہ نہیں بن سکیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سابق انچارج صاحب نے دانستہ ایسا کیا تھا یا پھر چودھری فیروز نے کسی قسم کا دباؤ ڈال کر فیض صاحب سے یہ سب کرایا تھا۔ بہر حال اثنائے تجویز جو اہم باتیں سامنے آئیں وہ میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور ان میں سے بہت ساری آپ کو سنائی جانے والی کہانی سے لگا نہیں کھاتیں......''
''زبردست خادم حسین!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں وہی حقائق تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''
''ان دونوں ماں بیٹے نے بڑی ہوشیاری اور تعقید سے کام لیا ہے۔'' حوالدار نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ نیاز احمد کو ماجھا ہی نے قتل کیا تھا لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان کے درمیان زمین کو پانی لگانے کے معاملے پر تین پانچ ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نیاز احمد نے ماجھا کی بہن کے حوالے سے انتہائی رکیک اور نازیبا الفاظ ادا کیے تھے۔ ماجھا، شاداں کے بارے میں نیاز احمد کی بکواس کو برداشت نہ کر سکا اور شدید غصے کے عالم میں اس کا کسی بردار ہاتھ حرکت میں آ گیا تھا۔ نتیجے کے طور پر نیاز کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے علاوہ......'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔
''یہ بھی درست ہے کہ ماجھا کے باپ سراج دین نے اپنے زرعی مسائل کو حل کرنے کے لیے چودھری فیروز سے آٹھ سو روپے ادھار لیے تھے لیکن باوجود کوشش کے بھی وہ چودھری کا قرض چکا نہ سکا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ قرض کی اس رقم نے بچے دینا شروع کر دیے تھے اور وہ بھی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ چنانچہ محض تین سال میں وہ آٹھ سو روپے، پانچ ہزار روپے کا روپ دھار چکے تھے۔ اتنی بھاری رقم کی ادائیگی سراج دین کے بس میں نہیں تھی لہٰذا وہ آئے روز چودھری کے ہاتھوں اپنی بے عزتی کرواتا رہتا تھا......''
''ایک منٹ خادم حسین!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بات سے میں یہ سمجھا ہوں کہ چودھری فیروز ضرورت مند افراد کو سود پر قرض دیتا ہے...... میرا اندازہ غلط تو نہیں ہے؟''
''نہیں ملک صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔ لوگ اپنی کسی مجبوری سے نمٹنے کے لیے گھر یا زمین کے کاغذات چودھری فیروز کے پاس رکھوا کر قرض لے لیتے ہیں۔ ایسے خوش نصیب بہت ہی کم دیکھنے میں آئے ہیں جو چودھری کا ادھار اتارنے میں کامیاب ہوئے ہوں کیونکہ بیاج کی رقم اتنی تیزی سے بڑھتی ہے کہ قرض دار کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور انتہائی بے

بسی کے عالم میں اسے اپنا گھر یا زمین چودھری فیروز کے نام لکھوانا پڑتی ہے۔ اسی گھناؤنے کھیل کی مدد سے چودھری کئی لوگوں کی مختصر سی زرعی اراضی کو اپنی زمین کا حصہ بنا چکا ہے۔

جس صبح سراج دین اپنے گھر میں مردہ پایا گیا، اس سے پچھلے روز چودھری فیروز نے اسے اپنی حویلی میں بلا کر نہ صرف بری طرح ذلیل کیا تھا بلکہ اس کی پانچ ایکڑ زمین بھی اپنے نام لکھوالی تھی۔ پٹواری، نمبردار...... الغرض ہر متعلقہ شخص کے ساتھ چودھری فیروز نے بنا کر رکھی ہوئی ہے اسی لیے کبھی اس کا کوئی کام رکا نہیں...... سراج دین کا جوان جہان اکلوتا بیٹا عمر قید کی سزا پا کر جیل جا چکا تھا۔ روزی روٹی کا واحد ذریعہ وہ پانچ ایکڑ زرعی اراضی بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر چودھری فیروز کی ملکیت کا حصہ بن چکی تھی۔ ان حالات میں سراج کو دل کا دورہ نہ پڑتا تو اور کیا ہوتا ملک صاحب......؟''

حوالدار نے لحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ''کیا کبھی کسی نے تھانے آ کر چودھری فیروز کے اس ظلم اور زیادتی کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی؟''

''اتنی جرأت بھلا کون کرے گا ملک صاحب!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''بے بس اور لاچار دیہاتی چودھری فیروز کے خلاف ہرگز ہرگز زبان نہیں کھول سکتے۔ سرجی...... آپ ظفر گڑھ کے وسنیکوں کو وہ والے انسان نہ سمجھیں جو جابر حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا حوصلہ رکھتے ہوں......!''

خادم حسین کی آواز میں ایک خاص نوعیت کا درد محسوس کر کے میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اپنے دل میں مظلوم کے لیے ہمدردی اور ظالم کے لیے بے پناہ غیظ و غضب رکھتا تھا اسی لیے وہ بڑے پُرتاثیر انداز میں ایک کے بعد ایک حقیقت سے پردہ اٹھا رہا تھا۔ میں نے اس کی دلی اور دماغی کیفیت کے پیشِ نظر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خادم حسین! میں تمہاری تکلیف کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے جذبات کی فصد کھلوانے کا بڑا ہی زبردست بندوبست کروں گا اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میرا کوئی بھی نشتر کُھٹل نہیں ہے۔ تم دیکھو گے کہ ہم اس علاقے کے گورخروں کو کس طرح دوڑا دوڑا کر ماریں گے......!''

میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میرے اندر سے یہ آواز آتی ہے کہ میں آپ سے اس قسم کی امید رکھ سکتا ہوں۔ آپ بڑے وکھری ٹائپ کے تھانے دار ہیں......!''

''اور تم بھی کوئی روایتی حوالدار نہیں ہو خادم حسین!''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توصیفی انداز میں کہا۔ ''مجھے توقع ہے کہ تمہارے ساتھ میری خوب نبھے گی۔ اب ذرا مجھے تم ماجھا کی بہن شاداں کی موت کے بارے میں بتاؤ۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ شاداں نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی تھی مگر ڈاکوؤں والی کہانی درست نہیں ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''دراصل چھوٹے چودھری انعام کی شاداں پر بری نظر تھی۔ ماجھا جیل چلا گیا اور سراج دین بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ شاداں کی ماں صفیہ بی بی کی آنکھیں بے نور تھیں۔ مطلب یہ کہ شاداں کی عزت کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا لہٰذا اس نے .... گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ شاداں کے اس عمل نے چودھری انعام کی بے غیرتی بردار ضد کو ہوا دی اور اس نے شاداں کو اٹھوانے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس رات جوڑا کو شاداں کے گھر پر حملہ آور ہوئے وہ چودھری انعام کے بھیجے ہوئے بندے تھے۔ نابینا صفیہ نے اپنی بیٹی کو بچانے کی جو لولی لنگڑی کوشش کی، اس کے نتیجے میں وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ شاداں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ماں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ لیا تھا اسی لیے اس نے فرار ہونے کے لیے چھت کی راہ لی تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑیں گے نہیں لہٰذا جب اسے اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو اس نے جان گنوا کر اپنی عزت بچا لی۔ وہ معصوم لڑکی چودھری انعام کے جبر کی بھینٹ چڑھ گئی تھی......''

بات کے اختتام پر خادم حسین اداسی بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ...... ہمہ خانہ کمین است!''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

''خادم حسین!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تمہیں چودھری خاندان کے کالے کرتوتوں کی جان کاری ہے تو میں مان نہیں سکتا کہ سابق تھانہ انچارج ان ترش حقائق سے آگاہ نہ ہو......''

''فیض صاحب یہ ساری باتیں جانتے تھے۔'' حوالدار نے کہا۔

''پھر انہوں نے چودھری فیروز اور اس کے خچر الانچار فرزندِ صغیر چودھری انعام کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''میں سمجھتا ہوں اس کے دو اسباب تھے۔'' اس نے

جواب دیا۔ ''ایک تو ان ساری باتوں کا پتا شاداں کی موت کے کافی عرصے بعد چلا تھا اور دوسرے......!''

خادم حسین ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولتے بولتے رکا تو میں نے پاٹ دار آواز میں دریافت کیا۔ ''دوسرا سبب کیا تھا؟''

''میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ فیض صاحب اپنے دل میں چودھری فیروز کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''وہ اکثر چودھری صاحب سے ملنے حویلی بھی جایا کرتے تھے......!''

''میں سمجھ گیا خادم حسین......!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب قانون کے محافظ مجرموں کے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کا کام سنبھال لیں تو پھر معاشرے میں اسی نوعیت کے ظالمانہ واقعات رونما ہونے لگتے ہیں لیکن میں فیض محمد نہیں، ملک صفدر حیات ہوں۔ مجرموں کے لیے میرے دل و دماغ میں رتی بھر بھی گنجائش نہیں ہے۔ میری بات سمجھ میں آ رہی ہے نا......؟''

''چنگی طراں سمجھ گیا ملک صاحب......!'' وہ بڑے عزم سے بولا۔ ''اس نیک کام میں آپ قدم قدم پر مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔''

''دیکھو خادم حسین!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ آئندہ کے لیے ہمیں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا ہوں گے۔ پچھلی رات چودھری فیروز کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کی تفتیش کے دوران میں بہت ساری ایسی نئی چیزیں کھل کر سامنے آئیں گی جن کے ڈانڈے ماضی سے جا کر ملتے ہوں گے لہٰذا ہمیں گڑے مردے اکھاڑنے کا بھی خاطر خواہ موقع ملے گا۔ اگر ماجھا کے حوالے سے چودھری فیروز کا شک درست ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ ماجھا کو جیل میں سراج دین، صفیہ اور شاداں کی المناک اموات کی خبریں ملی ہوں گی۔ اسی لیے اس نے چودھری فیروز کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا ہے۔ اس نے چودھری کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا بلکہ نمونۂ عبرت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ میری نظر میں ماجھا کا اگلا شکار چودھری انعام ہو سکتا ہے...... تمہارا کیا خیال ہے خادم حسین؟''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سنگین حقیقت کا اندازہ چودھری فیروز کو بھی ہوگا۔''

''چودھری فیروز کے اندازوں کی ہمیں فکر نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''وہ جو سوچنا ہے، سوچتا رہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں اس بندے کو گرفت میں لینا ہے جو گزشتہ رات ڈاکو کے بھیس میں ایک قصاب کا کردار ادا کرتے ہوئے چودھری فیروز کی بائیں ٹانگ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گیا ہے اور اگر......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر...... اس بہیمانہ کارروائی میں ماجھا ہی ملوث ہے تو ہمیں جلد از جلد اس کے مخبر کا سراغ لگانا ہوگا۔ اگر وہ نامعلوم خبری ہمارے ہاتھ لگ گیا تو پھر ماجھا کو چھاپنا بہت آسان ہو جائے گا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' خادم حسین نے گردن کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''کل صبح چودھری فیروز اسپتال سے حویلی آ جائے گا اور چودھری انعام اپنے باپ کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا ہے۔ اگر ہم دو سادہ لباس اہلکاروں کو حویلی کی خفیہ نگرانی پر مامور کر دیں تو ہمیں اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔''

''اچھا آئیڈیا ہے......'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تم کل صبح ہی دو ہوشیار قسم کے سادہ لباس پولیس اہلکاروں کو ضروری ہدایات کے ساتھ ظفر گڑھ روانہ کر دینا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''میں ماجھا کے کیس کے حوالے سے اہم کاغذات کو آج اپنے ساتھ کوارٹر پر لے جاؤں گا تاکہ رات میں باریک بینی اور توجہ کے ساتھ میں ان کا مطالعہ کر سکوں۔ ہو سکتا ہے دو سال پرانے اس کیس کی فائل میں مجھے کام کی کوئی چیز مل جائے......!''

''آپ نے بالکل درست فیصلہ کیا ہے ملک صاحب!'' خادم حسین نے عقیدت بھرے انداز میں کہا۔

اس رات میں کافی دیر تک نیاز مرڈر کیس والی فائل کے ساتھ سر کھپاتا رہا لیکن مجھے کہیں بھی کوئی ایسا پوائنٹ نہیں ملا جو ماجھا کی موافقت اور چودھری فیروز کی مخالفت میں جاتا ہو۔ یہ رپورٹ چونکہ سابق تھانہ انچارج فیض محمد نے تیار کی تھی لہٰذا یہی ہونا تھا جو نظر آ رہا تھا۔ فیض صاحب تو چودھری فیروز کے ہم جلیس ہونے کا اعزاز رکھتے تھے پھر وہ چودھری اور اس کے خاندان کے کسی فرد کے خلاف کوئی تہدیدی یا تعزیری کارروائی کیسے کر سکتے تھے......!

ان زہر آلود خیالات نے میری طبیعت مکدر کر دی۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے والا کوئی ذمے دار شخص

جب انتہائی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرتا ہے تو بہ الفاظِ دیگر وہ ڈیپارٹمنٹ کے منہ پر طمانچہ رسید کر رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کے ایسے عمل سے قانون ٹھٹول بن کر رہ جاتا ہے......!

ابتدا میں میرے ذہن میں چودھری فیروز کی شخصیت کے حوالے سے جو صحت مند اور مثبت تصور قائم ہوا تھا، تلخ حقائق آشکار ہونے کے بعد وہ کرچی کرچی ہو کر میری یادداشت میں بکھر گیا تھا۔ ان تکلیف دہ لمحات میں خود کو نیند کی دیوی کے حوالے کرنے سے پہلے میں نے یہ ارادہ باندھا کہ کل کسی وقت میں ماجھا کی محبوبہ سے ایک تفصیلی ملاقات ضرور کروں گا۔

مجھے امید تھی کہ تاجی میرے لیے کافی کارآمد ثابت ہوگی۔

☆☆☆

اکیس جنوری کی صبح بڑی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور ثابت ہوئی۔ میں حسبِ معمول نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد ناشتے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے کوارٹر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس خلافِ توقع دستک نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو سامنے کانسٹیبل رئیس کو کھڑے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے رئیس......؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''ادھر نصیر آباد میں بھی ظفر گڑھ جیسی ایک واردات ہوگئی ہے۔'' کانسٹیبل نے اضطراری لہجے میں بتایا۔ ''وہاں سے دو بندے اطلاع دینے آئے ہیں اور بار بار منت کر رہے ہیں کہ ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہیے......''

موضع نصیر آباد میرے تھانے سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''کیا ڈاکو نصیر آباد کے کسی وسنیک کی ٹانگ کاٹ کر لے گئے ہیں؟''

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ کانسٹیبل رئیس کے بیان کے مطابق نصیر آباد میں بھی ظفر گڑھ جیسی ایک واردات ہوئی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔

''نہیں جناب...... اس بار ڈاکو پٹواری امیر بخش کا ایک ہاتھ کاٹ کر لے گئے ہیں۔ پٹواری کا چھوٹا بھائی کریم بخش ایک بندے کے ساتھ تھانے میں بیٹھا ہے اور مسلسل یہی اصرار کر رہا ہے کہ پولیس کو فوراً کوئی ایکشن لینا چاہیے،

اسی لیے میں آپ کو ڈسٹرب کرنے آگیا ہوں......''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ اور نصیر آباد جانے کے لیے کسی تانگے کا بندوبست کرو۔'' میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''میں تیار ہو کر آرہا ہوں۔''

رئیس کے جانے کے بعد میں نے یونیفارم پہننے کے دوران میں ہی جلدی جلدی واجبی سا ناشتا کیا اور تیار ہو کر تھانے آگیا۔ حوالدار خادم حسین نے میرے کمرے میں آکر مجھے سلام کیا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! ہمارا خیال تھا کہ ڈاکوؤں کا اگلا شکار چودھری انعام ہوگا لیکن پٹواری امیر بخش نشانہ بن گیا۔''

''کیا پٹواری کا ماجھا کے معاملات سے کچھ لینا دینا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی بالکل ہے!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پٹواری امیر بخش اور چودھری فیروز میں بڑی گہری دوستی ہے۔ سراج دین کی پانچ ایکڑ زرعی اراضی چودھری نے اسی پٹواری کی مدد سے اپنے نام کرائی تھی۔''

''ہوں......!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا یہ شک رفتہ رفتہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے کہ ان واقعات کے پیچھے ماجھا ہی کا ہاتھ ہے......'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے حوالدار سے پوچھا۔ ''خادم حسین! کیا تم نے دو سادہ لباس اہلکاروں کو ظفر گڑھ کی جانب روانہ کر دیا ہے؟''

''جی ملک صاحب!'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''کانسٹیبل مختار احمد اور فضل محمود آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی تھانے سے گئے ہیں۔ میں نے انہیں ان کا کام اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''پٹواری والے واقعے کے بعد چودھری انعام کے لیے حالات اور بھی خطرناک ہوگئے ہیں۔ میں نصیر آباد سے ہو کر آتا ہوں۔ اس دوران میں تھانے کے معاملات کو تم نے سنبھالنا ہے۔''

''آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

اسی وقت کانسٹیبل رئیس نے میرے پاس آکر بتایا۔ ''ملک صاحب! میں نے آپ کے لیے تانگے کا انتظام کر دیا ہے اور اطلاع کنندگان کو تانگے میں بٹھا بھی دیا ہے۔''

''اب تم بھی جا کر تانگے پر سوار ہو جاؤ۔'' میں نے

سرسری انداز میں کہا۔ ”تم میرے ساتھ نصیر آباد جاؤ گے۔“

”جو حکم ملک صاحب......“ یہ کہتے ہوئے کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا موضع نصیر آباد میرے تھانے سے محض ڈیڑھ میل کی دوری پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔ یہ مختصر سا فاصلہ طے کرنے میں ہمیں چند منٹ لگے ہوں گے تاہم ٹھنڈی ٹھار کھلی فضا میں سفر کرتے ہوئے ہمیں لگ پتا گیا تھا۔ راستے بھر پٹواری کے بھائی سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا۔ کریم بخش ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ پٹواری کو ابھی کسی اسپتال نہیں لے جایا گیا تاہم اس کے کٹے ہوئے ہاتھ پر کس کر پٹی باندھ دی گئی تھی جس سے خون کے بہاؤ میں تو کمی واقع ہوئی تھی مگر خون کا رساؤ جاری تھا۔ میرے نزدیک پٹواری کے گھر والوں نے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ فوری طور پر پٹواری کو اسپتال پہنچانا ناگزیر تھا۔

موضع نصیر آباد لگ بھگ سو گھروں کی آبادی کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں بسنے والے افراد کی تعداد تین سے چار سو کے درمیان رہی ہوگی۔ تانگا پٹواری امیر بخش کے گھر کے سامنے رکا اور مجھے فی الفور اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس وقت پٹواری ایک گرم بستر پر لیٹا ہائے ہائے کر رہا تھا۔

میں پٹواری والے پلنگ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پٹی بندھے ہاتھ کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ پٹواری کے دائیں ہاتھ کو کلائی کے مقام سے کاٹا گیا تھا اور یہ دلخراش کارروائی کرنے والے اس کا کٹا ہوا دایاں ہاتھ ساتھ لے گئے تھے۔ یہ بڑی حد تک چودھری فیروز والے واقعے سے ملتی جلتی واردات تھی۔

پٹواری امیر بخش کی عمر پچپن سال تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی لہٰذا اس کے ساتھ بیوی بچوں والا کوئی معاملہ نہیں تھا جبکہ اس سے پانچ سال چھوٹا بھائی کریم بخش شادی شدہ تھا۔ اس کی اولادوں میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ کریم بخش کی بیوی جمیلہ ایک سگھڑ گھریلو عورت تھی۔ دونوں بھائی ایک ہی گھر میں راضی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ گزشتہ رات والے واقعے نے ان کے سکون اور خوشی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔

پٹواری امیر بخش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے کوئی لمبی چوڑی پوچھ تاچھ کرتا تاہم چند سوالات کرنا ضروری تھے۔ میرے استفسار پر اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جو کہانی سنائی وہ چودھری فیروز والے واقعے کی بازگشت لگتی تھی۔ ڈھاٹا پوش تین مسلح ڈاکو...... بغدا اور مڈی...... کا ڈوری والا غلاف...... ظالمانہ کارروائی اور...... یہ جا، وہ جا......!

”آپ کو کسی پر شک ہے؟“ میں نے پٹواری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب...... شک نہیں یقین ہے۔“ وہ درد کی شدت سے کراہتے ہوئے بولا۔ ”یہ اسی نامراد ماجھا کا کام ہے جس نے کل رات چودھری صاحب کی ٹانگ کاٹی تھی۔“

”ماجھا کی آپ سے ایسی کیا دشمنی ہے؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

”وہ خوامخواہ ہی میرا دشمن بن گیا ہے......“ وہ اذیت بھری آواز میں بولا۔ ”حالانکہ میں نے کبھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ماجھا کا باپ چودھری صاحب کا مقروض تھا اور قرض لیتے وقت سراج دین نے اپنی پانچ ایکڑ زمین کے کاغذات چودھری صاحب کے پاس رکھوائے تھے۔ ایسی ضمانت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اگر قرض دار قرض کی رقم واپس نہ کر سکے تو قرض خواہ اس کی گروی رکھی ہوئی چیز کا مالک بن جاتا ہے۔ میں نے تو صرف قانونی کارروائی میں چودھری صاحب کی مدد کی تھی۔ اس میں میرا کیا قصور تھانے دار صاحب......؟“

مجھے ان سوالوں کا جواب بھی مل گیا تھا جو میں نے پٹواری سے پوچھے بھی نہیں تھے۔ لہٰذا میں نے فوری طور پر گھائل پٹواری کو کانسٹیبل رئیس کی نگرانی میں ضروری علاج معالجے کے لیے اسپتال روانہ کر دیا اور خود کریم بخش کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

کریم بخش نصف صدی کا سفر طے کر چکا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک فربہ شخص تھا۔ اس کے پاس بیس ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ زراعت کے تمام معاملات میں اس کے دونوں بیٹے منظور اور سعید بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ منظور کی عمر بیس سال تھی جبکہ سعید اٹھارہ سال کا تھا۔ آسیہ اور مریم اپنے بھائیوں سے چھوٹی تھیں جن کی عمریں علی الترتیب پندرہ اور دس سال تھیں۔ منظور اپنے زخمی تایا پٹواری امیر بخش کے ساتھ اسپتال چلا گیا تھا جبکہ سعید میرے پاس موجود تھا۔

”کیا پٹواری کے ساتھ یہ حادثہ اسی کمرے میں پیش آیا ہے؟“ میں نے سوال کرنے کے بعد باری باری باپ بیٹے کی طرف دیکھا۔

Wide Range Of More
Than 100 Products
آفتاب قرشی
JOSHANDA
خالص قدرتی اجزاء سے تیار شدہ
JOSHANDA
Best Remedy For Flu, Cold, Fever, Cough and Sore Throat
JOSHANDA
A Unani Product
Aftab Qarshi Dawakhana
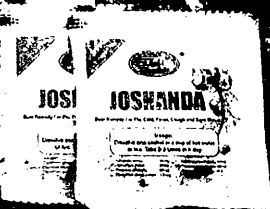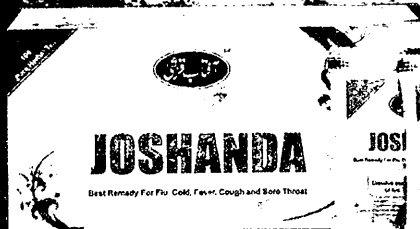
''نہیں جناب......'' سعید نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تایا ابو اپنے کمرے میں سو رہے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ بعد میں ہم انہیں اٹھا کر یہاں لے آئے تھے تاکہ ان کے زخمی ہاتھ کی مرہم پٹی کر سکیں۔''

کریم بخش نے بتایا۔ ''ہم دونوں بھائی اگرچہ ایک ہی چار دیواری کے اندر رہائش پذیر ہیں اور کھانا پینا بھی ایک ساتھ ہی ہے لیکن امیر بھائی نے اپنے آرام کے لیے ایک الگ تھلگ کمرا مخصوص کر رکھا ہے۔ ان کا سارا سامان، کپڑا لتا، کاغذات وغیرہ...... سب کچھ اسی کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ اس وقت آپ جہاں بیٹھے ہوئے ہیں، گھر کا یہ حصہ ہمارے استعمال میں ہے۔''

''میں اس الگ تھلگ کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں جہاں پچھلی رات پٹواری صاحب سو رہے تھے۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ مجھے وہاں لے جا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں جناب...... آپ آئیں میرے ساتھ۔'' کریم بخش بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ مکان لگ بھگ دس مرلہ زمین پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کراچی والے اس مکان کے رقبے کو کم و بیش تین سو گز سمجھ لیں۔ کریم بخش فیملی والا تھا اور اس کے فیملی ممبرز کی تعداد چھ تھی لہٰذا مکان کے بیشتر حصے پر انہی لوگوں کا قبضہ تھا۔ پٹواری امیر بخش کے تصرف میں صرف ایک کمرا ہی تھا اور مذکورہ کمرا گھر کے داخلی دروازے کی ایک جانب بنا ہوا تھا اور دوسری طرف بیٹھک تھی۔ بیٹھک کی طرح پٹواری والے کمرے میں داخلے کے لیے ایک دروازہ باہر کی سمت بھی تھا۔ میں کریم بخش کے ہمراہ گھر کے اندرونی حصے سے چلتے ہوئے اس کمرے تک پہنچا تھا لہٰذا مذکورہ کمرے میں داخل ہونے کے لیے ہم نے اندرونی دروازہ استعمال کیا تھا۔

وہ ایک کشادہ کمرا تھا جس میں انسانوں کی آمد و شد کے لیے دو دروازے تھے اور روشنی و ہوا کے گزر کے لیے ایک کھڑکی موجود تھی جیسا کہ متاثرہ چودھری فیروز کی وہ خواب گاہ تھی جہاں مبینہ طور پر ڈاکوؤں نے اسے بائیں ٹانگ سے محروم کر دیا تھا جبکہ یہاں پر پٹواری کی دائیں کلائی کو ہاتھ کے وجود سے بے نیاز کر دیا گیا تھا۔ یہ خاصا عجیب مگر دلچسپ اتفاق تھا۔ ایک اور قدر مشترک یہ بھی تھی کہ دونوں کے کمرے کے آگے کشادہ صحن تھا یعنی چودھری کی خواب گاہ کے سامنے اور پٹواری کی خواب گاہ کے پہلو میں......!

پٹواری امیر بخش کے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر گرم بستر بھی نظر آ رہا تھا تاہم مذکورہ بستر پر مجھے کہیں بھی خون کے دھبے دکھائی نہیں دیے البتہ کمرے کے فرش پر چوبی مڈی موجود تھی جس کے نزدیک دور دور تک خون پھیلا ہوا تھا۔ میں خون آلود فرش کا معائنہ کر ہی رہا تھا کہ کریم بخش نے دکھ بھرے لہجے میں مجھے بتایا۔

''وہ ظالم لوگ امیر بھائی کا ہاتھ کاٹنے کے بعد انہیں ادھر ٹھنڈے فرش پر ہی تڑپتا ہوا چھوڑ گئے تھے۔ جب ہم نے یہاں آ کر دیکھا تو ان کا چہرہ تکیے کے غلاف میں چھپا ہوا تھا اور وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا رہے تھے۔ پھر ہم انہیں اٹھا کر گھر کے دوسرے حصے میں لے گئے تھے۔''

کریم بخش اپنی بات مکمل کر چکا تو میں سوچنے لگا حملہ آور ڈاکوؤں کو گدھے گھوڑے کی خوب پہچان تھی۔ پٹواری کا آپریشن کرنے کے بعد وہ اسے ''مذبح'' پر ہی پھینک گئے تھے جبکہ چودھری کی ''سرجری'' کے بعد وہ اسے گرم بستر پر لٹا گئے تھے۔

مجھے کمرے میں ایک ناگوار سی بو کا احساس ہو رہا تھا۔ جب سے میں اس کمرے میں داخل ہوا تھا، یہ بو مسلسل میرے نتھنوں پر دستک دے رہی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ فرش پر پھیلے ہوئے خون کی بو ہے لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ محض بو ہی نہیں بلکہ بدبو ہے...... ایک مخصوص بساند!

میں اس وقت اکڑوں بیٹھ کر فرش کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس بساند کا ماخذ مجھے نظر آ گیا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پٹواری کے پلنگ کے نیچے ایک، گھٹنے سے کٹی ہوئی ٹانگ پڑی تھی۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ادھوری ٹانگ ظفر گڑھ کے مطلق العنان چودھری فیروز کے بدن کا ہی حصہ تھی......!

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کریم بخش کی طرف دیکھ کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس پلنگ کو ہٹانے میں میری مدد کرو۔''

مذکورہ پلنگ خاصا وزنی تھا ورنہ میں اکیلا ہی اسے گھسیٹ لیتا۔ کریم بخش کوئی سوال کیے بغیر میرے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم دونوں نے پلنگ کو اٹھا کر دوسری جگہ پر رکھ دیا۔ اگلے ہی لمحے کریم بخش کے حلق سے ایک حیرت بھری آواز خارج ہوئی۔

''تھانے دار صاحب...... یہ کیا ہے......؟''

''یہ تمہارے بھائی امیر بخش کے عزیز از جان دوست چودھری فیروز کی ٹانگ کا ایک حصہ ہے جو پچھلی

رات ڈاکوؤں نے حویلی میں کاٹی تھی۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کریم بخش کو بتایا۔ ''اب آپ خود اندازہ لگا لو کہ آپ کے بھائی کا کٹا ہوا ہاتھ کہاں پایا جائے گا؟''

وہ بے ساختہ بولا۔ ''جہاں ماجھا تیسری کارروائی کرے گا۔''

''بالکل درست!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ ایک ذہین انسان ہیں۔ اب جلدی سے کوئی ایسا تھیلا یا بوری لے آؤ جس میں اس کٹی ہوئی بساندی ٹانگ کو بند کیا جاسکے۔''

''جی ٹھیک ہے......'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں نے گزشتہ روز اسپتال میں چودھری فیروز سے تفصیلی ملاقات کی تھی اس لیے میں اس ٹانگ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کیونکہ چودھری کو لباس تبدیل کیے بغیر ایمرجنسی میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اس ادھوری بے جان ٹانگ پر وہی لباس موجود تھا جو چودھری نے زیب تن کر رکھا تھا۔

دو منٹ سے پہلے کریم بخش لوٹ آیا۔ سعید بھی اس کے ساتھ تھا۔ کریم بخش کے ہاتھ میں مجھے کھاد والی خالی بوری نظر آئی تو میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا۔

''کریم بخش......! یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ کھاد والی خالی بوری اٹھا لائے۔ کٹی ہوئی ٹانگ کی بساند کھاد کی مخصوص بو میں نفوذ ہو کر اپنا وجود کھو دے گی۔ اب تم لوگ جلدی سے اس ادھوری ٹانگ کو کھاد والی بوری میں قید کر کے بوری کے منہ کو اچھی طرح بند کردو۔''

آئندہ دس منٹ میں ان باپ بیٹے نے میری ہدایت کے مطابق چودھری فیروز کی کٹی ہوئی ٹانگ کو ''پیک'' کر کے گھر کے صحن میں ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد کریم بخش کا بیٹا سعید وہاں سے چلا گیا۔ میں دوبارہ پٹواری کے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

''اس الماری میں کیا ہے؟'' میں نے ایک دیوار کے ساتھ استادہ چوبی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''امیر بھائی اس الماری میں اپنے ضروری کاغذات رکھتے ہیں جیسا کہ مختلف فائلیں اور دیگر دستاویزات......'' اس نے بتایا۔ ''اس کی چابی بھائی صاحب کے پاس ہی ہوتی ہے اس لیے میں الماری کو کھول کر آپ کو نہیں دکھا سکتا۔''

''اس کی ضرورت نہیں کریم بخش! مجھے آپ کی بات پر بھروسا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کے بھائی کوئی معمولی انسان نہیں ہیں۔ وہ ایک پٹواری ہیں۔ زمین و جائداد کے کاغذات سے ان کا صبح شام کا واسطہ ہے۔ میں ان کے کام کو سمجھ سکتا ہوں۔''

''تھانے دار صاحب!'' وہ تملق آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ ہم لوگوں پر ایک مہربانی کردیں تو ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھیں گے......'' بات کے اختتام پر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے تھے۔

مجھے اس کی حالت پر بہت ترس آیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے بے پناہ کرب جھلکتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کریم بخش! اس انداز میں خوشامد کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بتائیں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ اگر قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے میرے لیے ممکن ہوا تو ضرور کروں گا۔''

''ماجھا کی اصل دشمنی چودھری فیروز سے ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چودھری کا امیر بھائی سے بہت میل ملاپ ہے اسی لیے وہ بھائی کے خلاف ہو گیا ہے۔ آپ ماجھا کی اس مخالفت کو بغض للّٰہی سمجھ لیں......!''

''ہوں......'' میں نے گہری نظر سے کریم بخش کی طرف دیکھا اور ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''ماجھا کی چودھری فیروز سے کیا دشمنی ہے؟''

''دیکھیں جی، میں اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سیدھا سادہ زمیندار ہوں اس لیے خوامخواہ کے معاملات میں نہیں پڑتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن امیر بھائی کا کام ایسا ہے کہ انہیں ہر قسم کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے جس میں اچھے بُرے سبھی شامل ہیں۔ ان سے تو گھر پر ملاقات کرنے بھی کئی افراد آتے ہیں۔ یہ کرسیاں انہوں نے اپنے ملاقاتیوں کے لیے ہی رکھی ہوئی ہیں......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لگی چار کرسیوں کی جانب اشارہ کردیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی مذکورہ کرسیوں پر میری نگاہ پڑی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ کریم بخش سے اس بارے میں استفسار کروں گا لیکن ادھوری ٹانگ کی ''بازیابی'' نے میری تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کرلی تھی اور میں کریم بخش سے پوچھنا بھول گیا تھا۔

کریم بخش کے نامکمل جواب پر میں نے کہا۔ ''آپ نے مجھے ماجھا اور چودھری فیروز کی دشمنی کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''میں اسی طرف آ رہا تھا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ چودھری کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے......!''

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ چودھری کے غیظ و غضب سے حد درجہ خوفزدہ تھا مگر اپنے پٹواری بھائی کی پوزیشن صاف کرنے کا بھی متمنی تھا اسی لیے وہ بے محابا کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

''کریم بخش!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تم نے مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تو سمجھو، یہ معاملہ یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو اس گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں جائے گی لیکن ابھی یا بعد میں بھی یہ پتا چلا کہ آپ نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی تو پھر مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہیں رکھنا۔ چودھری فیروز تو ہوسکتا ہے امیر بخش کی دوستی کے طفیل آپ کو معاف کر دے مگر قانون کو گمراہ کرنے کے جرم میں، میں آپ کا وہ حشر کروں گا جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے......!''

''اگر میں آپ سے کچھ بھی غلط کہوں تو میرا جھوٹ میری اولاد کے لیے قہر بن جائے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''اس سے زیادہ میں آپ کو کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا......!''

میں نے بغور کریم بخش کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور مجھے وہاں کسی قسم کی روباہی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''شروع ہو جائیں۔ میں سن رہا ہوں۔''

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں کریم بخش نے مجھے ظفر گڑھ، وہاں کے چودھری خاندان اور ماجھا اینڈ کمپنی کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ حوالدار خادم حسین کی فراہم کردہ معلومات سے میل کھاتا تھا۔ اس سے مجھے دو باتوں کا یقین ہوگیا۔ اول، خادم حسین میرے ساتھ بہ الفاظِ دیگر قانون کے ساتھ صد فیصد مخلص تھا۔ دوم، چودھری فیروز اور اس کا فرزند صغیر چودھری انعام رذیل درجۂ اول تھے۔ انہیں کسی بھی طرح کی تعویق دینا ایک سنگین غلطی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے طامع اور سفاک افراد کی سرکوبی مجھ پر واجب ہوگئی تھی۔ قبل اس کے کہ ان کی کوئی نئی رذالت میری سماعت تک رسائی حاصل کر پاتی، مجھے کوئی ہنگامی قدم اٹھانا تھا۔

کریم بخش خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ نے کبھی اپنے بھائی امیر بخش کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ چودھری فیروز جیسے گرگِ گرسنہ افراد سے دور رہیں کیونکہ اس قماش کے لوگوں کی گرسنگی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں...... چھڈ بُرے دی یاری......!''

''امیر بھائی مجھ سے بڑے ہیں اور پڑھے لکھے بھی ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''میری بات کا ان پر اثر نہیں ہوتا اور میں زیادہ زور بھی نہیں دے سکتا۔ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتے ہیں، پھر وہ کسی کی نہیں سنتے۔ وہ ہمیشہ سے اپنی مرضی کے مالک رہے ہیں۔ جب ہمارے ماں باپ زندہ تھے تو انہوں نے بڑی کوشش کی کہ امیر بھائی شادی کر لیں لیکن یہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ اگر انہوں نے ٹھیک وقت پر شادی کر لی ہوتی تو آج ان کے بھی بچے ہوتے۔ وہ یوں تنہائی کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔ خیر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولا۔

''جو سوہنے رب کی مرضی......!''

''کریم بخش......!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی امیر بخش کو راہِ راست پر لانے کا کوئی راستہ نکال لوں گا اور ہاں...... ہمارے بیچ ابھی جو بات چیت ہوئی ہے، اسے بھول جانا۔''

اس وقت ہم دونوں کے سوا پٹواری کے کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جی تھانے دار صاحب...... آپ کا جو حکم!''

اچانک میری نظر پٹواری کے کمرے کے اس دروازے پر پڑی جو باہر گلی میں کھلتا تھا۔ اس وقت مذکورہ دروازے پر اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے انگلی سے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کریم بخش سے پوچھا۔

''کیا امیر بخش گھر میں آمد و رفت کے لیے یہی دروازہ استعمال کرتا ہے؟''

''نہیں جناب! یہ دروازہ صرف ان کے ملاقاتیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔'' کریم بخش نے بتایا۔ ''بھائی گھر میں داخلے کے دروازے ہی سے آتے جاتے ہیں جیسا کہ ہم سب کرتے ہیں۔ پھر گھر سے اپنے کمرے میں جانے کے لیے وہ یہ دروازہ استعمال کرتے ہیں۔'' اس نے کمرے کے پہلو والے گھر کی سمت کھلنے والے دروازے کی طرف

اشارہ کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتایا۔ ''جب کوئی بندہ اپنے کسی کام سے بھائی کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے لیے بیرونی دروازہ کھولتے ہیں تاکہ گھر میں پردے کے معاملات متاثر نہ ہوں۔''

''آج کس وقت آپ لوگوں کو پتا چلا کہ امیر بخش کے ساتھ کوئی اذیت ناک حادثہ پیش آچکا ہے؟'' میں نے کریم بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس وقت فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔'' اس نے روہانسی آواز میں بتایا۔ ''امیر بھائی کی چیخوں کی آواز سب سے پہلے میں نے ہی سنی تھی بلکہ یوں سمجھیں کہ میری آنکھ اسی دردناک آواز سے کھلی تھی۔ میں نے فوراً منظور اور سعید کو جگایا پھر ہم تینوں امیر بھائی کے کمرے میں پہنچ گئے اور ہم نے دیکھا امیر بھائی فرش پر پڑے بری طرح تڑپ رہے تھے۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے اپنی دائیں کلائی کو پکڑ رکھا تھا اور اس کلائی پر ہاتھ کہیں نظر نہیں آرہا تھا بلکہ کلائی کے مقام سے خون نکل کر کمرے کے فرش پر پھیل رہا تھا۔ ہم گھائل امیر بھائی کو اٹھا کر گھر کے دوسرے حصے میں لے گئے اور خوب کس کر ان کی زخمی کلائی پر پٹی باندھ دی......''
اس نے توقف کرکے ایک جھرجھری لی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اس کے بعد ہی میں نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے تھانے کا رخ کیا تھا۔ باقی کے حالات آپ کے سامنے ہیں......''

''کریم بخش! اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے آخری سوال کا جواب دیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''جب آپ باپ بیٹے امیر بخش کی چیخیں سن کر اس کمرے میں پہنچے تو کمرے کا گلی کی طرف کا دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا......؟''

''اس دروازے کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔'' وہ متذکرہ بالا دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میں نے ہی اس دروازے کو بند کرکے کنڈی لگادی تھی۔''

حملہ آوروں کا کھیل میری سمجھ میں آگیا تھا۔ ان لوگوں میں کوئی ایسا شخص بھی شامل تھا جسے امیر بخش اچھی طرح جانتا تھا اور اسی نامعلوم شخص کی آواز پر پٹواری نے کمرے کا دروازہ کھولا ہوگا یا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان ڈاکوؤں میں سے کسی نے کمال ہوشیاری سے پٹواری کے کسی شناسا بندے کی آواز کی نقالی کرکے پٹواری سے دروازہ کھلوالیا ہو۔ اس معاملے کی حقیقت پٹواری کے تفصیلی انٹرویو کے بعد ہی کھل کر سامنے آسکتی تھی۔

میں نے نصیر آباد کو سردست خیرباد کہا اور چودھری فیروز کی ''پیک'' ٹانگ کو لے کر تھانے کی سمت روانہ ہوگیا۔ میرا ارادہ تو ظفر گڑھ جانے کا تھا لیکن تھانہ چونکہ راستے میں پڑتا تھا اس لیے میں نے حوالدار خادم حسین کو ٹچ کرنا ضروری سمجھا تھا کیونکہ اس کیس کے حوالے سے میرے ذہن میں جس منصوبہ بندی کا عمل جاری تھا اس کے بارے میں خادم حسین کو آگاہ کرنا ناگزیر تھا۔ میں نے جو کچھ سوچ لیا تھا، اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف مراحل پر مجھے خادم حسین کے پُرخلوص تعاون کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس کا اس منصوبے کی جزئیات سے واقف ہونا نہایت ہی اہم تھا۔

☆☆☆

ظفر گڑھ پہنچنے سے پہلے ہماری آمد کی اطلاع وہاں تک رسائی حاصل کرچکی تھی۔ چودھری اکرام نے اپنے حواریوں کے ساتھ حویلی کے داخلی گیٹ پر ہمارا استقبال کیا۔ رئیس، پٹواری امیر بخش کو اسپتال پہنچا کر واپس آگیا تھا۔ میں نے اسے ظفر گڑھ کے دورے کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اسی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ چودھری فیروز کو آج صبح ہی اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت اپنی حویلی میں موجود ہوگا۔ میں نے کانسٹیبل کو ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود چودھری اکرام کی معیت میں چودھری فیروز کے پاس پہنچ گیا۔

چودھری فیروز اس وقت ایک آرام دہ گرم بستر پر گداز تکیوں سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ یہ وہ خواب گاہ نہیں تھی جہاں پر قصابی ڈاکوؤں نے اس کے تن سے ایک ٹانگ کو جدا کردیا تھا۔ میں چودھری کے بیڈ کے نزدیک ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''اب آپ کی ٹانگ کی تکلیف کیسی ہے؟''

''درد کافی کم ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں بہت ہمت والا ہوں ملک صاحب! اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا۔ بس ذرا میری طبیعت ٹھیک ہوجائے پھر میں خود اس کمینے ماجھا کو ڈھونڈ کرکتے کی موت ماروں گا۔ حرامزادے نے مجھے زندگی بھر کے لیے بیساکھی کا محتاج بنادیا ہے۔ اگر وہ میری کٹی ہوئی ٹانگ کو ادھر ہی چھوڑ جاتا تو شاید ڈاکٹرز کسی آپریشن کے ذریعے میری ٹانگ کو جوڑ دیتے......!''

چودھری اکرام مجھے چودھری فیروز کے پاس چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس وقت میرے اور چودھری فیروز کے سوا اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے

چودھری کی بات مکمل ہونے پر کہا۔
''آپ کی گمشدہ ٹانگ کو میں نے تلاش کر لیا ہے مگر اس کی حالت ایسی نہیں کہ کسی معجزاتی جراحی کے بارے میں سوچا جاسکے۔ ویسے آپ کی ٹانگ کو گھٹنے کے مقام پر جس بے دردی سے کاٹا گیا تھا اس کو دیکھتے ہوئے کوئی ڈاکٹر وقوعہ کی رات بھی آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا!''
پتا نہیں چودھری نے میری بات پوری سنی بھی یا نہیں، میرے خاموش ہوتے ہی اس نے اضطرابی لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ کو...... میری ٹانگ کہاں...... سے ملی...... وہ اس وقت...... کہاں ہے......؟''
اس کے سوالات کے جوابات دینے سے پہلے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا آپ کو پٹواری امیر بخش کی کوئی خیر خبر ہے؟''
''نہیں تو......'' وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہوا امیر بخش کو...... میں تو توقع کر رہا تھا کہ وہ ابھی مجھے دیکھنے آئے گا...... سب خیریت تو ہے نا......؟''
یہ بات تو صاف ہوگئی کہ پٹواری کو پیش آنے والے حادثے کی خبر ابھی تک ظفر گڑھ نہیں پہنچی تھی۔ میں نے چودھری فیروز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''امیر بخش ابھی چند روز تک آپ کی خبر گیری کے لیے نہیں آسکے گا کیونکہ اسے خود تیمارداری کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ وہ اس وقت اسی اسپتال میں ہے جہاں سے آپ ڈسچارج ہوئے ہیں۔''
''کک...... کیا ماجھا نے...... امیر بخش کی ٹانگ بھی...... کاٹ ڈالی ہے......؟'' وہ وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔
''نہیں۔ اس کا دایاں ہاتھ کلائی پر سے کاٹا گیا ہے۔'' میں نے چودھری کی وحشت میں دہشت کے چار چاند لگاتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے آج صبح نصیر آباد جا کر اسے اسپتال بھیجا ہے۔ آپ کی کٹی ہوئی ٹانگ مجھے امیر بخش کے پلنگ کے نیچے پڑی ملی ہے۔ میں اسے ایک بوری میں بند کر کے ساتھ لے آیا ہوں۔ وہ بوری باہر تانگے میں رکھی ہوئی ہے......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے چاروں جانب متلاشی نگاہ دوڑائی پھر معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔
''آپ کا چھوٹا بیٹا چودھری انعام مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا وہ حویلی سے باہر گیا ہوا ہے؟''
میں نے حوالدار خادم حسین کے ساتھ مل کر جو ماسٹر پلان تیار کیا تھا...... اس پر عملدرآمدگی کا آغاز کر دیا تھا۔

چودھری نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میرے بات سن کر پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔
''ملک صاحب! آپ نے انعام کا کیوں پوچھا ہے۔ مجھے آپ کے انداز سے کافی ڈر محسوس ہو رہا ہے......!''
''یہ معاملہ ہے ہی ڈرنے والا چودھری صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر جان کھینچ نکالنے والے انداز میں کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آپ چودھری انعام کو چند روز تک حویلی سے باہر نہ جانے دیں بلکہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں تو زیادہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حویلی کے اندر محافظوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیں۔ خاص طور پر رات میں کڑی پہرے داری کا معقول انصرام ہونا ضروری ہے......''
''یہ بھی...... تو بتائیں کہ...... معاملہ کیا ہے......؟'' وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
''جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے، ماجھا کا اگلا شکار چودھری انعام ہوسکتا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ نامراد انعام کے ساتھ کوئی بھی درندگی کر کے پٹواری کا کٹا ہوا دایاں ہاتھ گھائل انعام کے پاس چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو جائے گا۔''
''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب......'' وہ حد درجہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ ''انعام نے اس شیطان کا کیا بگاڑا ہے؟''
قبل اس کے کہ میں چودھری فیروز کے سوال کا جواب دیتا، اکرام ایک ملازم صورت شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ مذکورہ تنومند ملازم نے خوانِ ہفت نعمت اٹھا رکھا تھا۔ یہ سب میری خاطر داری کے لیے تھا۔ اکرام کی ہدایت پر جب ملازم نے وہ کنگ سائز ٹرے میرے نزدیک ہی ایک چوبی میز پر سجادی تو چودھری فیروز نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔
''اکرام...... انعام کہاں ہے؟''
''ابا جی! وہ باہر نکلا ہوا ہے۔'' اکرام نے احترام بھرے لہجے میں جواب دیا۔
''وہ جہاں بھی ہے اسے ڈھونڈ کر فوراً میرے پاس بھیجو۔'' چودھری نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی ضروری کام ہے۔''
''جی ابا جی......!'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔
اکرام اور ملازم کے جانے کے بعد چودھری نے مجھ سے

گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
افشاں آفریدی اور نایاب جیلانی کے قسط وار ناول اختتامی گھڑیاں سمیٹتے ہوئے
سعدیہ رئیس کا منی ناول میں انمول آخری منزل کی طرف گامزن
عورت کہانی میں پڑھیے فرحین اظفر کے ماہرانہ قلم سے لکھی چونکا دینے والی تحریر
سینئر رائٹرز عطیہ ہدایت اللہ، عالیہ حرا، سعدیہ ہما شیخ اور روحیلہ خان کی دل پذیر تحریریں
غزالہ عزیز کے دلکش قلم کا شاہکار...... مکمل ناول..... یقین کا سفر
شمع ہدایت میں
اختر شجاعت کا پُرروح مقالہ
حضور اکرم ﷺ کے پُرنور معجزات
شائستہ زریں لائی ہیں
ایک اور اچھوتے عنوان کے تحت
مختلف آرا پر مبنی سروے
صداکار، اداکار آصف الیاس سے خوب صورت ملاقات
اس کے علاوہ
عائشہ مصطفیٰ، خولہ سعید جاوید، فرح ریاض چیمہ،
سمیرا سرفراز و دیگر باصلاحیت لکھاریوں کی پُرکشش کاوشیں......

مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ’’ملک صاحب! آپ کھانا پینا جاری رکھیں اور مجھے بتائیں کہ ماجھا کی انعام سے کیا دشمنی ہے؟‘‘

’’سچ کیا ہے، یہ تو آپ مجھے بتائیں گے چودھری صاحب! اور میں صرف آپ کی بات پر یقین کروں گا کیونکہ آپ میری نظر میں نہایت ہی معتبر اور محترم ہیں......‘‘ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی عقل پر پٹی باندھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’لیکن ماجھا کے دماغ میں آپ لوگوں کے خلاف جو زہر بھرا ہوا ہے وہ اسی کے مطابق اقدام کر رہا ہے......‘‘

’’اس بغلول کے بھیجے میں کون سا خناس سمایا ہوا ہے؟‘‘ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں نے کسی تکلف کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اللہ کی عظیم نعمتوں سے انصاف کا عمل جاری رکھا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں چودھری فیروز کو آئینہ دکھا دیا۔ میری بات سن کر چودھری کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

’’لگتا ہے اس احمق کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ جیل سے فرار ہو کر خود کو کوئی سلطانہ ڈاکو یا ملنگی سمجھنے لگا ہے۔ میری نظر میں وہ ایک تھرڈ کلاس اور کم ظرف انسان ہے جو یوں رات کی تاریکی میں چھپ کر سنگین وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔ یہ اس کی بسالت نہیں، گھٹیا پن ہے۔ ایک بار وہ میرے ہتھے چڑھ جائے تو میں اس کی کمین کو ایسا پاٹ پڑھاؤں گا کہ اس کی آنے والی سات نسلیں آتے جاتے کو روک کر پوچھا کریں گی...... ہمارا ابا کون ہے؟‘‘

’’آپ اپنے حواس اور اعصاب کو قابو میں رکھیں چودھری صاحب!‘‘ میں نے ہاتھ روکے بغیر اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ’’آپ کا پُرسکون رہنا صحت کے لیے ناگزیر ہے۔ میں نے کہا نا، میں اسی بات پر یقین کروں گا جو آپ کے منہ سے نکلے گی۔ ماجھا کیا سوچتا پھر رہا ہے، اس کی مجھے بالکل پروا نہیں۔ آپ کو تو اس لیے بتا دیا کہ مخالف پارٹی کی ذہنیت آپ پر عیاں ہو جائے......‘‘

یہ امکان میرے ذہن میں تھا کہ کہیں چودھری یہ نہ پوچھ بیٹھے کہ مجھے ماجھا کی منصوبہ بندی کا علم کیسے ہوا؟ لیکن خیریت گزری کہ اس نے ایسا کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ، پٹواری کے ہاتھ کے عبرت ناک حشر اور مستقبل قریب میں چودھری انعام کے ساتھ ہونے والی کسی متوقع بہیمانہ کارروائی کے بھیانک تصور نے چودھری کی مت مار دی تھی۔ ان لمحات میں وہ مجھے اپنا سب سے زیادہ ہمدرد انسان سمجھ رہا تھا...... ان بے ایمان حالات میں مجھ ایسے اپنے خیر خواہوں سے ایسے سوالات نہیں کیے جاتے۔ ویسے اگر وہ اس پٹڑی پر آ بھی جاتا تو اسے ریڈ سگنل دینے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا......!

’’سچ کیا ہے، یہ میں آپ کو بتاتا ہوں ملک صاحب......!‘‘ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ’’ماجھا کے باپ نے آج سے لگ بھگ پانچ سال پہلے مجھ سے کچھ رقم قرض لی تھی پھر وہ میرے پیسے واپس کرنا بھول گیا۔ سال پر سال گزرتے رہے مگر قرض کی رقم وہیں کی وہیں رہی۔ جب اس بات کو تین سال ہو گئے تو انہی دنوں ماجھا اور نیاز احمد میں جھگڑا ہو گیا اور ماجھا نے نیاز کا خون کر دیا اور عدالت سے عمر قید کی سزا پا کر وہ جیل چلا گیا۔ انہی دنوں میں نے ماجھا کے باپ کو حویلی بلا کر کہا کہ منافع کی رقم کو میں معاف کر دیتا ہوں بس وہ اصل زر مجھے لوٹا دے لیکن اس نے میری بات نہیں مانی۔ میں نے مجبوراً اس کی زمین اپنے قبضے میں کر لی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اسے اگر کچھ اور رقم دے دوں تو وہ اس پانچ ایکڑ اراضی کو میرے نام لگوانے کے لیے تیار ہے۔ میں نے امیر بخش کی موجودگی میں سراج دین کو ایک معقول رقم دے کر مختلف قانونی کاغذات پر اس کے انگوٹھے لگوا لیے۔ اس طرح وہ زمین میری ہو گئی۔ باقی جہاں تک ماجھا کی ماں اور بہن کی موت کا معاملہ ہے تو......‘‘ اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’صفیہ اور شاداں کی اموات میں میرے بیٹے چودھری انعام کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس رات واقعتاً ڈاکوؤں نے ان کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں ڈاکو تو لوٹ مار ہی کیا کرتے ہیں۔ اس گھر میں لوٹنے کے لیے کوئی قیمتی شے، سونا چاندی یا نقدی موجود نہیں تھی اس لیے انہوں نے ماجھا کی بہن کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ شاداں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ صفیہ نے ان کے اس مقصد کے راستے میں اندھی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو انہوں نے صفیہ کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر وہ شاداں کے تعاقب میں مکان کی چھت پر پہنچ گئے۔ شاداں نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو مرتے ہوئے دیکھ لیا تھا لہٰذا اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے چھت سے کود کر جان دے دی...... یہ ہے سچائی ملک صاحب! اگر ماجھا افترا پردازی سے کام لے کر اپنے باپ، ماں اور بہن کی اموات کا ملبا میری حویلی پر ڈالنے کے

بارے میں سوچ رہا ہے تو میں اس کی عقل پر ماتم ہی کر سکتا ہوں جناب......!''

چودھری فیروز ان لمحات میں مجھے ''گربہ مسکین'' کی عملی تفسیر نظر آرہا تھا۔ اس نے خود کو دودھ کا دھلا ثابت کرنے کے لیے کسی چالاک روباہ کے انداز میں ایک یکطرفہ کہانی سنائی تھی۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کہانی میں چودھری نے کہاں کہاں بددیانتی سے کام لیا تھا لیکن میں نے اسے اس امر کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کے پیش کردہ اس جھوٹوں کے بنچے کے اندر کا احوال جانتا ہوں۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب! میری نظر میں آپ کی بات کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ماجھا کیا سوچتا ہے، میری طرف سے وہ خصماں نوں کھائے اور بھاڑ میں جائے......!''

''یہ ہوئی نا مردوں والی بات......'' وہ خوش ہو گیا۔

''ملک صاحب! آپ میرے سچے خیر خواہ ہیں۔'' اس نے عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے پہلے والے تھانہ انچارج سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اور فیض محمد اکثر میری حویلی پر بھی آیا کرتے تھے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ میری خوب نبھے گی۔ ہمارا گٹھ بندھن فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ثابت ہوگا۔''

بات کے اختتام پر چودھری نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس کے دستِ دراز کو تھام لیا اور معنی خیز انداز میں کہا۔

''جو اللہ کو منظور چودھری صاحب!''

''میں دوستوں کے لیے اپنے دل اور ہاتھ کو ہمیشہ کھلا رکھتا ہوں ملک صاحب......'' وہ میرے ہاتھ کو پُرمعنی گرمجوشی سے دباتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے کسی قسم کا کوئی بھی کام ہو، ہچکچانا نہیں......آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا......؟''

''جی چودھری صاحب!'' اس کی خوش فہمی کو بانس پر چڑھاتے ہوئے میں نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''آپ کی اس مہربان پیشکش کے لیے میں تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اگر کوئی احتیاج ہوئی تو آپ کو بتاؤں گا۔''

''ہماری دوستی تو سدا شاد و آباد رہے گی ملک صاحب......'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

''اب آپ فوری طور پر ایک اہم کام کریں۔''

''آپ حکم کریں چودھری صاحب!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کسی طرح اس منحوس ماجھا کو پکڑ کر دوبارہ جیل بھجوا دیں۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''تف ہے اس ذلیل انسان پر۔ بیٹھے بٹھائے ہم سب کو مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں تو کہتا ہوں ماجھا پر اس قسم کا کیس بنائیں کہ سیدھا پھانسی کے پھندے تک جائے......''

''آپ فکر نہ کریں چودھری صاحب! میں نے ماجھا کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''میں اس کی خود بینی کو خاک میں ملا کر رکھ دوں گا لیکن فوری طور پر میرے پیشِ نظر ایک اور اہم کام ہے اور یہ کام ماجھا کی گرفتاری سے پہلے ہونا چاہیے......!''

میں نے آخری الفاظ بڑے پراسرار انداز میں ادا کیے تھے۔ وہ چونک اٹھا اور چند لمحات تک قیاسہ لگانے والے انداز میں مجھے تکتا رہا پھر جزع بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب! آپ کس اہم کام کی بات کر رہے ہیں؟''

''چودھری انعام کی حفاظت کا بندوبست......'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''حالات و واقعات کے مطابق ماجھا آج رات انعام کے ساتھ کوئی غیر انسانی کارروائی کرنے کی غرض سے آپ کی حویلی میں گھسے گا۔ میں نے ماجھا کا شکار کرنے کے لیے قلابہ ڈال دیا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی ڈاکو کسی بھی صورت بچ نہیں سکیں گے۔''

''میں سمجھا نہیں ملک صاحب......!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے ماجھا کو پکڑنے کے لیے کون سا کانٹا ڈالا ہے۔ وہ خاصی تگڑی مچھلی ہے۔ آپ کا قلابہ مضبوط تو ہے نا؟''

''ایک دم لوہا لاٹ چودھری صاحب!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''آپ تو اپنے طور پر حفاظتی اقدامات کریں گے سو کریں گے، آج صبح سے میں نے بھی اپنے چند سادہ لباس اہلکاروں کو ظفر گڑھ میں تعینات کر دیا ہے۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں گھل مل کر آپ کی حویلی پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں۔ کڑی نگرانی کا یہ کام دن بھر جاری رہے گا اور رات کا اندھیرا پھیلتے ہی میرے بندے کسی کی نگاہ میں آئے بغیر حویلی کے بہت نزدیک آ جائیں گے اور پوری رات جاگ کر... پہرا دیں گے۔ اگر ماجھا نے آپ کی حویلی کی طرف آنے کی کوشش کی تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔''

''یہ تو آپ نے بہت بڑا کام کر دیا ہے ملک صاحب......!'' وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے

بولا۔ ''بلکہ یوں سمجھیں کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرے بندے اور آپ کے بندے مل کر حویلی کی حفاظت کریں؟''

''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میرے بندوں کا سب کی نگاہوں سے چھپا رہنا ضروری ہے۔ آپ اسے میری حکمتِ عملی سمجھ لیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب......!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ اپنے معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔''

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ چودھری انعام وہاں پہنچ گیا۔ اس نے باری باری ہم دونوں کو سلام کیا پھر چودھری فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اکرام بھائی نے بتایا ہے کہ آپ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے میرے پاس بھی ایک سنسنی خیز خبر ہے......''

''بیٹا جی! پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ اور مجھے وہ خبر سناؤ جو تمہارے پاس ہے۔'' چودھری فیروز نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ تمہیں کس مقصد سے بلایا ہے۔''

وہ ایک کرسی کھینچ کر میرے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ اس دوران میں چپکے چپکے سے میں نے خورونوش کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ میں کوئی چٹور قسم کا انسان نہیں ہوں لیکن آج صبح میں ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کر پایا تھا اور اس کے بعد بھاگ دوڑ کا ایک ایسا تھکن رسیدہ سلسلہ شروع ہوا تھا کہ مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت میسر نہیں آئی تھی، پیٹ پوجا تو بہت دور کی بات ہے اور آپ جانتے ہیں کہ موسم سرما میں ایک متحرک انسان کو ویسے بھی زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا جب مجھے چودھری فیروز کی حویلی میں ٹک کر بیٹھنے کا موقع ملا اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے سجا ہوا خوان میرے سامنے آیا تو میں تمام تر تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر کام سے لگ گیا تھا......!

''ابا جی......!'' چودھری انعام نے سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''ادھر نصیر آباد میں آج سحری کے وقت ڈاکو پٹواری امیر بخش کا ایک ہاتھ کاٹ کر اپنے ساتھ لے گئے ہیں......''

''یہ سارا قصہ ملک صاحب کی زبانی میں سن چکا ہوں۔'' چودھری نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''انہوں نے ہی صبح امیر بخش کو اسپتال بھیجا تھا۔''

''اوہ اچھا......!'' وہ تشویش بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے اس شیطان ماجھا کو اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے؟ اس شیطان کو پکڑ کر پھانسی لگوائیں۔ سارے مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔''

''ملک صاحب نے ماجھا کو گرفتار کرنے کے لیے اپنا جال بچھا دیا ہے۔'' چودھری فیروز نے انعام کو بتایا۔ ''وہ جیسے ہی حویلی میں قدم رکھے گا، پکڑ میں آجائے گا۔''

یکایک، چودھری انعام کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے حیرت، غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ باری باری ہم دونوں کو دیکھا پھر اپنے باپ سے پوچھا۔

''وہ بدذات ہماری حویلی میں قدم کیوں رکھے گا؟''

جواب میں چودھری فیروز نے سمجھانے والے انداز میں اسے حالات کی سنگینی سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ ''میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے بیٹا جی۔ ابھی چند روز تک آپ حویلی سے باہر نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے......''

''ابا جی...... اس زلہ ربا کی اتنی ہمت کہ ہمیں للکارے گا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ کی نرمی نے ان کمی کمین لوگوں کو اتنی ہمت دی ہے۔ ہمیں بہت پہلے ماجھا کا کوئی مناسب بندوبست کر دینا چاہیے تھا۔''

اس وقت ان باپ بیٹے کے درمیان بات ہو رہی تھی لیکن میری توجہ کا مرکز چودھری انعام کا چہرہ تھا۔ جب چودھری فیروز اسے شاداں کی خودکشی والے واقعے کے حوالے سے، ماجھا کے خطرناک عزائم سے محتاط رہنے کی تلقین کر رہا تھا تو میں نے انعام کی آنکھوں میں سراسیمگی ہلکورے لیتے دیکھی تھی اور اس کے چہرے پر بھی تشویش بھری گھٹا امڈ آئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اس افسوسناک واقعے کا ذمے دار چودھری انعام ہی تھا۔ اسی کے بھیجے ہوئے بندے ڈاکوؤں کے بہروپ میں شاداں کو اٹھانے گئے تھے۔ نتیجے میں مزاحمت کرنے پر شاداں کی ماں صفیہ بی بی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور شاداں نے چھت سے کود کر جان دے دی تھی۔ اگر چودھری انعام کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اس کی شکل پر یوں بارہ نہ بج رہے ہوتے......!

''جب میں ہوں تو پھر آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے براہِ راست چودھری انعام کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ماجھا کے مناسب اور نامناسب سارے بندوبست میں نے ہی کرنا ہے۔ ویسے تو یہ حویلی کسی دمدمے سے کم نہیں ہے لیکن دو رات پہلے اسی حویلی میں بڑے چودھری صاحب کے ساتھ جو واقعہ پیش آچکا ہے

اس کو دیکھتے ہوئے حد سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے جو انتظامات کیے ہیں ان کی تفصیل میں چودھری صاحب کو بتا چکا ہوں مگر خاص طور پر تمہاری حفاظت کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں کچھ ہے......!''

''کیا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

چودھری فیروز بھی سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں ابھی تھانے پہنچ کر اپنے اسٹاف کے ایک خاص شخص کو سادہ لباس میں یہاں بھیج دوں گا۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''وہ پولیس اہلکار مسلح ہوگا اور پوری رات تمہارے کمرے میں بطور محافظ موجود رہے گا۔ اسے مجرموں سے نمٹنے کے ایک سو ایک گر آتے ہیں لہٰذا تمہیں خوف زدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔''

وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔''

میں چودھری فیروز اور اس کے بیٹے کے ساتھ بے حد سنجیدگی سے جو بھی مائنڈ گیم کھیل رہا تھا، وہ میرے اور حوالدار خادم حسین کے درمیان طے ہونے والے ایک منصوبے کا حصہ تھا۔ یہ ذہنی اور نفسیاتی کھیل دراصل اس کم ظرف فیملی کے گندے انڈوں کو بے نقاب کرنے کی غرض سے رچایا گیا تھا۔ اس اسکرپٹ کے مطابق میں آج کی رات خادم حسین کو چودھری انعام کے کمرے میں پہنچانے والا تھا۔ خود میری مصروفیات بھی کم پراسرار نہیں تھیں۔

''چودھری صاحب! اب میں اجازت چاہوں گا۔ بہت سارے کام میرے سر پر سوار ہیں۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں...... یہ بھی بتا دیں کہ آپ کی ٹانگ کا کیا کرنا ہے۔ وہ باہر تانگے میں رکھی ہوئی ہے...... آپ کی امانت کے طور پر......!''

''جب وہ دوبارہ میری ٹانگ کے ساتھ جوڑی نہیں جاسکتی تو پھر میں اس کا کیا کروں گا......!'' وہ ایک حسرت بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تو ایک سفاک حقیقت ہے کہ اب آپ کو اپنی بائیں ادھوری ٹانگ کے ساتھ ہی باقی کی زندگی گزارنا ہوگی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن وہ چونکہ نصف صدی تک آپ کے بدن کا حصہ رہی ہے اس لیے میں نے آپ سے پوچھ لیا......''

''آپ اسے اندر منگوائیں۔'' چودھری انعام نے مجھ سے کہا۔ ''ابا جی کو اس کا دیدار کرانے کے بعد ہم اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرا دیں گے۔''

چودھری انعام نے ایک طفلانہ بات کی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''ٹانگ کا وہ حصہ اب ایسا نہیں رہا کہ اس بوری کو یہاں حویلی کے اندر لا کر کھولا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو پوری حویلی میں اس کی بساند پھیل جائے گی۔''

''ملک صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بیٹا جی!'' چودھری فیروز نے میری طرف داری کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ملازموں سے کہہ کر وہ بوری تانگے سے اتروالو اور انہیں تاکید کردو کہ وہ ابھی اور اسی وقت اسے لے جا کر کہیں دفن کردیں۔''

آئندہ دس منٹ میں، میں نے چودھری فیروز کی بوری بند بساندی ٹانگ کو اس کے فرزند صغیر کے سپرد کیا اور کانسٹیبل رئیس کے ساتھ تانگے پر سوار ہو کر حویلی سے روانہ ہوگیا۔

تھانے کا رخ کرنے سے پہلے میں نے ظفر گڑھ کا ایک راؤنڈ لگانا ضروری سمجھا۔ یہ سب میرے منصوبے کا حصہ تھا۔ دو تین جگہ رک کر میں نے لوگوں سے ہلکی پھلکی بات چیت بھی کی۔ خاص طور پر نذیر حسین کے گھر کے سامنے اپنا تانگا رکوا کر میں گھر کے اندر بھی گیا اور نذیر حسین، اس کی بیوی شگفتہ بی بی اور ان کی بیٹی تاجی سے بھی رسمی علیک سلیک کی۔ تاجی کی عمر بیس سال تھی اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ تاجی معصوم صورت والی ایک دلکش و دلنشین لڑکی تھی۔ چاہِ ذقن نے اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔

جی ہاں...... میں اسی تاجی کی بات کر رہا ہوں جو اس کہانی کے مرکزی کردار معراج دین عرف ماجھا کی محبوبہ تھی!

☆☆☆

رات کے دس بجے تھے لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی ہو۔ ایک تو موسم سرما میں غروبِ آفتاب کافی جلدی ہوجاتا ہے، دوسرے گاؤں دیہات میں بسنے والے لوگوں کی شہری لوگوں کی طرح نوع بہ نوع مصروفیات بھی نہیں ہوتیں کہ وہ رات گئے تک جاگتے رہیں۔ اس وقت ماحول خاموش اور فضا ساکت تھی اور اس ٹھنڈے ٹھار سناٹے میں موضع ظفر گڑھ سہانی نیند کے مزے لے رہا تھا۔

میں اس وقت اپنے ایک چاق و چوبند کانسٹیبل امجد علی کے ساتھ نذیر حسین کے گھر میں موجود تھا۔ ہم سادہ لباس میں تھے اور پوری تیاری کے ساتھ وہاں آئے تھے۔ میرے پاس اپنا سروس ریوالور تو موجود تھا ہی۔ علاوہ ازیں میں نے امجد کو بھی ایک رائفل تھما دی تھی تاکہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ میری توقع کے عین مطابق آج رات کسی وقت نذیر حسین کے گھر پر چودھری کے بھیجے ہوئے ڈاکو حملہ کرنے

والے تھے اور میری یہ توقع اس خفیہ منصوبے کی رہین منت تھی جو میں نے خادم حسین کے ساتھ مل کر بنایا تھا۔ خادم حسین اس وقت چودھری فیروز کی حویلی میں چودھری انعام کی حفاظت کا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی ہنگامی مدد کے لیے حویلی کے گیٹ کے نزدیک ہی کانسٹیبل مختار احمد نے مورچا سنبھال رکھا تھا۔ دوسرے کانسٹیبل فضل محمود کو واپس تھانے بلالیا گیا تھا۔ اس رات تھانے میں میرے اسٹاف کے کُل چار افراد موجود تھے۔ کانسٹیبلز فضل محمود، رئیس اور امانت علی اور ہیڈ کانسٹیبل فرید احمد۔ میں نے تھانہ سنبھالنے کی ذمے داری فرید احمد کو سونپ دی تھی۔ ہماری واپسی تک ان چاروں نے تھانے میں ریڈ الرٹ رہنا تھا اور مجھے امید تھی کہ ہم لوگ صبح سے پہلے اپنی مہم سر کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

اس مہم کے بنیادی طور پر تین حصے تھے۔ حصۂ اول میں خادم حسین نے بڑی صفائی کے ساتھ محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے چودھری انعام کے دماغ میں یہ بات بٹھانا تھی کہ ملک صاحب آج ظفر گڑھ میں نذیر حسین سے مل کر گئے تھے۔ نذیر حسین اور اس کے گھر والوں نے ماجھا کی حمایت کرتے ہوئے چودھری فیروز اور اس کے چھوٹے بیٹے انعام کے خلاف بہت زہر اگلا ہے۔ یہ کہانی سننے کے بعد ملک صاحب نے ان لوگوں سے کہا کہ کیا وہ تھانے آکر یہ ساری باتیں اپنے بیانات حلفی میں لکھوا سکتے ہیں؟ نذیر حسین، اس کی بیوی شگفتہ اور بیٹی تاجی نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ ہم چودھریوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ان جابروں نے تو ظلم کی انتہا کردی ہے۔ ماجھا کا تو سارا خاندان ہی برباد ہوگیا اور وہ خود ایک بھولے بھالے دیہاتی سے خطرناک ڈاکو بن گیا۔ اب ہم سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ اگر چودھریوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ہمیں زبان کھولنا پڑی تو ہم سارا سچ کھول کر بیان کردیں گے۔ پھر انہوں نے بہ یک زبان ہوکر ملک صاحب کو یقین دلایا کہ وہ کل صبح تھانے آکر اپنے بیانات لکھوادیں گے۔

خادم حسین کی اس ''کاشت کاری'' کے نتیجے میں انعام نے فوراً جاکر اپنے باپ کو رپورٹ کرنا تھی۔ پھر وہ لوگ صرف اور صرف ایک ہی کام کرسکتے تھے...... کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے نذیر حسین، شگفتہ اور تاجی کو کسی بھی قسم کا بیان دینے کے قابل نہ چھوڑنا اور اس کام کے لیے آدھی رات کے آس پاس کا وقت سب سے زیادہ مناسب تھا۔ خادم حسین کی سنائی ہوئی اس فتنہ پرداز کہانی پر چودھری فیروز اینڈ کمپنی نے اس لیے بھی آنکھیں بند کرکے یقین کرلینا تھا کہ میں نے حویلی سے نکلنے کے بعد جو ظفر گڑھ کا راؤنڈ لگایا تھا اور نذیر حسین کے گھر کے اندر بھی گیا تھا، میری اس تمام تر مصروفیت کی رپورٹ چودھری فیروز تک پہنچ گئی ہوگی۔ میں نے اسی مقصد کے حصول کی خاطر دن میں دانستہ ظفر گڑھ کا مصنوعی دورہ کیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اب تک خادم حسین نے اپنے حصے کا کام کردیا ہوگا اور کسی وقت بھی موت کے ہرکارے شب خون مارنے نذیر حسین کے گھر پر یلغار کرسکتے تھے۔

میرے منصوبے کے حصۂ دوم پر عمل کرنے کے لیے میں کانسٹیبل امجد کے ساتھ نذیر حسین کے گھر میں موجود تھا تاکہ چودھریوں کے بھیجے ہوئے سفاک قاتلوں کو راتوں رات آہنی زیورات سے آراستہ کرکے تھانے کی حوالات تک پہنچا سکوں اور اگلی صبح سے پہلے ان کی تسلی بخش ''خاطر داری'' کرنے کے بعد فرداً فرداً سب کے حلفیہ بیانات سپردِ قلم کرکے ان کے انگوٹھے لگوالوں لیکن میں نے نذیر حسین اور اس کی بیوی و بیٹی کو کوئی اور کہانی فٹ کررکھی تھی۔

میں نے آج دن ہی میں نذیر حسین کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ مجھے خفیہ اطلاع ملی ہے کہ آج رات ماجھا اپنے ساتھی ڈاکوؤں کے ساتھ اس کے گھر پر ہلّا بولے گا اور وہ لوگ تاجی کو اٹھالے جائیں گے۔ نذیر حسین، ماجھا کو ناپسند نہیں کرتا تھا مگر کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو کسی ڈاکو سے بیاہنے کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ جب سے تاجی کے والدین کو یہ پتا چلا تھا کہ ماجھا جیل سے فرار ہوکر ایک خطرناک ڈاکو بن گیا ہے اور پولیس علاقے کے چپے چپے پر اس کی گرفتاری کے لیے چھاپے مار رہی ہے، ان لوگوں نے جلد از جلد تاجی کا رشتہ پڑوس میں رہنے والے ایک لڑکے ساجد سے پکا کردیا تھا اور آئندہ ماہ ان کی شادی ہونے والی تھی۔ میری بات سن کر نذیر حسین نے مجھ سے دست بستہ یہ درخواست کی تھی کہ میں کسی طرح اس کی بیٹی کو اغوا ہونے سے بچالوں اور میں اس وقت ان لوگوں کی مدد اور حفاظت ہی کی خاطر وہاں موجود تھا...... جی ہاں، بعض اوقات اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہم پولیس والوں کو اس نوعیت کے ناٹک بھی رچانا پڑتے ہیں......!

ہمارے پروگرام کا حصۂ سوم حوالدار خادم حسین سے متعلق تھا۔ اگر وہ سلسلی وارداتیا ماجھا آج رات چودھری انعام کے ساتھ کوئی اونچ نیچ کرنے کی نیت سے حویلی میں گھسا تو خادم حسین نے کانسٹیبل مختار کے ساتھ مل کر اسے

زندہ یا مُردہ گرفتار کرنا تھا۔
اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہم نے ہر مرحلے کو بڑی ہوش مندی اور احتیاط کے ساتھ نمٹانا تھا۔ اسی لیے میں نے نذیر حسین کے گھر کے بڑے کمرے میں تین چار پائیوں پر تکیے رکھ کر ان کے اوپر گرم لحاف اس طرح اوڑھا دیے تھے کہ دیکھنے والے کو ان چار پائیوں پر تین انسان گہری نیند سوتے نظر آتے۔ لحافوں کے نیچے لمبائی کے رخ پر تکیے اس طرح رکھے گئے تھے کہ وہ صحیح معنوں میں سوتے ہوئے انسان ہی دکھائی دیں۔ مذکورہ کمرے کے داخلی دروازے کو دانستہ نیم وا رکھا گیا تھا تاکہ متوقع حملہ آوروں کو اپنے شکاروں کو ڈھونڈنے کے لیے زیادہ محنت نہ کرنا پڑے۔ اس کمرے سے ملحقہ کمرے میں، میں نذیر حسین کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا جبکہ تیسرے کمرے میں کانسٹیبل امجد نے تاجی اور اس کی ماں شگفتہ بی بی کو اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔

''میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں تھانے دار صاحب......!'' نذیر حسین نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ ''اگر آج رات آپ یہاں موجود نہ ہوتے تو ہماری بے خبری میں ماجھا نے تاجی کو اٹھا لے جانا تھا پھر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ میں نے تو قدیر حسین کے بیٹے سے تاجی کا رشتہ پکا کر رکھا ہے......''

''نذیر حسین! قانون عوام کی حفاظت اور مجرموں کی سرکوبی کے لیے بنائے جاتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں پر اپنا فرض پورا کرنے آیا ہوں۔ اس میں تم لوگوں پر احسان والی کوئی بات نہیں۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ تاجی کا رشتہ طے کر دیا۔ ماجھا چاہے کتنا بھی اچھا انسان کیوں نہ ہو لیکن درحقیقت وہ ایک مفرور قیدی اور خطرناک مجرم ہے۔ پچھلی دو راتوں میں اس نے ظفر گڑھ اور نصیر آباد میں جو کچھ کیا ہے وہ سب تمہارے علم میں ہے۔ قانون اسے کسی بھی صورت معاف نہیں کرے گا۔ جلد یا بہ دیر ماجھا کا زندہ یا مُردہ پکڑا جانا لازمی ہے......''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بس، آج آپ کسی بھی طرح ماجھا کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ میں سکون سے تاجی کو باعزت انداز میں اس گھر سے رخصت کر سکوں۔ میری ایک ہی اولاد ہے۔ تاجی کو ہم نے بڑے لاڈ پیار سے پروان چڑھایا ہے۔ ہم بڈھی بڈھا نے تو اپنی زندگی گزار لی ہے۔ پتا نہیں کس وقت رب کا بلاوا

آ جائے۔ اگر ہماری آنکھ بند ہونے سے پہلے تاجی کا گھر بس جائے تو اس سے بڑی شکر کی اور کوئی بات نہیں۔''

اس وقت ہم دونوں گرم لحاف اوڑھے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں ایک مجبور باپ کی مشکلات کو بڑی گہرائی سے محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ تاجی کا ہونے والا خاوند کام کیا کرتا ہے؟''

''قدیر حسین اور کوثر بی بی کی بھی ایک ہی اولاد ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ان لوگوں کی تھوڑی سی زرعی اراضی ہے۔ ساجد کھیتی باڑی میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہ بہت ہی سادہ طبیعت کا ایک سمجھ دار جوان ہے۔ اسے بیٹی دینے میں ہمارے لیے سب سے زیادہ اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ تاجی بیاہ کر کسی دور دیس نہیں جائے گی۔ اس کے میکے اور سسرال میں صرف ایک دیوار کا فاصلہ ہے۔''

''چلیں، یہ تو اچھا ہی ہوا......'' میں نے معتدل انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''ساجد کے ساتھ تاجی کا رشتہ طے کرنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟ میرا مطلب ہے......تاجی کا پہلے ماجھا کے ساتھ معاملہ چل رہا تھا نا......؟''

''نہیں جناب! مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات ہمارے علم میں تھی کہ ساجد، تاجی کو دل سے پسند کرتا تھا مگر ماجھا کی وجہ سے اس نے کبھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ساجد ٹھہرے ہوئے مزاج کا ایک امن پسند لڑکا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ تاجی، ماجھا کے ساتھ سنجیدہ ہے اسی لیے اس نے زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ماجھا کے جیل جانے کے بعد حالات بدل گئے پھر جب اس کے فرار ہونے کی خبر اڑی تو معاملات اور بھی خراب ہو گئے۔ اسی لیے ہم نے جلد از جلد تاجی کا رشتہ ساجد کے ساتھ پکا کر دیا۔ اس بات کے امکانات روشن نظر آنے لگے تھے کہ ماجھا کسی بھی وقت ہمارے گھر کا رخ کر سکتا ہے اور ظاہر ہے...... یہ کوئی مناسب بات نہیں تھی۔''

''کیا اس موقع پر تاجی نے کسی قسم کی مزاحمت کی؟'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

''پہلے تو وہ شادی ہی سے انکاری تھی۔'' نذیر حسین نے بتایا۔ ''ہم اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ماجھا اس کے دل و دماغ سے نکلا نہیں ہے لیکن میں نے اور شگفتہ نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا۔ حالات کی حقیقت سے اسے آگاہ کیا تو بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ ہم نے بڑے واضح الفاظ میں اسے باور کرا دیا تھا کہ ماجھا ایک مفرور ڈاکو ہے۔ اس کے نصیب میں یا تو جیل کی چار دیواری ہے اور یا پھر پولیس کی گولی۔ وہ یا تو گرفتار ہوگا یا کسی پولیس مقابلے میں بے دردی سے مارا جائے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تاجی نے بوڑھے ماں باپ کی عزت کی لاج رکھ لی اور ساجد سے شادی کے لیے تیار ہو گئی......''

''تم اور تمہاری بیوی خوش قسمت والدین ہیں نذیر حسین۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جو تاجی جیسی فرمانبردار اولاد آپ لوگوں کو ملی۔ اللہ تاجی کا نصیب اچھا کرے۔''

''آمین......!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''ظفر گڑھ میں تم لوگوں کے علاوہ اور کسی کو یہ تو معلوم نہیں کہ میں تمہارے گھر میں ماجھا کی گرفتاری کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہوں؟''

''نہیں سرکار......'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے دن میں مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ میں نے آپ کی ہدایات کو یاد رکھا ہے حتیٰ کہ ساجد اور اس کے ماں باپ کو بھی اس معاملے کی کوئی خبر نہیں ہے۔''

''شاباش نذیر حسین!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''یہ تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ کانسٹیبل امجد نے حملہ آوروں کی آمد کا اعلان کر دیا ہے۔ امجد، تاجی اور شگفتہ کے ساتھ جس کمرے میں تھا اس کی کھڑکی سے گھر کے صحن اور داخلی دروازے پر بہ آسانی نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ ہمارے بیچ یہ طے ہوا تھا کہ وہ جیسے ہی کسی کو نذیر حسین کے گھر میں داخل ہوتے دیکھے، فوراً مجھے اطلاع دے اور اطلاع اسی طرح دستک سے دینا تھی......!

''نذیر حسین! ڈاکو آ گئے ہیں......'' یہ کہتے ہوئے میں لحاف سے نکل آیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

''ہاں امجد......؟'' میں نے دروازے کے نزدیک پہنچ کر سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا پوزیشن ہے؟''

''تین بندے دیوار پھلانگ کر گھر کے صحن میں اترے ہیں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''وہ تینوں مسلح ہیں اور انہوں نے ڈاکوؤں کے انداز میں ڈھاٹے بھی باندھ رکھے ہیں اور......وہ چوکنا انداز میں اس کمرے کی سمت پیش قدمی کر رہے ہیں جہاں ہم نے ان کے لیے جال پھیلا رکھا ہے۔''

''بہت خوب......'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ''جب وہ لوگ مذکورہ کمرے میں داخل ہو جائیں تو تم نے مجھے اطلاع دینا ہے اور تاجی و شگفتہ کو نذیر حسین کے پاس بھیج دینا ہے اسی دروازے سے۔ اس کے بعد ہم اگلے مرحلے پر عمل کریں گے۔''

او کے سر!'' امجد نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

میں نذیر حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تاجی اور شگفتہ جیسے ہی اس کمرے میں آئیں، تم تینوں نے چارپائیوں کے نیچے گھس کر چپ سادھ لینا ہے.....'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''باہر فائرنگ کی آواز سنائی دے، زلزلہ آئے یا کوئی طوفان، تم لوگوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنا، اِلّا یہ کہ میں خود آواز دے کر تمہیں باہر نکلنے کو نہ کہوں۔ میری بات تمہارے پلے پڑ رہی ہے یا نہیں.....؟''

وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا تھانے دار صاحب.....''

میں برآمدے کی سمت کھلنے والے دروازے کے ساتھ لگ کر مستعدی سے کھڑا ہو گیا اور اپنی تمام تر سماعت کو بیرونی ماحول پر لگا دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ چودھری انعام کے بھیجے ہوئے تین ڈاکوؤں نے بڑے کمرے میں داخل ہو کر اپنی دانست میں نذیر حسین، اس کی بیوی شگفتہ اور ان کی بیٹی تاجی کو سوتے میں گولیوں سے بھون ڈالا تھا.....!

جیسے ہی امجد نے خواتین کو اس کمرے میں منتقل کیا، میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ریوالور سونتے برآمدے سے گزر کر صحن میں نکل آیا۔ نذیر حسین کے گھر کے وہ تین کمرے ایل (L) کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ مکان کے عقبی حصے میں دو کمرے ایک ہی سائز کے تھے جن میں سے ایک میں امجد، ان ماں بیٹی کے ساتھ چھپا تھا اور دوسرے میں، میں نے نذیر حسین کے ساتھ پناہ لے رکھی تھی۔ ان دونوں کمروں میں ایک ایک دروازہ اور ایک ایک کھڑکی تھی جن کا رخ برآمدے کی جانب تھا۔ علاوہ ازیں دونوں کمروں کو آپس میں ملانے کے لیے ان کی درمیانی دیوار میں بھی ایک چھوٹا سا دروازہ رکھا گیا تھا۔ میرے اور امجد کے بیچ اسی ملاپی دروازے کے توسط سے بات چیت ہوئی تھی اور امجد نے مذکورہ دروازے ہی سے تاجی اور شگفتہ کو ادھر بھیجا تھا۔ امجد نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے باہر کا منظر دیکھ کر مجھے مطلع کیا تھا۔ تیسرا بڑا کمرا لمبائی کے رخ پر ان دو کمروں کے پہلو میں جڑا ہوا تھا۔

میرے باہر پہنچنے سے پہلے ہی امجد نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے کمرے کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی جس کے نتیجے میں وہ تینوں مسلح ڈاکو تین ''انسانی لاشوں'' کے ساتھ بڑے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ ساری کارروائی میرے سوچے ہوئے منصوبے کے عین مطابق عمل میں آئی تھی۔ نذیر حسین اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ ایک کمرے میں محفوظ تھا اور وہ ڈاکو میرے لگائے ہوئے پھندے میں پھنس چکے تھے۔

بڑے کمرے میں تین انسانوں کے سونے کا ڈرامائی جال بچھاتے ہوئے ہم نے دانستہ اس کی کھڑکی کو کھلا اور داخلی دروازے کو نیم وا چھوڑ دیا تھا تاکہ وہ سیدھے اسی کمرے کا رخ کریں۔ جب کانسٹیبل نے اس کمرے کو باہر سے کنڈی لگائی تو وہ سمجھ گئے کہ ان کے ساتھ ہینڈ ہو گیا ہے۔ اب وہ دروازے کو شدت سے پیٹتے ہوئے غضب ناک انداز میں چلا رہے تھے۔

''دروازہ کھولو.....ورنہ ہم تمہارا برا حشر کر دیں گے۔''

میں اور امجد دروازے سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے ایک دم تیار کھڑے تھے۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم لوگ ڈاکو ہو، قاتل ہو.....تم نے ابھی سوئے ہوئے تین معصوم افراد کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ تمہیں اپنے عبرت ناک حشر کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اپنی بندوقیں کھڑکی کے راستے باہر پھینک دو.....!''

''بکواس بند کرو.....!'' ان میں سے ایک نے جھلّا کر کہا۔ ''ہم نے کسی کی جان نہیں لی۔ یہاں پر کوئی بندہ بشر موجود تھا ہی نہیں۔ ہم نے تینوں چارپائیوں کو اچھی طرح چیک کر لیا ہے۔ ہمیں الو بنانے کے لیے تم نے یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔ آخر تم ہو کون.....؟''

''تم اس جھمیلے میں نہ پڑو کہ میں کون ہوں.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شکر مناؤ کہ تم لوگ انسانی خون میں ہاتھ رنگنے سے صاف بچ گئے اور یہ سب اسی ڈرامے کے طفیل ہوا ہے جو تمہارے بقول میں نے تمہیں الو بنانے کے لیے رچایا ہے۔ اب تم پر قتلِ عمد نہیں بلکہ اقدامِ قتل کا مقدمہ بنے گا۔ تم سزائے موت سے بچ جاؤ گے۔''

''تم تو ہمیں قتلِ عمد اور اقدامِ قتل کے بارے میں اس طرح بتا رہے ہو جیسے تم کوئی وکیل یا پھر پولیس والے ہو.....؟'' اندر سے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔

اس دوران میں وہ لوگ وقفے وقفے سے بند دروازے کو بھی پیٹ رہے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ

باہر میں اکیلا ہوں یا میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ میں نے اس کھیل کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور بہ آوازِ بلند کہا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ مجھے اپنے باخبر ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ تم تینوں نذیر حسین، شگفتہ اور ناجی کو فنا کے گھاٹ اتارنے آج رات یہاں دھاوا بولو گے لہٰذا میں نے تمہیں چھاپنے کے لیے پہلے سے بندوبست کرلیا۔ اب تم شرافت سے اپنی بندوقوں کو کھڑکی سے باہر پھینکو اور گرفتاری دے دو۔ مزاحمت کروگے تو میں تمہیں اڑانے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لوں گا۔''

نذیر حسین کے گھر میں جتنی بھی چوبی کھڑکیاں تھیں ان میں عمودی انداز میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں، جن کی موٹائی آدھے انچ کے برابر تھی اور دو سلاخوں کے درمیان لگ بھگ ساڑھے تین انچ کا فاصلہ رکھا گیا تھا۔ اس گیپ کے راستے وہ لوگ بہ آسانی اپنی بندوقوں کو باہر پھینک سکتے تھے لیکن خود وہاں سے بھاگ نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے چاہے وہ کسی سرکس میں کام کرنے والے سینڈو ہی کیوں نہ ہوتے۔

''ہم کیسے یقین کرلیں کہ تم تھانے دار ہی ہو......!''
مجھ سے بات کرنے والے نے شک زدہ انداز میں کہا۔
''اور یہ بھی کہ تمہارے باخبر ذرائع کی اطلاع پکی ہے۔ تم کوئی اور بھی تو ہوسکتے ہو اور ہمیں پھنسانے کے لیے یہ چال چل رہے ہو......''

''میں اپنے تھانے کے ٹرائل روم میں جب تم لوگوں کی تشریف جات پر نو چار کے چرمی لتر برساؤں گا تو خود بخود تمہیں میری شناخت ہوجائے گی۔'' میں نے زہر خند انداز میں کہا۔ ''باقی میرے ذرائع بڑے وثوق دار ہیں لہٰذا یہ اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔ تم لوگوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چار پائیوں پر بے دریغ فائرنگ کی ہے۔''

وہ تم سے آپ پر آتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کو...... ہمارے بارے میں کس نے...... بتایا ہے......؟''

''تمہارے شیطانی باپ، چودھری انعام نے......!''
میں نے نظریۂ ضرورت کے تحت قصداً غلط بیانی کرتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''یہ...... یہ نہیں...... ہوسکتا......!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت اور بے یقینی پائی جاتی تھی۔ میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''کیونکہ چھوٹے چودھری صاحب ہی نے تو ہمیں......!''
وہ بولتے بولتے یکایک رک گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس سے آگے اور کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میرے اس خطرناک باؤنسر پر کمرے کے اندر خاموشی چھاگئی تھی۔ اب ان میں سے کوئی دروازے کو بھی نہیں پیٹ رہا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ چودھری انعام کا نام سن کر ان تینوں کے تعزیے ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ میں نے کڑک دار آواز میں کہا۔

''میں تم تینوں کو آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اگر مجھ سے کسی نرمی کی توقع رکھتے ہو تو اپنے ہتھیار کھڑکی سے باہر پھینک کر گرفتاری دے دو ورنہ میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا۔ میں تین تک گن رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے پسپائی اختیار نہیں کی تو تم تینوں بڑی دردناک موت مروگے......ایک!''

کمرے کے اندر پراسرار سناٹے نے اپنا قبضہ جمالیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان تینوں کو کسی موذی سانپ نے سونگھ لیا ہے۔ میں نے اپنی آواز کو بلند رکھتے ہوئے گنتی کو آگے بڑھایا۔

''دو......!''

اس ''دو'' کے جواب میں کھڑکی کے راستے یکے بعد دیگرے دو بندوقیں باہر پھینک دی گئیں۔ میں نے بندوقوں کو قبضے میں لینے کے بعد دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''کوئی وعدہ وعید نہیں، کوئی تقدیم و تاخیر نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس آتشیں ہتھیار موجود ہے۔ جب تک تیسری بندوق باہر نہیں پھینکو گے، میں دروازہ نہیں کھولوں گا......تین!''

''تین'' نے عمل انگیز کا اثر دکھایا اور تیسری بندوق بھی کمرے سے باہر آگئی۔ اب وہ تینوں نہتے ہوچکے تھے۔ میں نے دھیمی آواز میں کانسٹیبل کو ہدایات دیں۔

''امجد! تم پوزیشن سنبھال کر اندھیرے میں ایک دم چاق و چوبند کھڑے ہوجاؤ۔ میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ اگر ان کمینوں نے شرافت سے گرفتاری دے دی تو ٹھیک۔ بصورت دیگر تم کوئی آسرا نہیں کرنا۔ ہم نے انہیں زندہ پکڑنا ہے۔ اگر یہ شیطان بھاگنے کی کوشش کریں تو ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنا کر گولی چلادینا......''

''سمجھ گیا سرجی......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں

گا......'' پھر اس نے عجیب سے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''ملک صاحب! کبھی کبھار تو گن چلانے کا موقع ملتا ہے۔ میں اس سنہری موقع کو بھلا کیسے ضائع کرسکتا ہوں!''

امجد کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں چودھری انعام کے بھیجے ہوئے تین خبیث الاخبث ناسوروں کی جانب متوجہ ہوگیا اور میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں نے قانون سے تعاون کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ میں تم سے خصوصی رعایت کروں گا۔ اب میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ اپنے ہاتھ گردن کے پیچھے رکھ کر چپ چاپ باہر نکل آؤ۔ مجھے کسی زور زبردستی پر مجبور نہیں کرنا ورنہ اس گھر کے صحن میں تمہاری بے گوروکفن لاشیں بچھی نظر آئیں گی......!''

پھر میں نے تیسری بندوق کو بھی اپنے قبضے میں لینے کے بعد بہ آہستگی دروازے کی کنڈی ہٹادی اور تھوڑے فاصلے پر ریوالور بہ دست کھڑا ہوگیا۔

وہ تینوں لائن بنا کر یکے بعد دیگرے کمرے سے باہر نکل آئے۔ میری ہدایت کے عین مطابق انہوں نے اپنے ہاتھوں کو گردنوں کے پیچھے باندھ رکھا تھا۔ امجد رائفل سونتے ایک ایسی جگہ پر کھڑا تھا کہ وہ تینوں اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جب وہ برآمدے میں پہنچ گئے تو میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم تینوں زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اپنے ہاتھ پشت کی طرف کرلو تاکہ میں تمہیں الٹی ہتھکڑی لگادوں۔''

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک اٹھے تھے اور اس کا سبب بھی فوراً ہی میری سمجھ میں آ گیا۔ میں اس وقت یونیفارم میں ملبوس نہیں تھا۔ یقیناً انہیں یہ شک ہوا ہوگا کہ میں تھانے دار نہیں ہوں۔ میں نے پولیس کا نام استعمال کرکے انہیں بے وقوف بنایا ہے۔ میرے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات ہوں یا ان کی سوچ میں سر اٹھانے والی بے یقینی...... یہ سب کچھ سیکنڈ کے دسویں حصے میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں نے ایک ایسی حرکت کی جس کے امکان کو میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود ریوالور کی پروا کیے بغیر ان تینوں نے باہر کی جانب دوڑ لگادی تھی......!

اگلے ہی لمحے امجد کی رائفل گرجی۔ اس نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے تھے۔ اس فائرنگ کے جواب میں فضا گھائل افراد کی چیخوں سے گونج اٹھی پھر میں نے ان تین میں سے دو کو لڑکھڑا کر زمیں بوس ہوتے دیکھا۔ تیسرا خوش قسمتی سے بچ نکلا تھا اور اس نے اندھا دھند دروازے کی جانب دوڑ لگادی تھی۔

''تم ان زخمی کمینوں کو دیکھو'' میں نے اپنے ساتھی کانسٹیبل سے کہا اور فرار کی کوشش میں مصروف شخص کے عقب میں زقند لگادی۔

میں اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس احمق نے دروازہ کھول کر وہاں سے نکلنے کے بجائے دیوار پھاندنے کا فیصلہ کیا۔ امجد کے بیان کے مطابق وہ تینوں نذیر حسین کے گھر کی دیوار پھلانگ کر ہی اندر آئے تھے۔ مذکورہ دیوار... بہ مشکل چار فٹ بلند رہی ہوگی۔ شاید اسی لیے اس نامعقول انسان نے اس ناٹی دیوار کو دروازے پر ترجیح دی تھی مگر میں بھلا کہاں چوکنے والا تھا۔ یہ ساری مارا ماری ہم نے اس لیے نہیں کی تھی کہ انہیں نکل بھاگنے کا موقع فراہم کرتے......!

اس بندے نے جیسے ہی دیوار کے اوپر ہاتھ جما کر اپنے بدن کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا، میں اس کے عقب میں پہنچ گیا۔ میں نے ریوالور کو نیفے میں اڑسا اور بھاگتے بھوت کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کر ایک زوردار جھٹکے سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس عمل میں میرے دوسرے ہاتھ نے بھی بھرپور مدد کی تھی۔

ردعمل کے طور پر وہ دھڑام سے پشت کے بل صحن میں آ گرا اور چاروں خانے چت ہوگیا۔ میں نے دوبارہ ریوالور نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ٹھڈوں سے اس کی مرمت شروع کردی۔ ان لمحات میں اس پر بے بھاؤ کی پڑ رہی تھی۔ وہ کم بخت مجھ سے بے دریغ پٹ رہا تھا اور مسلسل چلاتا چلا جارہا تھا۔ جب میں جی بھر کر اس کی درگت بنا چکا تو میں نے اپنا پاؤں روک لیا اور غصیلے لہجے میں کہا۔

''چلو...... اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ......''

اس نے بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کردی۔

اس دوران میں کانسٹیبل امجد نے اس کے دونوں گھائل ساتھیوں کو ہتھکڑیاں لگادی تھیں۔ امجد کی چلائی ہوئی گولیوں نے ان دونوں کے پاؤں اور پنڈلیوں کو بری طرح گھائل کردیا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہے تھے۔

''تم نے کیا سمجھا تھا، مجھے غچا دے کر بھاگ نکلو گے۔'' میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کرنے کے بعد پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا......؟''

''اچھو......'' اس نے لجاجت بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے معاف کردیں تھانے دار صاحب۔ ہم لوگ تو چھوٹے چودھری صاحب کے حکم پر یہاں آئے تھے......''

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا پھر پوچھا۔ ''تمہارے ساتھیوں کے کیا نام ہیں؟''

''وہ گوگا اور حنیفو ہیں جی......'' وہ منمنایا۔

''چلو، تم بھی ان کے پاس......'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

وہ گردن جھکا کر میرے آگے چل پڑا۔

آئندہ دس منٹ میں ہم نے ان تینوں کو الٹی ہتھکڑیاں لگا کر بے بال و پر کر دیا پھر ایک آہنی زنجیر کی مدد سے میں نے ان کی ہتھکڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک بھی کر دیا تاکہ وہ تینوں جہاں بھی جائیں، ایک ساتھ جائیں۔ یہ سارے انتظامات ہم نے پہلے سے کر رکھے تھے۔ جب میں امجد کے ساتھ تھانے سے نکلا تھا تو میں نے تین چار ہتھکڑیاں، نائیلون کی مضبوط ڈوری، ٹارچ اور اسی نوعیت کا دوسرا سامانِ ضرورِیہ ایک تھیلے میں ڈال کر تانگے میں رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد میں نے نذیر حسین اور اس کی بیوی و بیٹی کو کمرے سے باہر نکال لیا اور تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں کو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تینوں حملہ آور ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا ہے اور اب انہیں اپنے ساتھ تھانے لے کر جا رہا ہوں۔ میرا یہ ساتھی......'' میں نے کانسٹیبل امجد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''رات بھر اپنی رائفل سمیت ادھر تمہارے گھر میں موجود رہے گا تاکہ تم لوگ سکون سے سو سکو۔''

اس موقع پر نذیر حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! کیا ان ڈاکوؤں میں ماجھا بھی شامل ہے؟''

نوازش عرف گوگا، حنیف عرف حنیفو اور اشرف عرف اچھو کو میں نے بے دست و پا کر کے گھر کے صحن میں اکڑوں بٹھا رکھا تھا اور وہاں پر اتنا اندھیرا تھا کہ نذیر حسین کمرے کے اندر رہتے ہوئے ان تینوں کو شکل سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ میں نے آج ماجھا کی ذات کے حوالے سے نذیر حسین سے جو غلط بیانی کی تھی، اسے صبح تک نبھانا ضروری تھا لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ تینوں ماجھا کے قریبی ساتھی ہیں۔ ماجھا نے انہیں تاجی کو اٹھانے کے لیے بھیجا تھا۔ ماجھا خود اس وقت جنگل کے اندرونی حصے میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے ان تینوں سے ماجھا کے بارے میں سب کچھ جان لیا ہے۔ میں انہیں تھانے کی حوالات میں بند کر کے خود کل کا رخ کروں گا۔ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں انشاء اللہ ماجھا کو بھی گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

میری تشفی سے لبریز وضاحت کو سن کر نذیر حسین کی جان میں جان آئی۔ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! آپ کو دینے کے لیے میرے پاس دعا کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ نے جس طرح میری عزت کی حفاظت کی ہے، سوہنا رب اسی طرح ہمیشہ آپ کی عزت کی نگہبانی کرے......!''

''آمین!'' میں نے تہِ دل سے کہا۔

دولت مند انسان کو اپنی جان کی حفاظت سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور غریب انسان کو اپنی عزت...... اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کو کمانے میں انسان کو زیادہ محنت کرنا پڑے، وہ اس کے لیے عزیز ٹھہرتی ہے......!

ہمارے اس ''مڈنائٹ وینچر'' میں چونکہ گولیاں بھی چلی تھیں لہٰذا نذیر حسین کے آس پڑوس والے جائے وقوعہ کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔ قبل اس کے کہ اس ہنگامہ خیزی کی خبر چودھری فیروز کی حویلی تک پہنچتی، میں ان تینوں گرفتار شدگان کو تانگے میں ڈال کر تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

گوگا، حنیفو اور اچھو کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے ''تھانے دارانہ'' محنت نہیں کرنا پڑی۔ نذیر حسین کے گھر میں، میں نے انہیں جو زک پہنچائی تھی اس نے ان کے دل دماغ پر میری دہشت طاری کر دی تھی پھر تھانے کے اندر قدم رکھتے ہی وہ اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اس پر مستزاد میرے انسانی ہمدردی سے بھرپور رویے نے بھی انہیں آمادۂ تعاون ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نذیر حسین کے گھر میں کانسٹیبل امجد کی فائرنگ سے گوگا اور حنیفو اچھے خاصے زخمی ہو گئے تھے اور میرے طوفانی ٹھڈوں نے اچھو کے چہرے کی کھال کو بھی کئی ایک مقامات سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ میں نے تھانے پہنچ کر ان سے پوچھ گچھ کرنے سے پہلے گوگا اور حنیفو کی باقاعدہ مرہم پٹی کروائی تھی اور اچھو کو بھی مناسب طبی امداد دی گئی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے ان کے بیانات قلمبند کرنا شروع کیے تھے۔

ابتدا میں وہ تینوں چودھری انعام کے حوالے سے میرے بیان کے سلسلے میں ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے اور اسی تذبذب نے انہیں مجھ سے استفسار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آج تک چودھری صاحب نے ہم سے ایسا دھوکا نہیں کیا۔'' اچھو نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ہم تینوں ان کے خاص آدمی ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم ان کے لیے کئی کام کر چکے ہیں......؟''

اچھو کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اپنے اندرونی جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''ماجھا کے جیل چلے جانے کے بعد اس کے گھر پر جن ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا، وہ تم ہی لوگ تھے نا......؟''

ان تینوں نے سراسیمہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر خاموشی سے گردنیں جھکالیں۔ میرا خون کھول کر رہ گیا......!

ان کی ندامت بھری خاموشی میں میرے سوال کا جواب چھپا ہوا تھا مگر اس سانحے کی تلافی اس اظہارِ ندامت اور جھکی ہوئی گردنوں سے ممکن نہیں تھی کیونکہ اس رات ایک نابینا عورت کے سینے میں برچھی گھونپ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور ایک معصوم لڑکی نے چھت سے کود کر اپنی جان دے دی تھی اور یہ گھناؤنا عمل انہی تینوں نے چودھری انعام کے حکم پر کیا تھا۔

چودھری انعام کے گرد میرا گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جارہا تھا۔ نذیر حسین کے گھر سے تین ایسے جرائم پیشہ افراد میرے ہتھے چڑھے تھے جن کے بیانات چودھری انعام کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہونے والے تھے۔ میں نے ان کے بیانات قلمبند کرتے ہوئے ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔

''چودھری انعام تم لوگوں کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔'' میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تک اس نے خود کو محفوظ سمجھا، وہ تم لوگوں کو شہ دیتا رہا اور تم سے اپنے سارے قانونی اور غیر قانونی کام کرواتا رہا۔ اب جبکہ میں نے اس کے گرد قانون کا شکنجہ کس دیا ہے تو اس نے تم تینوں کو قربان کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ تم ساری زندگی ایک ایسے خود غرض انسان کے لیے اپنی جان کو جوکھم میں ڈالتے رہے ہو جو اپنی جان کو بچانے کے لیے آج تم لوگوں کو پھنسانے پر تیار ہو گیا ہے۔ اگر تم لوگ چاہتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت کروں تو چودھری انعام کے خلاف جو بھی بول سکتے ہو، وہ اپنے بیان میں لکھوا دو مگر صد فیصد سچ۔ میں جھوٹ بولنے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں......''

وہ یک زبان ہو کر بولے۔ ''تھانے دار صاحب! ہم آپ کو جو بھی بتائیں گے، سولہ آنے سچ بتائیں گے۔''

''اور یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ تم جو کچھ اپنے بیانات میں لکھواؤ گے۔ وہی سب عدالت میں جج کے سامنے بھی کہنا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے تاکیدی لہجے میں کہا۔

''جی بالکل...... ایسا ہی ہوگا!'' وہ پورے یقین سے بولے۔

اس کے بعد ان کی زبانیں اور میرا قلم اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں نے وہ بیانات انہیں پڑھ کر سنائے پھر ان کے انگوٹھے لگوا کر کام پکا کر دیا۔

☆☆☆

حوالدار خادم حسین کی واپسی علی الصباح ہوئی۔ وہ کانسٹیبل مختار احمد کو حویلی میں چھوڑ کر اپنے ساتھ بہت ساری سنسنی خیز خبریں لے کر آیا تھا۔ میں اس رات اپنے کوارٹر پر نہیں گیا تھا۔ خادم حسین سیدھا میرے کمرے میں چلا آیا اور مضمحل انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! میں نے اپنے حصے کا کام خوش اسلوبی سے نمٹا دیا ہے۔ آپ کے مشن کا کیا رہا......؟''

''چودھری انعام کے بھیجے ہوئے تینوں بندے حوالات میں بند ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ماضی میں ماجھا کے گھر پر حملہ کر کے اس کی نابینا ماں صفیہ بی بی کی جان لے لی تھی اور ماجھا کی بہن شاداں کو چھت سے کودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ان کے بیاناتِ حلفی سپردِ قلم کر لیے ہیں۔ وہ عدالت میں چودھری انعام کے خلاف بولنے کے لیے تیار ہیں۔''

''زبردست!'' خادم حسین نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''ملک صاحب! آپ نے چودھری انعام کو جیل کی دیواروں کے پیچھے سڑانے کا بڑا شافی انتظام کر دیا ہے۔''

''اور تم نے کیا تیر مارا ہے......؟'' میں نے حوالدار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کچھ اپنی بھی تو سناؤ......!''

''آپ کا حکم تھا کہ ماجھا کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرنا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن افسوس کہ میں اسے زندہ گرفتار نہیں کر سکا۔ ویسے ایک بات ہے کہ ماجھا بہت ہی احمق انسان ہے۔ دو دن پہلے وہ حویلی میں گھس کر چودھری فیروز کی ایسی کم تیسی کر گیا تھا۔ اگر اس میں ذرا سا بھی درک ہوتا تو اسے اتنی جلدی دوبارہ اس حویلی کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''خادم حسین! تم نے کیا بجھارتیں ڈالنا شروع کر دی ہیں۔'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے تیکھے لہجے

میں کہا۔ ''جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو......''

''ملک صاحب! اُدھر ظفر گڑھ کی حویلی میں دو لاشیں پڑی ہیں۔'' اس نے گمبھیر انداز میں بتایا۔ ''موقع کی کارروائی کے لیے آپ کو فوراً اُدھر روانہ ہو جانا چاہیے۔ ہماری باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں......''

''دو لاشیں......!'' میں نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے، ماجھا اور اس کے کسی ڈاکو ساتھی کی لاشیں......؟''

''نہیں ملک صاحب......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ماجھا کا ساتھی ڈاکو تو بڑا ہی موقع پرست اور تھرڈ لا ثابت ہوا۔ وہ ماجھا کو مشکل میں گھرا چھوڑ کر بھاگ نکلا اور ماجھا اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ چوبی مُڈی، بُغدا اور پٹواری کا ہاتھ......اُدھر ہی پڑا ہے۔''

''پھر......'' میں نے اضطراری لہجے میں حوالدار سے دریافت کیا۔ ''خادم حسین! حویلی میں......دوسری لاش......کس کی ہے......؟''

''چودھری فیروز کی......!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''چودھری فیروز دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ماجھا اپنے ساتھی ڈاکو کی معیت میں چودھری انعام کو نمونۂ عبرت بنانے کی غرض سے حویلی میں داخل ہوا تھا لیکن اس کی رائفل کی ایک گولی پر کاتبِ تقدیر نے چودھری فیروز کا نام لکھ رکھا تھا۔ ڈاکوؤں کو اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ حویلی کے اندر سے ایسی منظم مزاحمت پیش کی جائے گی۔ ہماری جانب سے کی جانے والی جوابی کارروائی نے ماجھا اور اس کے ساتھی ڈاکو کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ نتیجتاً وہ دونوں بے دریغ فائر کرنے لگے۔ اپنے دفاع میں جواباً ہمیں بھی گولیاں چلانا پڑیں۔ ماجھا کی چلائی ہوئی ایک گولی چودھری فیروز کے دل میں پیوست ہو گئی اور میری گن سے نکلنے والی ایک گولی نے ماجھا کو ٹھنڈا کر دیا......''

خادم حسین اپنی بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''ہمیں فوراً ظفر گڑھ پہنچنا ہوگا اور تم بھی میرے ساتھ جاؤ گے۔''

''ضرور جاؤں گا ملک صاحب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''اور میرے ساتھ ایک جوڑی آہنی زیور بھی جائے گا۔''

میں نے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔ ''وہ کس لیے خادم حسین؟''

''چودھری انعام کے لیے......'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''اسے گرفتار کرنے کا اس سے زیادہ موزوں موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں لگے گا۔ ابھی تک یہ بات اُس کے علم میں نہیں ہے کہ آپ نے اس کے تین بندوں کو گرفتار کرایا ہے۔ اگر چھوٹے چودھری کو ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ اس کے تین نمک خوار، عدالت میں اس کے خلاف بیان دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو وہ ہماری پہنچ سے کہیں دور نکل جائے گا۔''

حوالدار خادم حسین کی دلیل دم دار تھی لہٰذا میں نے اس سے کامل اتفاق کرتے ہوئے کرسی چھوڑ دی اور ضروری تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد میں خادم حسین کے ساتھ تانگے پر سوار ہو کر موضع ظفر گڑھ روانہ ہو گیا۔

یہ بائیس جنوری کی ایک یخ بستہ صبح تھی۔ میں پچھلے چوبیس گھنٹے سے مسلسل مصروفِ کارِ سرکار تھا اور اُدھر حویلی میں ابھی جس درجے کے معاملات کو نمٹانا تھا، ان میں آج کا سارا دن صرف ہو جانا تھا۔ پولیس کے بارے میں الٹی سیدھی منفی باتیں کرنے والے لوگوں کو کاش اس حقیقت کا احساس ہو جائے کہ ہمارا کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے......!

اس روز میں نے چودھری فیروز کی حویلی کے معاملات کو کس طرح ہینڈل کیا، میں اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ مجھے قارئین سسپنس کی ذہانت، سمجھداری اور مآل اندیشی پر کوئی شک نہیں ہے۔ ہاں، البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ حوالدار خادم حسین نے ماجھا کی حویلی میں دوبارہ آمد کو جو اس کی بے وقوفی اور حماقت پر منطبق کیا تھا، وہ میری نگاہ میں مشیت ایزدی تھی۔

وہ ثالث بالخیر، لیل و نہار کا خالق اور مالک ہے۔ اس قادرِ مطلق نے اِس دنیا اور اُس دنیا کی حرکات و سکنات کو پوری وضاحت کے ساتھ لوحِ محفوظ پر تحریر کر رکھا ہے۔ ظفر گڑھ کے وسنیک چودھریوں کے ظلم و جبر کے خلاف زبان کھولنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ انسان کے لبوں پر تو قفل ڈالے جا سکتے ہیں مگر دلوں کی دھڑکن کو اپنی مرضی کے موافق چلانا ممکن نہیں ہوتا۔ جانے کتنے ہاتھ چودھریوں کی زیادتیوں کے خلاف آسمان کی جانب اٹھتے ہوں گے اور کتنے دلوں کا خون، آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ جاتا ہوگا......!

انہی بے کس و لاچار ہاتھوں اور دلوں میں سے کسی کی میرے پروردگار نے سن لی تھی۔ اس کے ہاں دیر تو ہو سکتی ہے مگر اندھیر نہیں۔

(تحریر: حسام بٹ)

فنکار

کبیر عباسی

برے کو برا کہنا تو عام سی بات ہے۔ مزہ تو تب ہے جب برے کو برا سمجھنے کی وجہ ڈھونڈنا اور اس کی برائی کا سدباب کرنے کے لیے تھوڑی سی انفرادی کوشش کرلی جائے... اور اس میں سارا عمل دخل اس انسان کی فطری اچھائی کا ہوتا ہے جو کسی کی برائی کو ختم کرکے اس کی خصوصیات کو ابھرتا دیکھنا چاہتا ہے اور ان کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا جو پتھر کو تراش کر ہیرا بنانے کا فن جانتے تھے۔

بڑے بڑے بازی گروں کی قلعی کھولنے والے فنکاروں کا ماجرا

راولپنڈی شہر میں..... واقع پولیس اسٹیشن کی مارت کے ایک کمرے میں عثمان اور ذیشان شطرنج کی باط بچھائے بیٹھے تھے۔ وہ دونوں سب انسپکٹرز تھے اور اس تت آف ڈیوٹی تھے۔ فارغ وقت میں وہ اکثر اپنے اسی مشغلے میں مشغول نظر آتے تھے۔ دونوں میں ایک قدر مشترک تھی کہ دونوں کو ذہن کا استعمال بہت پسند تھا۔ شطرنج کے علاوہ بھی جہاں موقع ملتا اپنے ذہن کو خوب کام میں لاتے تھے۔

دونوں کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔عثمان نرم اور معصوم سے چہرے کا مالک تھا۔اس کی آواز میں بھی نرمی گھلی رہتی تھی جبکہ اس کے برعکس ذیشان کے خدو خال میں کرختگی پائی جاتی تھی۔اس کی آواز سے رعب و دبدبہ جھلکتا تھا۔دونوں ظاہری شخصیت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے متضاد تھے لیکن ان کے مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کا مزاج بھی ملتا جلتا تھا۔

عثمان اور ذیشان کی دوستی مثالی تھی اور یہ دوستی بچپن سے قائم تھی۔دونوں نے اکٹھے ہی پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن کیا تھا۔ان کی تعیناتی ایک ہی جگہ ہوئی تھی اور ڈیوٹی بھی عموماً ایک ہی وقت میں ہوتی تھی۔وہ دونوں گزشتہ دو سال سے اسی اسٹیشن میں تعینات تھے۔اپنے دیگر ساتھیوں کے برعکس وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے اور ان کی حتی المقدور کوشش ہوتی کہ اپنی ڈیوٹی ذمے داری سے سرانجام دیں۔وہ جانتے تھے کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے مگر وہ اپنے ساتھیوں کی سرگرمیوں سے چشم پوشی برتتے تھے اور بدلے میں یہی توقع رکھتے تھے۔یوں تو ان کے ساتھی بھی ان کے معاملات میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے تھے تاہم ان کا ایک شوق ایسا تھا جس کی وجہ سے ان کے ساتھی اکثر انہیں طنز کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔وہ اس شوق کے ہاتھوں مجبور تھے اس لیے خاموشی سے اپنے ساتھیوں کے طنز کے وار برداشت کر لیتے تھے۔یہ بھی غنیمت تھا کہ ان کے شوق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا،صرف مذاق اڑانے پر ہی اکتفا کر لیا جاتا تھا۔

دونوں کھیل میں پوری طرح مگن تھے۔عثمان نے ذیشان کو فیل پٹانے کا لالچ دیا تھا اور ذیشان اس کے پیچھے چال بھانپنے کے لیے غور و خوض میں مصروف تھا۔عثمان نے چند لمحے بعد ہلکا سا اضطراب ظاہر کیا جو ذیشان سے چھپا نہیں رہ سکا۔اضطراب ظاہر کرنے کا مقصد تھا کہ اس سے یہ چال غلطی سے سرزد ہوگئی ہے۔بظاہر فیل کو مارنے میں کوئی خدشہ نہیں تھا تاہم اس کے نتائج تین چالوں کے بعد ظاہر ہوتے۔قریب تھا کہ ذیشان چال کی گہرائی تک پہنچ جاتا کہ کمرے میں نائب قاصد شکور کی آمد ہوئی۔

''آپ دونوں کو انسپکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔''اس نے آتے ہی اطلاع دی۔

''خیریت تو ہے؟''عثمان نے لمحے بھر کے لیے بساط سے نظر ہٹا کے پوچھا۔

''آپ کا من پسند شکار شکنجے میں آیا ہے۔''اس کے لہجے میں موجود معنی خیزی محسوس کر کے دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''تم چلو ہم دو منٹ میں آتے ہیں۔''ذیشان نے کہتے ہوئے فیل کو اپنے مہرے سے مار دیا۔عثمان کے چہرے پر فتح مندانہ تاثرات نمودار ہوئے۔

''آخر تم میری چال میں آ ہی گئے۔''وہ فخریہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

''وہ کیسے؟''ذیشان کے چہرے پر اچنبھے کے تاثرات ابھرے۔

''وہ ایسے۔''عثمان نے اگلی چال چلی۔عثمان کو لمحے بھر میں ہی سمجھ آگئی کہ اسے شہ مات ہونے والی ہے۔

''چھوڑ یار! چل اصل کھیل کھیلتے ہیں۔''اس نے آنکھ کا گوشہ دبایا اور بساط سے مہرے اٹھانے لگا۔عثمان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''یاد رکھنا، یہ لگاتار تمہیں ساتویں شہ مات ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے میرے باپ، میں مانتا ہوں تو شطرنج میں مجھ سے بڑا کھلاڑی ہے لیکن اصل کھیل میں تو میرے بغیر اکیلے کبھی جیت نہیں سکتا۔''

''اور تو میرے بغیر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔''اس نے اطمینان سے کہا۔

''ہاں، ہم دونوں لازم و ملزوم ہیں مگر میں نہ ہوتا تو تجھے کوئی یہ کھیل کھیلنے کا موقع نہ دیتا۔یہ میری دلیری ہی ہے کہ اتنے حریفوں کے بیچ بھی اپنے شوق کی راہ نکال رکھی ہے۔''

''ٹھیک ہے بھئی، اب یہ بحث چھوڑ اور چل دیکھتے ہیں آج ہماری قسمت میں کیسا مال آیا ہے۔''عثمان نے معنی خیز انداز میں کہا اور آفس کی طرف چل پڑا۔

وہ انسپکٹر کے کمرے میں پہنچے تو انہیں سادہ لباس میں دیکھ کے انسپکٹر جہانگیر نے گھڑی کی طرف نگاہ کی۔ان کی ڈیوٹی شروع ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

''ہاں بھئی، جوانو۔تیار ہو؟''انسپکٹر ان کا ہم مزاج تھا اور دراصل اسی کی شہ پر انہیں اپنا مخصوص کھیل کھیلنے کا موقع ملتا تھا۔

''یس سر۔''ذیشان نے مستعدی سے کہا۔''ہم آن ڈیوٹی ہوں یا آف ڈیوٹی، ہر دم تیار رہتے ہیں۔''

''دو پندرہ سولہ سالہ لڑکے پکڑے گئے ہیں۔ان کے لیے آپ لوگوں کو بلوایا ہے۔''انسپکٹر نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے بے پروا سے انداز میں کہا۔عثمان اور ذیشان میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا پھر وہ سوالیہ نظروں سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

انسپکٹر نے بات آگے بڑھائی۔ ''آپ لوگ جانتے ہیں کہ ایم پی اے صاحب کو ان دنوں تھریٹس مل رہے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ پر اضافی نفری تعینات ہے۔ یہ دونوں لڑکے ان کے گھر کے اردگرد مشکوک انداز میں کافی دیر سے منڈلا رہے تھے۔ ایک پولیس اہلکار ان کی طرف بڑھا تو وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے، مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہیں پکڑ کے تلاشی لی گئی لیکن ان کے پاس سے کوئی مشکوک شے برآمد نہیں ہوئی۔ مگر ہم کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اس لیے انہیں ساتھ لے آئے ہیں۔''

''او کے سر! ہم اس وقت آف ڈیوٹی ہیں مگر ان سے مل لیتے ہیں۔'' ذیشان نے 'مل' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر مزے اڑاؤ۔'' انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے ریلیکس سے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ذیشان اور عثمان نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور باہر نکل آئے۔

☆☆☆

فرخ حوالات میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں موٹی چین اور بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے وہ دیکھنے میں کوئی لفنگا نظر آتا تھا۔ وہ بظاہر بے پروا نظر آرہا تھا لیکن اندر سے اس کی حالت پتلی تھی۔ جرم کی راہ پر چلتے اسے تین چار ماہ ہو چکے تھے مگر پولیس سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا خیام خوفزدہ انداز میں بار بار تھوک نگل رہا تھا۔ فرخ کے برعکس اس کا حلیہ بھی شریفانہ تھا اور چہرے سے بھی وہ انتہائی خوبصورت اور معصوم لگتا تھا۔ 'ممی ڈیڈی بچے' کی اصطلاح اس پر صادق آتی تھی۔

فرخ اور خیام پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ دوست بھی تھے۔ چند ماہ قبل دونوں کی زندگی عام سی ہی تھی جیسا کہ عموماً اس عمر کے لڑکوں کی ہوتی ہے۔ دونوں میٹرک کے طالبعلم تھے اور ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ پڑھائی میں ان کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ زیادہ وقت وہ فلمیں دیکھتے اور آوارہ گردی کرتے ہی گزارتے تھے۔ ان دونوں کے والد بھی گہرے دوست تھے۔ وہ ایک ہی پرائیویٹ فرم میں جاب کرتے تھے اور اکثر ایک ساتھ ہی نظر آتے تھے۔ خیام کے والد کے پاس بائک تھی اور وہ اس پر اکٹھے آفس جایا کرتے تھے۔ بائک تو فرخ کے والد صاحب کے پاس بھی تھی مگر وہ زیادہ تر فرخ ہی کے زیر استعمال رہتی تھی۔

فرخ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ سحرش اور مہوش دونوں اس سے بڑی تھیں۔ سحرش گریجویشن کر چکی تھی اور پرائیویٹ ماسٹرز کی تیاری کر رہی تھی جبکہ مہوش تھرڈ ائیر کی طالبہ تھی۔ اکلوتا بھائی اور وہ بھی چھوٹا ہونے کے باعث وہ گھر بھر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ سب کی چاہت نے جہاں اسے اعتماد بخشا تھا، وہاں خصوصی مراعات نے اسے چند... بدعادات میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے گھر والے اس کی ہر وقت کی آوارہ گردی سے نالاں رہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بس پڑھائی پر فوکس کرے لیکن وہ ان کی روک ٹوک اور نصیحتوں کو چٹکیوں میں اڑا دیتا۔ خیام بھی اکلوتا بھائی تھا، اس سے چھوٹی ایک بہن مائرہ تھی۔ مڈل تک وہ خاصا شریف اور پڑھاکو بچہ رہا تھا مگر میٹرک میں آ کے فرخ کی صحبت میں وہ بھی اس کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔

فرخ اور خیام کی زندگی مزے میں گزر رہی تھی۔ وہ میٹرک کے پرچے دے رہے تھے۔ آخری پرچہ دے کر وہ امتحانی سینٹر سے باہر نکلے تو بے انتہا خوش تھے۔ اب صرف پریکٹیکلز باقی تھے اور ان کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔ مشکل کام پرچے دینا تھا اور ان سے، ان کی جان چھوٹ گئی تھی۔ انہیں اس دن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک طویل عرصے سے وہ ایک قید خانے میں بند تھے اور بالآخر اس سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ دوستوں کے ساتھ بائکس پر آوارہ گردی کرنے نکل گئے تھے۔ شہر بھر کی خاک چھاننے اور خوب ہلا گلا کرنے کے بعد وہ شام کو تھکے ہارے گھر پہنچے تو ایک روح فرسا خبر ان کی منتظر تھی۔ دفتر سے واپسی پر خیام کے والد کی بائک کو ایک تیز رفتار گاڑی نے ہٹ کیا تھا۔ فرخ کے والد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان دونوں کو تشویشناک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ ان کے گھر والے اطلاع ملتے ہی اسپتال روانہ ہو گئے تھے۔

یہ خبر سن کے خیام کا چہرہ تو فق ہو گیا تھا لیکن فرخ نے خود کو تیزی سے سنبھالا۔ اس نے پڑوسیوں سے تفصیلات معلوم کیں اور بائک کو اسپتال کی طرف موڑ دیا۔ خیام بے حد خوفزدہ تھا۔ وہ بار بار اپنے خوف کا اظہار فرخ سے کر رہا تھا۔

''فکر مت کر یار! کچھ نہیں ہوگا۔ حادثات تو روز کا معمول ہیں۔ امید ہے وہ جلد تندرست ہو جائیں گے۔'' وہ خیام کو تو تسلی دے رہا تھا لیکن اندر سے اس کی حالت بھی بری تھی۔

شام کے وقت روڈ پر بے پناہ رش تھا۔ وہ گاڑیوں کے بیچ سے بائک کو نکالتا، خود کو امید دلاتا اسپتال پہنچا لیکن اس کی ساری امیدیں، محض خوش امیدی ہی ثابت ہوئی

تھیں۔ ان کے سر سے سائبان چھن چکا تھا۔ ان کی مائیں اور بہنیں ان سے لپٹ کے رونے لگیں۔ خیام بھی ان کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا لیکن فرخ ضبط کی تفسیر بن گیا۔ اس نے اپنی آہوں و سسکیوں کا گلا اندر ہی گھوٹ لیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اپنی ماں اور بہنوں کا خدا کے بعد اب وہی سہارا ہے۔ وہ انہیں دلاسا دینے لگا۔ وہ رات کو میتیں لے کر گھر پہنچے تو محلے میں کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ تقدیر کے ایک ہی وار سے دو خاندان آندھیوں کی زد پر آ گئے تھے۔ خیام کو تو اپنا ہوش نہیں تھا مگر فرخ نے خود کو سنبھالے رکھا تھا۔ چند محلے داروں اور رشتے داروں کے ساتھ مل کر اسی نے تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا تھا۔

☆☆☆

ان مشکل دنوں میں جس طرح فرخ نے اپنے اور خیام کے گھر والوں کو سنبھالا تھا، اس سے خیام کے دل میں اس کی قدر بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ غیر محسوس انداز میں اسے اپنے سرپرست کا درجہ دینے لگا تھا۔ چند دن تو غم اور تعزیت کے لیے آنے والوں کی خاطر مدارت کرتے انہیں کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ مہمانوں کی آمد کم ہوئی تو مستقبل کا مہیب دیو انہیں اپنے شکنجے میں لینے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ ان کی جمع پونجی کچھ خاص تھی نہیں، جو تھی اس سے بھی بیشتر حصہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں خرچ ہو چکا تھا۔

فرخ اور خیام نے مشورہ کیا کہ اب انہیں کسی کام دھندے کی تلاش میں نکلنا ہی ہوگا۔ میٹرک کے بعد انہوں نے جو آوارہ گردیوں کے خواب دیکھے تھے، حالات کی کروٹ نے انہیں چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ کسی کام کی تلاش میں نکلنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ کورونا کی وجہ سے پورے ملک میں لاک ڈاؤن ہو گیا۔ ملک بھر میں معاشی سرگرمیاں معطل ہو گئیں۔ اس غیر یقینی صورتِ حال سے تو اچھے خاصے آسودہ حال لوگ پریشانی کا شکار ہو گئے۔ وہ بیچارے تو پہلے ہی حالات کی چکی میں پس رہے تھے۔

والد کی وفات کے بعد یہ دوسری ناگہانی تھی جس نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔ لاک ڈاؤن کے دوران چند خدا ترس لوگوں کی وجہ سے انہیں راشن ملتا رہا ورنہ ان کے گھر فاقوں تک نوبت پہنچ چکی ہوتی۔ لاک ڈاؤن کا عرصہ جوں جوں بڑھتا گیا، غرباء کی مدد کرنے کا جذبہ بھی لوگوں میں کم ہونے لگا۔ اب تو ہر ایک کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ ان کا محلہ غرباء یا متوسط طبقے کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان دنوں سرکاری ملازمین کے علاوہ سبھی پریشانی کا شکار تھے۔

کچھ عرصے بعد لاک ڈاؤن جزوی طور پر کھلنا شروع ہو گیا مگر کام دھندے کی صورت حال ابھی تک ابتر تھی۔ فرخ کا خیال تھا کہ کپڑوں کی دکانیں کھلیں تو وہ کسی گارمنٹ شاپ پر سیلز مین لگ جائیں گے لیکن ہنوز اس کا امکان دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک دن وہ گلی میں تھڑے پر پریشان بیٹھے تھے کہ ان کے ایک محلے دار انیل کا وہاں سے گزر ہوا۔ انیل کی شہرت محلے میں اچھی نہیں تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کا غنڈے بدمعاشوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہ انہیں دیکھ کے ان کے پاس رکا۔

''کیوں بھئی، جوانو! کیوں اداس الو بنے بیٹھے ہو؟'' وہ بے تکلفی سے ان سے مخاطب ہوا۔ خیام نے اسے دیکھ کر ناگواری سے منہ پھیر لیا تاہم فرخ پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''انیل بھائی! آپ تو ہمارے حالات بھی جانتے ہیں اور ملک کے حالات بھی۔ ان حالات نے ہمیں بے بس کر دیا ہے۔''

انیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''مرد بن یار..... مرد حالات کے سامنے بے بس نہیں ہو جاتے بلکہ اپنی ہمت سے حالات کو بدلتے ہیں۔''

''ان حالات نے تو سب کو بے بس کر دیا ہے۔ سب کا کام دھندا بند ہے۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''ہمت والوں کے لیے کام دھندا کبھی بند نہیں ہوتا۔ ہمت کر ابھی تیرے حوالے کوئی کام کر دیتا ہوں۔'' اس نے ایسے کہا۔ جیسے اس کے لیے یہ معمولی بات ہو۔

فرخ کے چہرے پر چمک ابھری۔ ''بتائیں بھائی۔ میں ہر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' خیام نے اسے حیرانی سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''بائیک ہے نا تیرے پاس؟'' انیل نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''جی بھائی۔''

''پھر میرا ایک پارسل صدر کے علاقے تک پہنچا آئے گا؟''

''اس پارسل میں کیا ہوگا؟''

انیل کے چہرے پر سختی کا تاثر ابھرا۔ ''میں تمہیں اس معمولی سے کام کے پانچ ہزار دوں گا۔ مگر بس ایک شرط ہوگی کہ تو کوئی سوال نہیں کرے گا۔''

فرخ کشمکش میں نظر آنے لگا۔ خیام اسے بے چینی سے دیکھ رہا تھا لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اسے کشمکش میں دیکھ کر انیل بولا۔

''جلدی بتا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں اور نہ ہی اس کام کے لیے بندوں کی کمی ہے۔ میں تو بس تیری مدد کے خیال سے تجھے کہہ بیٹھا۔''

یکدم فرخ کے چہرے پر فیصلہ کن تاثر ابھرا۔ ''ٹھیک ہے بھائی۔ میں تیار ہوں۔'' اس نے پختہ انداز میں کہا تو انیل کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری۔

''یہ کام تو نے ذمے داری سے کر دیا تو آئندہ تجھے کام کے لیے کبھی پریشانی نہیں ہوگی۔'' فرخ نے جواب میں مسکرانے پر اکتفا کیا۔

انیل نے جیب سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ یہ پلاسٹک شیٹ میں لپٹا ہوا پیکٹ تھا جس میں کوئی نرم سی چیز موجود تھی۔ پیکٹ چھوٹا سا تھا مگر اس کا وزن چار پانچ سو گرام کے قریب لگ رہا تھا۔ انیل اسے اس شخص کے متعلق بتانے لگا جس تک فرخ نے پیکٹ پہنچانا تھا۔

''کام کرنے کے بعد میرے گھر آ جانا۔ معاوضہ میں کام کے بعد دوں گا۔ وہ بھی اگر مجھے کوئی شکایت نہ ہوئی تو......'' اس کے انداز میں تنبیہ چھپی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں۔'' فرخ نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''تو پھر جاؤ۔ ایک گھنٹے کے اندر پیکٹ میرے مطلوبہ بندے تک پہنچ جانا چاہیے۔ وہ مجھے فون پر بتا دے گا۔''

فرخ بائیک نکالنے کے لیے گھر کی طرف بڑھا۔ خیام اس کے پیچھے تھا۔

''یہ کیا کیا تم نے۔ کیا پتا اس پیکٹ میں کیا ہے۔'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ چرس ہی ہوگی۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''پھر بھی اگر ہم پکڑے گئے تو؟''

''آج تک کبھی کسی نے ہمیں روک کر ہماری تلاشی لی؟'' فرخ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں لی مگر......''

فرخ اس کی بات کاٹ کے تیزی سے بولا۔ ''تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو بتاؤ۔ نہیں تو میں اکیلا چلا جاؤں گا۔''

''میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا لیکن سوچ لو۔ ایک دفعہ ہم اس دلدل میں پھنس گئے تو ہمارے لیے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''اب بھی تو ہم حالات کے گہرے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کچھ اور دھنس گئے تو کیا فرق پڑے گا۔ اپنی بقا کے لیے ہمیں کچھ تو کرنا ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن جرم......''

''یار! ...... اب بور نہ کر۔'' فرخ بیزاری سے بولا۔ ''اس ملک میں پاک صاف کون ہے۔ اب اس انیل کو ہی دیکھ لے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ محسن خان کے لیے کام کرتا ہے اور محسن سیاسیوں کا گرگا ہے۔ وہ اسے قانون سے بچاتے ہیں اور یہ ان کے لیے زمینوں پر قبضے سے لے کر اغوا، ٹارگٹ کلنگ سب کرتا ہے۔ سیاستدان عوام کی فلاح کے جھوٹے دعوے کر کے اسمبلیوں تک پہنچتے ہیں اور پھر کیسے عوام کو بھول کر اپنے اکاؤنٹ بھرنے میں لگ جاتے ہیں۔ یہی دیکھ لے، کورونا میں لاک ڈاؤن کا فیصلہ تو فوری کر لیا گیا لیکن ابھی تک انہوں نے ہمارے لیے کیا کیا۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی۔ خیام ششدر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ کروڑوں کے مالک ہونے کے باوجود نت نئے ہتھکنڈوں سے عوام کو لوٹتے ہیں۔ ہم تو مجبوری میں ایسا کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس نہ کوئی اور کام ہے نہ چانس۔ یہی حالات رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے گھر فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔ ہمیں اپنے حالات سدھارنے کے لیے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ جائز ناجائز کا خیال کیے بغیر۔'' خیام حیرت سے اس کی ساری تقریر سن رہا تھا۔

''تم بہت بدل گئے ہو۔ ایسی باتیں تم نے پہلے تو کبھی نہیں کیں۔''

''وقت سب کو بدل دیتا ہے لیکن وقت اسی کا بدلتا ہے جو وقت کے ساتھ خود کو بدلتا ہے۔'' فرخ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ خیام ویسے بھی حد درجہ فرخ پر اعتماد کرتا تھا۔ اس کی تقریر سے وہ مکمل نہ سہی، اس بار اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا۔

وہ دونوں بہ آسانی اپنے پہلے ٹاسک میں سرخرو ہو گئے تھے۔ انیل نے واپسی پر انہیں چائے پلائی اور پانچ ہزار روپے بھی دیے۔ انیل نے اس کے لیے آئندہ کام کی یقین دہانی بھی کی تھی۔ واپسی پر فرخ نے دو ہزار خیام کے حوالے کیے۔ اس نے پیسے تو لے لیے تھے جو اس کی ضرورت تھے مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے فرخ سے بھی اظہار کیا۔

''یار! آئندہ کام کا کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ چند دن

تک ہمارا گزارہ اس رقم سے چل جائے گا۔ تب تک امید ہے بہتری کی کوئی صورت نکل آئے گی۔''

''ہم اس امید کے سہارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتے۔ باجی، کل کہہ رہی تھی کہ وہ جاب تلاش کرنے نکلے گی۔ اب لڑکیوں کے لیے ہمارے معاشرے میں کتنی مشکلات ہیں۔ وہ تُو جانتا ہی ہے۔'' وہ بظاہر سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز میں چھپا کرب خیام بخوبی محسوس کر رہا تھا۔

''تم درست کہہ رہے ہو لیکن ہم پکڑے گئے تو ہمارے گھر والوں کا کیا ہوگا۔ یہ سوچا تم نے؟ ہمیں تو کوئی بچانے والا بھی نہیں۔''

''تم خوامخواہ ڈر رہے ہو۔ ہم کسی خطرناک کام میں ہاتھ ڈالیں گے ہی نہیں اور محض چھوٹی موٹی ڈیلیوری کے دوران پکڑے جانے کا کوئی چانس ہی نہیں۔'' اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''پھر بھی...... زیادہ نہ سہی۔ خطرہ تو ہے اس کام میں۔''

''وہ تو ہر کام میں ہوتا ہے۔ بہرحال اگر کبھی ایسا ہو بھی گیا تو یہ ہے نا۔'' اس نے کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ذہن کے درست استعمال سے انسان بڑی سے بڑی مشکل سے نکل آتا ہے۔'' اس کے انداز میں عجیب طرح کا اعتماد تھا۔ خیام کو نہ چاہتے ہوئے بھی قائل ہونا ہی پڑا۔

اس کے بعد یہ ان کا معمول بن گیا۔ ہفتے میں ایک دو بار انیل انہیں کوئی پارسل کہیں پہنچانے کے لیے ان کے حوالے کر دیتا۔ فرخ تو ان کے اڈے سے بھی واقف ہو گیا تھا جہاں وہ لوگ منشیات رکھتے تھے۔ اس نے سب سن رکھا تھا مگر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ محسن خان کے پاس پوری غنڈا فورس موجود تھی۔ منشیات و اسلحے کی خرید و فروخت کے علاوہ یہ لوگ بااثر لوگوں کے کہنے پر کوئی بھی ناجائز کام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

کسی کے منہ سے سننا اور بات ہوتی ہے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا الگ بات۔ فرخ جوں جوں ان کے بارے میں جانتا جا رہا تھا، خوفزدہ ہوتا جا رہا تھا۔ انیل اس پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فرخ باقاعدہ اس کی شاگردی میں آ جائے۔ وہ اسے اسلحے کا استعمال بھی سکھانا چاہتا تھا لیکن فرخ نے فی الحال اس [illegible] معذرت کر لی تھی۔

خیام کے کہنے پر کپڑوں کی [illegible] کے بعد وہ ایک دکان پر سیلزمین لگ گئے تھے لیکن [illegible] اتنی معمولی تھی کہ اس سے گھر کا خرچ چلانا ممکن نہیں تھا۔ یہ نوکری بھی اس نے خیام کی ضد پر کی تھی ورنہ اس کے لیے فی الحال انیل کے دیے گئے کام سے گزارہ چل رہا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ جو کام کر رہا ہے انیل اسی پر اکتفا کر لے گا، اسے زبردستی ''ترقی'' دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مگر یہ اس کی بھول تھی۔ انیل نے اسے مجبور کرنے کے لیے وہاں سے وار کیا تھا جہاں...... اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اس دن فرخ، خیام کے ساتھ انیل کا دیا گیا پارسل لوٹا کے گھر پہنچا تو اسے انیل اپنے گھر سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ وہ جب تک گیٹ تک پہنچتا، انیل دوسری گلی میں اوجھل ہو چکا تھا۔ اسے اپنے گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر تفکرات کا جال تن گیا۔ اس نے کال بیل بجائی۔ اس کی امی نے دروازہ کھولا، تو انہیں دیکھتے ہی وہ غصے سے بولا۔

''یہ انیل ہمارے گھر کیوں آیا تھا؟''

امی نے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو نرمی سے بولیں۔ ''اندر تو آؤ، میں تمہیں بتاتی ہوں۔''

اس نے بائیک اندر کھڑی کی۔ لاؤنج میں پہنچتے ہی وہ صوفے پر ڈھے گیا۔ اس کی امی بھی اس کے سامنے بیٹھ چکی تھیں۔ وہ انہیں منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ میں گم تھیں۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ اس غنڈے کو آپ نے گھر میں کیوں داخل ہونے دیا؟'' وہ بمشکل اپنے طیش پر قابو پائے ہوئے تھا۔

انہوں نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا اور بولیں۔ ''یہ بھلا مانس لڑکا ہے۔ ہماری مدد کرتا رہتا ہے۔''

''آپ گھر میں ہوتی ہیں۔ کسی کے بارے میں جانتی ہی کیا ہیں۔ میں باہر ہوتا ہوں، جانتا ہوں کہ وہ شریف آدمی نہیں ہے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''بیٹا! ہمارے ساتھ تو وہ انتہائی شرافت سے پیش آتا ہے۔''

''کچھ بھی ہے۔ آپ آئندہ اسے گھر میں داخل نہیں ہونے دیں گی۔'' اس کے لہجے میں حد درجہ سختی تھی۔ ''بلکہ میں اس سے خود بات کروں گا۔'' اس نے کچھ سوچ کے کہا۔

''نہیں بیٹا! تم اس سے مت الجھنا۔ میں خود اسے طریقے سے منع کر دوں گی۔''

''وہ آپ کے کہنے سے نہیں مانے گا۔ مجھے خود ہی بات کرنی ہوگی۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا تو وہ مضطرب ہو گئیں۔

''نہیں بیٹا! اب ہمارے وہ پہلے والے حالات نہیں

رہے۔ اب ہمیں بڑا سنبھل کے محلے میں رہنا ہوگا۔ ہم کسی کی دشمنی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔ فرخ تڑپ گیا۔ وہ اٹھ کے امی کے قدموں میں بیٹھا اور ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

''امی..... کیا ہوا، ابو نہیں رہے تو۔ میں..... آپ کا بیٹا تو زندہ ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی آپ اور اپنی بہنوں پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''مجھے تم پر بھروسا ہے بیٹا۔ اسی لیے تو تمہیں منع کر رہی ہوں کہ کسی سے الجھنا مت۔ تم کسی مشکل میں پڑے تو ہمارا کیا ہوگا۔ کون سنبھالے گا ہمیں۔'' ان کی بات سن کر فرخ کو چپ سی لگ گئی۔ اسے عجیب سی پشیمانی نے گھیر لیا تھا۔ اسے خیام کی بات یاد آرہی تھی کہ اس دلدل میں ایک بار اتر گئے تو اندر ہی اندر دھنستے چلے جائیں گے۔

''کچھ بھی ہو، مجھے اس سے خود بات کرنی ہی ہو گی۔ میں ہرگز اپنے گھر والوں کو کسی بھیڑیے کا ترنوالا نہیں بننے دوں گا۔'' اس نے عزم سے سوچا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ صبح ہی صبح انیل کے گھر پہنچ گیا۔ وہ دو کمروں کے گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے گھر والوں کے بارے میں نہ فرخ جانتا تھا نہ پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ انیل اسے دیکھتے ہی خوشدلی سے بولا۔ ''یار..... تو آ گیا۔ ویلکم، مگر میرے پاس فی الحال تو تیرے لیے کوئی کام نہیں۔''

''میں آج آپ سے کام لینے نہیں، ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''ہاں بولو۔'' وہ بے فکری سے دانتوں میں خلال کرنے لگا۔ یکدم وہ چونکا اور بولا۔ ''ایک منٹ، پہلے میں تمہارے لیے چائے تو بنا دوں۔ پھر سکون سے بیٹھ کے دونوں بھائی بات کریں گے۔''

''نہیں..... نہیں۔'' اسے اٹھتے دیکھ کر فرخ تیزی سے بولا۔ ''چائے میں ابھی پی کے آیا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔''

اس نے کندھے اچکائے۔ ''ٹھیک ہے بھئی، جیسے تم خوش۔''

اس کی خوش اخلاقی دیکھ کر فرخ کی ہمت ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ انیل سکون سے بیٹھا اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اسے کشمکش میں دیکھ کر وہ بولا۔

''یار جی! کس سوچ میں گم ہو۔''

فرخ نے نظریں اٹھائیں اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کل ہمارے گھر کیوں گئے تھے؟'' انیل کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پھیلے۔

''کیوں بھئی، میں تیرا باس ہوں۔ اپنے باس کو تو لوگ خوشی سے خود گھر لے کے جاتے ہیں۔ اپنے گھر کی خواتین سے ان کی خدمت کراتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں چھپی معنی خیزی محسوس کر کے وہ بل کھا کے رہ گیا۔ اسے اپنی ماں اور بہنوں کا خیال نہ ہوتا تو ابھی اس پر چڑھ دوڑتا۔ اس نے خود پر بمشکل قابو پایا اور بولا۔

''آپ میرے گھر جانا چاہتے تھے تو میری موجودگی میں بھی جا سکتے تھے۔ یوں مجھے بتائے بغیر آپ کو نہیں جانا چاہیے تھا۔''

''میں تمہارا محلے دار ہوں۔ میرا تجھ سے ہی نہیں تیری ماں سے بھی تعلق ہے۔ مشکل وقت میں، میں تیری امی کی مدد کرتا رہا ہوں۔ اب میں ماں کے ہاتھ کی بنی چائے پینا چاہوں تو کیا اس کے لیے بھی مجھے تیری اجازت کی ضرورت ہے؟''

فرخ خود کو لاجواب محسوس کرنے لگا۔ وہ کچھ سوچ کے بولا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ گھر میں صرف میری امی نہیں بہنیں بھی ہوتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ محلے والے اس حوالے سے کوئی بات کریں۔''

''اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

فرخ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیسا حل؟''

''میں تیری امی سے بات کر چکا ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ میں سحرش سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے دھماکا کیا۔ فرخ اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ اچانک وہ غصے سے اٹھا اور انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ آج کے بعد میری بہن کا نام تیری زبان پر آیا تو میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔'' طیش کی شدت سے اس کی آواز لرز رہی تھی لیکن انیل پر اس کے غصے کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح سکون سے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیوں بھئی، مجھ میں کیا کمی ہے کہ میں ایک جائز خواہش کا اظہار بھی تیرے سامنے نہیں کرسکتا۔''

''یہ تم خود سے پوچھو۔ میں اپنی بہنوں کی شادی کسی شریف شخص سے کراؤں گا۔ تم جیسے غنڈے موالی سے نہیں۔''

انیل کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا۔ ''تم خود کیا ہو؟ منشیات کی ترسیل کرنے والے، میرے ٹکڑوں پر پلنے والے۔ تم کس منہ سے مجھے غنڈا ہونے کا طعنہ دے رہے ہو۔'' اس نے طیش آمیز طنزیہ انداز میں کہا تو فرخ کو ایسا لگا

جیسے اس پر کسی نے گھڑوں پانی انڈیل دیا ہو۔
''میں یہ سب مجبوری میں کر رہا ہوں۔'' اس نے کمزور سے لہجے میں دفاع کی کوشش کی۔
''سب مجبوری میں ہی ایسا کرتے ہیں اور پھر مجبوری ضرورت بن جاتی ہے۔'' اس نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔
''تو پھر میں یہ سب چھوڑ دیتا ہوں۔''
انیل نے کندھے اچکائے۔ ''ٹھیک ہے چھوڑ دو، مگر میں اب سحرش کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس کے لہجے میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ فرخ جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہ سارا غصہ بھول کے لجاجت سے بولا۔
''انیل بھائی! پلیز، شادی کوئی زبردستی کا سودا نہیں ہوتا۔ ہمارے لیے یہ مشکل وقت ہے تو اسے ہمارے لیے مزید مشکل نہ بنائیں۔ آپ بھی اگر مجبوری میں جرم کی راہ پر آئے ہیں تو آپ سے زیادہ کون ہماری مجبوری کو سمجھتا ہوگا۔''
''میرا تو ایسے وقت میں کوئی سہارا نہیں بنا تھا۔'' اس کے لہجے میں دکھ ہلکورے لینے لگا۔ فرخ امید بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ انیل نے سر جھٹکا اور سپاٹ انداز میں بولا۔ ''میں نے تجھے مجبور نہیں کیا بلکہ ہمیشہ تیرا ساتھ دیا ہے۔ تجھے اس وقت کام دیا جب تجھے کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ خاموشی سے تیرے گھر تب راشن پہنچاتا رہا جب باقیوں نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ رہی بات تیری بہن سے رشتے کی تو اس میں غلط کیا ہے؟ تو جانتا ہے کہ میں چاہوں تو اسے طاقت کے بل بوتے پر بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ مگر میں نے وہی طریقہ استعمال کیا جیسا ہمارے معاشرے میں رائج ہے۔'' اس کے لہجے میں دبا دبا طیش تھا۔
''میں مان لیتا ہوں کہ آپ نے غلط نہیں کیا لیکن میں آپ جیسے شخص کے ساتھ اپنی بہن کا رشتہ نہیں کر سکتا۔''
''اے۔'' اس نے غصے سے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''یہ بار بار تو میری توہین کیوں کر رہا ہے۔ میں جیسا بھی ہوں سب کو پتا ہے۔ صاف کون ہے یہاں؟ یہ تو جنہیں شریف سمجھتا ہے، میں جانتا ہوں انہیں۔ سب جائز کام بھی ناجائز طریقے سے کرتے ہیں اور وہ بھی دھڑلے سے، کوئی انہیں پوچھنے والا، ان پر اعتراض کرنے والا نہیں۔ جو ناجائز کام کرتے ہیں سب بچ بچا کے، چھپ چھپا کے کرتے ہیں۔ میں جو کام کرتا ہوں، اپنے لیے تو نہیں کرتا۔ یہ ان تمہارے نام نہاد شریفوں کے لیے ہی کرتا ہوں۔ وہ طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے لیے کئی کئی چہرے رکھتے ہیں۔ ہمیں ان کاموں پر وہی مجبور کرتے ہیں۔ ہم انکار کریں تو قانون کے نام نہاد محافظوں کی مدد سے ہمارا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ صرف ہم پر غنڈوں کا لیبل کیوں لگتا ہے۔ یہ ان پر کیوں نہیں لگتا جو رشوت لے کر ان کے ناجائز کام کرتے ہیں۔ ان پولیس والوں پر کیوں نہیں لگتا، جو حقیقت میں قانون کے نمائندے ہیں لیکن کام ان بااثر لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔ ان وکیلوں پر کیوں نہیں لگتا جو پیسے لے کے انہیں مکھن سے بال کی طرح صحیح سلامت نکال لیتے ہیں۔ ہم میں اور ان میں بس یہ فرق ہے کہ ہمارے ساتھ قانون کے محافظ کا ٹیگ نہیں لگا ہوتا۔ ہم پھر بھی ان سے بہتر ہیں کہ مجبوری میں ایسا کرتے ہیں۔ انہیں تو مجبوری بھی نہیں۔ تنخواہوں سے بس ضروریات پوری کرتے ہیں اور عیاشیوں کے لیے وہ طاقتوروں کے تلوے چاٹتے ہیں۔ ان سب نام نہاد شریفوں کی ایسی کی تیسی...... خبردار جو میرے سامنے شرافت کا پرچار کیا۔'' غصے سے اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ فرخ ہکا بکا اسے دیکھنے لگا۔ فرخ خود ان باتوں کا قائل تھا لیکن آج انیل کے منہ سے یہ باتیں سن کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ کیسے سب اپنے غلط کو درست سمجھنے کے لیے جواز گھڑتے ہیں۔
''آپ کی باتیں درست ہیں، لیکن ہم سماج کے طے کردہ معیار کو جھٹلا بھی نہیں سکتے۔''
''دیکھ...... میں سیدھی اور کھری بات کرتا ہوں۔ میں سحرش سے محبت کرتا ہوں۔ میں تجھے اپنے اور اس کے بیچ نہیں آنے دوں گا۔ تو نے ایسا کیا تو میں تیرے گھر والوں کو تیرے سارے کرتوت بتا دوں گا کہ کیسے تو شرافت کا چولا اوڑھ کے ہم جیسوں کے لیے کام کرتا ہے اور پھر ہمیں ہی باتیں سناتا ہے۔''
یہ دھمکی سن کر فرخ کے تو اوسان خطا ہو گئے۔ اگر اس کی امی اور بہنوں کو اس کی سرگرمیوں کا علم ہو جاتا تو وہ تو انہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ وہ تو اس پر انتہا درجے کا اعتبار کرتی تھیں۔ آج پھر اسے خیام کی بات یاد آ رہی تھی کہ جرم کی دلدل میں جو قدم رکھتا ہے پھر دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔
'کچھ بھی ہو، مجھے اب اپنا راستہ بدلنا ہوگا۔ خود کو اس دلدل سے نکالنا ہوگا۔' اس نے عزم سے سوچا۔

☆☆☆

فرخ حوالات میں سر جھکائے اپنی گزشتہ زندگی کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا۔ اب وہ پچھتا رہا تھا کہ نہ وہ انیل کے لیے کام کرنے کی حامی بھرتا، نہ آج وہ یہاں موجود ہوتا۔
''اب کیا ہوگا؟'' خیام نے خوفزدہ انداز میں پوچھا تو

فرخ چونک کر خیالوں سے باہر آیا۔
''تو فکر مت کر یار۔ میں نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کرنا۔ امید ہے ہم جلد ''آزاد'' ہوں گے۔'' خیام اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ فرخ کے اندازے درست ثابت ہوتے۔
''آہا، کیا خوب پنچھی پکڑے ہیں اس بار۔'' یہ آواز سن کے دونوں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ حوالات کے باہر ایک کرخت چہرے والا شخص سادہ لباس میں کھڑا انہیں گرسنہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ذیشان تھا۔ خیام نے ہراساں نگاہوں سے فرخ کی جانب دیکھا۔ اس نے خیام کا ہاتھ دھیرے سے دبا کے تسلی دی۔
''اس چکنے چھوکرے کو باہر تو نکال، ذرا دل پشوری کرتے ہیں۔'' کرخت چہرے والے نے آنکھ میچ کے ایک سپاہی سے کہا تو وہ حوالات کا تالا کھولنے لگا۔
''کہاں لے جا رہے ہو اسے؟'' فرخ، خیام کے سامنے آکر سختی سے بولا۔
''فکر نہ کر تیری باری بھی آئے گی۔ پھر جان لے گا تو کہ اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔'' سپاہی نے معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے فرخ کو دھکا دیا۔ وہ پیچھے جا گرا۔ خیام ہراساں نظروں سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سپاہی نے اس کا بازو پکڑ کے اسے اپنی طرف کھینچا اور حوالات سے باہر دھکیل کے تالا لگانے لگا۔ فرخ اٹھ کر تیزی سے لپکا۔
''پلیز، ایسا نہ کرو۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ حوالات کی سلاخیں پکڑ کر چلایا۔
''سب ایسا ہی کہتے ہیں۔'' کرخت چہرے والے نے کہا اور خیام کا بازو پکڑ کے کھینچنے لگا۔ فرخ چلاتا رہ گیا۔
خیام نے پولیس کے عقوبت خانے کا ذکر سن رکھا تھا جسے عرفِ عام میں ڈرائنگ روم کہا جاتا تھا۔ آج وہ بطور مہمان اس 'ڈرائنگ روم' میں موجود تھا۔ یہ سنگی دیواروں والا ایک تاریک کمرا تھا جس کی تاریکی زرد رنگ کا ایک مدقوق بلب دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ پولیس والے نے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ کمرے میں تشدد کے نت نئے آلات بکھرے پڑے تھے اور خیام انہیں خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
''دیکھ یہ کنڈا۔'' پولیس والے نے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس سے ہم مجرم کو ننگا کر کے الٹا لٹکاتے ہیں۔ پھر اس چابک سے اس کے ننگے بدن کی ٹکور کرتے ہیں۔'' اس نے چابک ہاتھ میں پکڑ کر لہرایا۔ شائیں کی آواز ابھری اور خیام نے اپنے بدن میں جھرجھری سی محسوس کی۔
''چابک سے ٹکور کے بعد ہم پانی میں نمک اور مرچ ملا کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں۔ یہ مرہم کتنا ''سکون'' دیتا ہوگا تم اندازہ کر سکتے ہو۔'' اس نے سکون پر زور دے کر کہا۔ ''زیادہ تر مجرم اتنی سی خاطر مدارت کے بعد ہی فرفر بولنے لگتے ہیں لیکن کوئی زیادہ ڈھیٹ ہو تو یہ دیکھو۔'' اس نے ہاتھ میں ایک آہنی خود اٹھایا۔ اس کے ساتھ بجلی کی ایک تار منسلک تھی۔ اس نے تار ساکٹ میں لگا کے سوئچ دبایا۔ گھر گھر کی آواز آنے لگی۔ پھر اس نے خود کے ساتھ لگا ایک بٹن دبایا تو وہ سکڑنے لگا۔ ''یہ ہم مجرم کے سر پر پہنا کے اسے آن کر دیتے ہیں۔ یہ جب مجرم کے سر کو جکڑنا شروع کرتا ہے، تو بڑے سے بڑا مجرم بھی سب اگلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔'' وہ اس سے ایک ایک چیز کا تعارف کرانے لگا۔ خیام کے چہرے کی رنگت انتہائی زرد پڑ چکی تھی۔ اس کا گلا خشک ہو چکا تھا۔ وہ تھوک نگل کر بمشکل بولا۔
''یہ سب مجھے کیوں دکھا رہے ہیں؟ میں نے کچھ نہیں کیا۔''
''ہاں بھئی، یہ سب میں تمہیں کیوں دکھا رہا ہوں۔'' وہ چہرے پر مصنوعی سوچ کے تاثرات سجا کر بولا۔ ''تم جیسے چکنے چھوکرے کے لیے تو میرے 'پیار' کا تشدد ہی کافی ہے اور یہ میرا پسندیدہ ترین تشدد ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں چھائی ہوس دیکھ کر خیام کا رواں رواں لرزنے لگا۔
''چل کپڑے اتار۔'' یکدم پولیس والا سختی سے بولا۔ خیام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اچانک دروازے پر دستک سنائی دی۔
پولیس والے کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمودار ہوئی۔ ''کون ہے؟'' اس نے ناگواری سے پوچھا۔
''ذیشان صاحب، میں عثمان ہوں۔ آپ کو انسپکٹر صاحب بلا رہے ہیں۔'' ذیشان نے جھلا کے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک اور سادہ لباس والا شخص کھڑا تھا۔ اس کا نرم چہرہ دیکھ کر خیام کے دل میں امید کی کرن جاگی۔
ذیشان نے مڑ کے خیام کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں لوٹ کے آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔'' الفاظ کے برعکس اس کے لہجے میں عجیب طرح کی سختی تھی۔
اس کے باہر جاتے ہی عثمان اندر آگیا۔ ''چچ چچ...... تم جیسا معصوم لڑکا کس جلاد کے ہتھے چڑھ گیا۔'' اس کی آنکھوں میں تاسف تھا۔ ہمدردی کے دو بول سن کے خیام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عثمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ

رکھا اور نرمی سے بولا۔

''دیکھو میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ یہ بہت ظالم شخص ہے۔ بڑے بڑے مجرم اس کا نام سن کے لرزنے لگتے ہیں۔ تم تو بہت کم عمر اور معصوم سے لڑکے لگتے ہو۔ تم مجھے بتاؤ، تم ایم پی اے صاحب کی گلی میں کیا کر رہے تھے۔ میں تمہاری نجات کا کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''ہم وہاں مجبوری میں گئے تھے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کیسی مجبوری؟'' عثمان نے حیرانی سے پوچھا۔ خیام کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''دیکھو، تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ مجھے جلدی بتاؤ۔ وگرنہ وہ جلاد آ گیا تو میں بھی تمہیں اس کے شر سے بچا نہیں سکوں گا۔''

''آپ مجھے ان لوگوں سے بھی نہیں بچا سکتے جن کے شر سے بچنے کے لیے ہمیں اس گلی میں جانا پڑا تھا۔ میں نے آپ کو کچھ بتایا تو ہمیں، ہمارے گھر والوں کو، کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ سب کو ماردیں گے۔'' نادیدہ خوف سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''قانون سے بالاتر کوئی نہیں۔ تم مجھے بتاؤ۔ میں کہیں تمہارا نام نہیں آنے دوں گا اور تم دیکھنا ان لوگوں میں سے کوئی بھی قانون سے بچ نہیں پائے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

''معذرت کے ساتھ، پولیس والے اس شخص کے زر خرید غلام ہیں۔ وہ تو فوراً اس تک رپورٹ پہنچائیں گے کہ میں نے اس کا نام لیا ہے اور اپنا انعام کھرا کریں گے۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''میں مانتا ہوں ہمارے محکمے میں کالی بھیڑیں موجود ہیں، لیکن سب ایسے نہیں ہیں۔ تم نے پولیس کے متعلق منفی باتیں ہی سنی ہیں لیکن پولیس کا مثبت چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔'' اس کی آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔ خیام کی کچھ ہمت بندھی۔ اسے آمادہ دیکھ کر عثمان جلدی سے بولا۔ ''تم مختصر الفاظ میں جلدی سے اپنی ساری روداد سنا دو۔ اس سے قبل کہ کوئی آ جائے۔''

خیام نے چند لمحے سوچا اور بولنا شروع کر دیا۔

''میں اور میرا دوست ایک گارمنٹ اسٹور پر سیلز مین ہیں۔ ہم دونوں یتیم ہیں۔ چند ماہ قبل ہمارے والد ایک ساتھ ہی ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ہمارا کوئی بھائی بھی نہیں۔ اپنے گھرانے کے ہم ہی کفیل ہیں۔'' اس کی بات سن کر عثمان کے چہرے پر ہمدردانہ تاثرات نمودار ہوئے۔ یہ تاثرات دیکھ کر اس نے اطمینان کی لہر اپنے اندر اترتی محسوس کی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''صبح ہم کام پر جانے کے لیے نکلے ہی تھے کہ ایک شخص نے ہمیں گن پوائنٹ پر لے کر اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ ہمیں شہر سے باہر اپنے ٹھکانے پر لے گئے۔ وہاں سب جرائم پیشہ لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان سب نے اسلحہ اٹھایا ہوا تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں لے جا کے بند کر دیا گیا۔ کمرے سے باہر موجود لوگ بلا کسی خوف و خطر اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ہمیں معلوم ہوا اس اڈے پر منشیات اور اسلحے کی بڑی مقدار موجود ہے جو وہ بیچتے ہیں لیکن اس سے بھی خطرناک بات یہ تھی کہ وہ انتہائی غصے میں تھے۔ وہ سب جس سیاسی شخصیت کے لیے کام کرتے تھے، اس کا مخالف اس کے خلاف کیسز کھلوا رہا تھا۔ اسے روکنے کے لیے انہوں نے ایک منصوبہ بنا رکھا تھا۔'' خیام نے ایک لمحے توقف کیا اور عثمان کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیسا منصوبہ؟'' وہ بے چینی سے بولا۔

''ایم پی اے صاحب کی بیٹی کو اغوا کرنے کا منصوبہ۔'' خیام نے دھماکا کرنے والے انداز میں کہا۔ عثمان کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''وہ لوگ کس شخصیت کے کہنے پر ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''وہ ملک عمیر کا نام لے رہے تھے۔'' اس نے سابق ایم پی اے کا نام لیا۔

''ہوں......'' ان نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

''یہ سیاسی لوگ ایسے ہی ایک دوسرے سے دشمنیاں نبھاتے ہیں۔ ملک عمیر کی فائل ہمارے پاس کھلی ہے۔ اس کے خلاف ہم ثبوت جمع کر رہے ہیں۔''

خیام نے سکون کی سانس لی اور گویا ہوا۔ ''ہمیں دو تین گھنٹے بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا گیا۔ پھر ایک شخص آیا اور ہمیں ایک گاڑی کا نمبر دے کر کہا کہ ہم چیک کریں کہ یہ گاڑی ایم پی اے صاحب کے گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر موجود ہے تو ادھر ہی رہو اور جب گاڑی باہر نکلے گی تو ہمیں خبر کر دو۔ اس نے ہمیں ایک فون نمبر بھی دیا تھا۔ ہم نے انکار کیا تو انہوں نے ہمیں دھمکی دی کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی تو وہ ہماری بہنوں کو اغوا کر لیں گے۔ ہم دیکھ چکے تھے کہ وہ کتنے خطرناک لوگ ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ بس مجبوری میں ہم نہ چاہتے ہوئے ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔'' اس نے شرمندگی سے کہتے ہوئے
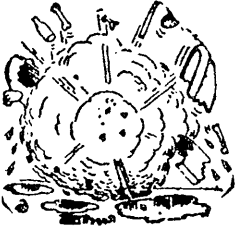
نظریں جھکالیں۔

''تم فکر مت کرو۔ وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ تمہیں جو گاڑی کا نمبر اور فون نمبر دیا گیا تھا وہ بولو۔''

خیام نے گاڑی کا نمبر بتایا تو وہ بولا۔ ''یہ گاڑی تو ایم پی اے صاحب کی بیٹی کے زیر استعمال ہے۔ اس کے ساتھ زیادہ سیکیورٹی بھی موجود نہیں ہوتی کہ اسے اپنے گرد بھیڑ بھاڑ پسند نہیں۔''

''جی، وہ ان کی بیٹی کو اغوا کرنا چاہتے تھے اس لیے ہم سے اس کے بارے میں معلومات لے رہے تھے۔''

''انہوں نے یہ کام کرنے کے لیے تم جیسے اناڑیوں کا انتخاب کیوں کیا؟ اپنے بندوں سے یہ کام کیوں نہیں لیا؟'' اس نے پُرسوچ انداز میں پوچھا۔

''وہ جانتے تھے کہ گیٹ پر پولیس اہلکار تعینات ہیں۔ ان کا کوئی بندہ فوراً ان کی نظروں میں آجاتا۔ شاید اس لیے انہوں نے ہمیں اس کام کے لیے منتخب کیا۔''

''تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔''

''آپ نے کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایم پی اے صاحب کی بیٹی اب تک اغوا نہ ہو چکی ہو۔''

''تم فکر مت کرو۔ میں ابھی ان کی رہائش گاہ پر مامور سیکیورٹی اہلکاروں کو الرٹ کرتا ہوں۔ تم مجھے ان مجرموں کے ٹھکانے کے بارے میں بتاؤ۔'' خیام اسے پتا سمجھانے لگا۔ پتا سنتے ہی وہ باہر جانے لگا تو خیام تیزی سے بولا۔

''پلیز، سر! ہم اس وقت تک دکان سے گھر لوٹ چکے ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر والے ہمارے منتظر ہوں گے۔ ہمارے موبائل بھی آپ لوگوں نے رکھ لیے۔ وہ کال کر رہے ہوں گے اور بہت پریشان ہوں گے۔''

''پریشان مت ہو۔ میں اطلاع دے کر تمہارا موبائل لے آؤں گا تم انہیں تسلی دے دینا۔'' وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد خیام پُرتفکر انداز میں بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ 'پتا نہیں ہمیں اس مصیبت سے کبھی چھٹکارا حاصل ہوگا بھی یا یہ بے رحم دیواریں ہی ہمارا مقدر بن چکی ہیں۔' اس نے آزردگی سے سوچا۔

☆☆☆

عثمان باہر نکلا تو ذیشان کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ہاں بھئی، کیسا رہا تمہارا 'گڈ کوپ' کا کھیل؟''

''بیڈ کوپ نے اتنی اچھی پرفارمنس دی تھی...... 'گڈ کوپ' بھلا ناکام ہو سکتا تھا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو ذیشان نے فخریہ انداز میں سینہ پھلا لیا۔

''بہرحال معاملہ تشویشناک ہے۔ اگر ہم نے تیزی سے کوئی قدم نہ اٹھایا تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا جینا حرام ہو جانا ہے۔ انسپکٹر صاحب کے سامنے تمہیں ساری تفصیل بتاتا ہوں۔''

کچھ دیر کے بعد وہ انسپکٹر کو ساری تفصیل بتا رہا تھا۔ انسپکٹر ساری بات سن کے بولا۔

''چلو بھئی، یونیفارم پہن لو۔ تمہاری ڈیوٹی کا وقت شروع ہو گیا ہے اور ڈیوٹی نبھانے کا بھی۔''

''وہ تو ہم سادہ لباس میں بھی ڈیوٹی ہی نبھا رہے تھے۔'' ذیشان ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں، مگر وہ ان آفیشل ڈیوٹی تھی۔ اب آفیشلی تیار ہو جاؤ۔''

کچھ دیر کے بعد پولیس پارٹی خیام کے بتائے گئے مجرموں کے ٹھکانے پر ریڈ کرنے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

عثمان اور ذیشان پولیس کے روایتی طریقۂ تفتیش جس میں تشدد کا عنصر لازمی شامل ہوتا تھا، سے متنفر تھے۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ جو گھی سیدھی انگلی سے نکل سکتا ہے اس کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنے کا تردد کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ جبکہ دیگر پولیس والوں کا خیال تھا کہ ملزموں سے اعترافِ جرم کے لیے تشدد ناگزیر ہے۔

اسی دوران ذیشان نے اپنا آئیڈیا پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ملزموں پر تشدد کرنے کے بجائے نفسیاتی طریقہ زیادہ کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ پولیس کا اگر ایک شخص خوفزدہ کر دے تو دوسرا ہمدردی کی آڑ میں ان سے سب باتیں اگلوا سکتا ہے۔ اس کا آئیڈیا سن کے سب پولیس والے ہنسنے لگے تھے۔

''یہ طریقے فلموں میں ہی کارگر ہوتے ہیں۔ حقیقت میں مجرم اتنے کچے نہیں ہوتے۔'' ایک پولیس والے نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''تو آزما لیتے ہیں۔'' ذیشان نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ شروع میں سب ان کے آئیڈیے کا مذاق اڑاتے رہے تھے لیکن ان کی سنجیدگی دیکھ کے انسپکٹر نے انہیں ٹرائل بیس پر یہ تجربہ کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ پہلے ہی کیس میں سرخرو ٹھہرے تھے۔

انسپکٹر ان کی کارکردگی سے بہت خوش ہوا تھا۔ اس کے بعد تو وہ اکثر یہ کھیل کھیلنے لگے تھے اور زیادہ تر وہ کامیاب ہی رہتے تھے۔ عثمان کا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر عموماً لوگ وہ باتیں بھی بتا دیتے تھے جو تشدد کے نتیجے میں ہرگز نہ بتاتے۔ عثمان بھی ان کے اعتماد پر پورا اترتا تھا اور ہر ممکن ان کی مدد کرتا تھا۔

انہیں احساس تھا کہ لوگ پولیس کے ڈر سے ہی پولیس سے تعاون نہیں کرتے اور وہ اس کلچر کو آہستہ آہستہ بدلنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ وہ عموماً کامیاب ہی رہتے تھے البتہ کوئی بہت پکا مجرم ہی ہوتا تھا جو ان کے جال میں نہیں آتا تھا تو پھر ان کے ساتھی اپنی کارکردگی دکھانے حاضر ہو جاتے تھے۔

ان کے ساتھی ان کی کامیابی کو تسلیم تو کرتے تھے لیکن گاہے بگاہے انہیں طنز کا نشانہ بنانے سے بھی باز نہیں رہتے تھے۔ ذیشان اور عثمان ہنس کے ان کے طنزیہ وار برداشت کر لیتے تھے کہ کچھ بھی تھا.... ان کی بدولت اس پولیس اسٹیشن پر طریقۂ تفتیش میں کچھ تبدیلی تو آئی تھی۔ انہیں یہ کھیل اب بہت لطف دینے لگا تھا اور وہ اسے پوری فنکاری سے سرانجام دیتے تھے۔ اب تو انہیں خود پر اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ سمجھنے لگے تھے کہ ان جیسا کوئی فنکار تو کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

فرخ بے چینی سے حوالات میں ٹہل رہا تھا۔ خیام کو گئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ اس کے حوالے سے حد درجہ پریشان تھا۔ اگر اس کے ساتھ کچھ برا ہو جاتا تو وہ کبھی خود کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

''یا اللہ، اس بار ہمیں اس مصیبت سے نکال دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی کسی غلط کام میں نہیں پڑوں گا۔'' وہ بار بار دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا لیکن اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔

اسے گھر والوں کی بھی پریشانی تھی۔ وہ نصف شب تک عموماً گھر پہنچ چکے ہوتے تھے۔ اس وقت اس کے پاس گھڑی تو نہیں تھی تاہم اسے اندازہ تھا کہ شب نصف سفر طے کر چکی ہوگی۔

اچانک ایک سپاہی نے حوالات کا دروازہ کھولا۔

''چل بھئی، باہر آ جا۔''

فرخ تیزی سے باہر نکلا۔ سپاہی اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں خیام ایک نرم چہرے والے پولیس اہلکار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ قدرے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فرخ نے سکون کا سانس لیا۔

''میں ابھی تمہارے گھر والوں کو پریشانی سے بچانے کے لیے تمہیں اپنی ذمے داری پر چھوڑ رہا ہوں۔ جیسے میں نے تمہارے ساتھ تعاون کیا میں امید کرتا ہوں تم لوگ بھی مجھ سے تعاون کرو گے۔ میرے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بنو گے۔''

''سر! آپ ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر حاضر ہوئے ہیں۔ ہم ساری زندگی آپ کا یہ احسان نہیں بھولیں گے۔ بس خیال رکھیے گا کہ ہمارا نام کہیں نہ آئے۔'' خیام نے التجائیہ انداز میں عثمان سے کہا۔

''اس حوالے سے تم بے فکر رہو۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ پولیس کے ساتھ اسی خوف سے تعاون نہیں کرتے کہ وہ مجرموں اور ہمارے بیچ سینڈوچ بن کے رہ جاتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جو ہمارے ساتھ تعاون کرے، اسے ہماری طرف سے کوئی سہولت ملے نہ ملے، کم از کم اسے کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

''بہت شکریہ سر! آپ جیسے لوگ ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ آپ......''

عثمان تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''ابھی میں جلدی میں ہوں۔ کل تم لوگوں سے ملوں گا، باقی تعریف تب کر لینا۔'' اس کا انداز دیکھ کر فرخ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

عثمان، خیام کی توقع سے بھی زیادہ نرم دل اور معاون ثابت ہوا تھا۔ اس نے ان کی ساری چیزیں ان کے حوالے کر دی تھیں اور نمبروں کا تبادلہ بھی کر لیا تھا۔ پولیس والوں کی تیاری سے لگ رہا تھا کہ وہ محسن خان کے ٹھکانے پر ریڈ کرنے جا رہے ہیں۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر انہوں نے سکون کا سانس لیا۔

''یا اللہ، تیرا شکر ہے۔'' فرخ نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے کہا۔ اس کا دل شکر گزاری کے جذبات سے لبریز تھا۔

''اتنی آسانی سے ہماری اس مصیبت سے جان چھوٹ جائے گی، یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔'' خیام نے کہا۔

''ابھی جان چھوٹی تو نہیں لیکن امید کی کرن بہر حال روشن ہو گئی ہے۔''

خیام نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ ''وعدہ کرو مجھ سے۔ اس بار ہم بچ گئے تو آئندہ کسی غیر قانونی دھندے میں نہیں پڑیں گے۔''

فرخ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یہ وعدہ تو میں پہلے ہی خدا سے کر چکا ہوں۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں استقامت عطا کرے۔''

''آمین۔'' خیام نے دل سے کہا اور دونوں ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

عثمان کی آنکھ فون کی بیل سے کھلی۔ وہ جب تک کال ریسیو کرتا، فون خاموش ہو چکا تھا۔ اس نے وقت دیکھا۔ دن کے تین بج چکے تھے۔

رات بہت مصروف گزری تھی۔ خیام کے بتائے گئے ٹھکانے پر ان کا ریڈ انتہائی کامیاب رہا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ محسن کے چند گرگے ہی پکڑے جائیں گے اور یہ بھی ان کے لیے غنیمت تھا کہ وہ ملک عمیر کی غنڈا فورس کو کمزور کر کے ہی اس کے گرد گھیرا تنگ کر سکتے تھے، لیکن ان کی خوش قسمتی کے باعث نہ صرف محسن خان ادھر موجود تھا بلکہ ملک عمیر بھی ادھر سے ہی پکڑا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری نے ہلچل مچا دی تھی۔ میڈیا کے نمائندوں کو جوں ہی خبر ہوئی تھی انہوں نے پولیس اسٹیشن کا رخ کیا تھا۔

ملک عمیر کی گرفتاری معمولی بات نہیں تھی۔ وہ بڑا... مگر مچھ تھا، اس کی گرفتاری کے لیے ان پر حکومت کی طرف سے دباؤ بھی تھا لیکن پکے ثبوتوں کے بغیر اس پر ہاتھ ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ... بہ آسانی اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ 'گڈ کوپ، بیڈ کوپ' کا کھیل کھیلتے انہیں کافی عرصہ ہو گیا تھا لیکن اتنی بڑی کامیابی پہلی بار ان کے حصے میں آئی تھی۔

ملک عمیر اور اس کی سیاسی جماعت اب چاہے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیتے، وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے پیچھے حکومتی مشینری بھی موجود تھی۔ اس لیے اس کا بچنا انتہائی مشکل ہو چکا تھا۔

عثمان صبح دس بجے ہی گھر پہنچ پایا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا۔ ابھی اس کی آنکھ کھلی تو رات کے واقعات اس کے ذہن میں گھوم گئے۔ وہ خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کا بیل پھر بجا۔ ذیشان کال کر رہا تھا۔

''ہاں بھئی، گڈ کوپ۔ سو رہا ہے ابھی تک۔'' اس کی آواز میں خوشی کھنک رہی تھی۔

''تم واقعی بیڈ کوپ ہو۔'' اس نے آہ بھری۔ ''جانتے تھے میں سو رہا ہوں گا مگر پھر بھی میری نیند میں خلل ڈالنا ضروری تھا کیا؟''

ذیشان ہنسا۔ ''اپنا تو کام ہی یہی ہے۔''

''بتا فون کیوں کیا؟'' اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''جلدی سے فریش ہو کے آجا۔ پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔''

وہ چونکا۔ ''اتنی جلدی؟''

''بھئی، ہر ایک کی زبان پر ہماری فنکاری کے چرچے ہوں گے۔ وہ سن کے محظوظ نہیں ہونا چاہتا تو؟''

''سن لیں گے یار وہ بھی۔'' اس نے کسلمندی سے کہا۔ ''لیکن ابھی میں ان لڑکوں سے ملنے جاؤں گا جن کی بدولت ہمیں اتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔''

''ان سے ملنے کی اب کیا ضرورت ہے۔ ہمارا کام تو ہو گیا۔'' اس کے لہجے میں تعجب تھا۔

''ان سے مل لوں پھر تمہیں تفصیل بتاؤں گا۔''
''ٹھیک ہے یار! میں اسٹیشن جا رہا ہوں۔تو بھی جلدی فارغ ہو کے آ جانا۔''

☆☆☆

فرخ اور خیام ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔وہ عثمان کے بلانے پر ہی ادھر آئے تھے لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ریسٹورنٹ میں ٹی وی پر ملک عمیر احمد کی گرفتاری ہی موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔
فرخ اطمینان سے خبریں سن رہا تھا جبکہ خیام کے چہرے سے بے چینی ہویدا تھی۔
''کیا خیال ہے یار، عثمان نے ہمیں کیوں بلوایا ہے؟''
''تو خوامخواہ کیوں پریشان ہو رہا ہے۔وہ ابھی آئے گا تو پتا چل جائے گا۔''اس نے بے فکری سے کہا۔وہ بڑے عرصے کے بعد خود کو حقیقی معنوں میں آزاد محسوس کر رہا تھا۔وہ بے حد خوش تھا اور اس وقت کوئی پریشانی اس کے لیے معنی نہیں رکھتی تھی۔
''یار! یہ نہ ہو، دوران تفتیش اسے ہماری مجرمانہ سرگرمیوں کے بارے میں بھی علم ہو گیا ہو اور وہ ہمیں گرفتار کرلے۔''
فرخ ہنسنے لگا۔''کل تو ہتُو بڑا مطمئن تھا کہ اس نے تیری کہانی پر یقین کر لیا ہے۔''
''ہاں، مگر میں نے سنا ہے کہ شک پولیس کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔وہ کسی پر یقین نہیں کرتے۔''
''تو پریشان نہ ہو۔جو بھی ہے کچھ دیر میں پتا چل جائے گا۔''اس نے خیام کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔
اچانک اس کی نظر ریسٹورنٹ کے دروازے پر پڑی۔وہاں عثمان کھڑا متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔اس نے سادہ سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔اس کے حلیے کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ پولیس والا ہے۔
ان پر نظر پڑتے ہی وہ ان کی طرف لپکا۔ذیشان اور عثمان نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔اس نے ان سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔
''ہاں بھئی، بچو۔کل گھر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔''
''نہیں سر! انہیں علم ہی نہیں ہوا کہ ہم کس مشکل سے گزر کے آئے ہیں اور یہ سب آپ کی مہربانی سے ہوا۔''اس کا لہجہ شکر گزاری کے جذبات سے لبریز تھا۔
''میں تو تم لوگوں کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا تھا۔تم اگر مجھے سب نہ بتاتے تو ہمارے لیے اتنے بڑے مجرم کو پکڑنا کبھی آسان نہ تھا۔''
''آپ کا ہمدردانہ رویہ دیکھ کر ہی میں آپ کو سب بتا سکا۔آپ بہت گریٹ انسان ہیں۔''
عثمان ہنسا۔''ایک منٹ، میں ویٹر کو کچھ آرڈر کر دوں پھر تمہاری تعریفیں سنتا ہوں۔''اس نے ویٹر کو اشارہ کیا اور تین کولڈ ڈرنکس لانے کا کہا۔
آرڈر دینے کے بعد وہ ان کی طرف مڑا۔''سر! ملک عمیر کی گرفتاری کا تو میڈیا پر بھی کافی چرچا ہے۔آپ باقی تفصیلات بتائیں گے۔کتنے لوگ پکڑے گئے؟''
عثمان انہیں چھاپے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔وہ رکا تو خیام نے بے چینی سے پوچھا۔''سر! میں نے آپ کو جس شخص کا فون نمبر دیا تھا، وہ بھی پکڑا گیا ہے نا؟''
''ہاں، وہ انیل نامی ایک شخص کا تھا۔وہ بھی پکڑا گیا ہے۔''خیام اور فرخ نے یہ خبر سن کر سکون کا سانس لیا۔وہ عثمان کے گن گانے لگے۔وہ ان کی تعریفیں سن کر مسکراتا رہا۔
''تم لوگوں کو لڑکپن میں ہی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔اس کم عمری میں آپ لوگ جس طرح اپنی ذمے داریاں اٹھا رہے ہو، اس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔یہ تم لوگوں کے کھیلنے کودنے کے دن تھے لیکن شاید تقدیر کو یہی منظور تھا۔بہرحال ان حالات میں آپ نے گھبرانا نہیں ہے۔بہادری سے مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے۔جلد ہی مشکل وقت بھی گزر جائے گا۔میں چاہتا ہوں تم لوگ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھو اور میرے پاس تم لوگوں کے لیے ایک پارٹ ٹائم کام بھی ہے۔''اس نے رک کر ان کے چہروں کو بغور دیکھا۔وہ پوری توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔اسے توقف کرتا دیکھ کر فرخ بولا۔
''سر! ہمارا میٹرک کا رزلٹ آ چکا ہے۔ہم پاس ہو گئے ہیں لیکن آگے ہم پرائیویٹ پڑھائی ہی جاری رکھ پائیں گے۔بہرحال آپ کام بتائیں۔آپ کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔''
عثمان مسکرایا۔''نہیں بھئی مجھے جان نہیں چاہیے۔میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے لیے کام کرو۔''
دونوں کے چہروں پر تعجب ابھرا۔''وہ کیسے سر؟''فرخ نے حیرانی سے استفسار کیا۔
''آج کل تمہاری عمر کے نوجوان غلط سرگرمیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔کچھ خاص قوتیں ہیں جو ایسے نوجوانوں کے گروپس بنا رہی ہیں۔وہ انہیں اسلحہ اور منشیات فراہم کر رہی ہیں۔نوجوان بھی پیسے اور اختیار کے لیے ان کا ساتھ

دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کو آزاد سمجھتے ہیں لیکن غیر محسوس انداز میں یہ قوتیں انہیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہیں۔ ابھی راولپنڈی شہر میں نوجوانوں کے لاتعداد گروپس بنے ہوئے ہیں۔ جو چھوٹے درجے کے جرائم میں شریک ہیں، لیکن جلد یہ بڑے جرائم میں دھنستے چلے جائیں گے۔ اگر ایسا ہو گیا تو وہ دن دور نہیں جب کوئی نوجوان محفوظ نہیں رہے گا۔ تم لوگوں کا نوجوانوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم ہمارے لیے ان کی مخبری کرو۔ ہر اطلاع کا تمہیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔'' ویٹر کب کا کولڈ ڈرنکس رکھ کے جا چکا تھا مگر وہ ہمہ تن گوش اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوا تو فرخ بولا۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں سر! ایسے گروپس کا ہم بھی سنتے رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے ہمارے شہر میں منشیات اور اسلحے کا کلچر تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ اردگرد کی تحصیلیں بھی محفوظ نہیں۔ ڈکیتی اور چوری کی وارداتیں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ ہم ان جرائم کی بیخ کنی میں اپنا کوئی کردار ادا کرسکیں۔'' عثمان اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔

کولڈ ڈرنکس پیتے ہوئے وہ اس بابت تفصیلات طے کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد عثمان رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں بھی باہر آ گئے۔

اس کے جانے کے بعد فرخ نے معنی خیز انداز میں خیام کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تم ایسے ہی ڈر رہے تھے۔ یہ تو ہمیں بالکل معصوم سمجھ رہا ہے۔''

''اسے خود پر اعتماد ہی اتنا ہے کہ اسے اندازہ تک نہیں ہوا کہ ہم نے کیا کھیل کھیلا ہے۔'' خیام نے ہنستے ہوئے کہا تو فرخ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''تیری اداکاری ہی اتنی شاندار تھی کہ وہ سب مانتا چلا گیا۔''

''فنکار تو وہ بھی بہت بڑے تھے لیکن ہم ان سے بڑے فنکار نکلے۔ تو ٹھیک کہتا تھا کہ دماغ کا درست استعمال کیا جائے تو انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔'' وہ ہنسا۔

''انیل نے مجھے پھنسا ہی اس بری طرح دیا تھا کہ مجھے اس کے شکنجے سے نکلنے کے لیے دماغ کا استعمال کرنا ہی پڑا۔ جب میں نے کاشف سے ان کے 'گڈ کوپ، بیڈ کوپ' کے کھیل کا سنا اور یہ بھی کہ دونوں بہت اچھے انسان ہیں تبھی میرے ذہن میں یہ منصوبہ پرورش پانے لگا تھا۔ میں نے انیل کا ساتھ دیتے ہوئے ہمیشہ اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھی تھیں۔ میں ان کے متعلق معلومات جمع کرتا رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان معلومات کی کبھی نہ کبھی مجھے ضرورت پڑے گی اور آخر وہی ہوا۔ ہمیں انیل نے بند گلی میں پھنسایا تو ان معلومات سے فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا۔''

''بالکل، مجھے تم پر پورا اعتبار تھا۔ اسی لیے تم نے مجھے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا تو اس میں میرا کردار مشکل ہونے کے باوجود میں نے اس پر عمل کی ہامی بھر لی۔ میں کسی بھی حال میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لیے تمہارے ساتھ ایم پی اے صاحب کی گلی میں مشکوک انداز میں گھومنے چلا گیا۔ تمہارا اندازہ درست نکلا اور ہم پولیس والوں کی نظروں میں آ گئے۔ آگے بھی سب تمہاری توقع کے مطابق ہوتا چلا گیا۔'' خیام ہنسا۔

''تمہارا کردار واقعی بہت مشکل تھا مگر تم نے اسے نبھایا بھی انتہائی عمدگی سے۔'' فرخ نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔

''ذیشان کی اداکاری اتنی شاندار تھی کہ میں تو گھبرا گیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ کاشف نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے، ہم سرخرو ہوئے۔''

''تمہارا منصوبہ بھی تو انتہائی شاندار تھا۔ وہ اپنی فنکاری کے زعم میں ہماری فنکاری سمجھ ہی نہیں سکے۔'' وہ خوشدلی سے ہنسا۔ ''بہرحال تمہیں اس منصوبے کا خیال آیا کیسے؟''

''وہ جائز کام ناجائز طریقے سے کرتے ہیں تو میں نے سوچا ہم بھی تو ایسا کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کی چال انہی پر الٹنے کا فیصلہ کیا۔''

''یہ تو خدا کی مہربانی ہے۔ وہ نیت دیکھتا ہے۔ ہماری بھی نیت صاف تھی اور ان کی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہم سب کو کامیاب کیا۔''

فرخ نے گہری سانس لی۔ ''اور سب سے بڑی بات ہمیں مجرموں کے شکنجے سے بھی آزادی مل گئی۔''

''اور نیا کام بھی۔'' خیام نے لقمہ دیا۔ ''اب ہم پولیس کے لیے کام کر کے جرائم کا حصہ بننے کے بجائے جرائم کی بیخ کنی میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ شاید ہمارے گناہوں کی ایسے ہی تلافی ہو جائے۔''

''انشاء اللہ۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ انسان برائی سے بچنے اور نیک کام کرنے کا ارادہ کر لے تو خدا خود آسانیاں پیدا کرنے لگتا ہے۔''

⌘⌘⌘

محفل شعر و سخن

❄ حرا خان......کراچی
آج پھر پیاس کے ٹیلوں سے بگولے اٹھیں
آج پھر ابر کا امکان دکھایا جائے
بعد کے زخم تو بھر جائیں گے دھیرے دھیرے
پہلے ماضی کے حسابوں کو چکایا جائے

❄ چودھری اسد جٹ......لاہور
بدن کے قید خانے میں عجب تھی روح کی حالت
اسیری بھی مقدم تھی رہائی بھی ضروری تھی

❄ وزیر محمد خان......بٹل ہزارہ
چلتی ہی جا رہی ہے یہ عمرِ رواں کی ریل
ہم کو یہیں اترنا ہے زنجیر کھینچیے

❄ علی حفیظ......لاہور
اب کسی کو نہیں رخصت کرنا
لوٹتے ہی نہیں چھوڑ کر جانے والے

❄ اسما خان؟......کوئٹہ
کبھی دیکھا ہی نہیں آنکھ بھر کے اُسے
کبھی دیکھا تو آنکھ بھر آئی

❄ ارم کاشف......جھنگ سٹی
ہم بھی ہیں ایک اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں ویران تم بھی ہو

❄ شائستہ ......روہڑی
بچھڑ گیا جو بے چینیوں کے موسم میں
اسے کہو کہ زمانے اُسے بلاتے ہیں

❄ چودھری رفیق مہر......گوجرانوالہ
کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

❄ پرویز خان......منڈی بہاالدین
محبتوں کا ہر اک پل اداس کرتا ہے
مگر رگوں میں نئی زندگی بھی بھر دیتا ہے
حقیقتوں کے تعاقب میں آنکھ اندھی ہوئی
ہر اک اجالا نئے روپ میں ابھرتا ہے

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال
مت دیکھ کسی کو بھی حقارت کی نظر سے
ہر چہرہ کسی کا محبوب ہوتا ہے

❄ مہر النساء......کراچی
میری عمارت جھوٹی بنیادوں پہ قائم تھی
پھر کیوں میرے ملبے سے سچ کی تحریک ہوئی
کمرے میں روشن سناٹوں کا وہ عالم تھا
کرن جھروکے سے اندر آ کر باریک ہوئی

❄ شاکر محمود......ملتان
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

❄ انعم شکور......پشاور
جرم سمجھو تو پھوڑ دو آنکھیں
میری آنکھوں نے خواب دیکھے ہیں

❄ نورین ایوب.....بہاولنگر

ٹھیک ہی لکھا تھا میرے ہاتھوں کی لکیروں میں
تو اگر پیار کرلے گا تو بکھر جائے گا

❄ نوید خان.....سرگودھا

گلشن میں ہر اک چیز خزاں کرگئی برباد
پھر کسی کو وہاں پگلی ہوا ڈھونڈ رہی تھی

❄ ثنا صادق.....کراچی

تنہائیوں کا درد لیے میرے دل کے ساتھ
شب بھر تیرے خیال میں جلتی ہے چاندنی

❄ فرح صادق.....کراچی

میں بکھر جاؤں گا زنجیر کی کڑیوں کی طرح
اور رہ جائے گی اس دشت میں جھنکار میری

❄ فیاض احمد.....اوکاڑہ

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے ہم نے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

❄ محمد انور ندیم.....حویلی لکھا، اوکاڑہ

مٹا کر اپنی ہستی کو سراسر جستجو ہو جا
جو تو چاہے گا وہ ہوگا، جو وہ چاہے گا تو ہو جا

❄ طوبیٰ جنید.....سکھر

تیرے ماتھے کی شکن کرگئی محتاط ہمیں
راز ورنہ ترے ہم پہ نہ کھلے تھے اتنے
ناگواری تھی تری بزم میں ہر چہرے پر
آج سے پہلے تعلق نہ بڑھے تھے اتنے

❄ منیر شگفتہ.....وہاڑی

آنکھ میں آنسو آئیں تو خود ہی پونچھ لینا
کوئی اور پونچھے گا تو سودا کرے گا

❄ امبرین.....مری

ایک نئے آغاز کی دھن میں کوئی مسافر
خود اپنے ہی گھر کا رستہ بھول گیا ہے

❄ عاشی.....راولپنڈی

بات کی ساعت کا اعتبار کیسے ہو
دوستوں کے لہجے میں تہمتوں کے چہرے ہیں
چھوٹی چھوٹی باتوں میں، چھوٹے چھوٹے رشتوں میں
کس قدر قیامت کی الجھنوں کے چہرے ہیں

❄ امتیاز احمد.....منڈی بہاالدین

سوال خوابوں کی بے صدا رات کا نہیں تھا
قصور سب کا تھا صرف حالات کا نہیں تھا

❄ امجد علی.....گلگت

جو مصلحت اندیش کہا کرتا ہے
غالباً ایک وہی ہے جو مجھے سمجھا ہے

❄ مہوش.....حیدرآباد

بے چہرگی کا خوف جو پھیلا تو جسم جسم
تہذیب ماند پڑنے لگے پارساؤں کی
میں ایک بار پھر اسی ساحل پہ ہوں جہاں
سب کشتیاں جلائی تھیں میں نے وفاؤں کی

❄ اظہر رشید.....ملتان

دل کی تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے مانگے
ہم نے گزرے ہوئے انمول زمانے مانگے
آہ، وہ جس کو سخاوت کی نہیں ہے توفیق
اس سے اک شخص وفاؤں کے خزانے مانگے

❄ عاصم خان.....اسلام آباد

ہم لحہ لحہ آگ کی بستی میں گھر گئے
بن کے ہوا ڈرانے لگا خواہشوں کا شور

❄ پروین خان.....مانسہرہ

جو اداکاری کے فن میں باکمال و طاق تھا
سب سے بڑھ کر اس زمانے میں وہی چاہا گیا

❄ وقاص علی.....روہڑی

عشق کے رستے لگ جائیں تو لوگ بھلے چنگے
ہوتے ہوتے ہوجاتے ہیں، دیوانے پاگل
موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل

❄ ناظر خان.....میانوالی

ہل جائیں گے اک بار تو عرشوں کے در و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن
جاتی ہے کسی جھیل کی گہرائی کہاں تک
آنکھوں میں تری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن

❄ وردہ جنید.....کراچی

افلاک کا سایہ ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا، تعبیر کہیں پر ہے

❄ عائشہ ثانی.....حیدرآباد

حالت جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل درد کی پناہ میں ہے

❁ ناہید یوسف......اسلام آباد
ہوس کی اور لغت ہے، وفا کی اور زباں
یہ راز ہم پہ کھلا، انتظار کرتے ہوئے
عجیب شے ہے محبت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہوئے

❁ نیر رضوی......نواب شاہ
کرنی ہے تو کھل کے کرو، انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے
شہرِ سخن میں ایسا کچھ کر، عزت بن جائے
سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے، عزت رہتی ہے

❁ زبیر خان......لیہ
دل کو حصارِ رنج و الم سے نکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی
دنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ وبال بھی

❁ عمران شیروانی......لاہور
ہمیں اے دوستو اب کشتیوں میں رات کرنی ہے
کہ چھپ جاتے ہیں سب ساحل، چراغِ شام سے پہلے

❁ شاہینہ علی......چنیوٹ
جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

❁ عظیم احمد......جھنگ سٹی
کمرے میں میرے غم کے سوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دھند

❁ یوسف علی......میرپور خاص
جو سامنے ہے، سب ہے یہ اپنے کیے کا پھل
تقدیر کی تو چھوڑیے، تقدیر جو بھی تھی

❁ محمود خان......ٹنڈو الہیار
خدا کے خوف سے جو دل لرزتے رہتے ہیں
انہیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

❁ رانا خالد محمود......پھالیہ
شام کی دھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اس کا چہرہ تھا گھنی شب میں ستارے جیسا

❁ آصف علی......سکھر
جو تیرا دستِ عنایت نہ کر سکے پورا
کسی فقیر کے کاسے میں وہ سوال نہیں

❁ سکندر خان......فیصل آباد
کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زمانے میں
ہجومِ درد، غمِ بے کسی میں رہتا تھا
نہیں تھی حسنِ نظر کی بھی کچھ اسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

❁ شکور احمد......چیچہ وطنی
آپس کی ایک بات تھی، دونوں کے درمیاں
اے اہلِ شہر آپ کا یہ مسئلہ نہ تھا
اک سمت پاسِ عشق تھا، اک سمت اپنا مان
کیسے گریز کرتے، کوئی راستہ نہ تھا

❁ شاہانہ سلطان......کراچی
ایک دوسرے کے کتنے مزاج آشنا تھے ہم
اور پھر بھی اختلاف کی راہیں نکل پڑیں
جب خوف تھا تو کوئی بھی چھپنے کی جا نہ تھی
اب ڈر نہیں تو کتنی پناہیں نکل پڑیں

❁ نازیہ مختار......گوجرانوالہ
شہرِ دل میں جم گئی آوارہ سناٹوں کی گرد
ایک مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں

❁ عائشہ ناز......کوئٹہ
سحر ہوئی اور جھلمل کرتے تاروں کا
اک اک کرکے سارا لشکر لوٹ گیا

❁ جنید ملک......کراچی
دل کے شیشے پر نہ لکھو راز کی باتیں کبھی
آنکھ کی کھڑکی کھلی ہے عکس باہر آئے گا

کوپن
جنوری
2021
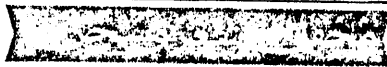
نام : --
پتا : --

دنیا میں سر پھروں کی کمی نہیں ہے مگر... ہر بار آپ کے سر میں سمایا ہوا سودا کامیاب ہوجائے یہ کوئی ضروری بھی نہیں۔ وہ بھی تو کسی کی تنہائیوں کا سودا کرنے نکلی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ تمام عمر اسے خود تنہائیوں کا اسیر ہونا پڑے گا کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے کاموں میں۔

شاطرانہ کھیل کھیلنے والے کھلاڑیوں کی شکستِ فاش کی روداد

شاطر

عتیق بخاری

راجر جیل کی سلاخوں کو تھامے ان پر اپنا سر ٹکراتے ہوئے خود کو کوس رہا تھا کہ وہ جینی کی باتوں میں کیوں آگیا۔ راجر جیسے شاطر نوجوان کا جینی جیسی معصوم لڑکی کے ہاتھوں بے وقوف بن جانا بڑا حیران کن تھا اور یہی بات اسے مشتعل کررہی تھی۔ جائداد، دولت، آزادی، سب چھن گیا تھا اور اب ارادۂ قتل و دیگر دفعات کے تحت جیل کی سلاخیں اس کا مقدر بن گئی تھیں۔

☆☆☆

بوڑھی اور دولت مند مارگریٹ کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ بہن بھائی مرچکے تھے۔ خود اس نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں دم رہا، اپنا کام اور کاروبار خود دیکھتی رہی لیکن جوں جوں عمر ڈھلتی جارہی تھی

اس سے کام کاج سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسے اپنی مدد کے لیے قابلِ اعتماد لڑکی اور کاروبار دیکھنے کے لیے قابلِ بھروسا مرد کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی لیکن کوئی بھی اسے موزوں نہ لگا جسے وہ اپنے گھر رکھ سکتی۔

ایک روز وہ معمول کے مطابق شام کی واک کرنے قریبی پارک گئی تو اس کی نظر بینچ پر بیٹھی ایک اداس سی لڑکی پر پڑی۔ پہلے تو اس نے اسے نظرانداز کر کے اپنی واک جاری رکھی لیکن تھوڑی ہی دیر میں کچھ جاننے کے تجسس میں وہ لڑکی کے پاس آبیٹھی۔ دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی، پھر مارگریٹ نے ہی خاموشی توڑی اور اس لڑکی کو مخاطب کیا۔

''تم یہاں نئی معلوم ہوتی ہو۔ پارک میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے مارگریٹ کہتے ہیں۔''

جواباً لڑکی نے کہا۔ ''جی! مجھے جینی کہتے ہیں۔ میں چند دن پہلے اس شہر میں آئی ہوں۔'' لڑکی پھر خاموش ہوگئی اور پھر مارگریٹ کو پہل کرنا پڑی۔

''تم کچھ اداس نظر آرہی ہو۔ کیا بات ہے، کسی سے لڑائی کر کے آئی ہو؟''

مارگریٹ کا اتنا پوچھنا تھا کہ لڑکی نے بے اختیار سسکنا شروع کر دیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میرے جیسی بدنصیب لڑکی اداس ہی بیٹھے گی۔ دکھی رہنا تو میرا مقدر بن گیا ہے۔''

مارگریٹ نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟ پہلے تو لڑکی چپ رہی لیکن جب مارگریٹ نے یہ کہا کہ بات کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا تو جینی نے مارگریٹ کو بتایا کہ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ اس شہر میں اپنی ایک دوست کے پاس آگئی تاکہ کوئی ملازمت وغیرہ ڈھونڈ سکے اور رہائش کا بندوبست کرلے۔ جینی نے بتایا کہ اس کی سہیلی کے والدین جینی کو پسند نہیں کرتے اور ان چند دنوں میں ہی اسے کئی بار اشاروں کنایوں میں گھر چھوڑنے کا کہہ چکے ہیں۔ ملازمت بھی نہیں ملی ورنہ سوچا تھا کہ سہیلی کے گھر پر ہی پے انگ گیسٹ بن جاؤں گی۔ بات کرتے کرتے جینی تقریباً رو پڑی۔

''اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' جینی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

مارگریٹ کو اس پر بڑا ترس آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ لڑکی کو تھوڑے سے پیسے دے دے تاکہ وہ اپنی سہیلی کے والدین کو دے کر ملازمت ملنے تک وہاں رہ سکے۔ اس نے اسے اپنے ساتھ اپنے گھر چلنے کا کہا۔ جینی ساتھ چل دی۔

جب اپنے گھر پہنچ کر اس نے جینی کو مالی امداد دینا چاہی تو جینی نے بڑی خودداری سے انکار کر دیا۔ مارگریٹ نے اس سے کہا کہ وہ یہ رقم بطور قرض لے لے اور پھر کوئی کام مل جانے پر قرض ادا کردے۔ جواباً جینی نے کہا کہ اسے نہیں معلوم کہ وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ اس لیے اگر وہ واقعی اسے رقم دینا چاہتی ہیں تو اس سے کوئی کام کروا کر بطور معاوضہ رقم دے دیں۔

''تم کیا کام کرسکتی ہو؟'' مارگریٹ نے سوال کیا۔

''کھانا پکانا، صفائی، برتن دھونا، باغیچے کی دیکھ بھال۔ میں یہ سب کام کرسکتی ہوں۔ آپ کچھ بھی کروالیں۔''

مارگریٹ نے اس سے کہا کہ اس کا باغیچہ واقعی بہت زیادہ خراب ہو رہا ہے لیکن اس وقت رات کے کھانے کا ٹائم ہو رہا ہے، وہ اس کے لیے کھانا بنادے اور رات اس کے گھر قیام بھی کرے تاکہ صبح کا ناشتا اور باغیچے کا کام کرسکے۔ مارگریٹ نے اسے کہا کہ وہ ان کاموں کا اسے معقول معاوضہ دے گی۔

جینی نے بات مان لی۔ مارگریٹ کچن کے سامنے بنے ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہو کر ٹی وی دیکھنے لگی۔ سامنے کچن کی کشادہ کھڑکی سے جینی اسے کام کرتی نظر آرہی تھی۔ جینی نے بڑی پھرتی سے بڑا مزیدار کھانا بنایا۔ تنہا رہنے والی مارگریٹ کو ٹی وی پر چلنے والی ہلکی سی موسیقی اور کچن میں ایک نوجوان لڑکی کے کام کرنے سے ایک دم گھر آباد سا لگنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سالوں بعد ویرانی میں رونق آگئی ہے۔ جینی کام کرتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا بھی رہی تھی۔ اس نے دو چار بار گنگنانا بند بھی کیا تھا جب مارگریٹ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی لیکن جب مارگریٹ نے اسے کہا کہ اس کا گنگنانا اسے اچھا لگ رہا ہے تو وہ پھر سے اپنے کام پر اسی انداز میں لگ گئی۔

''کیا میں کھانا لے آؤں؟'' جینی نے پوچھا۔

''ہاں، لگاؤ کھانا۔ میں آتی ہوں ڈائننگ روم میں۔'' مارگریٹ ریموٹ سے ٹی وی آف کرتے ہوئے بولی۔

مارگریٹ جب ہاتھ دھو کر آئی تو اس نے دیکھا کہ جینی نے کھانا ٹی وی لاؤنج کی ٹیبل پر رکھا ہوا تھا اور وہ خود ٹیبل کے پاس فلور کشن رکھ کر اس پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جینی نے ٹی وی آن کرلیا تھا۔

''کھانا یہاں لگایا ہے؟'' مارگریٹ نے پوچھا۔

''ہاں۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''دراصل میم،

ڈائننگ روم مجھے الگ تھلگ سا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا ٹی وی دیکھتے ہوئے کھانا کھاتے ہیں۔ اس طرح ٹی وی کو ساتھ ملا کر ہم تین افراد بن جائیں گے۔ رونق زیادہ لگے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟'' جینی نے بات ختم کر کے سوال کیا۔

اب اس کے معصوم سے روئے روئے چہرے پر ہلکی سی اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

''بالکل بالکل، درست کیا تم نے۔'' مارگریٹ نے خوش دلی سے جواب دیا اور خود بھی بڑی بے تکلفی سے فلور کشن پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے دونوں کھانا کھانے لگیں۔ باتیں کرتے کرتے کھانا کھایا۔ مارگریٹ پھر صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی جبکہ جینی نے تیزی سے برتن دھوئے۔ انہیں صاف کر کے ان کی جگہ رکھا اور جھٹ پٹ کچن صاف کر دیا۔ مارگریٹ کو اس کا پھرتیلے پن سے کام کرنا بہت پسند آیا تھا۔ مارگریٹ آج سارے کام معمول سے ہٹ کر کر رہی تھی۔ لاؤنج میں کھانا کھانا، واک نہ کرنا، دیر تک ٹی وی دیکھنا، کسی کے ساتھ گپیں لگانا۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ برسوں بعد اسے کوئی باتیں کرنے والا ملا تھا۔

جب سونے کا وقت ہوا تو مارگریٹ نے اسے اپنے ہی بیڈروم میں سونے کا کہا۔ صبح قدرے دیر سے مارگریٹ بیدار ہوئی۔ وہ بیڈروم سے باہر آئی تو کچن سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اس کے نتھنوں سے ٹکرائیں۔ وہ کچن میں آئی تو دیکھا کہ جینی بڑی اپنائیت بھری مسکراہٹ چہرے پر سجائے ناشتا بنا رہی تھی۔ مارگریٹ کو دیکھتے ہی اس نے خوش دلی سے ''گڈ مارننگ میم'' کہتے ہوئے بریک فاسٹ تیار ہوجانے کا بتایا۔ ٹی وی لاؤنج میں تازہ خبریں سنتے ہوئے، تازہ مزیدار ناشتا کرتے ہوئے مارگریٹ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ناشتے کے دوران دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہیں۔ ناشتے کے بعد جینی نے باغیچہ درست کرنے کی اجازت مانگی۔ جینی نے باغیچے میں آ کر اس کا جائزہ لیا۔ واقعی باغیچے کی حالت بہت خراب تھی۔ گھاس کافی لمبی ہوگئی تھی۔ خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پودے، بیلیں تراشنے والے تھے۔ جینی نے سب سے پہلے گھاس کاٹنے کی مشین چلانا شروع کی۔ گھاس کاٹنے کے بعد کٹی ہوئی گھاس اور گرے ہوئے پتے تنکے وغیرہ اکٹھے کر کے آگ لگادی اور پھر بیلوں، پودوں کو تراشنے کا کام شروع کر دیا۔ پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی مارگریٹ بڑی دلچسپی سے یہ کام ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے تک باغیچہ اپنی درست حالت میں لوٹ آیا تھا۔ مارگریٹ نے جینی کو باہر چل کر لنچ کرنے کا کہا۔ جینی اور مارگریٹ قریبی ہوٹل گئیں اور لنچ کیا۔

لنچ کے بعد جینی نے مارگریٹ سے کہا۔ ''میم! میرا معاوضہ دے دیں اور پلیز مجھے اجازت بھی دیں۔''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' مارگریٹ نے پرس کھولتے ہوئے کہا اور بڑی مالیت کے چند نوٹ اسے تھما دیے جنہیں دیکھ کر جینی کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ جب وہ رقم لے کر اٹھنے لگی تو مارگریٹ نے اس سے اس کا سیل نمبر لے لیا۔ اس لیے کہ شاید پھر اسے اجرت پر کسی کام کرنے والی کی ضرورت پڑے تو وہ اسے کال کر سکے۔ نمبر دینے کے بعد جینی نے رات قیام کروانے کا شکریہ ادا کیا اور ''گڈ بائے'' کہتے ہوئے چل دی۔

☆☆☆

گھنگرالے سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والا، شکل ہی سے شاطر نظر آنے والا راجر بڑی بے چینی سے جینی کا منتظر تھا، پھر اسے جینی نظر آگئی۔ اس سے انتظار نہیں ہو رہا تھا اس لیے پرانی سی گاڑی کو چلاتا ہوا اس کی جانب چل دیا۔ اس کے قریب گاڑی روکی اور تیزی سے باہر نکل کر اس کے قریب آتے ہی سوال کیا۔ ''ہاں تو بڑھیا کچھ جال میں پھنسی؟''

جینی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑے پُرجوش لہجے میں بولی۔ ''لگ تو یہی رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ تو پھنس گئی ہے۔ اس نے مجھ سے میرا سیل نمبر بھی لیا ہے۔ اب انتظار کرتے ہیں اس کی کال کا۔ اگر نہ آئی تو میں پھر بے چارگی کا ڈھونگ رچانے اس کے گھر جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے دوسری بار میں پہلی بار سے زیادہ اچھا پرفارم کروں گی۔'' راجر نے اثبات میں سر ہلایا اور جینی کو گاڑی میں بیٹھنے کا کہا۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد جینی تنہا مفلسی کے دن کاٹ رہی تھی کہ ایک روز اس کی ملاقات راجر سے ہوئی۔ راجر ایک جرائم پیشہ گروہ کا رکن تھا۔ چھوٹی موٹی چوریاں کرنا ان کا کام تھا۔ ایک بڑا ہاتھ مارنے کے چکر میں گروہ کے ہاتھوں ایک قتل ہوگیا۔ پورا گروہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا، سوائے راجر کے، کیونکہ اس روز وہ بخار کی وجہ سے اپنے گروہ کے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ اکیلا راجر پھر کسی جرائم پیشہ گروہ کو ڈھونڈنے لگا۔ گروہ تو نہ ملا، جینی مل گئی۔

دونوں کی ملاقات لوکل بس میں ہوئی۔ جینی نے راجر کو ایک مسافر کی جیب بڑی ہوشیاری سے کاٹتے دیکھا۔ راجر کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ ایک لڑکی اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ ڈرا کہ کہیں اس کی چوری دوسروں کو نہ بتادے لیکن وہ

جان بوجھ کر خاموش رہی۔ ایک ہی اسٹاپ پر دونوں اترے تو راجر تیزی سے جینی کی طرف بڑھا اور اسے روک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ جینی نے بڑی معصومیت سے صرف سر ہلایا اور آگے بڑھنے لگی تو راجر نے اسے روک کر ایک کپ کافی پینے کی دعوت دی جو جینی نے قبول کرلی۔

اسی دوران دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔ راجر نے جینی کو اپنا ساتھی بنا کر اکٹھے وارداتیں کرنے کا منصوبہ بنایا اور جینی سے کہا کہ مفلسی اور تنہائی کی اس زندگی کو چھوڑ کر ایک بھرپور زندگی گزارنا چاہتی ہے تو اس کا ساتھ دے۔ راجر اس کی معصوم شکل سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر وارداتیں کرنا چاہتا تھا۔ راجر کی نظر بڑے عرصے سے اپنے شہر کی مالدار خاتون مارگریٹ کی جائداد و دولت پر تھی۔ اس نے دو تین ملاقاتوں میں ہی جینی کو ایک بار میں ہی بڑا ہاتھ مارنے کا کہا۔ جینی اس شہر سے چند کلومیٹر فاصلے پر ایک قصبے میں رہتی تھی اور شہر والوں اور مارگریٹ کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ راجر نے جینی کو بے چاری بنا کر مارگریٹ کے گھر کے قریبی پارک میں بھیجا جہاں وہ ہر روز واک کے لیے جاتی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ جینی مارگریٹ سے مل کر اسے ملازمت دینے کا کہے گی، پھر آہستہ آہستہ اس کا اعتماد حاصل کرکے راجر کو بھی وہاں ملازمت دلوا دے گی، پھر دونوں مل کر بوڑھی مارگریٹ کو ڈرا دھمکا کر اس کی جائداد، دولت اپنے نام کروالیں گے اور اسے قتل کرکے کسی دوسرے شہر جا بسیں گے۔ راجر نے جینی سے کہا کہ دولت مند ہوجانے کے بعد وہ آپس میں شادی بھی کرلیں گے۔ راجر اسے مارگریٹ کو واک کرتے ہوئے دکھا چکا تھا۔ پارک میں جاکر جینی کو مارگریٹ کے پاس جانے یا ملازمت مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مارگریٹ نے خود ہی اسے دیکھ کر اس کا تعارف حاصل کرکے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی اور اگلے روز سیل نمبر لے کر اسے بھیجا۔ اب دونوں آگے کا سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

شام ہوئی۔ ٹی وی کی دھیمی سی آواز اور تنہائی، مارگریٹ کو دونوں چیزیں بہت بری لگیں اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ صرف ایک دن جینی کے ساتھ گزار کر اسے گویا اس کی عادت ہوگئی تھی۔ مارگریٹ سوچنے لگی کہ جینی کس طرح تیز تیز کام کررہی تھی۔ کس طرح اس نے مزیدار کھانا بنایا اور اسے بوریت سے نکال کر اس کے ایک دن کو خوبصورت بنادیا۔ سوچتے سوچتے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس نے ایک نمبر ملانا شروع کیا۔

☆☆☆

ایک سستے سے ہوٹل میں راجر اور جینی رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ جینی کے سیل فون کی رنگ بج اٹھی۔ اس نے اسکرین پر انجانے نمبر کو دیکھا اور فون اٹینڈ کیا۔ ''ہیلو'' کے جواب میں دوسری طرف سے جو کہا گیا، وہ سن کر جینی کا چہرہ کھل اٹھا۔

''جی ضرور! میں ایک گھنٹے میں آپ کے پاس پہنچ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور راجر کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''پروگرام کا پہلا حصہ کامیاب ہوگیا۔ بڑھیا نے مجھے مستقل ملازمہ رکھنے کی پیشکش کی ہے اور جلد سے جلد اس کی رہائش گاہ پہنچنے کا کہا ہے۔''

راجر خوشی اور حیرت سے اچھل پڑا۔ ''ہیں! واقعی؟''

''ہاں، اور اب تم مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر مارگریٹ کے گھر ڈراپ کردو۔'' جینی نے کہا۔

جینی کو دیکھ کر مارگریٹ کھل سی گئی۔ اس کے ساتھ دیر تک باتیں کرتی رہی اور پھر اسے اس کا بیڈروم دکھادیا۔ بیڈروم جاتے ہوئے جینی بولی۔ ''میم! بس اب آپ بے فکر رہیے۔ کل سے گھر کے سارے کام میں کروں گی۔ آپ بس اپنے کاروبار پر توجہ دیں۔''

''ٹھیک ہے جینی! میں تو چاہتی ہوں کہ کوئی تمہارے جیسا اچھا نوجوان مل جائے تو اسے بھی کاروبار کا نگران بنادوں اور خود آرام کروں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب پہلے جیسا دم خم نہیں رہا۔'' یہ کہہ کر مارگریٹ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور اس کے جملے کو سن کر جینی کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

☆☆☆

جینی کو مارگریٹ کے گھر آئے دو ہفتے ہوچکے تھے۔ اس دوران اس نے مارگریٹ کا اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ مارگریٹ اب کاروبار پر پوری توجہ دے رہی تھی۔ اسے بااعتماد اور اچھا کام کرنے والی ملازمہ ملی تھی۔ اب اسے ہر وقت کھانا تازہ ملتا۔ کپڑے، جوتے، جیولری، سب جینی سنبھالتی۔ گھر کی صفائی، پھولوں، گملوں کا خیال رکھنا، سب جینی نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ گھر موتی کی طرح چمک اٹھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مارگریٹ کی تنہائی ختم ہوگئی تھی۔ اسے ایک دوست، غم گسار میسر آگئی تھی جس کے ساتھ وہ گھنٹوں اپنے کاروبار، بچپن اور اسکول تک کے واقعات پر گفتگو کرتی۔ بعض اوقات تو دونوں باتیں کرتے کرتے

تیز رفتاری کا تیر بہ ہدف نسخہ

لاؤنج میں صوفوں پر ہی سو جاتیں۔ دو ہفتے سے زائد عرصہ بیتا تو جینی نے ایک صبح ناشتا کرتے ہوئے مارگریٹ کو بتایا کہ کل اس کی عدم موجودگی میں ایک نوجوان آیا تھا۔ اس کا نام راجر تھا اور بزنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کررکھی ہے۔ جینی نے مارگریٹ سے کہا کہ وہ نوجوان شکل سے سمجھ دار اور قابلِ بھروسا لگ رہا تھا۔

مارگریٹ نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس کا نمبر، پتا وغیرہ لیا؟''

''یس میم! وہ خود ہی اپنا نمبر دے کر گیا ہے۔ آپ جب کہیں، میں اس سے رابطہ کروادوں گی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ آج شام اسے بلوالو۔'' مارگریٹ بولی۔

☆☆☆

پہلی ہی نظر میں راجر، مارگریٹ کو بالکل پسند نہ آیا۔ وہ چہرے سے ہی مکار وعیار دکھائی دے رہا تھا۔ مارگریٹ کو جینی نے کہا تھا کہ راجر کو ملازمت کی ضرورت ہے۔ وہ قابلِ بھروسا دکھائی دیتا ہے اس لیے اسے ملازم رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ مارگریٹ کو تو وہ نوجوان کسی طور پر قابلِ بھروسا نہیں لگ رہا تھا لیکن پھر بھی اس نے اسے اس شرط پر رکھ لیا کہ وہ اس کا کچھ عرصے ٹیسٹ لے گی۔ اگر وہ کامیاب رہا تو اسے مستقل اپنے ساتھ کاروبار کا نگران بنالے گی۔

راجر کو آئے ابھی ڈیڑھ ہفتہ ہوا تھا۔ اس نے بڑے اچھے انداز میں کام سنبھالا تھا۔ مارگریٹ کو کئی مفید اور اچھے مشورے بھی دیے جو اسے پسند بھی آئے۔ راجر بھی جینی کی طرح مارگریٹ کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ ایک شام چائے پیتے ہوئے جب مارگریٹ راجر کی تعریف کررہی تھی تو جینی نے اس سے کہا کہ وہ اسے ایک اہم بات بتانا چاہتی ہے۔

''اہم بات؟'' مارگریٹ نے قدرے چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''یس میم! اہم، بلکہ انتہائی اہم بات۔'' جینی نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''ہاں، بولو۔'' مارگریٹ نے خالی کپ ٹیبل پر رکھ کر پوری طرح متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

جینی نے ایک گہری سانس لی اور بات بتانا شروع کی۔ بات سنتے ہوئے مارگریٹ کی آنکھیں حیرت اور قدرے خوف سے پھٹ رہی تھیں۔ جب جینی نے بات مکمل کرلی تو مارگریٹ کچھ دیر تو خاموش رہی، پھر اس نے جینی سے کہا کہ اب وہ اس سے انتہائی اہم بات کرنے والی ہے، وہ غور سے سنے۔ مارگریٹ نے بولنا شروع کیا اور جینی نے بڑے غور سے سننا شروع کردیا۔

☆☆☆

مارگریٹ اپنی کسی دوست کے پوتے کی سالگرہ میں شرکت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ راجر اور جینی، مارگریٹ کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

راجر بولا۔ ''جینی! تو پھر کیا خیال ہے۔ اسی ہفتے کے کسی دن بڑھیا سے سائن کروالیے جائیں؟''

جینی بولی۔ ''ہاں، ٹھیک ہے۔ ویسے بھی میں اب غربت زدہ اور کسی کی ملازم بن کر زندگی گزارنے سے تنگ آگئی ہوں۔''

راجر نے سوال کیا۔ ''کیا کاغذات کے بارے میں اچھی طرح معلومات لے لی ہیں؟''

جینی نے جواب دیا۔ ''بالکل! میں نے ابھی پرسوں ہی کچھ ضروری کاغذات اس الماری میں رکھے ہیں جہاں بڑھیا اپنی جائیداد اور کاروبار کے کاغذات رکھتی ہے۔''

''ویری گڈ!'' راجر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر دو دن بعد اپنے شاندار پروگرام کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔''

جینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اگلے ہی روز مارگریٹ نے جینی کو دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بلایا اور اسے کچھ ضروری باتیں سمجھائیں اور کچھ ضروری فونز کیے۔ ایک کال اس نے جینی سے بھی کروائی۔ پُرجوش ہوکر کال کرتی جینی اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ اس کی کال ریکارڈ ہورہی ہے۔

☆☆☆

رات کا تقریباً ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ مارگریٹ اپنے بیڈروم میں پُرسکون انداز میں لیٹی سو رہی تھی۔ اچانک اس کے بیڈروم کا دروازہ کھلا اور کوئی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یہ راجر تھا۔ راجر نے مارگریٹ کے پاس جاکر بڑے زور سے اس کا شانہ ہلایا۔ مارگریٹ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کک...... کون...... کون ہے؟'' اس کے منہ سے اٹکتے ہوئے نکلا۔ سامنے راجر کھڑا تھا۔ راجر کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ راجر نے آگے بڑھ کر بڑی بے رحمی سے چاقو اس کے گلے پر رکھ دیا، ساتھ ہی جینی بھی کمرے میں داخل ہوئی اور بجائے ڈرنے یا حیرت زدہ ہونے کے، آرام سے راجر کے قریب آگئی۔

''کیا چاہیے تمہیں؟'' مارگریٹ نے قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ اتنی جلدی بڑھیا کے سنبھل جانے پر راجر کو شدید حیرت ہوئی۔

''یہ تمہیں جینی...... میرا مطلب ہے میری ساتھی جینی بتائے گی۔'' راجر نے ایک ایک لفظ خصوصاً ''ساتھی'' پر زور دیتے ہوئے بتایا۔

''ہاں بتاؤ جینی! تم راجر کی ساتھی ہو، یہ تو مجھے پتا چل گیا ہے۔ اب اپنا مقصد بھی بتادو۔'' مارگریٹ نے بڑے پُرسکون انداز میں پوچھا۔ راجر اس کے اتنا پُرسکون ہونے پر شدید حیرت زدہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بڑھیا چیخنے چلانے کی کوشش کرے گی یا رحم کی بھیک مانگے گی لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔

''کچھ کاغذات پر دستخط کروانے ہیں۔'' جینی نے کہا۔

''کس قسم کے کاغذات؟'' مارگریٹ نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ کاغذات ہیں جن پر تم ہمیں اپنا منہ بولا بیٹا اور بیٹی قرار دے کر ساری جائداد، کاروبار ہمارے نام کر رہی ہو۔'' جینی نے کاغذات اس کی جانب بڑھائے۔

''اگر میں سائن کرنے سے انکار کردوں تو؟'' مارگریٹ نے پوچھا۔

''تو میں تمہیں اس تیز دھار چاقو سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔'' راجر نے بڑے درشت لہجے میں کہا۔

مارگریٹ نے جینی سے کاغذات لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ راجر کی کنپٹی پر ریوالور کی نال آلگی۔

''چاقو پھینک دو ورنہ گولی چل جائے گی۔''

راجر کو سنائی دیا۔ اس نے فوراً چاقو پھینک دیا اور آواز کی جانب مڑا۔ پولیس اہلکار کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ایک اور پولیس والا دوسری جانب پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔ چند ہی لمحوں میں راجر کو ہتھکڑیاں لگ گئیں۔ چاقو کا گلے پر دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے مارگریٹ کے گلے پر ہلکا سا کٹ لگ گیا تھا اور اس سے خون رِس رہا تھا۔ مارگریٹ نے رومال اپنے زخم پر رکھتے ہوئے بڑے غصیلے انداز میں پولیس والوں سے راجر پر دھوکا دہی اور قاتلانہ حملے کی دفعات لگانے کی استدعا کی۔

راجر چند منٹوں میں سرکاری مہمان خانے جا پہنچا۔ اس سارے وقت ایک بات پر شدید حیرت تھی کہ اس کی شریکِ جرم جینی کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ پولیس وہاں کیسے پہنچی؟ جینی ابھی تک اس گھر میں کیوں موجود ہے؟ حالانکہ اس نے سائن کروانے والے کاغذات بھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے جو اس کے شریکِ جرم ہونے کا واضح ثبوت تھے۔ انہی سوالات کا جواب سوچتے ہوئے وہ رات بھر حوالات میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور...... اگلی صبح اس کو سارے سوالوں کے جواب مل گئے جب مارگریٹ اور جینی دونوں اکٹھی اس سے ملنے آئیں۔

مارگریٹ تو اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے ایک دو الفاظ کہہ کر پرے ہٹ گئی لیکن جینی سلاخیں تھامے وہیں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی۔ راجر کو اس کی مسکراہٹ بہت پُراسرار لگ رہی تھی۔ اسے یوں لگا کہ اس کے مسکرانے کے پیچھے کوئی چونکا دینے والی اسٹوری ہے۔ آخر پہل اسی نے کی اور سوال کیا۔

''جینی! یہ سب کیا ہے؟ پولیس وہاں پہلے ہی سے کیسے موجود تھی؟ انہوں نے تمہیں گرفتار کیوں نہیں کیا؟ کیا بڑھیا نے تمہیں معاف کردیا ہے؟ پلیز...... پلیز مجھے میرے سوالوں کے جواب دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

جینی ایک بار پھر مسکرائی اور اپنی معصوم سی مسکراہٹ

کے ساتھ بولی۔ ''مجھے میم کو دھوکا دینا اچھا نہیں لگا۔ میں ایک بھیانک جرم کر کے اور ایک مجرم کی شریکِ کار بن کر زندگی نہیں گزار سکتی تھی اس لیے میں نے اپنا اور تمہارا سارا پلان میم کو بتا دیا۔ انہیں میری باتوں پر یقین نہ آیا تو میں نے انہیں یہ ریکارڈنگ سنوا دی۔'' یہ کہتے ہوئے جینی نے ریکارڈر کا بٹن آن کیا۔ اس میں وہ ساری گفتگو ریکارڈ تھی جو جینی اور راجر نے مارگریٹ کے لان میں پلان بناتے ہوئے کی تھی۔

ریکارڈنگ سنا کر جینی بولی۔ ''یہ سننے کے بعد میم نے مجھے معاف کر دیا اور کہا کہ تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑوایا جائے تاکہ تمہیں لمبے عرصے کی جیل ہو۔ پولیس والے بھی میم نے پہلے ہی بلا لیے تھے۔'' جینی نے تفصیل بتائی کہ کیسے راجر کو بے وقوف بنایا گیا تو راجر کو مارگریٹ کے جلد پُرسکون ہو جانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ ظاہر ہے جینی اور دو پولیس والے اس کے ساتھ تھے تو وہ کیوں گھبراتی؟

''تم نے میرے ساتھ بہت بڑا دھوکا کیا ہے۔'' راجر چیخا۔

''کون سا دھوکا؟'' جینی نے اپنی معصوم سی آنکھیں پھیلا کر بڑی معصومیت سے سوال کیا اور پھر اس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ ''میں نے تو ایک عورت کو دھوکا کھانے اور جائداد سے محروم ہونے سے بچایا ہے۔''

''جینی! تم دھوکے باز ہو۔ تم نے دوست بن کر بہت بڑی دشمنی کی ہے۔ میں...... میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' راجر غصے سے چلّا رہا تھا۔ جواب میں جینی جلا دینے والے انداز میں مسکرائی اور کہنے لگی۔

''دیکھو راجر! آرام سے سنو۔ مجھے اچھی زندگی چاہیے اور وہ میم مارگریٹ کی مستقل ملازمہ بن کر مجھے... بہ آسانی مل سکتی ہے۔ اسی لیے میں نے انہیں سب سچ بتا کر تمہیں پکڑوا دیا۔'' جینی رکی اور پھر بولی۔ ''راجر! یہ کیا کہا تم نے؟ چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔ ارے پہلے خود تو باہر آ جاؤ پھر مجھے پکڑنے کی بات کرنا۔'' یہ کہہ کر جینی تیزی سے مڑی اور میم مارگریٹ کے ساتھ باہر آ گئی۔

راجر غصے اور صدمے سے پھنکار رہا تھا۔ وہ جیل کی سلاخوں پر اپنا سر پٹخ رہا تھا اور خود کو کوس رہا تھا کہ وہ جینی کی باتوں میں کیوں آیا۔ بظاہر معصوم نظر آنے والی جینی نے کیسی شاطرانہ چال چلی۔ اس کا پلان چوپٹ کر کے اسے سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا اور خود اب عیش کرنے والی تھی۔

☆☆☆

مارگریٹ اور جینی گھر پہنچ چکی تھیں۔ جینی بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ کوئی بھی جرم کیے بغیر، کوئی خاص محنت کیے بغیر اسے سب کچھ مل رہا تھا۔ اچھا معاوضہ، رہائش اور دوستوں جیسی مالکن مارگریٹ۔ البتہ مارگریٹ چپ چپ سی تھی۔ اس نے جینی سے کوئی خاص بات نہیں کی اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنے لگی۔ شام کی چائے کا وقت تھا۔ حسبِ معمول مارگریٹ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ جینی نے پوچھا کہ کیا چائے بنا لی جائے؟

''نہیں، مجھے ابھی چائے نہیں پینی۔'' مارگریٹ نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

''کیوں میم! خیریت تو ہے؟ جب سے ہم راجر سے مل کر آئے ہیں، آپ خاموش خاموش سی دکھائی دے رہی ہیں۔ اب چائے سے بھی انکار کر رہی ہیں......''

اس کی بات جاری تھی کہ ڈور بیل بج اٹھی۔ جینی گئی اور گیٹ کھولا۔ درمیانی عمر کے ایک مرد اور عورت اندر داخل ہوئے۔

''ہمیں میم مارگریٹ سے ملنا ہے۔'' عورت نے کہا۔

''جی آیئے۔'' کہتے ہوئے جینی انہیں اندر لے آئی۔

مارگریٹ ان سے بڑی گرم جوشی سے ملی اور ان کے نام پوچھے۔ مرد کا نام آرتھر اور عورت کا نام مارتھا تھا۔ جینی خاموش کھڑی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ مارگریٹ ان سے چھوٹے بڑے کئی سوال کر رہی تھی مثلاً کتنے بچے ہیں، پہلے بھی کام کا تجربہ ہے، کون کون سا کام کر سکتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

جینی کو اچانک کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا اور وہ یکایک بے چین سی ہو گئی۔ مارگریٹ کا خاموش رہنا، روکھے پن سے چائے سے انکار اور اب مرد عورت سے، جو میاں بیوی تھے، انٹرویو نما گفتگو کرنا، یہ سب جینی کو خوفزدہ کر رہا تھا۔

جب سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو مارگریٹ نے دونوں کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''چلو پھر آج سے ہی کام شروع کر دو۔ مارتھا! تم میرے لیے چائے بناؤ۔ آرتھر! تم ذرا باہر کا ایک کام کر کے آؤ۔''

جینی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ مارگریٹ نے اسے یوں نظر انداز کر رکھا تھا گویا وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ مارتھا کا کچن میں جانا اسے کسی خطرے کا احساس دلا رہا تھا۔

''تم ادھر آؤ جینی۔'' مارگریٹ نے اسے پکارا۔

''یس میم!'' جینی تیزی سے قریب آئی۔

مارگریٹ بولی۔ ''سامنے صوفے پر بیٹھو اور میری بات سنو۔''

جینی کوئی جواب دیے بغیر کوئی انجانا سا ڈر لیے بات سننے کے لیے تیار ہو کر صوفے پر سیدھی بیٹھ گئی۔ مارگریٹ

نے بولنا شروع کیا۔ ''جینی! نہایت افسوس سے مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ میں تمہیں ملازمت سے نکال رہی ہوں۔ تم نے بے شک مجھے دھوکا نہیں دیا لیکن اس گھر میں آئی تم اسی نیت سے تھیں۔ تم نے راجر کو پکڑوانے میں بھی مدد کی ہے۔ تم جیسی دھوکے باز کچھ بھی کرسکتی ہے۔ کیا پتا کل تم پھر کسی مجرم کی ساتھی بن جاؤ اور اس بار مجھے کوئی نقصان پہنچادو۔''
مارگریٹ نے آرام سے پوری بات کی۔
''لیکن میم! میں نے تو آپ کو نقصان سے بچایا ہے۔ آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کررہی ہیں؟'' جینی نے احتجاج کرنا چاہا لیکن مارگریٹ نے بالکل توجہ نہ دی۔ جینی پھر بولی۔ ''میم! میرا تو دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں اب کہاں جاؤں گی؟''
''اس کا میں نے انتظام کردیا ہے۔ تم تنہا نہیں رہو گی۔ تم جیسیوں کا ساتھ تمہیں ملے گا۔'' مارگریٹ نے معنی خیز لہجے میں کہا تو جینی کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔
''کیا مطلب میم؟ میں سمجھی نہیں۔'' جینی نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا۔
''میں سمجھادیتی ہوں معصوم جینی۔'' مارگریٹ نے ''معصوم'' پر زور دیتے ہوئے کہا اور بولی۔ ''دراصل میں تمہیں بھی پولیس کے حوالے کررہی ہوں تاکہ دھوکے کی نیت سے کسی کے گھر گھسنے اور کسی کو لوٹنے کا پلان بنانے کے جرم میں تم بھی اپنے ساتھی راجر کی طرح جیل کی ہوا کھاسکو۔''
''میم! لیکن میں نے تو......''
مارگریٹ نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''ہاں ہاں، مجھے معلوم ہے تم نے مجھے بچایا ہے لیکن اس کے پیچھے تمہاری عیش بھری پُرسکون زندگی گزارنے کا مقصد ہے۔ تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنی اچھی زندگی کی خاطر یہ سب کیا۔ ویسے بھی تم نے راجر یعنی اپنے ہی ساتھی کو دھوکا دے کر اور پھنسوا کر ثابت کردیا کہ تم اگر اپنے دوست کے ساتھ بے وفائی کرسکتی ہو تو کسی کے ساتھ بھی کرسکتی ہو۔ تمہارا کیا بھروسا، کسی اور کو دوست بنا کر مجھے لوٹنے کا پلان بنارہی ہو۔ تھوڑی دیر میں پولیس تمہیں لینے آرہی ہے۔ اگر خود پر رحم کھانا چاہتی ہو تو پلیز بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔''
''لیکن آپ مجھے کیسے پکڑوا سکتی ہیں جبکہ میں نے تو پولیس کے سامنے آپ کا ساتھ دیا ہے۔'' جینی نے تیز لہجے میں پوچھا۔
''تمہارے انداز میں جینی! تم نے ہی مجھے پھنسوانے کا طریقہ سمجھایا ہے۔''

جینی الجھی الجھی نظروں سے مارگریٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''جینی! تم نے اپنی اور راجر کی پلان بناتے ہوئے گفتگو ریکارڈ کرکے مجھے سنوائی، اسی طرح تم جیسی معصوم نظر آنے والی فراڈ لڑکی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تمہاری اور راجر کی وہ گفتگو ریکارڈ کی ہے جو تم نے میرے ہی کہنے پر راجر سے فون پر کی تھی۔ اس گفتگو میں تم نے مجھے ڈرانے، دھمکانے، سائن کروانے، گھر کا گیٹ کھلا چھوڑ دینے تاکہ راجر آرام سے رات کے وقت گھر کے اندر گھس سکے اور سائن کروانے کے بعد میرے قتل کی باتیں کررہی ہو۔'' مارگریٹ نے ہلکا سا توقف کیا اور بولی۔ ''میں نے یہ ریکارڈنگ پولیس کو دے دی ہے۔ بس وہ آتے ہی ہوں گے۔''
''لیکن یہ ڈراما تو میں نے آپ کے کہنے پر کیا تھا۔''
جینی رو دینے کو تھی۔
''درست کہا تم نے۔ واقعی راجر کو پھنسانے کے لیے تم نے وہ بات چیت میرے ہی کہنے پر کی لیکن ریکارڈنگ میں صرف مجرمانہ بات چیت ہی ہے۔ کوئی بھی جملہ یہ ظاہر نہیں کررہا کہ تم میرے کہنے پر یہ سب کررہی ہو۔ یہ تمہیں جیل بھجوانے کا پکا ثبوت ہے۔ میں نے قابلِ بھروسا ملازمین کا بندوبست کرلیا ہے۔ اب تم جاؤ اور جیل جاکر اپنی غلطی کی سزا بھگتو۔ مجھے دھوکے باز لڑکی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' مارگریٹ نے رکھائی سے کہتے ہوئے صوفے کے ساتھ آرام سے ٹیک لگالی۔ چند ہی لمحوں میں پولیس کی گاڑی کا سائرن اور پھر مارگریٹ کے گھر کی ڈوربیل کی آواز سنائی دی۔ جینی نے ہار مان کر خود کو صوفے پر گرالیا۔

☆☆☆

جیل کے ٹھنڈے فرش پر گھٹنوں میں سر دیے جینی بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اس نے تو راجر جیسے شاطر کو بری طرح پھنسوا کر خود اچھی زندگی گزارنا چاہی تھی لیکن مارگریٹ ان دونوں سے زیادہ شاطر نکلی۔ پہلے جینی کی مدد سے خود کو بچایا، راجر کو جیل بھیجا پھر شاطرانہ طریقے سے جینی کو بھی جیل بھجوادیا۔

☆☆☆

مارگریٹ واک کررہی تھی۔ پارک میں بہت سے لوگ موجود تھے۔ اچانک مارگریٹ کی نظر ایک اداس بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ اس نے اسے رک کر بغور دیکھا اور پھر یکدم نظرانداز کرکے آگے بڑھ گئی۔ اب اس میں مزید شاطرانہ کھیل کھیلنے یا ایڈونچر کرنے کی ہمت نہ تھی۔

⌘⌘⌘

اشک ندامت

تنویر ریاض

مخلص دوست [illegible] قسمت
والوں کو ہی [illegible] اور [illegible] آخر
[illegible]
کڑا امتحان [illegible] درپیش تھا [illegible] کرشمے کا منتظر [illegible]
پچھتاوا اس کی جان کا [illegible] بن چکا تھا [illegible]
اچانک اس کا رہبر [illegible]

پُرخلوص نصیحت کو رد کرنے والے ایک

نافرمان بیٹے کا قصہ

بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ ملٹن کنٹری کلب میں گالف کھیلنے والے شاٹ لگا کر گیند ہار پر چینل تک پہنچا سکیں لیکن اس پیر کی صبح فرینک ڈیلفی نے زوردار شاٹ لگا کر گیند کو میدان سے باہر پھینک دیا۔ یہ لڑکے گالف کھیلنے والوں کے ملازم تھے اور ان کے ڈنڈے وغیرہ ساتھ لے کر چلتے تھے۔ انہیں ہفتے میں ایک بار گالف کھیلنے کی اجازت تھی۔ اسے اپنی گیند تلاش کرنے کے لیے نشیب میں اگے سرکنڈوں کے درمیان سے گزرنا پڑا۔ اسے گیند تو نہیں ملی

لیکن کچھ اور نظر آ گیا۔

''جونی!'' اس نے اپنے دوست کو پکارا۔ ''تم نے یہ دیکھا۔''

جونی میدان پار کرکے اس کے پاس آیا اور دونوں لڑکے حیرت سے اس جگہ کو دیکھنے لگے۔ وہ ایک ریت کا قطعہ تھا جو ڈھلوان کی شکل میں مٹی کی چٹان سے پانی کی چھوٹی سی موج کی طرف جا رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی ریت تھی جس میں چمک دار پتھر اور ٹوٹی ہوئی سیپیاں بھری ہوئی تھیں۔

''کسی لڑکی کو ساتھ لانے کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔'' جونی نے کہا۔

''یہاں پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔'' فرینک نے کہا۔

وہ دونوں ابھی نوعمر تھے۔ لڑکیاں اور پارٹیاں ان کے تصور سے بھی دور تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ چیزیں بالآخر ان کی دسترس میں آ گئیں۔

☆☆☆

''کیا تمہیں واقعی میری ضرورت ہے؟'' جونی نے کہا۔ وہ دس پونڈ وزنی مگدر سے اپنے مسل بنا رہا تھا۔

فرینک، جھونپڑی کے برابر موجود .... برقی چھکڑے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سورج کی کرنیں اس کی زرد چھاتی پر پڑ رہی تھیں۔ اس کے جسم سے ٹالکم پاؤڈر کی خوشبو آ رہی تھی۔

''ہاں! مجھے تمہاری ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ایک دوست کو لے کر آ رہی ہے۔''

''کون سی دوست؟'' جونی نے پوچھا۔

''کیرن۔ وہ کالج میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔''

جونی نے مگدر پھینک دیا اور اپنے بازو جھکا کر مسلز کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ ہمیشہ سے قابلِ اعتبار تھا لیکن میموریل ڈے کے بعد سے کچھ بدحواس اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ گفتگو کے دوران اس کے جملے بے ربط ہو جاتے، آنکھیں جھپکنے لگتیں اور یوں لگتا جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ پہلے تو فرینک یہ سمجھا کہ اس کی وجہ ہائی اسکول کی پڑھائی ہے لیکن جونی نے کچھ ایسے اشارے دیے جن سے فرینک کو شبہ ہونے لگا کہ اس معاملے میں کوئی لڑکی بلکہ عورت ملوث ہے۔ اس کے ذہن میں دو خواتین کے نام آئے۔ ایک ان کی بارھویں گریڈ کی انگلش ٹیچر اور دوسری گالف کلب میں کام کرنے والی حسینہ جسے حال ہی میں طلاق ہوئی تھی۔

''آٹھ بجے۔'' فرینک نے کہا۔ ''میں تمہیں دس منٹ پہلے لے لوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔'' جونی نے کہا اور بات ختم کرکے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

فرینک نے الیکٹرک کارٹ کو گالف گراؤنڈ کے عقب میں سخت جگہ پر روکا۔ قریب ترین گالف کے کھلاڑی بھی وہاں سے تین سو گز کے فاصلے پر تھے۔ فرینک نے کارٹ سے کولر اتارا اور اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ سورج غروب ہونے کے بعد وہاں اندھیرا پھیل جائے گا اور صرف آدھے چاند اور نہر کے دوسری جانب بنے ہوئے نئے مکانوں کی روشنی ہوگی۔ وہاں اس طرح کی کئی پرائیویٹ جگہیں تھیں۔ اس کولر میں بیئر کی بوتلیں، دو کمبل اور چار تولیے بھی تھے۔ اس نے وہ کولر سرکنڈوں کے درمیان رکھا اور واپس یارڈ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

ڈیلفی کے ڈائننگ روم میں کاغذوں اور کاپیوں نے پوری میز کو ڈھانپ لیا تھا۔ ڈیلفی کے عقب میں فرش پر ایک پیڈسٹل فین رکھا ہوا تھا جس کی ہوا سے پردے ہل رہے تھے۔ فرینک کا باپ پہلے سراغ رساں تھا پھر دوبارہ پٹرول سارجنٹ بن گیا۔ اب وہ ایک بار پھر سراغ رساں بن چکا تھا اور اسے سراغ رساں سارجنٹ بننے کے لیے ایک امتحان دینے کی ضرورت تھی۔ فرینک کے خیال میں یہ امتحان غیر ضروری تھا کیونکہ ملٹن پولیس میں صرف تیس پولیس اہلکار تھے۔

''کیونکہ یہی طریقہ کار ہے۔'' اس کے باپ نے وضاحت کی۔ ''اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر افراتفری پھیل جائے گی۔''

''آج رات کیا پروگرام ہے؟'' اس کے باپ نے پوچھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ فرینک نظروں میں آئے بغیر کچن کے راستے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''وہی معمول کے مطابق۔'' فرینک نے کہا۔

وہ گزشتہ ایک سال سے اپنے باپ سے بہت کم بات کرتا تھا، جب اس نے گول مول الفاظ میں یہ کہا کہ کالج اس کے لیے گھر سے فرار ہونے کا بہانہ ہے جو دو بالغ مردوں کے لیے بہت چھوٹا پڑ گیا ہے۔ اس کے بعد اس کے باپ کی گفتگو کا انداز بدل گیا اور اس کی عام بات چیت میں بھی تفتیش کا رنگ جھلکنے لگا۔

''کیا گریجویشن پارٹی میں جا رہے ہو؟'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''آج رات کوئی پارٹی نہیں ہے۔''

''پھر کون سی معمول کی بات ہے؟''
کھانے کا کمرا سارا دن سورج کی گرمی سے تپتا رہا ..... پنکھا چلنے کے باوجود بھی وہ گھر کا سب سے گرم کمرا تھا۔ اس کے باپ نے باکسروں والا نیلا جانگیا اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سیاہ بال بے ترتیب ہو رہے تھے اور نظر کا چشمہ ناک پر رکھا ہوا تھا۔
''جونی کے ساتھ کوئی کام ہے۔'' اس نے گول مول الفاظ میں بتایا۔ ''ابھی مجھے کام کی نوعیت معلوم نہیں۔''
''اوہ!'' اس کے باپ نے طنز کیا۔
اس کے لہجے نے فرینک کو چونکا دیا۔ جونی دوسرے بچوں کے والدین کا پسندیدہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ محلے کے سب بچے اس کی تقلید کریں لیکن سراغ رساں ڈیلفی کی رائے مختلف تھی۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر آنکھیں صاف کیں اور بیٹے کو دیکھنے لگا۔
''آج میں نے لاکر روم میں ایک افواہ سنی۔'' اس نے کہا۔ ''کہ جونی ایک بڑی عمر کی عورت سے چوری چھپے ملتا ہے۔ تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟''
''نہیں۔'' فرینک نے کہا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''
''مجھے امید ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ جونی جیسے اچھے لڑکے کو اس طرح کی شہرت کی ضرورت نہیں۔''

☆☆☆

فرینک ایک پرانی فورڈ گلیکسی میں ساؤنڈ ویو روڈ پر سفر کر رہا تھا۔ لوری نیولینڈ اس کے بالکل برابر اور اس کی دوست کیرن پسنجر ڈور کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ اچانک کار زور سے اچھلی تو لڑکیوں کی چیخ نکل گئی۔ شاید کوئی گڑھا آ گیا تھا۔ کیرن نے ڈیش بورڈ کا سہارا لیا جبکہ لوری نے فرینک کا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ناخن کی چبھن سے فرینک کے بدن میں سنسنی ہونے لگی۔
اس نے سڑک پر لگے ہوئے آخری ٹیلی فون کے کھمبے کے ساتھ کار روکی جو ٹوٹی ہوئی سڑک پر جھکا ہوا تھا۔ اس کھمبے میں ایک ایمرجنسی کال بکس نصب تھا۔ فرینک کو وہ واقعہ یاد آ گیا کہ کس طرح ایک لڑکے نے اسے ایمبولینس بلانے کے لیے استعمال کیا جب ایک کھلاڑی گالف کے میدان میں گر گیا تھا۔
دونوں لڑکیاں گالف کورس پر دوڑنے لگیں۔ وہ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھیں۔ فرینک نے کار کے شیشے چڑھائے اور دروازے لاک کر دیے۔ اسے امید تھی کہ جونی کی کار پہاڑی کے دامن میں کھڑی ہو گی لیکن اسے مایوسی ہوئی۔
فرینک نے ساحل کے کنارے ریت پر کولر گھسیٹا اور سوچنے لگا کہ ایک کمبل بچھائے یا دونوں۔ گریجویشن کے چند ہفتوں بعد ہی لوری اس کی باضابطہ طور پر گرل فرینڈ بن گئی تھی لیکن کیرن کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوری اور کیرن ایک کمبل پر لیٹیں اور اسے دوسرے کمبل پر اکیلا لیٹنا پڑے۔ اس نے صرف ایک کمبل کھولا اور بیئر کے گھونٹ لینے لگا جبکہ دونوں لڑکیوں نے پیراکی کا لباس پہنا اور پانی میں چلی گئیں۔ وہ نیچی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ فرینک کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا باتیں کر رہی تھیں جبکہ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ صرف انگریزی بول رہی ہیں یا کوئی خفیہ زبان جسے کوئی لڑکا نہ سمجھ سکے۔ اس نے بیئر کا ایک اور گھونٹ لیا اور کہنیوں کے بل لیٹ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رات اسی طرح گزر جائے لیکن فی الوقت اس کے پاس کوئی متبادل نہیں تھا۔
فرینک اور لوری کی ملاقات چار سال قبل ہوئی تھی جب اس نے ویمنز کلب چیمپئن شپ میں حصہ لیا اور فرینک نے گالف خادم کے طور پر اس کے لیے کام کیا۔ لوری ایک شرمیلی اور سیدھی لڑکی تھی۔ اس کی ماں کو گالف کھیلنے کا جنون تھا اور وہ بیٹی کو بھی اس جانب راغب کر رہی تھی جبکہ فرینک کلب کا سب سے چھوٹا گالف خادم تھا۔ گالف کے علاوہ وہ کسی دوسرے موضوع پر بات نہیں کرتا تھا۔ اس گرم سہ پہر میں ان کی دوستی کا آغاز ہوا جو ہائی اسکول میں بھی قائم رہی اور اب یہ دوستی کوئی اور شکل اختیار کر چکی تھی۔
تھوڑی دیر بعد لوری پانی سے باہر آ گئی اور کمبل پر فرینک کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم کی قربت محسوس کر کے فرینک ایک بار پھر سنسنی محسوس کرنے لگا۔
''پانی کیسا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''گرم۔'' لوری نے جواب دیا۔
اس نے فرینک کے ہاتھ سے بوتل لے کر بیئر کا گھونٹ لیا۔ کیرن ابھی تک پانی میں چل رہی تھی۔ اب پانی اس کے گھٹنوں تک آ گیا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا جیسے وہ پانی میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو۔
''وہ جونی کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔'' لوری نے کہا۔
''میں خود بھی اس کا انتظار کر رہا ہوں۔'' فرینک بولا۔
''ہمیں اس کو خوش رکھنے کی ضرورت ہے۔'' لوری نے کہا۔ ''ورنہ وہ چلی جائے گی اور میں نہیں چاہتی کہ آج کا

پروگرام خراب ہوجائے۔''

عین اسی وقت کیرن پانی میں ڈوبنے لگی، جیسے اس کے نیچے اچانک ہی کوئی دروازہ کھل گیا ہو۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر اوپر آنے کی کوشش کررہی تھی، پھر اس نے مدد کے لیے چلانا شروع کردیا۔ فرینک فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کپڑوں کے نیچے نہانے کا لباس پہن رکھا تھا لیکن اسے کپڑے اتارنے اور پانی میں جانے کا وقت نہیں ملا تھا۔ وہ ریت پر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھا اور پانی میں چھلانگ لگادی۔ کیرن ابھی تک ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ فرینک نے اپنا ایک بازو اس کی کمر کے گرد ڈالا اور اسے لے کر خشکی کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ ساحل سے چھ فٹ دور تھے لیکن ابھی تک اس نے پانی کی تہ کو محسوس نہیں کیا تھا۔

لوری نے ہاتھ بڑھا کر کیرن کو اپنی جانب کھینچا جبکہ فرینک اسے پیچھے سے دھکیلنے لگا۔ کیرن ریت پر لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور کمبل پر گر گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ لوری اس کے برابر جھک کر اس کی کمر سہلانے لگی۔ کیرن کو کھانسی آئی اور اس نے تھوڑا سا پانی نکال دیا اور پھر بوتل منہ سے لگا کر بیئر کا ایک گھونٹ لیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''آرمی کے انجینئرز نے گزشتہ برس نہر کی صفائی کی تھی۔'' فرینک نے کہا۔ ''اس وجہ سے نہر میں ایک خلا بن گیا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' کیرن نے کہا۔ ''تم اب ہمیں بتا رہے ہو۔''

''مجھے خیال نہیں رہا۔'' فرینک ہکلاتے ہوئے بولا۔

''اس نے پانی میں چھلانگ لگائی اور تمہیں باہر نکالا۔ تم کم از کم اس کا شکریہ تو ادا کرسکتی ہو۔'' لوری نے کہا۔

فرینک ساحل کی طرف چل دیا اور دونوں لڑکیاں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ اس کے گیلے کپڑے بدن سے چپک رہے تھے اور اسے سردی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے اپنی قمیص اور جینز اتاری، انہیں نچوڑا اور ایک چٹان پر پھیلا دیا۔ اس کے بازو اور گردن، سینے اور کندھوں کے مقابلے میں سیاہ تھے۔

جب وہ واپس آیا تو دونوں لڑکیاں خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ ''معاف کرنا، مجھے خیال نہیں رہا۔'' کیرن بولی۔ ''دراصل میں بہت سہمی ہوئی تھی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں۔'' فرینک نے کہا۔

کیرن سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگوں نے کبھی مسٹر شوٹ کی ہے؟''

فرینک اور لوری نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''یہ بہت صاف ستھرا طریقہ ہے۔'' کیرن نے کہا۔ ''میرے اسکول کے سبھی لڑکے اس طرح کرتے ہیں۔ اس کے لیے تمہیں صرف ایک کین اوپنر چاہیے۔'' اس نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا۔ ''یہ رہا۔''

پھر وہ فرینک کو مخصوص ہدایات دیتے ہوئے بولی۔ ''ڈبے کے پیندے میں ایک سوراخ کرو اور اپنا منہ اس پر رکھ دو اور اندر کی طرف ہوا کھینچو۔ یہاں تک کہ کین پچک جائے، پھر اپنا سر پیچھے کی جانب کرو اور کین کو سیدھا کردو۔''

فرینک نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ بیئر اس کے منہ میں جانے لگی۔ فرینک تیزی سے اسے پینے لگا۔ چند سیکنڈ میں ہی کین خالی ہوگیا۔ فرینک نے اسے پھینک کر اپنا منہ صاف کیا۔ تھوڑی بیئر اس کی ناک میں چلی گئی جس سے اس کے نتھنوں میں گدگدی ہونے لگی اور اسے ایک زوردار چھینک آئی۔

''دیکھا تم نے یہ کتنا آسان ہے۔'' کیرن نے کہا۔ ''میرا ایک دوست ہے جو ہر ہفتے کی رات پورے چھ پیگ اسی طرح پیتا ہے۔''

کیرن اور لوری نے ایک ایک کین لیا۔ فرینک نے جب کیرن کے دوست کے بارے میں سنا تو اس نے چیلنج قبول کرتے ہوئے ایک اور کین اٹھالیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد اس کا سر چکرانے لگا اور اس نے اپنی کنپٹیوں پر دباؤ محسوس کیا اور وہ کمبل پر سیدھا لیٹ گیا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ اس نے لوری اور کیرن کو سرگوشیاں کرتے دیکھا لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ دونوں کیا باتیں کررہی تھیں۔ تھوڑی سی مزید گفتگو کے بعد لگا جیسے ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہوگیا ہے۔ کیرن وہاں سے چل دی اور لوری کہنیوں کے بل کروٹ لے کر فرینک کے قریب آگئی۔

''بہت خراب صورت حال ہے۔'' اس نے کہا۔ ''جونی کو خدا ہی سمجھے۔ اب میں کبھی اس پر بھروسا نہیں کروں گا۔''

''اسے بھول جاؤ۔'' وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے بولی۔ ان کے لب ملے اور فرینک پر نشہ سا چھانے لگا۔ بیئر کا سرور اور چار سال کا صبر رنگ لا رہا تھا۔

''کیرن کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' اس نے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے گالف گراؤنڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسے گھر چھوڑ کر یہاں واپس آجاتے ہیں۔''

JASOOSI DIGEST
PUBLICATIONS
Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through

”نہیں۔“ لوری نے کہا۔ ”میں نے اس سے بات کی تھی۔ وہ یہیں ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔“

”کتنا؟“ فرینک نے پوچھا۔

”پریشان مت ہو۔“ لوری نے کہا۔ ”کافی وقت ہے۔ تمہاری پیاس بجھ سکتی ہے۔“

لوری کی جانب سے اشارہ ملنے کے بعد فرینک نے اسے چمٹالیا اور دونوں بوس وکنار میں مصروف ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی سرگوشیاں بھی جاری تھیں۔ وہ گردوپیش سے بےخبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

”اوک آئی لینڈ۔“ لوری نے اچانک کہا۔

”کیا؟“ فرینک اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔

”یہ جگہ نارتھ کیرولینا میں ہے۔ ہم وہاں اکتوبر میں ملیں گے۔“

”میں اسکول کے بارے میں کوئی بات نہیں کرسکتا۔ موسم گرما کا سیشن شروع ہونے والا ہے۔“

”اور وہ ختم بھی ہوگا۔“ لوری نے کہا۔ ”ستمبر سے دسمبر تک کافی لمبا عرصہ ہے۔ ہم وہاں اکتوبر میں ملیں گے یعنی سیشن کے درمیانی وقفے میں۔“

فرینک دو مرتبہ اپنی فیملی کے ساتھ فلوریڈا جاچکا تھا اور اسے یاد تھا کہ نارتھ کیرولینا کے پیچھے وہ ساحلی شہر دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن آج کی رات اس کی اہمیت نہیں تھی۔ وہ آج کچھ بھی کرسکتا تھا۔ اس نے بیئر کے دو کین حلق میں انڈیلے، کیرن کو ڈوبنے سے بچایا اور لوری کی قربت سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

دفعتاً اسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ اسے یوں لگا کہ دور کہیں گڑگڑاہٹ ہورہی ہو، پھر وہ آواز لفظوں میں تبدیل ہوگئی۔

”دوستو!“ کیرن نے پکارا۔ اس کے پیچھے چٹان پر ایک سایہ نظر آیا۔ ”ہمیں کمپنی مل گئی۔“

فرینک، لوری سے دور ہٹ گیا۔ وہ جونی سے ملنے کی توقع کررہا تھا لیکن اب وہاں ایک کے بجائے دو سائے کیرن کے ساتھ چٹان پر کھڑے ہوئے تھے اور ان میں سے کوئی بھی فرینک کا دوست نہیں تھا۔

”کیا یہاں ڈیلفی موجود ہے؟“ یہ آواز روڈ اسٹون کی تھی۔

لوری نے سرگوشی میں کہا۔ ”دفع کرو۔“

روڈ نے دوسرے لڑکے کو کوئی چیز پکڑائی۔ ایک نارنجی نقطہ چمکا اور بجھ گیا۔

”ہم نے سنا ہے کہ یہاں کوئی پارٹی ہورہی ہے۔“ روڈ نے کہا۔ ”ہم وہی دیکھنے آئے ہیں۔“

”تم نے کس سے سنا؟“

”تمہارے دوست جونی سے۔ اس کا کہنا تھا کہ تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے۔“

”کیسی مدد؟“ فرینک نے کہا۔

”میں وہی دہرا رہا ہوں جو اس نے کہا تھا۔“

فرینک کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس نے اسے ناراض کیا۔ جونی نے روڈ کو بھیج کر یا روڈ نے یہاں آکر۔

”غصہ مت کرو۔“ لوری نے سرگوشی کی، پھر بلند آواز میں بولی۔ ”اگر تم آگئے ہو تو ہمارے ساتھ شامل ہوجاؤ۔“

وہ پانچوں اس کمبل پر ایک ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے۔ لوری، فرینک کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور اس کا سر فرینک کے کاندھے پر تھا جبکہ فرینک کے دماغ سے لوری کی قربت اور بیئر کا نشہ اتر چکا تھا۔ وہ روڈ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا غرور، دولت اور کلب میں اس کا طرزعمل کچھ بھی اسے پسند نہیں تھا۔ وہ ان لڑکوں کے ساتھ اس طرح پیش آتا جیسے وہ اس کے ملازم ہیں۔ فرینک اس کے ساتھ ہائی اسکول کی گالف ٹیم میں کھیل چکا تھا اور اسے شکست دے کر اس کی نمبر ون پوزیشن چھین لی تھی۔ اس کے بعد فرینک نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا لیکن روڈ اور لوری کے خاندان کے درمیان تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ ان کے والدین ہر اتوار کو گالف کھیلتے تھے اور روڈ کی ماں کا لوری کے باپ کے ساتھ افیئر چل رہا تھا۔ لوری نے دو ہفتے قبل فرینک کے سامنے اس کا اعتراف کرلیا تھا۔

روڈ نے بھرا ہوا سگریٹ پیش کیا۔ کیرن نے اس کا ایک کش لیا لیکن لوری نے انکار کردیا۔

”میں وہی پیوں گا جو اپنے ساتھ لایا ہوں۔“ فرینک نے کہا اور بیئر کا ایک اور کین کھول لیا۔

”تمہارے پاس اور بھی کین ہیں؟“ دوسرے لڑکے بوبی کیسل نے پوچھا لیکن روڈ نے ناک بھوں چڑھائی اور اس سے پہلے کہ فرینک ایک اور کین کھولتا، بوبی نے اسے منع کردیا۔

جب روڈ نے بھرا ہوا سگریٹ کیرن اور بوبی کو دیا تو اس کی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ فرینک نے کین اوپر کیا اور اس سے کین کے پیندے میں کٹ لگایا۔ اس نے کبھی بھرے ہوئے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی ارادہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سراغ رساں ڈیلفی کا بیٹا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میری جوانا کا ایک ذرہ بھی اس کے

بال یا کپڑوں پر لگا رہ گیا تو اس کا باپ فوراً اس کی بو سونگھ لے گا اور وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بیئر کی حد تک ٹھیک تھا اور اگر اسے اعتدال کے ساتھ پیا جائے تو آدمی اپنے ہوش و حواس میں رہتا ہے جبکہ بھرے ہوئے سگریٹ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں چرس کے علاوہ اور کیا ملا ہوا ہے۔ وہ چیز جان لیوا بھی ہو سکتی ہے۔

فرینک نے کین سے ہوا کھینچی۔ اسے اپنے سر سے اوپر کیا اور بیئر اس کے حلق میں اتر گئی۔

''بیئر پی رہے ہو؟'' روڈ نے کہا۔ ''یہ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے۔''

''تم اپنا کام کرو اور میں اپنا کام کروں گا۔'' فرینک نے کہا۔

نہر کے آخری سرے پر اسے روشنیاں نظر آئیں۔ فرینک ان قریب آتی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا پھر اس کے کانوں میں ڈیزل انجن کی آواز آئی۔

''بہتر ہے کہ ہم نیچے لیٹ جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ پولیس کی لانچ ہے، وہ ہمیں دیکھ لیں گے۔''

''وہ ہمیں کس طرح دیکھ سکتے ہیں؟'' روڈ نے کہا۔ ''یہاں گہری تاریکی ہے۔''

''تمہارے بھرے ہوئے سگریٹ کی خوشبو سے وہ اس جانب متوجہ ہو سکتے ہیں۔''

''اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک سراغ رساں کا بیٹا بھی ہے۔'' روڈ نے کہا۔

لوری نیچے لیٹ گئی اور اس نے فرینک کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ لانچ کے اوپر ایک اسپاٹ لائٹ لگی ہوئی تھی اور اس کی روشنی ساحل کا احاطہ کر رہی تھی۔ روڈ نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور دوسرے لوگ کمبل پر چت لیٹ گئے۔ روشنی کی شعاع ان کے اوپر گھومتی رہی پھر بند ہو گئی۔

لانچ کے جانے کے بعد فرینک اور روڈ کے درمیان کھنچاؤ بھی ختم ہو گیا اور یہ گروپ کوئی حرکت کیے بغیر خود بخود دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ کیرن، روڈ اور بوبی کمبل کے ایک جانب تھے تو دوسری طرف فرینک اور لوری نے ڈیرا جما لیا۔ بوبی وہ پہلا فرد تھا جس نے روشنیاں دیکھیں۔ وہ کمر کے بل لیٹا ہوا تھا اور اس کا ایک بازو ماتھے پر تھا۔ اس نے کہا۔

''یہ کیسی روشنیاں ہیں؟''

وہ روشنیاں آسمان پر ستاروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ مختلف شکلیں اختیار کر کے آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔ روڈ نے کہا کہ اس نے بھی وہ روشنیاں دیکھی ہیں۔ کیرن نے اس کی تائید کی۔

دراصل یہ چرس کا نشہ تھا جس کی وجہ سے انہیں آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے حرکت کرتی ہوئی روشنیوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔

''میں نے کچھ نہیں دیکھا۔'' لوری نے فرینک کے کان میں کہا۔

''میں نے بھی کچھ نہیں دیکھا۔'' فرینک بولا۔

تھوڑی دیر بعد کیرن، بوبی اور روڈ وہاں سے چل دیے۔ فرینک نے لوری کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''ابھی نہیں۔'' لوری نے کہا۔

''وہ جا چکے ہیں۔''

''جانتی ہوں لیکن میں کمفرٹیبل نہیں ہوں۔''

''میرے ساتھ؟''

''نہیں بے وقوف۔ ان کی وجہ سے۔'' وہ بولی۔ ''اس کے بعد بھی کئی راتیں آئیں گی۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور نہر کی طرف دیکھنے لگے۔ مدھم چاندنی میں صاف پانی شیشے کے تختے کے مانند لگ رہا تھا۔

''تمہارا روڈ سے کیا جھگڑا ہے؟'' فرینک نے پوچھا۔

''اس کی وجہ ہمارے گھرانوں کا باہمی اختلاط ہے۔'' لوری نے کہا۔ ''وہی پرانی کہانی۔ میں روڈ کے والدین کے بارے میں نہیں جانتی لیکن اس کی وجہ سے میرے والدین میں طلاق ہو جائے گی۔ میں نے ان دونوں کو بعض اوقات رات گئے بحث کرتے ہوئے سنا ہے۔ میرے والد ابھی طلاق دینا نہیں چاہتے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس وقت تک انتظار کریں گے جب تک میری بہن ہائی اسکول پاس نہ کر لے۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری ماں کو آدھے اثاثے نہیں دینا چاہتے۔''

''کیا کبھی روڈ اور تم نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے بارے میں سوچا؟''

''میں اور روڈ؟'' لوری نے قہقہہ لگایا۔ ''میں واضح کر دوں کہ مجھے روڈ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ میں دلچسپی نہیں لیتا۔''

وہ برابر برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک ہی کین سے باری باری بیئر کے گھونٹ لیے۔ پولیس لانچ ایک بار پھر واپس آئی لیکن انہوں نے چھپنے کی کوشش نہیں کی اور لانچ کی سرچ لائٹ بھی بند تھی۔ فرینک نے سوچا کہ روڈ اسٹون کی بے جا مداخلت ان کے حق میں بہتر رہی کیونکہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اور لوری کتنے قریب آ چکے ہیں۔

لوری نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے بعد بھی کئی راتیں آئیں گی۔ فرینک جان گیا تھا کہ وہ کسی ڈھلوان چٹان پر کارٹون کیریکٹرز کی طرح نہیں دوڑ رہے تھے بلکہ ان کے قدم زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

''اوک آئی لینڈ۔'' اس نے کہا۔

''اکتوبر۔'' لوری نے جواب دیا۔

اچانک ہی روڈ ان کے سامنے دھڑام سے آن گرا۔

''ہیلو۔'' وہ باری باری ان کے سامنے جھکا۔ اس کی قمیص آدھی پتلون سے باہر نکلی ہوئی تھی۔

''کیرن تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' اس نے فرینک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کیوں؟ کیا وہ بوبی کے ساتھ نہیں ہے؟''

''وہ چلا گیا۔''

''کیرن ٹھیک تو ہے؟'' لوری نے کہا۔

''ہاں، وہ ٹھیک ہے۔'' روڈ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔''

فرینک کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ لوری کو روڈ کے ساتھ چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ اس نے لوری کو اپنے قریب کرلیا اور روڈ کو گھورنے لگا۔

''پریشان مت ہو۔'' لوری نے سرگوشی کی۔ ''ممکن ہے کہ اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا ہو۔ تم تو جانتے ہی ہو۔''

فرینک کو اس کی ماں کے افیئر کا خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ روڈ کی ماں طلاق کی درخواست دے رہی ہے۔ اس کا باپ اسے تھپڑ مار رہا ہے، پھر اچانک ہی لوری کا باپ گھر سے باہر آجاتا ہے۔

''میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔'' فرینک نے لوری کی ران پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تاکہ روڈ کو معلوم ہوجائے کہ وہ اس کے ساتھ ہے پھر وہ مٹی کی چٹان پر چڑھا اور سرکنڈے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گالف کورس تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فرینک نے سڑک پار کی اور میدان کے پشتے پر چڑھ گیا۔ بوبی جھنڈے کے پول کے ساتھ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ فرینک اس کی جانب جھکا تو بوبی چونک گیا۔

''وہ آرہے ہیں۔''

''کون؟'' فرینک نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اجنبی۔'' وہ بڑبڑایا پھر اس کا جسم اکڑ گیا۔

فرینک نے اسے ہلایا لیکن بوبی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اسے چھوڑ کر میدان کے آخری کنارے کی طرف چل دیا۔ کیرن نیچے کھڑی اسے اشارہ کررہی تھی۔ وہ نیچے اترا۔ اس کے پاؤں ریت میں دھنس گئے۔ اس نے محسوس کیا کہ گھر جانے سے پہلے اسے اپنے پیروں سے ریت ہٹانی ہوگی۔

''مجھے گرمی لگ رہی تھی۔'' کیرن نے کہا۔ اس کا جسم کپڑوں کی قید سے آزاد تھا۔ اس نے فرینک کی کلائیاں پکڑیں اور اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔

فرینک اس کے بے حجابانہ انداز پر حیران رہ گیا۔ اسے کیرن سے اس بے باکی کی توقع نہ تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''کیرن......''

''میں آج کی رات جونی کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔'' کیرن نے کہا۔ ''لیکن وہ نہیں آیا۔ تم اس کے بہترین دوست ہو۔ کیا تم اس کی کمی پوری نہیں کرسکتے؟''

وہ میکانکی انداز میں بول رہی تھی اور اس کی آواز پہلے کے مقابلے میں قدرے بلند تھی۔ اس پر ہیجان طاری تھا اور فرینک کی کلائیوں پر اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔

''بہترین دوست ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس کی امانت میں خیانت کروں۔ اگر وہ کسی وجہ سے نہیں آسکا تو کیا ہوا۔ ایسے مواقع بعد میں بھی آئیں گے تب تم اپنی تسکین کا سامان کرسکتی ہو۔''

اس نے ریت پر سے اس کی بکنی کا زیریں حصہ اٹھایا اور اسے پکڑا دیا۔

''تم انتہائی نامعقول اور ناپسندیدہ شخص ہو۔'' وہ بولی۔ ''سارا موڈ خراب کردیا۔''

اس نے ٹانگ اٹھا کر اپنا پاؤں زیریں جامے میں ڈالنا چاہا لیکن اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ دونوں ریت پر گر پڑے۔

فرینک نے اپنے آپ کو اس سے الگ کیا اور ٹیلے پر چڑھ گیا۔ بوبی ابھی تک وہیں لیٹا ہوا ان اجنبیوں کا انتظار کررہا تھا جنہیں کبھی نہیں آنا تھا۔ کیرن اور بوبی دونوں ہی اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھے۔ منشیات کا نشہ ان کے دماغ پر چڑھ گیا تھا۔ فرینک کے باپ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بعض اوقات نشے میں انسان کے حواس مختل ہوجاتے ہیں۔

فرینک نے سوچا کہ روڈ اور لوری کو باتیں کرتے ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے اس لیے اب اسے لوری کے پاس جانا چاہیے۔ وہ پشتے سے اترا اور ساحل کی طرف چل

دیا۔ تبھی اس نے دیکھا کہ روڈ سرکنڈوں کے جھنڈ سے لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس طرح جھول رہا تھا جیسے ٹوٹ گیا ہو، پھر وہ دہرا ہوا اور اس نے قے کر دی۔

''کتیا۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے میرے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ میں اس کا بوسہ لینے آگے بڑھا تو اس نے میرے منہ میں الٹی کر دی۔''

فرینک نے اسے وہیں چھوڑا اور سرکنڈوں میں گھس گیا۔ لوری کمبل پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک گھٹنا اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں بازو سر پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی ناک مڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور ہونٹ کے اوپر خون جما ہوا تھا۔ فرینک اس پر جھک گیا۔ سڑے ہوئے دودھ کی بو اتنی تیز تھی کہ اس کا منہ بن گیا۔ فرینک نے اسے آواز دی لیکن لوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اوہ میرے خدا!'' فرینک پریشان ہو گیا۔ اس نے لوری کو کروٹ کے بل لٹایا۔ لوری کے منہ سے سبزی مائل بلغم نکلنے لگا۔ فرینک نے اس کی گردن کو ایک طرف سے دبایا جیسے ٹی وی پر ڈاکٹر اور پولیس والے کرتے ہیں لیکن اسے کچھ محسوس نہیں ہوا۔

اس نے پریشانی کے عالم میں چاروں طرف دیکھا۔ پولیس لانچ بہت پہلے وہاں سے جا چکی تھی اور نہر خالی پڑی تھی۔ نہر کے پار مکانات تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وہ دوڑتا ہوا سرکنڈوں سے باہر آیا۔ روڈ رینگتا ہوا کچے راستے پر آ گیا تھا اور پشتے پر منہ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ بوبی ابھی تک اسی جگہ پر تھا اور کیرن ریت پر کھڑی اپنی دوسری ٹانگ بکنی میں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

انتہائی پریشانی کے عالم میں اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ دوڑتا ہوا ساؤنڈ ویو کے آخری سرے تک گیا جہاں ٹیلی فون کا آخری کھمبا لگا ہوا تھا۔ اس نے روڈ کی اورنج کنورٹیبل پر توجہ نہیں دی جو اس کی اپنی کار کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی اور ایک جھٹکے سے کال بکس کا ریسیور کھینچ لیا۔

''ملٹن پولیس۔'' کسی نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

فرینک نے اپنا نام، جائے وقوع اور کچھ تفصیلات بتائیں پھر اس نے ریسیور رکھا اور واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔ وہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ پہلی پولیس کار اس کے پاس سے گزری۔ بقیہ گاڑیاں اس کے پیچھے تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں گالف کورس کو جانے والا راستہ پولیس کاروں سے بھر گیا۔

فرینک ایک ایک پولیس والے کو بتا رہا تھا کہ اس نے کیا دیکھا اور اس کے خیال میں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا جب وہ چند منٹوں کے لیے لوری کو روڈ کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔

پولیس والے کیرن، بوبی اور روڈ کو پکڑ کر لے آئے تھے اور انہیں ایک ساتھ بٹھا دیا تھا جبکہ طبی عملہ لوری کو دیکھنے کے لیے سرکنڈوں کے پیچھے چلا گیا۔

فرینک گالف کے میدان کے کنارے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ یہ واقعہ کیسے پیش آ سکتا ہے؟

''سراغ رساں آ رہا ہے۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

کچھ فاصلے پر ایک گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں جو آہستہ آہستہ اسی طرف آ رہی تھیں۔ اس گاڑی کی روشنیاں پولیس کار یا ایمبولینس کی طرح چھت پر نہیں لگی ہوئی تھیں اور اپنی جگہ فکس تھیں۔ بالآخر کار وہاں آ کر رکی اور اس کا دروازہ کھل گیا۔

سراغ رساں نے اپنی سیٹ بیلٹ کھولی۔ برساتی کا گریبان بند کیا اور اپنے ہیٹ کو سر پر جماتے ہوئے آگے بڑھا۔ فرینک نے دیکھا کہ تمام پولیس والوں کی توجہ سراغ رساں پر ہے۔ اب انہیں طریقہ کار پر عمل کرنا تھا اور اسی طرح معاملات سیدھے ہو سکتے تھے ورنہ طریقہ کار پر عمل نہ کرنے کی صورت میں افراتفری پھیل سکتی تھی۔

فرینک پشتے سے نیچے اترا اور سراغ رساں سے ملنے چل دیا۔ وہ اسے سب کچھ بتانا چاہ رہا تھا...... وہ بھی جسے دوسرے پولیس والوں نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔ جونی نے کیا پروگرام بنایا تھا اور یہ کہ اب اس پر کبھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ ایک بڑی عمر کی عورت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ جونی نے ہی روڈ کو آج کی پارٹی کے بارے میں بتایا تھا۔ روڈ اور لوری کے خاندانوں کے درمیان کیا کشمکش چل رہی ہے اور ان سب باتوں کی وجہ سے لوری کی موت واقع ہوئی۔

لیکن جیسے ہی سراغ رساں گھوم کر اس کے سامنے آیا، فرینک کے اندر ...... جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ وہ سراغ رساں کی طرف لپکا اور اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے۔

''ڈیڈی!'' اس سے آگے کچھ کہنے کی اس میں طاقت نہ تھی جیسے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی ہو۔ وہ باپ کے سینے سے لگ کر رونے لگا تھا۔ کاش اس نے باپ سے جھوٹ نہ بولا ہوتا۔

⌘⌘⌘

نواں حصہ

عمر عبداللہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر
عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا
بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی
تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا
سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے
اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب
دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے
خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت
کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ
چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں
زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی
رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل
نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور
آنکھوں میں سنہرے خواب تھے جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل
مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

ریاست کے حسد اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

ساشا کا تعلق ڈاکوؤں کے ایک ایسے گروہ سے ہے جس کا سردار اس کا اپنا باپ تھا۔ ساشا کا باپ ڈاکو بننے سے قبل ایک عرب امیر کے دربار سے وابستہ تھا اور امیر کے بیٹے کے اتالیق کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران ہی اسے کچھ ایسے بدترین حالات سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ عزت دار زندگی چھوڑ کر ڈاکو بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ مختلف قومیتوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد پر مشتمل ایسا گروہ ترتیب دیتا ہے جو طویل عرصے کے لیے کسی ایک جگہ سکونت اختیار نہیں کرتا۔ ایسے گروہ کے درمیان رہ کر جنگلوں اور بیابانوں میں پرورش پانے والا ساشا ایک ایسے نوجوان کے طور پر سامنے آتا ہے جسے فنونِ حرب اور سخت جانی میں کمال حاصل ہے اور جو طرح طرح کی زبانیں بولنے اور سمجھنے میں مہارت رکھتا ہے۔ گروہ کے بیشتر افراد کی رائے کے مطابق وہ اپنے باپ کا بہترین جانشین ہے لیکن اس منظم گروہ میں ایک ایسا سازشی ٹولا بھی موجود ہے جو ساشا کی جگہ اپنے آدمی کو سردار دیکھنا چاہتا ہے۔ ساشا کے باپ کی موت پر اس ٹولے کو سر اٹھانے کا موقع [illegible] زور لگایا جاتا ہے۔ ان نامساعد حالات میں ساشا کو اپنی زندگی بچانے کے لیے فرار کی [illegible] بھاگتا ہوا وہ ایک بااثر امیر کے آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اسے مشکوک [illegible] زبان دانی کی صلاحیت کی بنیاد [illegible] وہ ایک اتفاق کا فائدہ اٹھا کر امیر [illegible] سرخرو ہو [illegible] قرب حاصل کرنے کے بعد جہاں وہ [illegible] خزانے کی تلاش میں پیش [illegible] رہتا ہے۔ ادھر کفار [illegible] برسرِ پیکار مسلمانوں کا ایک قافلہ بہادر داؤد کی [illegible] جاری رکھے ہوئے ہے [illegible] سمیت ایک بستی میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے تاہم پناہ گزینوں میں [illegible] سارہ نامی [illegible] کے پیچھے کچھ لوگ انہیں [illegible] کی کوشش میں ہیں۔ بستی میں قیام کے دوران بھی انہیں کافی نقصان [illegible] سردار پر شک کرتے [illegible] پڑاؤ کے دوران انسانی آنکھ سے مشابہ ایک غار کی طرف بڑھتا ہے مگر وہاں [illegible] بند کر دیتا ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اسے ہوش آتا ہے تو اسے تلاوتِ قرآن سنائی دیتی ہے [illegible] کر رہے ہوتے ہیں۔ ادھر داؤد قافلے سمیت بستی میں پھنس جاتا ہے۔ سردار کو قتل کر دیا جاتا ہے اور سردار زادی اسے مخالف لوگوں کی سرکوبی کے لیے اسے اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ داؤد مخالف گروہ کے پاس ان کا ہمدرد بن کر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات ایک شخص سے ہوتی ہے جو اسے اس کے ساتھی سے متعلق بری خبر سناتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"کیا واقعی آقا......؟" فیرس کے لکڑیاں چیرتے ہاتھ ساکت ہوئے اور وہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

"کیا اتنے دنوں کے ساتھ میں تم نے کبھی مجھے جھوٹ بولتا ہوا پایا؟" اس نے فیرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے سوال کیا تو وہ گڑبڑا گیا۔

"نہ......نہیں آقا......میں تو بس۔"

"تو کیا تم مجھے اس لائق نہیں سمجھتے کہ میں......؟" اس کے ادھورے سوال میں گہری اداسی تھی۔ فیرس تڑپ گیا۔

"ہرگز نہیں۔ میری کیا مجال کہ میں اس انداز میں سوچوں۔ میرے آقا کے دوجہاں کا لایا ہوا دین تو دنیا کے ہر اس انسان کے لیے بانہیں کھولے کھڑا ہے جسے رب کائنات کی طرف سے ہدایت مل جائے۔" وہ خوشی اور عاجزی کی ملی جلی کیفیت میں گھرا کھڑا بہت محبت سے ساشا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہدایت تو مجھے اسی روز مل گئی تھی جب میں اس تاریک غار کی قید میں ایک موذی سانپ کے زہر کے اثر سے قریب المرگ ہو چلا تھا۔ اس روز میرے رب نے مجھے اپنا ہونا باور کروایا تھا۔ یہ تھوڑا سا وقت تو بس کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے میں لگا مجھے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں تم نے انجانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ میں تمہاری زبانی

اس رب کا کلام سنتا رہا اور سن کر حیران ہوتا رہا کہ یہ سب پہلے مجھ تک کیوں نہ پہنچا۔'' وہ بہت سادگی سے اپنے غلام کو سب بتاتے ہوئے کہیں سے بھی وہ مغرور اور خود پر ناز اں ساشا نہیں دکھائی دیتا تھا۔

''آپ کی خوش نصیبی نے آپ کو ڈھونڈ نکالا ہے میرے آقا۔'' فیرس کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگی تھیں۔

''میں ابھی جناب سلیمان صاحب کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ آپ کا ارادہ جان کر بہت خوش ہوں گے۔'' وہ ہاتھ میں موجود کلہاڑی ایک طرف رکھ کر جانے لگا۔ ساشا کے ہوش میں آنے کے بعد ان کا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا اور وہ اس سنگلاخ پہاڑی سلسلے سے آگے سفر کر رہے تھے۔ سفر کا یہ مرحلہ نسبتاً آسان تھا اور وہ اس لائق ہو چکے تھے کہ راستے میں پڑنے والی بستیوں سے تازہ گوشت اور سبزیاں حاصل کر کے اپنے لیے من پسند کھانا تیار کر سکیں۔ اس وقت فیرس کھانا پکانے کے لیے ہی لکڑیاں چیرنے کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

''رک جاؤ فیرس۔'' ساشا کی آواز نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کو روک لیا اور مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میری خواہش ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کروں۔''

''میں...... میں آقا......'' اس کی خواہش جان کر فیرس کانپ سا گیا۔

''ہاں تم...... کیونکہ یہ تم ہی ہو جس نے مجھے راہ کا تعین کرنے میں مدد دی۔'' وہ فیرس کی کیفیت دیکھ کر حوصلہ دینے والے انداز میں مسکرایا۔ فیرس نے زبان سے بنا کوئی ایک لفظ ادا کیے آسمان کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

ذرا دیر میں ساشا کے قبولِ اسلام کی خبر پورے قافلے میں پھیل چکی تھی۔ اکثریت نے اس خبر کو خوشی سے سنا اور مبارک باد دینے کے لیے اُمڈ آئے۔

''آپ ایک بہادر ہیں۔ بہادر آدمی اپنی تلوار صرف حق کی خاطر اٹھاتا ہے۔ دینِ حق میں داخل ہونے کے بعد آپ کی ذمے داری بڑھ گئی ہے۔ اللہ آپ کو حق پر استقامت عطا فرمائے۔ میں آپ کے لیے اسلامی نام سیف اللہ تجویز کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ کی یہ تلوار حق باطل کے معرکوں میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔'' اسے کلمہ پڑھا چکنے کے بعد فیرس نے پہلے رقت آمیز لہجے میں دعا کی پھر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اللہ تمہارے ہر یقین کو سلامت رکھے محمد صالح میرے بھائی......!'' ساشا کا اپنا لہجہ جذباتی ہو گیا البتہ فیرس اس کے طرزِ تخاطب پر حیران تھا۔

''اب میں تمہیں محمد صالح ہی کہہ کر پکاروں گا کیونکہ آج سے تم میرے غلام نہیں بلکہ مسلمان بھائی ہو۔'' ساشا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اب آنسو صرف ان دونوں کی آنکھوں میں نہیں تھے۔ وہاں موجود ہر آنکھ بھیگ گئی تھی جبکہ محمد صالح کی قوم کے وہ لوگ جو محض جان بچانے کے لیے امیر ارغل کی ذلت آمیز شرط قبول کر چکے تھے، آج تسلیم کرنے پر مجبور تھے کہ حق پر قائم رہنے والوں کے لیے ہی عزت و سلامتی ہے۔ زندہ آج وہ بھی تھے اور محمد صالح بھی لیکن فرق واضح تھا۔ وہ امیر ارغل کے احکامات کے پابند حقیر غلاموں کی سی زندگی جی رہے تھے جبکہ محمد صالح ایک آزاد اور باعزت آدمی تھا۔

☆☆☆

''تمہارے ساتھی لطیف کو کچھ دن قبل گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ اس نے اپنی گرفتاری کے سلسلے میں مجھے جو کچھ بتایا اس کے مطابق جس روز سردار مراد کے مکان میں ہنگامہ ہوا اور بھگدڑ میں سب اپنی اپنی جان بچانے کو بھاگے، وہ بھی بھاگ کر مکان کے ایک کمرے میں چھپ گیا۔ اسے وہاں چھپے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ کبیر دو تین آدمیوں کے ساتھ وہاں چلا آیا اور ان آدمیوں کو ہدایت دیتے ہوئے بولا کہ اس ہنگامے کو جلدی ختم نہیں ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرو تاکہ لوگوں کے غم و غصے میں اضافہ ہو اور وہ سردار مراد سے مزید نفرت کرنے لگیں۔ کبیر کی زبان سے ایسے الفاظ سننا لطیف کے لیے حیرت انگیز تھا۔ اس سے قبل کہ وہ کبیر کے اس کردار سے کسی کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کرتا، ایک اتفاق نے اس کی وہاں موجودگی کا راز فاش کر دیا۔ وہ بے چارہ بالکل اچانک آ جانے والی چھینک کو نہ روک سکا اور پکڑا گیا۔'' نور الدین، داؤد کو لطیف کی گرفتاری سے متعلق تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

''وقتی طور پر انہوں نے لطیف کو باندھ کر اسی کمرے میں بند کر دیا پھر بعد میں خفیہ طور پر یہاں لے آئے۔ یہاں اس بے چارے پر بہت تشدد کیا گیا۔ وہ اس سے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کیا وہ سردار مراد کی خاطر جاسوسی کر رہا تھا۔ لطیف نے اس الزام سے انکار کیا اور اپنی اس کمرے میں

موجودگی کو صرف اتفاق قرار دیا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اس کے اس بیان کو سچ تسلیم کیا لیکن اس بے چارے پر سے سختی ختم نہیں ہوئی۔ وہ اس پر تشدد کر کے قافلے کے متعلق تفصیلات جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کا زیادہ زور یہ جاننے پر تھا کہ قافلے میں شامل کن افراد کے پاس قیمتی اشیاء موجود ہونے کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ وہ قافلے میں موجود ان افراد کی تفصیلات بھی جاننا چاہتے تھے جو لڑنے بھڑنے میں مہارت رکھتے ہیں۔''

بوڑھا نور الدین ذرا دیر کے لیے سانس لینے کو رکا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں اس نوجوان پر ہونے والے انسانیت سوز تشدد اور اس کی استقامت کا چشم دید گواہ ہوں۔ اس نے خود پر بے پناہ ظلم سہہ کر بھی ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ تھک کر وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے گئے اور مجھے اس کی دلجوئی کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ باتیں بتائیں۔ وہ آپ سے خصوصی عقیدت رکھتا تھا اور بار بار اس خواہش کا اظہار کرتا تھا کہ کاش میں اخی کو کبیر کے کردار سے آگاہ کر پاتا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا کیونکہ ثوبان نے اندر خدمت انجام دینے والے تمام افراد کے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ تہ خانے تک رسائی رکھنے والا میرا ہمدرد عبیداللہ، جس کے ساتھ آپ یہاں آئے ہیں، بھی اس پابندی کی زد میں تھا چنانچہ لطیف دنیا سے جاتے جاتے آپ تک رسائی کی حسرت دل میں ہی لے گیا۔''

''لطیف کب اور کیسے......؟'' داؤد کا گلا رندھ گیا اور وہ اپنا سوال مکمل ادا نہ کر سکا۔

''اگلے ہی روز اس کی مشکل آسان ہو گئی تھی اور وہ سر پر لگائی جانے والی ایک شدید ضرب کے نتیجے میں شہید ہو گیا تھا۔'' نور الدین نے اس کا سوال سمجھتے ہوئے اداس لہجے میں اسے لطیف کی موت سے آگاہ کیا۔

''کاش مجھے لطیف کے لیے کچھ کرنے کا موقع مل پاتا۔'' وہ شدید دکھ کی زد میں تھا۔

''بے شک آپ لطیف کے لیے کچھ نہیں کر سکے لیکن لطیف جیسے کئی دوسرے مسلمان نوجوانوں کو بچانے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ میرے اور عبیداللہ کی طرح مجبور نہیں ہیں۔ آپ کوئی ایسی تدبیر لڑا سکتے ہیں جو ہماری قوم کو تباہی سے بچا سکے۔ اسے محض علاقائی لڑائی سمجھنے کی غلطی مت کیجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان سازشیوں کو اس جگہ کامیابی حاصل ہو گئی تو ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے اور پھر جہاں جہاں انہیں موقع ملا یہ مسلمانوں کی بربادی کا سامان کرتے چلے جائیں گے۔'' نور الدین کے لہجے میں دکھ اور اضطراب دونوں تھے۔

''اطمینان رکھیے۔ میں اس فتنے کو کچلنے کے لیے اپنی بساط سے بڑھ کر کوشش کروں گا۔'' اس نے خود کو لطیف کی موت کے جھٹکے سے سنبھال لیا تھا اور اب ایک بار پھر سچے اور جانباز سپاہی کی طرح میدانِ جنگ میں اترنے کے لیے تیار تھا۔

''اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ معلوم نہیں ہماری دوبارہ ایک دوسرے سے ملاقات ہو یا نہیں لیکن میں آپ کی کامیابی کے لیے آخری سانس تک دعا کرتا رہوں گا۔ سردار مراد کی بہادر بیٹی کی مدد ضرور کیجیے گا۔'' اسے یہاں لانے والا عبیداللہ سلاخوں کے پار آ کھڑا ہوا تھا اس لیے نور الدین جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔ اس نے نور الدین کو تسلی دینے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر دبا ڈالا۔

''مزید یہاں رکنا مناسب نہیں ہوگا۔ کچھ دیر میں نگراں مکان کے گشت پر نکل کھڑا ہوگا، اس سے پہلے آپ کا اپنے کمرے میں موجود ہونا ضروری ہے۔'' عبیداللہ نے اضطرابی لہجے میں مداخلت کر کے اسے متوجہ کیا تو وہ از خود باہر نکل گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس مکان میں رہ کر اس قسم کی سرگرمیاں انجام دینے والے نے حقیقتاً اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔

وہ دونوں پہلے والے راستوں سے گزرتے ہوئے واپس اس کے لیے مخصوص کمرے تک پہنچ گئے۔ پہرے دار .... ابھی تک دیوار سے پشت لگائے سو رہا تھا اور اس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

''اس کو کسی نے اس طرح سوئے ہوئے دیکھ لیا تو گڑبڑ نہیں ہو جائے گی؟'' اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

''بس میں اسے جگانے لگا ہوں۔ میرا احسان مند ہو جائے گا کہ میں نے اسے پھنسنے سے بچا لیا۔'' اسے کمرے کے اندر جانے کا اشارہ کر کے وہ پہرے دار پر جھک گیا۔ داؤد اندر جا کر بستر پر بیٹھا تو یوں لگا کہ وجود میں برسوں کی تھکن اتر آئی ہو۔ لطیف کی موت کا ابھی تک دل کو یقین نہیں آتا تھا حالانکہ موت اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ میدانِ جنگ میں اس نے اپنے کتنے ہی پیارے ساتھیوں کو کٹ کر گرتے دیکھا تھا۔ ثریا کے سوا اس کے خاندان کا ہر فرد تاتاریوں کی بربریت کا نشانہ بن کر ملکِ عدم سدھار چکا تھا لیکن اب...... اب جبکہ وہ جنگ و جدل

سے دور اپنی زمین، اپنا وطن چھوڑ کر امن کی چاہ میں ایک دوسرے خطۂ زمین پر قدم رکھ چکے تھے، یوں اپنے ایک پیارے ساتھی کے بچھڑ جانے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ نامعلوم وقت تک بستر پر یونہی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ صبح کے معمولات شروع ہوئے تو انہیں بھی ایک کاٹھ کے پتلے کی طرح انجام دے ڈالا۔ ناشتے کے فوراً بعد اسے ثوبان کی طرف سے ملاقات کا پیغام مل گیا۔ وہ ملاقات کے لیے پہنچا تو ثوبان چہرے پر گہری سنجیدگی لیے اس کا منتظر تھا۔

''آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ثوبان سے پوچھا۔

''میں جس صورتِ حال سے بچنا چاہتا تھا، وہ پیش آ چکی ہے اور میرے پاس اب پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔'' ثوبان نے اداس سے لہجے میں جواب دیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' اس نے ثوبان کے چہرے کو ٹٹولا۔ اس چہرے کی خوبصورتی میں کلام نہیں تھا اور یہ خوبصورتی دل کو اس کی طرف کشش کرتی تھی لیکن اس کے سامنے اس خوبصورت چہرے کے پیچھے چھپی بدصورتی آ چکی تھی اور وہ حیران تھا کہ چہرے ایسے بھی دھوکا دیتے ہیں۔

''اطلاع ملی ہے کہ سردار زادی لیلیٰ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہم پر حملے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے اور وہ کسی بھی وقت اچانک یہاں حملہ کر سکتی ہے۔ ان حالات میں میرے لیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ صرف میری نہیں، ان سارے لوگوں کی زندگی کا بھی معاملہ ہے جو مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سردار مراد کے بعد اس کی بیٹی کو بھی منطقی انجام تک پہنچا دیا جائے تاکہ اہلِ علاقہ کھل کر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق زندگیاں بسر کر سکیں۔''

''کیا آپ کے لوگ حملہ آوروں کے مقابلے کے لیے تیار ہیں؟'' اس نے اطلاع سن کر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''ہم ان کے حملے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھیں گے۔ اس وقت جارحیت سب سے بہترین دفاع ثابت ہو سکتی ہے اس لیے میں نے اور میرے مشیروں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج رات ہم خود سردار مراد کے مکان پر حملہ کر دیں گے۔'' ثوبان نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''اس صورت میں خاصی خون ریزی کا امکان ہے۔ حالات سے ثابت ہو چکا ہے کہ صرف مکان کی حفاظت پر مامور افراد ہی سردار کے وفادار نہیں ہیں بلکہ باہر بھی ان کے ساتھی موجود ہیں۔'' وہ ان کی پوری منصوبہ بندی سے آگاہی چاہتا تھا۔

''ان افراد سے نمٹنے کے لیے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔ آپ کے ساتھیوں کی مدد سے ہم بخوبی ان افراد سے نمٹ سکتے ہیں۔ حملے کے وقت انہیں ہماری پشت پر رہ کر سردار زادی کے ان وفادار جتھوں کو روکنا ہوگا۔''

''اس مقصد کے لیے تو مجھے پہلے سے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے انہیں سب کچھ سمجھانا ہوگا۔'' اسے یہاں سے باہر نکلنے کی ایک راہ دکھائی دی۔ باہر نکل کر وہ نہ صرف اپنے ساتھیوں کو حالات سے آگاہ کر سکتا تھا بلکہ سردار زادی لیلیٰ کو بھی حملے کی اطلاع پہنچا سکتا تھا لیکن ثوبان کے جواب نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

''باہر نکلنے میں خطرہ ہے۔ سردار زادی کے جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے ساتھیوں سے ملاقات کے لیے باہر نکلے تو ان کی نظر میں آ سکتے ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ آپ ان کے نام خط تحریر کر کے ہم سے تعاون کا حکم دے دیں۔ آپ کے قریبی ساتھی آپ کی تحریر تو پہچانتے ہوں گے۔'' ثوبان اس سے نہایت دوستانہ اور نرم لہجے میں مخاطب تھا لیکن اس کا اس حد تک محتاط ہونا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس پر سو فیصد اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس نے کوئی بحث نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور عاجزی سے بولا۔

''یہاں کے حالات سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں اس لیے میں آپ کی رائے کو مقدم رکھنا واجب سمجھتا ہوں۔ میرے ساتھیوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ میری تحریر پڑھ کر بھی پورا پورا تعاون کریں گے البتہ مجھے سردار مراد کے مکان میں موجود اپنے قافلے کی خواتین کی طرف سے فکر ہے۔ وہ وہاں مقید ہیں اور حملے کی صورت میں انہیں بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔'' اپنے تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے اس نے اس نکتے کو چھیڑنا ضروری سمجھا تاکہ ثوبان کو باور کروا سکے کہ اسے بھی لیلیٰ کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق ہے۔

''میں ان خواتین کی طرف سے بے فکر نہیں ہوں۔ ہماری طرف سے پوری کوشش ہوگی کہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے لیکن ہو سکتا ہے کہ لیلیٰ کوئی گھٹیا حرکت کر جائے اس لیے ذہنی طور پر ہمیں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔'' وہ پوری ہوشیاری سے اس کا ذہن بنا رہا تھا کہ کوئی نقصان ہو جائے تو اسے لیلیٰ کے کھاتے میں ڈال کر اپنا دامن بچا لے۔

”اس بات کو میں بھی سمجھتا ہوں اور اللہ سے یہی امید کر سکتا ہوں کہ ان مظلوم خواتین کے لیے کوئی بہتر راہ نکل آئے۔“ اس نے ایک بار پھر ثوبان سے اتفاق کیا۔

”بس! تو اب خط لکھ دیجیے۔ وقت کم ہے۔ آج کے دن ہمیں بہت سے معاملات انجام دینے ہوں گے۔“

”میں تیار ہوں۔ آپ کاغذ قلم منگوا دیں۔“ اس نے کہا تو فوراً ہی اسے مطلوبہ اشیاء فراہم کر دی گئیں۔ اس نے عبدالمالک کے نام خط لکھنا شروع کیا اور ابتدائی رسمی کلمات کے بعد لکھا۔

”میرے دوست! تم جانتے ہو کہ... امتِ مسلمہ کی سربلندی اور حق کا ساتھ دینے کے معاملے میں، میں کتنا حریص ہوں۔ ہماری زندگیوں میں ایک بار پھر وہ وقت آچکا ہے جب ہمیں اپنی جانوں کے مقابلے میں حق کو چننا ہوگا۔ میرا خط لے کر آنے والوں کی بات کو توجہ سے سنو اور میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری تلواریں شجاعت کے کارنامے رقم کرنے کے اس موقع کو ضائع نہیں ہونے دیں گی۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

تمہاری بھلائی و کامیابی کا متمنی

تمہارا اخی“

تحریر کے نیچے اس نے اپنے دستخط بھی ثبت کر دیے اور کاغذ ثوبان کو تھما دیا۔ اس علاقے میں لوگ کثرت سے عربی اور فارسی سے واقفیت رکھتے تھے اس لیے اب تک انہیں زبان کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ ثوبان نے خط لے کر اس کی تحریر پڑھنی شروع کی تو ثابت ہو گیا کہ وہ اچھی طرح عربی لکھنا اور پڑھنا جانتا ہے۔ خط پڑھ کر اس نے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر بولا۔

”اب آپ آرام کیجیے۔ حملے کے وقت سب کا تازہ دم رہنا ضروری ہے۔“ اس کے الفاظ نے داؤد کو مطمئن کر دیا کہ وہ حملہ آوروں کے ساتھ شامل ہوگا اور اسے موقع مل جائے گا کہ اس فتنے کو ختم کرنے کے لیے کوئی کردار ادا کر سکے۔ اسی اطمینان کے سہارے وہ اپنے لیے مختص کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

”قبولِ اسلام مبارک ہو محترم!“ وہ سنبل تھا جو اس کے پہلو میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس سے مخاطب تھا۔

”خیر مبارک، شکریہ۔“ اس نے مختصر جواب دیتے ہوئے سنبل کا سرسری جائزہ لیا۔ وہ خاصا کمزور اور بجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ شاید سختی کے چند دنوں نے اس کا یہ حال کر دیا تھا۔

”شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا تھا۔ آپ کی رحم دلی نے مجھے امیر کے عتاب سے بچا لیا۔ میرا جرم اس لائق تو نہیں کہ آپ اسے فراموش کر سکیں لیکن پھر بھی میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔“ وہ شرمسار سا اس سے مخاطب تھا۔

”جو ہوا سو ہوا۔ میں اس بات کو بھول گیا ہوں، تم بھی بھول جاؤ۔“ اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

”یہ آپ کی مہربانی ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنے مہربان انسان کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔“ خواجہ سرا سنبل اپنی حرکت پر شرمندہ تھا۔

”میرے رب نے مجھ سے مہربانی کا معاملہ کیا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اس کی مخلوق کے ساتھ ایسا نہیں کرتا۔ قبولِ اسلام کے بعد میں ایک نیا انسان ہوں اور میرے سامنے ایک نئی زندگی ہے۔ میں نے اپنی پچھلی زندگی کی تمام تلخیوں اور دشمنیوں کو اس امید پر فراموش کر دیا ہے کہ میرا رب بھی میرے تمام سابقہ گناہوں کو معاف کر دے گا۔ تم میری طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میرے دل میں اب نہ تمہارے لیے کوئی عداوت ہے نہ تمہاری مالکن کے لیے۔“ اس نے سنبل کو تسلی دی۔

”بہت شکریہ محترم!“ سنبل کا گلا رندھ سا گیا۔ اس نے اس کے شانے پر دھیرے سے تھپکی دی اور اپنا گھوڑا آگے نکال کر لے گیا۔ اس نے سنبل سے غلط نہیں کہا تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ اپنے جذبات میں ایک انقلابی سی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ پہلے جن لوگوں کے خلاف اس کے دل میں آتشِ انتقام بھڑکتی رہتی تھی، اب ان کا خیال بھی کم کم ہی آتا تھا۔ حقیقتاً اب وہ اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں کے بجائے ان لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچتا تھا جن کے ساتھ اس سے زیادتی سرزد ہوئی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا جو حصہ ایک ڈاکو کی حیثیت سے گزارا تھا اس کے لیے خود کو کیسے معاف کر سکتا تھا۔ اپنے ذاتی عیش و عشرت کے لیے لوگوں کو ان کی عمر بھر کی کمائی یا سامانِ تجارت سے محروم کر دینا کتنا قبیح عمل تھا۔ یہ اس نے دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر ہی جانا تھا اور اس کا ضمیر ان جرائم کو یاد کر کے مسلسل اسے کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ ایسے میں وہ کسی دوسرے کا بھلا کیا احتساب کرتا۔

”بہت چالاک ہو تم۔ بڑے موقع سے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ شاید تم نے سوچا ہوگا کہ تمہارے ڈاکو ہونے کا علم ہونے پر امیر کے دل میں تمہارے لیے جو گرہ

پڑ گئی ہے، وہ تمہارے مسلمان ہونے کا سن کر کھل جائے گی۔'' صفیہ جانے کب اس کے قریب چلی آئی تھی اور زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

''میں عورت نہیں ہوں جو کسی مرد کے دل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کروں۔ میں مردوں کی اس قسم میں سے ہوں جو سمندروں کا سینہ چیر کر بھی اپنے حصے کی کامیابی حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔'' وہ واقف تھا کہ صفیہ خاتون نے امیر سالک سے نکاح کے وقت اسلام قبول کیا تھا اور یہ قبولِ اسلام بس دکھاوے ہی کا تھا اس لیے اسے دوبدو جواب دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

''بہرحال میں امیر کو باور کرواتی رہوں گی کہ ایک ڈاکو کے اپنے ساتھ ہونے کو فراموش نہ کریں بصورتِ دیگر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ امیر جس خزانے کے حصول کے لیے اتنی زحمت اٹھا رہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔'' صفیہ خاتون نے بھی بھرپور جوابی وار کیا لیکن وہ طیش میں آنے کے بجائے حظ اٹھانے والے انداز میں مسکرایا اور نہایت سکون سے بولا۔

''میں نے بھی امیرِ محترم کی اہلیہ ارسلہ خاتون کو خبردار کردیا ہے کہ اپنے شوہر کے قریب موجود اس فتنے سے ہوشیار رہیں جو رات کی تاریکی میں چپکے سے ان کے حق پر نقب لگانے پہنچ جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنی ذہانت سے جلد اس فتنے کی سرکوبی کرڈالیں گی۔''

''تم بچو گے نہیں ساشا۔ بہت جلد تمہارا بھیانک انجام تمہارے سامنے آجائے گا۔'' نفرت اور غصے سے بلبلاتے ہوئے اس نے اعلان کیا اور اس سے دور ہٹ گئی۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی اور قافلے کے دیگر افراد کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ لوگ اب سفر روک کر پڑاؤ ڈالنے کی تیاری میں نظر آرہے تھے۔ یہ پہلے ہی طے ہوا تھا کہ آج کی رات بھرپور آرام کرنے کے بعد کل وہ علی الصباح دوبارہ سفر کا آغاز کریں گے اور یہ سفر نہایت تیز رفتاری سے کیا جائے گا۔ اب وہ ایسے علاقے میں تھے جہاں سفر دشوار گزار نہیں رہا تھا اور راستے میں پڑنے والی آبادیوں کی موجودگی انہیں اطمینان دلاتی تھی کہ سامانِ زندگی کا حصول ان کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ اب بھی انہوں نے ایک آبادی کے باہر ہی اپنا پڑاؤ ڈالا تھا اور چند لوگوں کو تازہ خوراک کے حصول کے لیے آبادی کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ ان لوگوں کے واپس آنے تک خیمے نصب کیے جاچکے تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد

سب جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گئے کہ صبح سفر کے لیے تازہ دم ہوں۔ وہ بھی سونے والوں میں شامل تھا۔ سلیمان کی تجویز کردہ ادویات اور اپنی مضبوط جسمانی مدافعت کے باعث سانپ کے مہلک زہر کے اثرات تیزی سے معدوم ہونے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک کمزوری باقی تھی جس کا واحد حل یہی تھا کہ وہ اچھی خوراک کے ساتھ ساتھ بھرپور آرام کرتا رہے۔ سلیمان کی سخت ہدایت کے باعث وہ ان دونوں باتوں کا دھیان رکھ رہا تھا۔

نیند گہری تھی لیکن دماغ کو دی گئی ہدایت کے بموجب مخصوص وقت پر آنکھ کھل گئی۔ پہلے اسے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی پھر قریب سے پکار سنائی دی۔

''آقا......''

''جاگ رہا ہوں صالح! بس ذرا سا انتظار کرو۔ میں ابھی وضو کرکے آتا ہوں۔'' اس نے نیچی آواز میں پکارنے والے کو جواب دیا اور بستر چھوڑ دیا۔ محمد صالح (فیرس) خاموشی سے پلٹ گیا۔ یہ وہی تھا جس نے اسے رات کے آخری پہر اٹھ کر عبادت کرنے اور اللہ سے رجوع کرنے کی افادیت سے آگاہ کیا تھا۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد رات کے اس پُرسکون پہر میں وہ دونوں مل کر نہ صرف عبادت کرتے تھے بلکہ صالح اسے دین کے بہت سے رموز اور تعلیمات سے بھی روشناس کرواتا تھا۔ وہ جو غلام بن کر اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا، اس کے استاد کے درجے پر فائز ہوگیا تھا لیکن وہ ایسا استاد تھا جسے خود سے زیادہ اپنے شاگرد پر ناز تھا اور وہ اب بھی اس کے منع کرنے کے باوجود اسے آقا کہہ کر ہی پکارتا تھا۔

آخری پہر کی خوشگوار ہوا میں نوافل کی ادائیگی کے بعد حسبِ معمول صالح نے دینی امور سے متعلق درس کا آغاز کیا ہی تھا کہ کسی کے ہلکے سے کراہنے کے ساتھ ساتھ معمولی سی دھپ کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ اور صالح دونوں چونک گئے۔ وہ دونوں اس وقت پڑاؤ کے شمالی حصے میں تھے اور آواز قریب سے ہی آئی تھی۔ اس طرف خواتین کے خیمے بھی نصب تھے۔ دونوں کے ذہنوں میں یک وقت خطرے کا احساس جاگا اور اپنی اپنی تلواریں سنبھالتے ہوئے تیزی سے آواز کی سمت میں بڑھے۔ تیز رفتاری کے باوجود انہوں نے احتیاط کا دامن ہاتھ [illegible] نہیں چھوڑا تھا اور کوشش کررہے تھے کہ خود کو خیموں کی اوٹ میں رکھتے ہوئے آگے بڑھیں۔ ایک خیمے [illegible] پڑا انسانی جسم دیکھ کر خطرے کا احساس مزید بڑھ گیا۔ [illegible]

پر معلوم ہوا کہ بے ہوش پڑا وہ شخص پہرے داروں میں سے ایک تھا۔ اسے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔ بے ہوش پہرے دار کو دیکھ کر خطرے کا احساس دوچند ہوگیا۔ یقینی طور پر پڑاؤ میں کچھ ایسے لوگ موجود تھے جنہیں دوست نہیں کہا جاسکتا تھا۔

''تم بائیں طرف سے گھوم کر جاؤ۔ میں دائیں سے جاتا ہوں۔ ہمیں احتیاط سے کام لینا ہوگا لیکن اگر تم کوئی خطرہ محسوس کرو تو شور مچادینا۔'' اس نے سرگوشی میں فیرس کو ہدایت دی اور خود بھی حرکت میں آگیا۔ پڑاؤ میں آخری پہر کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یقینی طور پر تھکے ماندے اہلِ قافلہ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور کسی نے ان کی اس غفلت کا فائدہ اٹھا کر نقب لگادی تھی۔ پہرے پر مامور کسی فرد کا نظر نہ آنا اس بات کی نشانی تھی کہ جیسے انہیں ایک بے ہوش پہرے دار نظر آیا تھا ویسے ہی دوسرے پہرے داروں کو بھی ناکارہ بنادیا گیا تھا لیکن ابھی تک کوئی حملہ آور اس کی نظروں میں نہیں آسکا تھا۔ رینگ کر آگے بڑھتا ہوا وہ ایک خیمے کی اوٹ سے نکلا ہی تھا کہ امیر زادی حورم کے خیمے سے چپکا ہوا ایک سایہ متحرک ہوا۔ وہ چلتا ہوا خیمے کے دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ اندر سے دو مزید سائے برآمد ہوئے۔ ان میں سے آگے والے شخص نے کاندھے پر کوئی بوجھ لادر کھا تھا۔ بے حد کم روشنی اور فاصلے کے باعث اس کے لیے درست شناخت کرنا تو ممکن نہیں تھا لیکن وہ اتنا اندازہ بہرحال لگاسکتا تھا کہ اس شخص کے کندھے پر موجود وہ بوجھ دراصل ایک نسوانی وجود ہے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ اس نسوانی وجود سمیت ایک طرف چل دیے۔ یقینی طور پر ان کا رخ پڑاؤ سے باہر کی طرف تھا۔ شاید ان لوگوں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اپنی سواری کے جانور پڑاؤ سے باہر ہی چھوڑ دیے تھے اور اب چپکے سے فرار ہورہے تھے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ بوجھ اٹھانے والے کے باقی دونوں ساتھی بے حد چوکنے ہیں اور اطراف پر نظر رکھنے کی پوری پوری کوشش کررہے ہیں لیکن اب اسے اپنے دیکھ لیے جانے کے اندیشے کو پسِ پشت ڈال کر ان کی راہ روکنی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے قافلے کی کسی عورت کو اٹھا کر لے جاتے۔ وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور للکارتا ہوا ان پر جھپٹا۔ وہ تو پہلے ہی ہوشیار تھے۔ دو تلواریں سونت کر اس کے مقابل آکھڑے ہوئے جبکہ تیسرا، جس نے کاندھے پر نسوانی وجود لادا ہوا تھا، تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب خاموشی غیر ضروری تھی۔ وہ وحشیانہ چیخ مارتا ہوا اپنی راہ میں حائل ہوجانے والے ان دونوں تیغ زنوں سے نمٹنے لگا۔ اگر اسے تیغ زنی میں مہارت حاصل تھی تو اناڑی وہ دونوں بھی نہیں تھے۔ تلواروں کی جھنکار سے فضا گونج اٹھی۔ سوئے ہوئے اہلِ قافلہ بھی ہڑبڑا کر جاگ گئے۔ کون ہے؟ کیا ہوا ہے؟ کی پکاروں کے درمیان گھبرائی ہوئی نسوانی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ بجھ جانے والی مشعلوں کو روشن کیا جارہا تھا اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ اس ساری افراتفری کے درمیان اسے سب سے زیادہ اس بات کی فکر لاحق تھی کہ اس تیسرے فرد کے پیچھے جاکر اس کی راہ روک سکے۔ وہ حورم کے خیمے سے برآمد ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کے شانے پر لدی عورت حورم ہی تھی۔

اسے جتنی فکر اس تیسرے شخص کی راہ روکنے کی تھی، اتنے ہی اس کے ساتھ نبرد آزما دونوں افراد اپنے ساتھی کے فرار کو کامیاب بنانے کے خواہاں نظر آتے تھے، اس لیے پوری جانفشانی سے اس کا مقابلہ کررہے تھے۔ بڑی مشکل سے اسے ایک موقع ملا اور دونوں میں سے ایک اس کی تلوار کی زد میں آگیا۔ ایک کے گرتے ہی اس نے دوسرے کی فکر چھوڑی اور اس سمت میں بھاگا جس سمت میں ان کا تیسرا ساتھی فرار ہوگیا تھا۔ بھاگنے سے پہلے اس نے دیکھ لیا تھا کہ قافلے کے چند مرد تلواریں سونتے وہاں آپہنچے ہیں اس لیے امید تھی کہ وہ اس دوسرے تیغ زن پر قابو پالیں گے لیکن کسی بھی لڑائی میں سب کچھ آپ کے اندازوں کے مطابق ہو، ایسا کب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی بالکل غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ ابھی وہ اپنے مقابل سے چند گز ہی دور گیا تھا کہ ایک شدید تکلیف دہ احساس کے ساتھ وجود کو زوردار جھٹکا لگا۔ اسے سمجھنے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ وہ نہایت مہارت سے تاک کر پھینکا گیا خنجر تھا جو اس کے بائیں کولہے میں پیوست ہوگیا تھا۔ تکلیف سے اس کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا لیکن اس نے اپنے قدموں کو رکنے نہ دیا۔ عقب سے آنے والی آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ حملہ آور کو چھاپ لیا گیا ہے لیکن اس مفرور شخص کو روکے بغیر ہر کامیابی رائگاں تھی۔ اپنی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ دوڑتا چلا گیا۔ آخر کار وہ اسے آگے جاتا ہوا دکھائی دے گیا۔ شانے پر موجود بوجھ کی وجہ سے اس کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔

''رک جاؤ۔ تم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔'' اس کے کولہے میں پیوست ہونے والا خنجر اپنی جگہ موجود تھا لیکن اس کے حرکت میں ہونے کے باعث زخم سے خون کا بہاؤ

شروع ہوگیا تھا۔ بہنے والا خون اس کی ٹانگ پر سے پھسلتا ہوا جوتے میں جمع ہو رہا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی اور پوری قوت سے بھاگتا ہوا وہ لمحہ بہ لمحہ مفرور شخص کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس شخص نے بھی اس بات کو محسوس کرلیا کہ وہ کسی بھی لمحے اس تک پہنچ کر اس کی راہ میں حائل ہوجائے گا۔ اس نے یکدم ہی بھاگنا موقوف کردیا اور بالکل غیر متوقع طور پر پلٹ کر اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ اس کی اس حرکت سے ساشا کو لگا کہ وہ رک کر اس سے مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن اگلا ہی پل اسے ششدر کردینے والا تھا۔

''ایک قدم آگے نہ بڑھنا۔ اگر تم آگے آئے تو میں اس عورت کو قتل کردوں گا۔'' حلق کے بل دہاڑ کر اسے یہ دھمکی دیتے ہوئے اس شخص کے لہجے میں اتنی وحشت تھی کہ اسے ایک فیصد بھی اس بات کا شک نہ ہوا کہ وہ جو کہہ رہا ہے اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی ہچکچائے گا۔ ایک ہاتھ سے شانے پر لدی عورت کو سنبھالے وہ دوسرے ہاتھ میں موجود خنجر اس کی پشت پر رکھے ہوئے تھا۔

''کون ہو تم اور اس حرکت سے تمہارا کیا مقصد ہے؟ آخر تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو کہ تم ہماری عزت پر ہاتھ ڈالو گے اور ہم تمہیں جانے دیں گے۔''

وہ عورت (جو کہ متوقع طور پر حورم تھی) کی جان خطرے میں دیکھ کر اپنی جگہ رکنے پر مجبور ہوگیا تھا لیکن اس کے اندر کا غیظ و غضب اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

''مجھے جانے دو۔ تمہارے ہر سوال کا جواب مل جائے گا اور اگر تم لوگوں نے عقل مندی سے کام لیا تو اس عورت کی جان اور عزت بھی سلامت رہے گی۔''

''میں تمہاری زبان پر کیسے بھروسا کرسکتا ہوں؟''

''بھروسا نہ کیا تو یہ ابھی ابھی اپنی جان سے چلی جائے گی۔'' اس نے ایک بار پھر دھمکایا۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' ساشا نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر تاثر دیا کہ وہ اس کا پیچھا کرنے کا ارادہ ترک کرچکا ہے۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں کہ محض زبانی وعدے پر یقین کرلوں اور تم میرے پلٹتے ہی اپنی تلوار لے کر مجھ پر ٹوٹ پڑو۔''

''تو تم ہی بتادو کہ مجھ پر کیسے اعتبار کرو گے؟'' وہ اس شخص کو کسی صورت مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اپنی تلوار ان جھاڑیوں میں پھینک دو۔'' اس نے قریب موجود گھنی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا تو ساشا نے بنا کسی تذبذب کے اس کی ہدایت پر عمل کرڈالا۔

''اگر تمہارے پاس کوئی اور ہتھیار ہے تو اسے بھی نکال کر پھینک دو۔'' اس شخص نے دوسری ہدایت دی۔

''تم دیکھ سکتے ہو کہ میرے پاس تلوار کے علاوہ کوئی ہتھیار موجود نہیں اور میں خود شدید زخمی ہوں۔'' آواز میں تکلیف کا تاثر پیدا کرکے اس نے مقابل کو نفسیاتی طور پر اس کی برتری کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

''دوسری طرف پلٹ جاؤ۔'' اس نے رعونت سے حکم دیا تو ساشا کو پلٹنا پڑا۔

''گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔'' ایک اور ہدایت دی گئی۔ کولہے میں پیوست خنجر کے باعث اس کے لیے اس ہدایت پر عمل کرنا بہت تکلیف دہ ثابت ہوا اور زخم سے خون مزید تیزی سے بہنے لگا لیکن یہ وقت اپنی تکلیف پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ وہ شکاریوں کے نرغے میں گھرے شیر کی طرح اپنی تمام حسیات کو جگائے ماحول کو سن اور سونگھ رہا تھا۔ تب ہی اپنی طرف پھینکے جانے والے خنجر کی سنسناہٹ کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا اور فوراً ہی پینترا بدل کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔

حورم کو شانے پر لادے شخص نے اس پر خنجر پھینکتے ہی ایک بار پھر دوڑ لگادی تھی۔ اس کی اس حرکت پر اس کے وجود میں طیش کی شدید لہر اٹھی اور ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے عجب وحشت کے عالم میں اپنے کولہے میں پیوست خنجر کو پوری قوت سے کھینچ کر نکالا اور اس بھاگتے شخص پر کھینچ مارا۔ غصے اور عجلت کے باوجود متحرک جسم پر اس کا نشانہ حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوا۔ حورم کو اس نے بائیں شانے پر لاد رکھا تھا۔ خنجر اس کی پشت پر دائیں جانب پیوست ہوا اور وہ بھاگتے بھاگتے جھٹکا کھا کر زمین پر گر گیا۔ ساشا نے یہ منظر دیکھا اور پیچھے سے آتی ہوئی آوازوں کو سن کر مطمئن ہوگیا کہ اہلِ قافلہ میں سے کچھ لوگ مدد کے لیے آرہے ہیں۔ اب اسے مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسی جگہ لیٹ گیا۔ اس کے کولہے کے زخم سے جریانِ خون بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔ خون کے بہاؤ کو کم کرنے کے لیے اس نے ایک ہاتھ پیچھے لے جاکر حتی الامکان سختی سے زخم پر جمادیا اور وہیں لیٹے لیٹے فرار میں ناکام ہوکر گرنے والے شخص اور اس کے شانے سے پھسل کر زمین بوس ہوجانے والی حورم کے ہیولوں کو دیکھتا رہا۔ گرنے سے یقینی طور پر اسے چوٹ لگی ہوگی۔ اس سے پہلے ہی خفا رہنے والی نخریلی امیرزادی خود کو پہنچنے والی اس تکلیف کے لیے اس پر نہ جانے کون سی فردِ جرم عائد کرتی؟

☆☆☆

داؤد کا پورا دن شدید اضطراب میں گزرا۔ آنے والے وقت کا خیال اس کے دل میں ڈھیروں اندیشے جگا رہا تھا۔ اس نے ثوبان کی خواہش پر عبدالمالک کو جو خط لکھا تھا، اس کے متعلق پُرامید تھا کہ عبدالمالک نے اس کے اشارے کو سمجھ لیا ہوگا اور اندھادھند ثوبان کا ساتھ دینے کے بجائے سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائے گا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ عبدالمالک کو اصل معاملات سے آگاہی نہیں تھی اور یہ لاعلمی اس کے لیے کسی بھی راست فیصلے تک پہنچنے میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔ ایسے میں ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ جاتا لیکن اس کی بھی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''کیا محترم ثوبان نے میرے لیے کوئی پیغام دیا ہے؟'' خدمت گار اسے رات کا کھانا پہنچانے آیا تو اس نے بےچینی سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ اگر کوئی پیغام ہوتا تو میں آپ کے پوچھنے سے قبل آپ تک پہنچا دیتا۔'' خدمت گار نے سنجیدگی سے جواب دیا اور کھانا رکھ کر واپس پلٹ گیا۔ داؤد بے دلی سے کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ کھانا پُرتکلف اور بے حد لذیذ تھا لیکن اپنے اندرونی اضطراب کے باعث وہ زیادہ رغبت سے نہ کھا سکا۔ تھوڑا بہت بھی صرف اس خیال سے حلق سے نیچے اتار لیا کہ میدانِ عمل میں اترنے کے لیے جسم میں توانائی موجود ہو۔ آج بھی کھانے کے ساتھ سرخ مشروب موجود تھا۔ اس مشروب کے نشہ آور ہونے کا علم ہونے کے بعد اسے پینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن آج اس نے دکھاوے کے لیے اسے ضائع کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ خیال تھا کہ چند گھنٹوں بعد جب کوئی سرگرمی شروع ہوگی تو ویسے بھی ثوبان اور اس کے ساتھیوں کو حقیقت کا علم ہو جائے گا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ عشا کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز کے بعد اس نے خصوصیت سے اس بات کی دعا مانگی کہ اللہ اسے حق کی راہ پر چلائے اور وہ اس کے ساتھ باطل کی سازشوں کا حصہ نہ بنیں۔ دعا کے بعد اس نے اپنی طبیعت کے اضطراب کو قدرے کم پایا۔ البتہ تجسس کے باعث دروازے تک دو تین چکر لگا کر باہر کی سن گن لینے کی ضرور کوشش کی لیکن کوئی سرگرمی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کچھ سستی سی محسوس کرتا ہوا بستر پر دراز ہو گیا۔ دراز ہوتے ہی نیند اس کی پلکوں پر دستک دینے لگی۔

''مجھے دوپہر میں کچھ دیر کے لیے سو کر اپنی نیند پوری کر لینی چاہیے تھی۔'' اس نے قدرے جھنجلاہٹ سے سوچا۔ گزشتہ شب نورالدین سے ملاقات کے چکر میں وہ نیند سے محروم رہا تھا اور بعد میں بھی حالات کی سنگینی کا سوچتے ہوئے نیند نہیں آ سکی تھی اس لیے اب اس وقت آنکھیں بند ہوتی محسوس کر کے وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ نیند کی کمی کے باعث اس کیفیت کا شکار ہے۔

''یقیناً حملے کے لیے آدھی رات کے بعد ہی کوئی وقت منتخب کیا گیا ہوگا اور جب ثوبان اور اس کے ساتھی روانہ ہونے لگیں گے تو مجھے بھی پیغام بھجوا دیا جائے گا۔ میرے لیے بہتر ہے کہ اس دوران میں تھوڑی دیر کمر ٹکا کر خود کو تازہ دم کر لوں۔'' جسم میں اترنے والی سستی نے اس سے یہ فیصلہ کروایا تو پھر نیند کی وادی میں اترنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک بے خبری کی نیند سوتا رہا۔ سوتے میں اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے آوازیں دے رہا ہے لیکن پلکوں پر اتنا بوجھ تھا کہ وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

''محترم...... محترم داؤد...... برائے مہربانی آنکھیں کھولیے۔'' پکارنے والے کے لہجے میں پریشانی تھی۔ وہ اس پکار پر ردِعمل ظاہر کرتا اس سے قبل ہی بارش شروع ہو گئی۔ وہ بارش کے پانی سے اپنے چہرے کو بچانے کے لیے سر کو زور زور سے حرکت دینے لگا لیکن پتا نہیں وہ کیا شے تھی جو بارش کے پانی کے ساتھ اس کے چہرے سے ٹکرا کر اس کے رخساروں پر ضرب لگا رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی دھندلائی ہوئی نظروں کے سامنے ایک باریش چہرہ تھا۔ وہ اسے شناخت نہیں کر پایا۔

''اٹھ جائیے محترم! جلدی سے اٹھ جائیے ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔'' اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس باریش شخص نے شدید بےچینی سے پکارتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی تو اسے پہلی بار اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اس کے چہرے پر لگنے والی ضربیں اصل میں اس شخص کے مارے گئے تھپڑ ہیں۔ اس کے وجود میں طیش کی ایک لہر سی اٹھی اور وہ ایک جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''شکر ہے کہ آپ کو ہوش تو آیا۔ جلدی سے یہاں سے نکل چلیے۔ کوئی آ گیا تو ہم دونوں یہاں پھنس کر رہ جائیں گے۔'' وہ غصے میں اس شخص کے منہ پر مکا دے مارتا اس سے قبل ہی اس کے الفاظ نے اسے ٹھٹکا دیا اور اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹ کم ہو جانے کے بعد اس نے پہلی بار اسے شناخت کیا۔ وہ عبیداللہ تھا۔ گزشتہ شب اسے نورالدین سے ملاقات کے لیے لے جانے والا لیلیٰ کا وفادار......

"براہِ مہربانی ہوش میں آیئے اور میرے ساتھ چلیے۔" اسے اپنی طرف غور سے دیکھتے پا کر عبیداللہ نے اس کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ اب وہ بھی کافی حد تک صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا۔ وہ بے ہوشی کی نیند سویا ہوا تھا اور اسے جگانے میں ناکام ہونے کے بعد عبیداللہ نے اس کے اوپر پانی پھینکنے اور پھر چہرے پر تھپڑ مارنے کی تراکیب استعمال کی تھیں۔ اپنی ایسی نینداس کے لیے حیرت کا باعث تھی لیکن اس وقت حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے عبیداللہ کی ہدایات پر عمل کرنا ضروری تھا۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے ساتھ چل پڑا لیکن اسے خود اپنی چال میں لڑکھڑاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے عبیداللہ نے اسے سہارا دیا اور کمرے سے باہر لے کر چلا۔ باہر نگراں گزشتہ شب کی طرح دیوار سے پشت ٹکائے سو رہا تھا۔ یقینی طور پر اسے غافل کرنے کے لیے عبیداللہ نے کسی ترکیب سے کوئی نشہ آور شے استعمال کروائی تھی۔ نگراں کو اس کے حال پر چھوڑ کر عبیداللہ اسے اسی راہداری میں واقع ایک کمرے کے اندر لے گیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"کیا تم مجھے کچھ بتاؤ گے کہ یہ سب کیا ہے؟" داؤد نے سر جھٹک کر حواس پر ابھی تک طاری ہلکی سی دھند سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کچھ دیر صبر کیجیے پھر میں آپ کو ساری تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔" وہ عجلت بھرے انداز میں شمالی دیوار میں نصب کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ کھڑکی کے پٹ بند تھے۔ اس نے ان بند پٹوں کو کھولنے کے بجائے عجیب سی حرکت کی۔ وہ ایک جانب سے زور لگا کر یوں دھکا دینے لگا جیسے پوری کھڑکی کو اس کے فریم سمیت بائیں جانب کی دیوار کے اندر دھکیل دینا چاہتا ہو۔ داؤد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے اور پوری کی پوری کھڑکی دیوار میں غائب ہو گئی۔ یقینی طور پر اس جانب دیوار میں خلا تھا لیکن کھڑکی اس طرح نصب تھی کہ خلا کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ داؤد ابھی اس چکر کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ عبیداللہ نے جھک کر فرش پر بچھا بوسیدہ قالین الٹ دیا۔

"خفیہ راستہ....." قالین کے نیچے نظر آنے والے چوکھٹے خلا کو دیکھ کر ساری بات اسے سمجھ آ گئی۔

"آ جایئے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔" عبیداللہ نے اسے پکارا اور خود اس خلا میں اترنے لگا۔ داؤد نے بھی اس کی پیروی کی۔ اب وہ قدرے بہتر تھا اور زمین پر قدم جما کر چلنے کے لائق ہو گیا تھا۔ آگے پیچھے چلتے وہ دونوں سیڑھیاں طے کر کے نیچے پہنچے تو عبیداللہ نے دیوار پر لگی ایک مشعل اس کے حوالے کی۔

"آپ اسے روشن کیجیے۔ میں جب تک اس راستے کو بند کرتا ہوں۔" وہ خود دیوار میں نصب آہنی پہیے کو گھمانے لگا۔ اس کام میں اسے خاصی طاقت صرف کرنا پڑی۔ بہرحال وہ کامیاب رہا اور اوپر موجود خلا بند ہو گیا۔ داؤد کو یقین تھا کہ اس پہیے کی حرکت کے باعث اس خلا کے بند ہونے کے ساتھ ساتھ دیوار میں موجود کھڑکی بھی اپنی جگہ پر واپس آ گئی ہوگی۔ وہ کسی محل میں یہ سب کچھ دیکھتا تو اتنا حیران نہ ہوتا لیکن اس علاقے کے ایک مکان میں یہ سارا انتظام حیرت انگیز تھا۔

"یہ سب کیا ہے عبیداللہ؟ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اسے دیکھ کر تو میری عقل خبط ہو گئی ہے۔" اس نے مشعل کی روشنی میں عبیداللہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

"مجھے محترم نورالدین نے اس راستے کے بارے میں آگاہ کیا تھا لیکن انہیں خود اچھی طرح یاد نہیں تھا کہ مکان کے کون سے کمرے کی کس دیوار میں وہ کھڑکی نصب ہے جس کو حرکت دے کر یہ خفیہ راستہ کھولا جا سکتا ہے۔ کسی کی نظر میں آئے بغیر یہ خفیہ راستہ تلاش کرنے میں مجھے وقت لگ گیا اور آج شام ہی میں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔"

"شام سے اب تک بھی خاصا وقت گزر چکا ہے۔ تمہیں اس راستے کو پہلے ہی استعمال کر لینا چاہیے تھا۔" وہ جو حملے کا علم ہونے کے بعد سے مکان سے باہر نکلنے کے لیے پھڑپھڑا رہا تھا، عبیداللہ پر تنقید کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

"مجھے کچھ انتظامات کرنے تھے۔ اس کے علاوہ میں محترم نورالدین اور آپ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس لیے رات کا انتظار کرنا بہتر سمجھا لیکن کچھ دیر قبل میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر گیا ہے۔" اس نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے جواب دیا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے مخالف دیوار کی طرف بڑھا۔ سیلن زدہ ہوا والے اس چھوٹے [illegible] نے کی اس دیوار کے ساتھ ایک تھیلا پڑا ہوا تھا۔ مشعل کی روشنی میں داؤد کی نظروں نے دیوار میں موجود جوڑ کو بآسانی دیکھ لیا۔ عبیداللہ نے تھوڑا سا دباؤ ڈالا تو دیوار کا وہ حصہ کسی دروازے کی طرح کھل گیا۔ وہ تھیلا اٹھا کر بننے والے خلا میں داخل ہو گیا۔ داؤد نے بغیر کہے اس کی پیروی کی۔

"نورالدین ہمارے ساتھ کیوں نہیں [illegible]

نگران نے تمہیں انہیں ساتھ لانے کی اجازت نہیں دی؟" اسے نورالدین کا ساتھ نہ ہونا کھٹک رہا تھا۔

"میرے بازوؤں کی طاقت نگران کے انکار کا مقابلہ کرسکتی تھی لیکن نورالدین کے نصیب میں ہی آزادی نہیں تھی۔ میرے وہاں پہنچنے تک وہ زندگی کی قید سے رہائی پا چکے تھے۔" اس نے اداسی سے بتایا۔

وہ جس سرنگ نما راستے سے گزر رہے تھے، وہاں شدید گھٹن کا احساس تھا اور ان کے مساموں سے پسینا پھوٹ کر جسم پر بہنے لگا تھا۔ داؤد، جس کی طبیعت پہلے ہی کچھ عجیب سی ہو رہی تھی، اس راستے پر چلنے میں زیادہ ہی دقت محسوس کر رہا تھا۔ چلنا بھی کوئی سیدھا سادہ نہیں تھا۔ راستے کی کم اونچائی کی وجہ سے انہیں اپنی کمروں کو خم دے کر چلنا پڑ رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ مجھے رات کے کھانے میں کوئی نشہ آور شے ملا کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے میں بہت گہری نیند سو گیا اور اب بھی طبیعت میں قدرے سستی محسوس کر رہا ہوں۔" نورالدین کی موت کی خبر پر چند لمحے افسردگی بھری خاموشی اختیار کر کے اس نے عبیداللہ کو اپنی کیفیت سے آگاہ کیا۔

"یقیناً ایسا ہی تھا۔ انہوں نے آپ کو حالات سے بے خبر رکھنے کے لیے یہ ترکیب استعمال کی ہوگی۔" عبیداللہ نے اس کی تائید کی اور اپنے شانے پر موجود تھیلے سے ایک چھاگل نکال کر اسے تھمائی۔

"پانی پی لیں۔ آپ کو اپنی سانس ہموار کرنے میں تھوڑی مدد ملے گی۔" وہ رک گیا تھا۔ داؤد کو واقعی پانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لیے بنا کسی تکلف کے چھاگل کا منہ کھول کر اسے اپنے دہانے سے لگا لیا۔

"تقریباً گھنٹا بھر قبل میں نے یہاں سے بہت سارے لوگوں کو ہتھیار بدست باہر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ مکان کے پہرے داروں اور اندرونی حصے میں خدمت پر مامور چند افراد کے سوا تقریباً ہر شخص یہاں سے جا چکا ہے اور یقیناً ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔" وہ پانی پی رہا تھا جب عبیداللہ نے اسے بتایا۔ پانی اس کے حلق میں اٹک گیا۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ لوگ سردار مراد کے مکان پر حملہ کرنے جا چکے تھے۔ گھریلو ملازمین کو یقینی طور پر اس معاملے کی سن گن نہیں ہونے دی گئی تھی اس لیے عبیداللہ کو بھی حقیقت نہیں معلوم تھی۔

"ہمیں یہاں سے نکلنے میں مزید کتنی دیر لگے گی عبید! سردارزادی سمیت سردار مراد کے مکان پر موجود ہر شخص کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ لوگ سردار کے مکان پر حملہ کرنے گئے ہیں۔" اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہتے ہوئے چھاگل کا منہ بند کر دیا۔

"میرے خیال میں تھوڑا سا ہی راستہ باقی ہے۔ ہم اسے دوڑ کر طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔" عبیداللہ نے کہا اور بغیر انتظار کیے حرکت میں آ گیا۔ پانی پی کر تازہ دم ہو جانے والا داؤد اب بہتر طور پر اس کا ساتھ دینے کے لائق ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں پانی کی چھاگل تھامے وہ حتی الامکان پھرتی سے آگے بڑھنے لگا۔ اب سرنگ دھیرے دھیرے بلند ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے چلنے کا عمل مزید مشکل ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے اپنی ہمت سے کسی نہ کسی طرح اس مشکل کو سر کر لیا اور ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جس سے آگے راستہ بند تھا۔

"مجھے پانی دیجیے۔" عبیداللہ ہانپتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا اور چھاگل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پانی پی کر اس نے اپنے قریب دھری بوری کھول کر اس میں سے کچھ سامان نکالنا شروع کیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" داؤد، جس کا خیال تھا کہ حسبِ سابق یہاں بھی راستہ کھولنے کے لیے کوئی خفیہ نظام موجود ہوگا، بوری سے برآمد ہونے والے پھاوڑے اور بیلچے وغیرہ کو دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگا۔

"یہاں سے آگے راستہ بنانے کے لیے ہمیں تھوڑی سی کھدائی کرنی ہوگی۔" عبیداللہ نے اسے آگاہ کیا اور پھاوڑا اٹھا کر ایک مقام پر ضرب لگائی۔ داؤد کے پاس اس کا ساتھ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شدید گھٹن اور گرمی میں یہ پُرمشقت کام کرتے ہوئے وہ دونوں چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں نہا گئے۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" ذرا دیر کی مشقت کے بعد ایک چھوٹا سا خلا نمودار ہوا اور اس میں سے ہوا کا جھونکا اندر آیا تو بے ساختہ ہی داؤد کی زبان سے کلمۂ شکر ادا ہوا۔ اس کے بعد ان کے ہاتھوں میں مزید تیزی آ گئی اور جلد وہ خلا کو اتنا کشادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس میں سے ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ دونوں باری باری باہر نکلے۔ تازہ ہوا بدن سے ٹکرائی تو ایک گونا گوں سکون کا احساس ہوا۔ دونوں نے باری باری پانی سے ہاتھ تر کر کے اپنے چہروں پر پھیرے تو کسی حد تک پسینے اور مٹی سے نجات مل گئی۔ چند گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارا تو حالت میں مزید بہتری آئی۔

"کس احمق کی ایجاد تھا یہ خفیہ راستہ۔ جب اتنا کچھ کیا تھا تو اس جگہ بھی راستہ کھولنے کا کوئی نظام ہونا چاہیے تھا۔"

تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے داؤد نے جھلاہٹ بھرے لہجے میں تبصرہ کیا۔

''محترم نور الدین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ماضی میں ایک مفرور شہزادے نے اس مکان میں رہائش اختیار کی تھی۔ شہزادے کو ہر وقت یہ اندیشہ رہتا تھا کہ اس کے دشمن کسی بھی وقت اچانک حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے اپنے ساتھ آئے ایک ماہر مہندس کی نگرانی میں مقامی معماروں سے اس خفیہ راستے کی تعمیر شروع کروائی۔ تعمیر کا کام تقریباً مکمل تھا کہ شہزادے کے اندیشے سچ ثابت ہو گئے اور دشمن نے کسی آندھی کی طرح ایسا شب خون مارا کہ شہزادے اور اس کے حواریوں کو راہِ فرار اختیار کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ بعد میں محترم نورالدین کے دادا نے یہ مکان خریدا تو معماروں میں سے کسی نے انہیں اس راستے کے بارے میں آگاہ کیا۔ ان کی زبانی اگلی نسل تک بھی یہ معلومات منتقل ہوئیں لیکن کسی عام آدمی کو بھلا خفیہ راستے کے استعمال کی کیا ضرورت تھی اس لیے نہ تو کبھی یہ راستہ استعمال ہوا اور نہ ہی کسی نے رہ جانے والا کام مکمل کروانے کی ضرورت محسوس کی۔'' وہ دونوں اپنی حالت سنبھالنے کے لیے کچھ دیر آرام کی غرض سے زمین پر دراز ہو گئے تھے۔ عبید اللہ نے حاصل شدہ معلومات سے اسے آگاہ کیا تو خفیہ راستے سے متعلق تمام الجھنیں دور ہو گئیں۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' ابتر حالت ذرا سی سنبھلی تو داؤد کھڑا ہو گیا۔ عبید اللہ بھی اس سے کم بے چین نہیں تھا، چنانچہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہمیں آبادی تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟'' اردگرد پھیلے ویرانے کو دیکھتے ہوئے داؤد نے استفسار کیا۔

''کوئی سواری ہوتی تو بہت زیادہ وقت نہیں لگتا لیکن پیدل پہنچنے میں ہمیں کچھ وقت لگے گا۔'' عبید اللہ نے بھاگتے ہوئے اسے جواب دیا۔ طویل سرنگ کے گھٹن زدہ ماحول کے مقابلے میں کھلی فضا کا یہ سفر نسبتاً آسان تھا اس لیے وہ تیزی سے فاصلہ طے کر رہے تھے۔ رات بھی اپنا سفر طے کرتے ہوئے اختتامی مرحلے تک آ گئی تھی۔

''لگتا ہے ہم پہنچنے والے ہیں۔'' داؤد نے آبادی سے متصل مختصر پہاڑی سلسلے کو شناخت کرتے ہوئے جوش سے کہا۔

''جی ہاں۔ بس اس پہاڑ کی دوسری طرف پہنچ کر ہم آبادی میں ہوں گے۔'' عبید اللہ نے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے اس کے خیال کی تصدیق کی۔ اب تاریکی چھٹنے لگی تھی اور دھندلی سی روشنی میں اردگرد کا ماحول واضح ہونے لگا تھا۔

''کون ہو تم؟ رک جاؤ۔'' ابھی انہوں نے پہاڑی سلسلے میں قدم رکھا ہی تھا کہ دائیں بائیں سے دو تیغ زنوں نے نمودار ہو کر ان کا راستہ روک لیا۔

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' مرعوب ہونے کے بجائے عبید اللہ نے سخت لہجے میں دریافت کیا جبکہ داؤد کی توجہ راہ میں حائل ہونے والوں کے بجائے ان مدھم آوازوں کی طرف مبذول ہو گئی تھی جو وہاں پر مزید انسانوں کی موجودگی کا پتا دے رہی تھیں۔

''عبید اللہ...... تم عبید اللہ ہو نا؟'' راہ میں حائل ہونے والوں میں سے ایک عبید اللہ کو شناخت کر چکا تھا۔

''اور تم تیمور...... لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم تمہیں تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں۔'' انہوں نے ایک دوسرے کو شناخت کر لیا تو لہجہ خود بخود دوستانہ ہو گیا۔ انہیں گھیرنے والے اپنی راہنمائی میں انہیں لے کر ایک سمت چل پڑے۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ جمع ہیں؟'' چلتے چلتے داؤد نے اپنی الجھن کو سوال کی صورت دی۔

''ابھی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔'' تیمور نامی شخص نے مختصر جواب دیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ ان پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی تنگ جگہ پر موجود تھے جہاں انہوں نے کئی عورتوں اور بچوں کو جمع پایا۔ ان کے چہروں پر ہراس تھا۔ داؤد نے ان کے درمیان اپنے قافلے میں شامل کچھ خواتین اور بچوں کو شناخت کر لیا۔

''داؤد بن معیز...... تم کہاں تھے؟ یہ تم نے ہمیں کس جگہ لا پھنسایا ہے۔ ہمیں اسی جنگ و جدل اور خون خرابے کا سامنا کرنا تھا تو پھر ترکِ وطن کی کیا ضرورت تھی۔ یوں ایک اجنبی زمین پر مرنے سے تو بہتر تھا کہ ہم اپنے وطن کی مٹی میں ہی مل جاتے۔'' وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جو اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی اور ہیجانی انداز میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

''صبر سے محترمہ! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اس عورت کو تسلی دے رہا تھا لیکن اس کی نظریں ثریا اور سارہ کو کھوج رہی تھیں۔ اگر وہ اس جگہ موجود تھیں تو اصولاً انہیں اب تک اس کے مقابل پہنچ جانا چاہیے تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم ہمیں بھولی نسلیاں د... رہے ہو۔ تم نے سارہ اور ان عیسائی راہبا... خاطر ... کی

زندگیاں خطرے میں ڈال دی ہیں۔ یہ تم ہو جس کی وجہ سے میرا نوجوان بیٹا ہاتھ میں تلوار اٹھائے نہ جانے کس کے حصے کی جنگ لڑ رہا ہے۔'' وہ یقینی طور پر اپنے بیٹے کو کھو دینے کے اندیشے میں مبتلا اپنے حواس پر قابو رکھنے میں ناکام تھی۔ داؤد اس بار اسے کوئی تسلی بھی نہ دے پایا اور بے بس سا کھڑا رہا۔

''آپ میرے ساتھ آئیے چچی جان! انہیں اس طرح الزام دینا اور برا بھلا کہنا کسی طور مناسب نہیں ہے۔'' وہ ایک نازک سی لڑکی تھی جس کا چہرہ حجاب میں چھپا ہوا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے اسے نہیں بلکہ خدا کو الزام دینا چاہیے جس نے ہمیں یوں ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا ہے۔'' وہ عورت جنونی انداز میں چیخی اور پھر روتی بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

''بہت زیادہ صدمات انسان کی زبان پر کفریہ کلمات بھی لے آتے ہیں۔ اس بے چاری کا سارا خاندان شہید ہو چکا ہے۔ ایک بیٹا بچا تھا، آج وہ بھی ہاتھ میں تلوار تھامے میدانِ کارزار میں اترا ہوا ہے اس لیے اس کا ضبط جواب دے گیا ہے۔'' وہ جس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا، شرمندہ شرمندہ سی وضاحت پیش کر رہی تھی۔

''آپ فکر مت کیجیے۔ میں نے برا نہیں مانا۔ مان بھی کیسے سکتا ہوں۔ کیا میں اپنی قوم کی بربادی اور دکھوں سے واقف نہیں ہوں؟'' اس نے افسردگی سے جواب دیا اور فوراً ہی موضوع گفتگو بدلتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا آپ مجھے ثریا اور سارہ کے متعلق کوئی اطلاع دے سکتی ہیں؟''

''وہ دونوں بہادر دوشیزائیں اس وقت سردار زادی لیلیٰ کے شانہ بشانہ ہم سب کے تحفظ کے لیے لڑ رہی ہیں۔'' اس نے آہستہ سے بتایا۔

''اوہ میرے خدایا.....'' سن کر داؤد کی زبان سے بے ساختہ ہی پھسلا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ محفوظ رہیں گی۔'' اس نے تسلی دی۔

''آمین.....'' داؤد نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

''محترم داؤد! برائے مہربانی یہاں اوپر آجائیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔'' اسے یہاں تک لانے والے اسے باتوں میں مصروف چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے تھے اور اب عبیداللہ اوپر پہاڑی پر سے اسے پکار رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اس کی پکار پر دوڑ گیا۔ ایک شور سا تھا جو لحہ بہ لحہ قریب آتا جا رہا تھا۔

''یہ تیر کمان سنبھالیے۔ ہمارے ساتھی پسپائی اختیار کرتے ہوئے یہاں پناہ لینے آرہے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی ہوگی۔'' اوپر عبیداللہ اور تیمور کے علاوہ بھی چند لوگ موجود تھے جو اپنی کمانیں سنبھالے مختلف مقامات سے نیچے کی طرف تیر برسا رہے تھے۔ داؤد نے بھی تیمور کے اشارے پر ایک جگہ سنبھال لی۔

اب اتنی روشنی ہو چکی تھی کہ وہ اپنے سامنے کا منظر واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس منظر میں دو ٹولیاں واضح طور پر نظر آرہی تھیں۔ ایک چھوٹی ٹولی جو بے جگری سے اپنا دفاع کرتے ہوئے بتدریج پہاڑی کی طرف آتے ہوئے پسپائی اختیار کر رہی تھی اور دوسری بڑی ٹولی جس کا انداز جارحانہ تھا اور جس کا ہر فرد شاید پسپا ہونے والی ٹولی کو کچل ڈالنے کی خواہش رکھتا تھا۔ داؤد نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان وحشیانہ تیور رکھنے والوں کو چن چن کر نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ بلندی کی وجہ سے قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود انہیں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کا موقع مل رہا تھا اور جارحانہ تیور رکھنے والی دشمنوں کی ٹولی اپنے کئی ساتھیوں کو ایک ایک کر کے گرتا دیکھ کر بوکھلاہٹ کا شکار ہونے لگی تھی۔ ان کی اس بوکھلاہٹ نے پسپائی اختیار کرتی ہوئی ٹولی کو بھرپور موقع دیا کہ وہ پہاڑی کے دامن میں روپوش ہو جائے۔ اس موقع پر داؤد سمیت پہاڑی پر تعینات تمام تیر انداز، جو اپنے ساتھیوں کی وجہ سے پہلے محتاط انداز میں تیر چلانے پر مجبور تھے، بے فکر ہو گئے اور دشمن ٹولی پر تیروں کی ایسی بوچھاڑ کی کہ ان کے پاس دم دبا کر بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ افراتفری میں بھاگتے ہوئے انہیں اپنے زخمیوں اور لاشوں کا بھی ہوش نہ رہا۔

''کوئی شخص اپنی جگہ نہیں چھوڑے گا۔ یاد رکھو، یہ ہمارا سب سے اہم دفاعی مورچا ہے اور تمہارا اس مورچے پر ڈٹے رہنا ہی بچاؤ کی واحد راہ ہے۔'' تیمور کی گونج دار آواز نے ان سب کو اپنی جگہ موجود رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس موقع پر بے اختیار ہی داؤد کو غزوۂ احد یاد آیا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی تو احد والوں سے نسبت رکھتے تھے اور ان ہی کی طرح حق و باطل کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہاں بس جو چوک احد والوں سے ہو گئی تھی وہ انہیں نہیں کرنی تھی۔ انہیں اپنے مورچے کسی حال میں نہیں چھوڑنے تھے۔

وہ وہیں اپنی جگہ بیٹھا نیچے کا منظر دیکھتا رہا۔ اب اسے زخمیوں اور لاشوں کے درمیان کچھ لوگ چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ لوگ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے

ہتھیاروں اور تیروں کو جمع کر رہے تھے۔ ان کی قیادت کرنے والے سیاہ پوش کو شناخت کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ سردار زادی لیلیٰ تھی جو حسبِ معمول اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ شاید یہ اسی کی ہدایت تھی جس پر عمل کرتے ہوئے زخمی پڑے افراد میں سے چند کے سر قلم کیے جانے لگے جبکہ کچھ زخمیوں کو اٹھا کر پہاڑی کی طرف لایا جانے لگا۔

''داؤد بن معیز کہاں ہے؟ سردار زادی نے داؤد بن معیز کو طلب کیا ہے۔'' ابھی وہ اپنے سامنے ہوتی کارروائی کی کوئی توجیہہ تلاش ہی کر رہا تھا کہ ایک بلند آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے پکارنے والے کی طرف رخ بدلا اور خود بھی بلند آواز میں بولا۔

''میں داؤد بن معیز ہوں اور سردار زادی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے حضور حاضر ہونے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھ سمیت تمام تیراندازوں کو پابند کیا گیا ہے کہ ہم کسی صورت اپنا مورچا نہ چھوڑیں۔''

''آپ چلے جائیں۔ آپ کی جگہ کسی اور کو تعینات کر دیا جائے گا۔'' تیمور ایک طرف سے نمودار ہو کر بولا تو وہ سر ہلاتا ہوا بلاوے کے لیے آنے والے کے پیچھے چل پڑا۔ لیلیٰ ابھی تک پہاڑی کے دامن میں موجود تھی اور اس کے لوگ اس کے ماتحت خدمات انجام دے رہے تھے۔

''آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے تعاون کا شکریہ۔ آپ کے دوست عبدالمالک نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہم تک بروقت حملے کی اطلاع نہ پہنچائی ہوتی تو بہت زیادہ نقصان ہو جاتا۔'' آج لیلیٰ کے لہجے میں اس کے لیے نرمی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ عبدالمالک نے میرے پیغام کو سمجھا اور بہتر حکمتِ عملی اختیار کی۔ اس محفوظ پناہ گاہ میں اپنے قافلے میں شامل افراد کے علاوہ دیگر لوگوں کی موجودگی میرے لیے باعثِ اطمینان ہے۔''

''حملے کی اطلاع پاتے ہی ہم نے لوگوں کی ممکنہ تعداد کو یہاں منتقل کر دیا تھا لیکن اب بھی کئی بے گناہ لوگ ایسے ہیں جو اپنے گھروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور میں ثوبان سے ان کے لیے کوئی اچھی امید نہیں رکھ سکتی۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ حملہ آوروں میں ثوبان کے پیروکاروں کے علاوہ قابوس کے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ ابھی میں نے جن لوگوں کے سر قلم کروائے ہیں ان کا تعلق قابوس سے ہی ہے البتہ مسلمان نوجوانوں کو محض قیدی بنایا گیا ہے اور ان کے زخموں کی مرہم پٹی کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور وہ دوبارہ راہِ راست پر آ جائیں گے۔''

''اللہ آپ کی نیک امیدوں کو پورا کرے لیکن آئندہ کے لیے آپ کا کیا لائحہ عمل ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ پہاڑ ہمیں تحفظ تو فراہم کر سکتے ہیں لیکن دیگر مسائل کے باعث ہم طویل عرصے ان کی پناہ میں چھپے رہنے کے متحمل نہیں ہوں گے۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' سردار زادی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''آیئے کسی مناسب جگہ پر بیٹھ کر ساتھیوں کی موجودگی میں مشاورت کرتے ہیں۔'' داؤد نے اس کی پیروی کی۔ وہ سارہ، ثریا اور دیگر ساتھیوں کا احوال جاننے کے لیے بے چین تھا لیکن ایک تو سوال کی مہلت نہیں ملی، دوسرے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ اگر خدانخواستہ ان میں سے کسی کے بارے میں کوئی بری خبر ہوتی تو سردار زادی اسے آگاہ ضرور کرتی۔

''اخی......'' وہ اپنے خیالات میں مگن سردار زادی کے پیچھے چلا جا رہا تھا کہ ثریا کی مانوس آواز کانوں سے ٹکرائی اور پھر وہ خود کسی گولے کی طرح آ کر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

''میری بہادر بہن کی آنکھوں میں آنسو میرے لیے حیرت کا باعث ہیں۔'' اس نے ثریا کے سر کو محبت سے تھپتھپاتے ہوئے اسے ٹوکا۔

''میں آپ کے لیے بہت پریشان تھی۔ دل میں بلاوجہ وہم آ رہے تھے کہ جانے آپ کو دوبارہ دیکھ بھی سکوں گی یا نہیں۔'' ثریا نے اپنے آنسو صاف کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک تسلسل سے بہتے چلے جا رہے تھے۔

''پانی پی لیں ثریا بہن اور خود پر قابو پائیں۔ آپ کے آنسو آپ کے بھائی کو پریشان کر رہے ہوں گے۔'' ثریا کو پانی پیش کرنے والی لڑکی وہی تھی جس نے جھڑپ سے قبل اسے بگڑے حالات کے لیے خود کو موردِ الزام ٹھہرانے والی عورت کے طعنوں تشنوں سے نجات دلائی تھی۔ پردے میں ہونے کے باوجود وہ اس لڑکی کو آسانی سے پہچان گیا۔

''طیبہ ٹھیک کہہ رہی ہے ثریا۔ تم جیسی باہمت لڑکی کو یوں ضبط کھو دینا زیب نہیں دیتا۔'' سارہ نے بھی آگے بڑھ کر ثریا کو سمجھایا تو بالآخر وہ خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گئی۔

''مجھے اجازت دیجیے۔ میں زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔'' طیبہ نے اپنے

مخصوص دھیمے لہجے میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔
''حیرت انگیز۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، یہ خاتون تو اپنی بچی کے جھلس کر مرجانے کے بعد سے اپنے حواس میں ہی نہیں تھی اور یہاں میں انہیں اس قدر سرگرم دیکھ رہا ہوں۔'' لڑکی کا نام جان کر وہ اپنی حیرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔
''انسان سے زیادہ عجیب وغریب مخلوق کوئی اور نہیں ہے۔ بیٹی کی موت کے بعد ہوش وحواس کھودینے والی طیبہ میں موجودہ حالات میں تیزی سے انقلاب برپا ہوا ہے اور وہ پوری پامردی سے ان حالات سے نمٹنے کے لیے سرگرم نظر آرہی ہے۔'' سارہ نے اسے جواب دیا تو وہ اسے بس ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا حسین سراپا دھول مٹی میں اٹا ہوا تھا لیکن داؤد بن معیز کی نظریں اس کے حسن کو دیکھ سکتی تھیں۔
''عبدالمالک، حاطب اور دیگر ساتھیوں کے بارے میں کیا خبر ہے؟'' اس کے حسن سے نظر چراتے ہوئے اس نے ساتھیوں کے بارے میں معلوم کیا۔
''الحمد للہ! سب بخیریت ہیں۔ لڑائی میں حصہ لینے والوں کے سوا دیگر لوگوں کو پہلے ہی یہاں منتقل کردیا گیا تھا۔ لڑنے والوں میں سے چند کو معمولی زخم آئے ہیں لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔'' سارہ نے اسے جواب دیا ہی تھا کہ انہیں اس شخص کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو داؤد کو سردار زادی کے بلاوے کی اطلاع دے رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھیوں کے درمیان چھوڑ کر لیلیٰ خاموشی سے آگے بڑھ گئی تھی اور اب پیغام بھجوایا تھا کہ آکر مشاورت میں شامل ہوجائے۔
''تم لوگ آرام کرو۔ میں فارغ ہوکر دوبارہ ملاقات کرتا ہوں۔'' اس نے ثریا کا شانہ تھپکا اور پیغام لانے والے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔
سردار زادی لیلیٰ اپنے چند اہم ساتھیوں کے ساتھ محفلِ شوریٰ سجائے بیٹھی تھی۔ وہ بھی ایک پتھر پر ٹک گیا۔
''حالات ہم سب کے سامنے ہیں۔ اس مقام پر ہم چند دن اپنا دفاع تو کامیابی سے کرلیں گے لیکن ہماری بے سروسامانی ہمیں زیادہ دن اس پناہ گاہ میں ٹھہرنے نہیں دے گی، خصوصاً اس صورت میں کہ ہمارے ساتھیوں کی ایک بڑی تعداد عورتوں اور بچوں پر مشتمل ہے۔ بے آرامی اور خوراک کی قلت کے باعث بہت جلد وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیں گے۔ دوسری طرف ہمارے پاس ہتھیار بھی محدود تعداد میں ہیں۔ تیروں کا جو ذخیرہ میں نے یہاں بھجوایا تھا، اس میں سے نصف سے کچھ کم استعمال ہوچکا ہے۔ لڑنے والوں کی تعداد بھی محدود ہے جبکہ ثوبان کا قابوس سے گٹھ جوڑ ثابت ہوجانے کے بعد ہمیں اپنے دشمنوں کی عددی برتری اور ہتھیاروں کی فراوانی کے سلسلے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ موجودہ حالات میں میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟'' لیلیٰ نے خطاب کرتے ہوئے پہلے مختصراً حالات کو بیان کیا پھر مشورہ طلب کیا۔ مشورہ طلب کرتے ہوئے اس کا رخ وہاں موجود سب سے عمر رسیدہ شخص کی طرف تھا چنانچہ اسی نے پہل کی اور گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔
''موجودہ صورت حال بہت گمبھیر ہے۔ زندگی بھر ہم ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوئے۔ ہمارے لوگ جنگ و جدل کی سختیاں سہنے کے عادی نہیں ہیں۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ یہ بہت دیر تک اس آزمائش سے نبرد آزما رہ سکیں گے۔ حالات کے بہت زیادہ خراب ہونے سے قبل ہمیں مفاہمت کی کوئی راہ تلاش کرنی ہوگی۔''
''مفاہمت...... کیسی مفاہمت اور کس کے ساتھ؟ دین میں فتنہ پیدا کرنے والوں اور اپنوں کو اپنوں سے لڑوانے والوں کے ساتھ مفاہمت......؟ ناممکن......''
لیلیٰ کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک تقریباً چالیس سالہ شخص نے تلخ لہجے میں معمر شخص کی رائے سے اختلاف کیا اور یوں زور زور سے سر کو نفی میں جنبش دینے لگا جیسے اپنے بے پناہ غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کررہا ہو۔ داؤد نے خود کو اس شخص کی رائے سے بہت قریب پایا۔
''بابا قادر کی بات غلط نہیں ہے۔ اول تو ہمارے پاس جنگ و جدل جاری رکھنے کے وسائل نہیں ہیں، دوسرے اگر ہم لڑائی جاری رکھتے ہیں تو ہماری تلواروں تلے آنے والی گردنوں میں سے اکثر ہماری اپنی قوم کے لوگوں کی ہوں گی اور ہم ان کا خون بہا کر کبھی بھی سکون سے نہ رہ سکیں گے۔'' ایک اور شخص نے معمر شخص کی تائید کی۔
''حق و باطل کی جنگ میں مسلمان صرف اس فرق کو ہی مدنظر رکھتا ہے۔ بدر، احد اور خندق کے غزوات میں نبی ﷺ کے زیر سایہ لڑنے والے مسلمانوں نے صرف حق و باطل کے فرق کو سامنے رکھا تھا اور اس الجھن میں نہیں پڑے تھے کہ اہلِ مکہ میں سے ان کے مقابل آنے والوں میں سے کون ان سے کیا رشتہ رکھتا ہے۔'' ایک اور شخص نے دلیل دی جس کی تائید میں مزید چند آوازیں اٹھیں۔ لیلیٰ بغیر کسی مداخلت کے خاموشی سے ہر ایک کی رائے سنتی رہی۔ یہی کام داؤد کررہا تھا۔

"آپ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے، داؤد بن معیز؟" خاموشی کا ایک وقفہ آیا تو لیلیٰ نے اسے مخاطب کیا۔

"میں بہت زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا۔ میرا ایمان ہے کہ جنگیں افرادی قوت یا وسائل سے زیادہ جذبے کی شدت سے لڑی جاتی ہیں اور جہاں قومی غیرت و حمیت اور ایمان کا معاملہ ہو، وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے بلکہ یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ چونکہ ہم حق پر ہیں اس لیے ہم ہر صورت باطل کے سامنے اپنی آخری سانس تک ڈٹے رہنے کی جرأت رکھتے ہیں۔" وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"یہ صرف ایک جذباتی تقریر ہے۔" بابا قادر نے اس پر طنز کا تیر چلایا۔

"انسان کا جذبۂ ایمانی زندہ ہو تو وہ مشکل حالات سے لڑنے کی حکمتِ عملی بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"بہت خوب......" لیلیٰ نے اسے اس کے الفاظ پر سراہا اور نہایت دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ کے پاس کوئی ایسی تجویز ہے جس پر عمل کر کے ہم ان حالات کا مقابلہ کر سکیں؟"

"سب سے پہلے تو آپ کو سردار ہونے کا حق ادا کرنا ہوگا اور اپنی قوم میں جذبۂ ایمانی کی ایسی روح پھونکنی ہوگی کہ یہاں موجود بچہ بچہ اپنے پیٹ پر ایک تو کیا دو پتھر باندھ کر بھی لڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔ آپ کو انہیں یقین دلانا ہوگا کہ زندہ قومیں صرف خوشحالی اور آسودگی میں اللہ اور رسول ﷺ کے نام کے نعرے نہیں لگاتیں بلکہ آزمائش کی گھڑیوں میں ان کا ایمان اللہ اور رسول ﷺ پر مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔" وہ آج پھر وہی داؤد بن معیز تھا جو شیرِ خوارزم کے جھنڈے تلے لڑنے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا تھا۔

"شاید یہ نوجوان ہم سب کو شہادت کے رتبے پر فائز کرنا چاہتا ہے۔" طنز کا ایک اور تیر چلایا گیا۔

"شہادت کی موت خوش بختوں کو نصیب ہوتی ہے۔" اس نے بُرا مانے بغیر بڑے جذب سے جواب دیا۔

"میں اپنے اگلے قدم کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔" لیلیٰ نے اسے اصل موضوع سے ہٹنے سے روکا۔

"ایمان کی پختگی کے بعد اگلا مرحلہ اچھی حکمتِ عملی کا آتا ہے۔ اچھا راہنما اپنی قوم کو اندھی کھائی میں گرانے کے بجائے ان کی حفاظت کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" لیلیٰ کی بے قراری نے اس کی دلچسپی کی انتہا کو ظاہر کیا۔

"آپ کو خوراک اور ہتھیاروں کے انتظام کے ساتھ ساتھ افرادی قوت بڑھانی ہوگی۔"

"اور یہ سب براہِ راست آسمان سے نازل ہوگا" اس کی تجویز کا برملا مذاق اڑایا گیا۔ لیلیٰ کی آنکھوں میں بھی الجھن سی دکھائی دی۔

"بہتر ہوگا کہ پہلے اس نوجوان کی تجویز کو اچھی طرح سن لیا جائے، پھر اس پر تبصرے کیے جائیں۔" بابا قادر کی مفاہمت کی تجویز سے اختلاف کرنے والے شخص نے سخت لہجے میں مذاق اڑانے والے کو ٹوکا۔

"حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ ثوبان اسلام دشمن اور سازشی ہے اور اس نے اپنی سازش کے تانے بانے غیر مسلموں کے تعاون سے مضبوط کیے ہیں۔ ان حالات میں آپ کو چاہیے کہ قرب و جوار کی بستیوں میں بسنے والے ان لوگوں کو مدد کے لیے پکاریں جو اللہ اور رسول ﷺ کے نام لیوا اور اسلام کے چاہنے والے ہوں۔ آپ اپنے مسلمان بھائیوں کو اپنی مدد کے لیے پکاریں۔"

"تم بھول رہے ہو نوجوان کہ ہم اس جگہ محصور ہو چکے ہیں اور یہاں سے ہماری پکار کہیں نہیں جا سکتی۔" بابا قادر نے جیسے اس کی تجویز کو رد کیا۔

"میرا تجربہ ہے کہ ایسے ہر مقام پر جہاں انسان کو اپنے محصور ہو جانے کا گمان ہو، عموماً کوئی نہ کوئی ایسا راستہ ہوتا ہے جہاں سے باہر تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسا راستہ خفیہ، دشوار گزار یا طویل ہو سکتا ہے لیکن اس کے ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہوں لیکن جس حد تک میں نے اس علاقے کو دیکھا ہے، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی ہمارے گرد حصار اتنا مضبوط نہیں ہوا ہوگا کہ ایک دو بہادر اور سمجھ دار نوجوان یہاں سے نکل کر جانے کی کوشش کریں تو انہیں کامیابی نہ مل سکے۔" وہ ہر اختلاف کے جواب میں نہایت بردباری اور سمجھ داری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"یہ نوجوان بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اس کی تجاویز پر غور کرنا ہوگا۔" اس کی پُرخلوص کوشش رنگ لائی اور اس کی حمایت میں آوازیں اٹھنے لگیں۔

"ٹھیک ہے، آپ لوگ اگر ان تجاویز کو مناسب سمجھتے ہیں تو ان پر عمل کر کے دیکھنے میں حرج نہیں ہے لیکن ایک بات میں واضح کر دوں کہ اردگرد کی بستیوں میں بسنے

والے اتنے پکے اور سچے مسلمان نہیں ہیں جو محض جذبۂ ایمانی کے تحت ہماری جنگ میں کودنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگر ہم ان سے کام لینا چاہتے ہیں تو ہمیں انہیں معاوضوں کی ادائیگی کے لیے تیار رہنا ہوگا۔''

''یہ تو بابا قادر نے بالکل درست کہا۔ ہمارے اطراف میں موجود مسلمان بستیوں میں رہنے والے غربت اور معاشی مسائل کے باعث اتنے بدحال ہیں کہ ان کے لیے کسی بھی شے سے بڑھ کر روزگار اہم ہے اور ہمارے اتنے وسائل نہیں کہ ہم ان کی خدمت کا معقول معاوضہ دے سکیں۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ لیلیٰ نے بابا قادر سے اتفاق کیا۔

''صرف معاوضوں کی بات نہیں، ہمیں طویل عرصے کے لیے ضروریاتِ زندگی اور ہتھیاروں کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔ ہمارے پاس پہلے ہی ان اشیا کی قلت ہے، مزید لوگ ساتھ شامل ہوں گے تو ہمیں ان کے لیے بھی انتظامات کرنا ہوں گے۔ کیسے ہوگا یہ سب؟'' بابا قادر کا سوال ایسا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ اس بار داؤد بن معیز بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے یاد تھا کہ شیرِ خوارزم جو برسوں تاتاریوں کے سمندر کا راستہ روکنے کے لیے دیوانہ وار کوشش کرتا رہا تھا، فقط اسی لیے ہمت ہارنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ خلیفہ بغداد نے اس کی ساری درخواستوں کو نظر انداز کر ڈالا تھا اور کہیں سے ایسی کوئی مدد نہیں ملی تھی جو اسے میدانِ جنگ میں کھڑا رکھتی۔ ایک عظیم جنگجو کو اس کی قوم کی بے حسی کھا گئی تھی۔ اس بے حسی نے اسلامی تاریخ کا ایک ایسا سیاہ باب رقم کیا تھا جس نے مسلمانانِ عالم کو سدا شرمسار ہی رکھنا تھا۔ اس نے اپنے دل میں چپکے سے دعا کی۔

''اے میرے رب! آج کے دن میں تجھ سے تیرے رحم کے سوا کچھ نہیں مانگتا۔ تو ہم خانماں بربادوں کے حال پر رحم فرما اور ہماری آنکھوں کو ایسا کوئی منظر نہ دکھا جس میں ہماری قوم کی ذلت ورسوائی ہو۔''

☆☆☆

''تم نے اپنے ساتھ بڑی زیادتی کی میرے دوست! ابھی تو تمہارا جسم پچھلے حادثے کے اثرات سے پوری طرح نہیں نکلا تھا اور تم یہ نیا گھاؤ لگوا لائے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہارا کتنا خون بہہ گیا ہے؟'' سلیمان جو ایک ذمے دار اور فرض شناس معالج کی حیثیت سے کئی گھنٹوں سے اس کے علاج معالجے میں مصروف تھا، اب اس کی حالت سنبھلتی دیکھ کر ایک مخلص اور ہمدرد دوست کے طور پر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

''مجھے یقین تھا ناکہ زخموں کی رفوگری کے لیے تم جیسا قابل اور ماہر معالج موجود ہے اس لیے جو کرنا تھا، بے فکری سے کر گزرا۔'' اس نے تکلیف کے باوجود مسکرانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے، تم بہادر ہو اور اللہ نے تمہیں کچھ غیر معمولی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم اپنی پروا ہی نہیں کرو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہارے کولہے کا زخم کتنا گہرا ہے اور مسلسل متحرک رہنے سے اس کا کتنا برا حال ہوگیا ہے۔'' سلیمان کی خفگی کو اس کی مسکراہٹ دور نہ کرسکی تو اس نے بھی سنجیدگی اختیار کرلی اور دھیمے لیکن جذباتی لہجے میں بولا۔

''تمہاری ہر بات درست ہے دوست اور اس وقت میں خود کو خوش قسمت محسوس کر رہا ہوں کہ اس دنیا میں ابھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں مجھ سے محبت ہے اور جو میری پروا کرتے ہیں لیکن......'' مسلسل اوندھے لیٹے رہنے کی وجہ سے وہ کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا اس لیے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ذرا سا پہلو بدلنے کی کوشش کی لیکن سلیمان نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''نہیں...... ابھی تم حرکت نہیں کرسکتے۔ ابھی تمہیں مزید کچھ گھنٹے اسی حالت میں لیٹا رہنا ہوگا پھر میں زخم کا معائنہ کر کے تمہیں اس سلسلے میں ہدایات دوں گا۔''

''جیسا جناب کا حکم! اس وقت خادم مکمل طور پر آپ کے رحم وکرم پر ہے۔'' اس نے ایک بار پھر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔

''رحم تو اللہ نے تم پر کیا ہے کہ اس حال میں پہنچنے کے باوجود بولنے کے لائق ہو ورنہ تم نے تو خود کو ختم کرلینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' سلیمان کے لہجے میں بار بار در آنے والی ناراضگی اس امر کا اظہار تھی کہ اس نے اس کی کیفیت کے باعث خاصی پریشانی کا سامنا کیا ہے۔

''ایسا کرنا میری مجبوری تھی دوست! میں نے امیر ارغل سے وفاداری کا عہد کر رکھا ہے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے کوئی ان کے قافلے کے کسی فرد کو نقصان پہنچا جاتا پھر......'' اس نے لمحاتی توقف کیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔

''ایک مسلمان کی حیثیت سے بھی میں یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ کوئی باہر سے آئے اور میری قوم کی عزت پر ڈاکا مار کر چلا جائے۔ میری نظروں کے سامنے اگر وہ لوگ امیر زادی کو اٹھا کر لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو میرے لیے تو میری زندگی ہی باعثِ شرمندگی بن جاتی۔''

''تمہارا جذبہ قابل قدر ہے ساشا اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایک مشکل وقت میں تم جیسا جانباز ہمارے سامنے ہے جس کی مثال سامنے رکھ کر ہم اپنے لیے بہترین راہِ عمل کا انتخاب کر سکتے ہیں۔'' سلیمان نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کچھ ایسے لہجے میں یہ بات کہی کہ وہ چونک گیا۔

''سب خیریت تو ہے سلیمان! کیا کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا ہے؟''

''ہاں......'' سلیمان نے ایک سرد آہ بھری۔

''تمہاری وجہ سے امیر زادی تورات اغوا ہونے سے بچ گئیں لیکن امیر سالک کی بیوہ صفیہ کو نہیں بچایا جا سکا۔ صالح نے جس وقت انہیں دیکھا، اغوا کار انہیں گھوڑے پر ڈال کر نکل رہے تھے۔ صالح کے پاس نہ تو تیر کمان تھا کہ دور سے انہیں نشانہ بنا لیتا اور نہ ہی سواری کے لیے گھوڑا کہ ان کا تعاقب کر پاتا چنانچہ وہ لوگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔'' سلیمان نے افسردگی سے اسے حالات سے آگاہ کیا۔

''یہ تو واقعی بری خبر ہے۔ امیر سخت پریشان ہوں گے۔'' اس نے تشویش کا اظہار کیا پھر خیال آنے پر پوچھا۔

''محمد صالح کہاں مصروف ہے؟ میری جب سے آنکھ کھلی ہے میں نے اسے نہیں دیکھا۔''

''تمہاری غشی کے دوران وہ مسلسل تمہارے پاس موجود رہا اور میری بھی بڑی مدد کروائی لیکن تمہیں ہوش میں آتے دیکھ کر باہر نکل گیا کہ آقا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔''

''وہ کیوں بھئی؟'' اسے سلیمان کی اطلاع نے حیران کیا۔

''کہتا تھا اتنے بہادر آقا کے سامنے اپنی صفائی کیونکر پیش کر سکوں گا۔ میں تو ان سے نظریں ملانے کے لائق نہیں رہا کہ میری موجودگی میں قافلے کی ایک عورت اغوا کر لی گئی۔''

''بے وقوف ہے وہ جو ایسا سوچتا ہے۔ میں کیا اس کے کردار کی بلندی اور بہادری سے واقف نہیں ہوں جو اس کے بارے میں کوئی بدگمانی کروں گا۔ میرے لیے وہ میری اپنی ذات کی طرح ہی قابل اعتبار ہے۔ اسے بلواؤ میرے پاس۔'' اس کے لہجے میں ہلکی ہلکی خفگی میں صالح کے لیے ڈھیروں محبت تھی۔ سلیمان خیمے کے دروازے تک گیا اور کسی کو صالح سے متعلق ہدایت دے کر واپس آ گیا۔

''امیر محترم کا کیا ارادہ ہے؟ کچھ معلوم ہوا کہ صفیہ بیگم کو اغوا کرنے والے کون ہیں اور ان کا کیا مقصد ہے؟'' ماتھے پر سوچ کی لکیریں لیے اس نے سلیمان سے سوال کیا۔

''اغوا کاروں کی طرف سے پیغام بھیجا گیا ہے۔ صفیہ بیگم اس وقت یہاں کے ایک مقامی حکمران قابوس کی تحویل میں ہیں۔ قابوس کی طرف سے امیر کو پیغام بھیجا گیا ہے کہ اگر وہ معزز خاتون کی باعزت رہائی چاہتے ہیں تو انہیں اس کے لیے ایک بڑی بھاری قیمت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ وہ یہاں کے کسی بھی علاقائی معاملے میں مداخلت کیے بغیر خاموشی سے اپنا قافلہ لے کر آگے بڑھ جائیں گے۔ بصورتِ دیگر سنگین نتائج اور طاقت کے استعمال کی دھمکیاں دی گئی ہیں۔'' سلیمان نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

''بڑی عجیب سی بات ہے۔ حکمران اس طرح کا طرزِ عمل اختیار نہیں کیا کرتے۔ بالفرض انہیں مال و دولت کی چاہ تھی تو اس صورت میں بھی عورتوں کو اغوا کرنے کے بجائے

براہِ راست ہم پر لشکر کشی کی جا سکتی تھی یا کم از کم محاصرہ ہی کر لیا جاتا تو ہم اپنی سلامتی کے لیے ان کا مطالبہ مان کر یہاں سے جانے پر مجبور ہو جاتے۔'' اس نے صورتِ حال جان کر اس پر تبصرہ کیا۔
''تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن کچھ ایسی باتیں بھی سامنے آئی ہیں جن کی روشنی میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس علاقے کے معاملات ٹھیک نہیں ہیں۔''
''کیسی باتیں......؟'' وہ سلیمان کی بات سن کر بے چین ہوا۔
''جو لوگ کل خریداری کے لیے آبادی میں گئے تھے انہوں نے بتایا ہے کہ وہاں انہیں جوان اور توانا مرد نہ ہونے کے برابر دکھائی دیے۔ زیادہ تر عمر رسیدہ اور ضعیف مرد حضرات تھے یا عورتیں اور بچے۔ یہاں تک کہ خرید و فروخت بھی زیادہ تر عورتیں ہی کر رہی تھیں۔ اس سے یہ لگتا ہے کہ بستی کے جوان مرد یا تو کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں یا پھر کسی معرکے وغیرہ پر گئے ہوئے ہیں۔''
''تمہاری دوسری بات زیادہ قرین قیاس محسوس ہوتی ہے۔ ایک ساتھ سارے جوان مردوں کا کسی حادثے کا شکار ہو جانا ذرا مشکل بات ہے البتہ دوسری بات کا بہت زیادہ امکان ہے خصوصاً اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہ امیرِ محترم کو کسی بھی علاقائی معاملے میں مداخلت نہ کرنے کی خصوصی ہدایت کی گئی ہے۔ یقینی طور پر اس بستی کے نوجوان قرب و جوار کی کسی دوسری بستی والوں کے ساتھ پنجہ آزما ہیں اور اپنے لڑنے والوں کے ہاتھ پیر مضبوط کرنے کے لیے قابوس کو مال و زر کی ضرورت ہے اس لیے وہ حکمران سے لٹیرا بن گیا ہے۔'' اس نے لیٹے لیٹے صورتِ حال کا بھرپور تجزیہ کر ڈالا۔
''واللہ، تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ میں امیرِ محترم کو بھی تمہاری رائے سے آگاہ کرتا ہوں لیکن برائے مہربانی میری واپسی تک تم اسی طرح آرام سے لیٹے رہنا بصورتِ دیگر کم از کم میں تمہارا علاج نہیں کروں گا۔'' خیمے سے باہر نکلنے سے قبل سلیمان نے اسے باقاعدہ دھمکی دی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا لیکن اس قہقہے کے نتیجے میں اس کے جسم میں درد کی جو لہریں اٹھیں، انہوں نے اس پر واضح کر دیا کہ واقعی فی الحال اس کی حالت نازک ہے۔
''صالح آنے ہی والا ہو گا۔ کوئی بھی ضرورت ہو اس سے کہنا، خود جگہ سے اٹھنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد واپس آ جاؤں۔'' سلیمان جاتے جاتے اسے ایک بار پھر ہدایت دے کر گیا۔ اس کی ہدایتیں اپنی جگہ لیکن وہ خود بھی اپنی حالت کو سمجھ رہا تھا اس لیے کسی حماقت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تکلیف کے ساتھ ساتھ کمزوری کا واضح احساس تھا۔ دماغ اگرچہ پوری طرح کام کر رہا تھا لیکن سلیمان سے اتنی دیر باتیں کرنے کی وجہ سے تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی تھکن کے زیرِ اثر اس نے آنکھیں موند لیں۔ شاید ہلکی سی غنودگی بھی طاری ہو گئی تھی اس لیے کسی کے اندر آنے کی آہٹ سن کر بھی آنکھیں کھولنے کی زحمت نہیں کی۔ ذہن میں خیال تھا کہ صالح آیا ہو گا۔ صالح سے اسے کافی باتیں کرنی تھیں لیکن فی الحال کچھ بولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے اس کام کو بعد پر ٹال دیا۔ یہ تو طے تھا کہ اسے سوتے پا کر صالح کہیں نہیں جائے گا اور وہیں رہ کر اس کا خیال رکھے گا۔
نیم غنودگی میں اپنے پاس صالح کی موجودگی کا یقین ایک معطر جھونکے نے ڈانواں ڈول کیا اور تصدیق کے لیے آہستہ سے آنکھیں کھولیں لیکن دیر ہو چکی تھی۔ ایک چمکتی ہوئی بے نیام کی تلوار کی نوک عین اس کی گردن تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی نظروں نے تلوار تھامنے والے ہاتھوں سے چہرے تک کا سفر نسبتاً تیزی سے طے کیا لیکن سیاہ نقاب اس کی نظروں کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس نے بے ساختہ ہی ایک گہری سانس لی۔ شب و روز آتشِ انتقام میں جھلستی ہستی کو بالآخر ایک سنہری موقع میسر آ ہی گیا تھا۔
''اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟'' کھنکتے لہجے والی کے ہونٹوں پر بڑا زہریلا سوال تھا۔
''مارنے اور بچانے کا اختیار تو ہر صورت میں ایک ہی ہستی کے پاس ہے۔ میرے رب نے اگر میری موت آپ کے ہاتھوں ہی لکھی ہے تو مجھے مرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس کی رضا پر اپنا سر جھکا دوں گا لیکن مرتے وقت یہ افسوس ضرور رہے گا کہ ایک بے معنی و بے مقصد انتقام لے کر بھی آپ اپنے دل کا سکون حاصل نہیں کر پائیں گی۔'' وہ ان جانوروں کی سی خوبو رکھتا تھا جو خطرے کو دیکھنے سے پہلے اسے سونگھ لیتے ہیں۔ جن کی حسِ شامہ مقابل کی کسی حرکت سے قبل اس کے جسم سے خارج ہوتی بو سے دشمنی اور دوستی کے جذبات کا تعین کر لیتی ہے اس لیے گردن تلوار کی نوک کے نیچے ہونے کے باوجود اس پر کسی قسم کی گھبراہٹ طاری ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی اضطراری حرکت کی اور نہایت اطمینان سے جواب دیا۔
''بہت خوب! ہم تو سمجھتے تھے کہ تم محض ہاتھ پیر چلانا

جانتے ہو لیکن تمہاری تو زبان بھی خوب چلتی ہے۔'' امیر زادی نے تلوار گردن سے ہٹا کر نیام میں ڈال لی۔

''اللہ رب العزت کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے تمام جسمانی اعضا بالکل ٹھیک حالت میں عنایت کیے ہیں اس لیے میں اپنے رب کی اس مہربانی کا فائدہ اٹھاتا ہوں اور ہر عضو سے اس کا متعین کردہ کام بخوبی لیتا ہوں۔'' اس نے ترت جواب دیا تو وہ ہنس دی۔ وہی سریلی گھنٹیوں کی سی ہنسی...... جو اسے ماضی میں کہیں، کسی ایسی ہستی تک لے جاتی تھی جسے بھولنے کی خواہش کے باوجود وہ کبھی بھلا نہ سکا تھا۔

''کیا ہوا، اچانک بولتی کیوں بند ہوگئی؟'' نقاب پوش حورم نے اس کے خاموش ہوجانے کو محسوس کیا۔

''طبیب سلیمان نے فی الحال میرے لیے سخت آرام تجویز کیا ہے۔ میں اس کی ہدایات سے انحراف کر کے واحد دستیاب معالج کو کھونے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا۔'' اس نے شگفتگی سے بہانہ بنایا۔

''واقعی! آپ کو بہت زیادہ آرام اور بہترین علاج کی ضرورت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری خاطر آپ کو اس قدر تکلیف برداشت کرنا پڑی۔ ہم خود پر کیے گئے آپ کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔'' اس کے الفاظ نے تصدیق کردی کہ اس نے جسے اغوا ہونے سے بچایا تھا، وہ امیرزادی حورم ہی تھی۔

''آپ اسے احسان تصور نہ کریں۔ آپ کے علاوہ قافلے میں شامل کوئی بھی دوسرا فرد مصیبت میں ہوتا تو میں وہی کرتا جو میں نے آپ کے لیے کیا۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''کسی اور کے لیے اتنی تکلیف اٹھانا الگ بات تھی اور ہمارے لیے ایسی زحمت کرنا الگ بات ہے۔ ہم نے آپ کے ساتھ جس قدر زیادتی کی اس کے بعد ہمارا کوئی حق نہیں تھا کہ ہم آپ سے ایسے احسان کی توقع رکھتے۔'' یکدم ہی امیرزادی حورم کا شوخ لہجہ رندھ گیا اور اس کی ہر ادا سے شرمندگی جھلکنے لگی۔

''وہ گزرے وقت کی بات ہے۔ میں اپنے قبولِ اسلام سے قبل کے ہر دشمن کو معاف کرچکا ہوں کیونکہ اسلام قبول کر کے میں ایک نئی زندگی میں داخل ہوچکا ہوں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے کے تمام سابقہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔ میرا رب اتنا مہربان ہے تو میں کیسے اپنے دل کو سخت رہنے دیتا۔ میرے رب نے میرے لیے معافی رکھی تو میں نے بھی اپنے دشمنوں کے لیے معافی کا فیصلہ کرلیا۔ میری تمام دشمنیاں اور دوستیاں اب بس میرے رب کے لیے ہیں۔ جو میرے رب کا دوست ہے، وہ میرا دوست اور جو میرے رب کا دشمن ہے وہ میرا دشمن۔'' یہ محمد صالح کی صحبت کا اثر تھا اور اس پر اس کے رب کی مہربانی کہ اتنے تھوڑے دنوں میں وہ اس مقام تک پہنچ گیا تھا۔

''سبحان اللہ۔ اللہ تمہیں دین پر استقامت دے۔ ہم اب تم سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم حالیہ واقعے سے قبل بھی تم سے شرمندہ تھے اور ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرتا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے تمہارے جرم سے کہیں زیادہ سخت سزا تجویز کی۔ تم اللہ کی مہربانی سے بچ گئے اور پھر مسلمان ہوگئے تو جہاں ایک طرف ہمیں خوشی ہوئی، وہیں احساسِ ندامت بھی مزید بڑھ گیا لیکن ہم خود میں اتنی ہمت نہ پیدا کرسکے کہ تمہارے روبرو آکر اس کا برملا اظہار کر پاتے، لیکن اب......'' اس نے لمحاتی توقف کیا۔

''اب تو گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ ہم خود کو یہاں آنے سے روک سکتے۔ ہمارے حکم پر سنبل موقع کی تلاش میں کئی گھنٹوں سے اس خیمے کے اطراف میں چکر لگا رہا تھا۔ ابھی سلیمان باہر نکلا ہے تو اس نے موقع غنیمت جان کر ہمیں یہاں پہنچایا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تم ہمارے تھوڑے کہے کو بہت جانو گے اور ہماری معذرت قبول کرتے ہوئے ہمارے لیے اپنے دل سے ہر منفی جذبہ نکال دو گے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو لڑھک کر اس کے نقاب میں جذب ہوگئے۔ اس منظر نے ساشا کو گنگ سا کردیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے زبان کو جنبش دے پاتا اس سے قبل ہی حورم یکدم مڑی اور تیزی سے خیمے سے باہر نکلتی چلی گئی۔

اس کے باہر جاتے ہی پردہ ہٹا اور محمد صالح اندر داخل ہوا اور تیزی سے چلتا ہوا سیدھا اس کے قریب آکر نظروں ہی نظروں میں اسے یوں ٹٹولنے لگا جیسے یقین کرلینا چاہتا ہو کہ اسے کوئی معمولی سا بھی گزند تو نہیں پہنچا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ میں بالکل بہ خیریت ہوں۔'' ساشا نے اسے ٹوکا۔

''اللہ آپ کو ہمیشہ اپنے فضل و کرم کے سائے میں رکھے۔ میں نے دور سے سنبل اور سردارزادی کو آپ کے خیمے سے نکلتے دیکھا تھا اس لیے ذرا تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔''

''تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے مجھ پر اپنا فضل ہی کیا ہے کہ کل تک جو جان کے دشمن تھے، آج ان کے دل میرے لیے موم کردیے ہیں۔'' اس نے مختصراً صالح کو حورم کی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

''رب العزت کا احسان ہے جو اس نے دشمنوں کی تعداد میں کمی کر دی۔'' سن کر صالح نے بھی شکر گزاری کا اظہار کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود کچھ بدہیت اور بھورے سے رنگ کے پھل کے سخت خول کو خنجر کی مدد سے کاٹ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟'' ساشا نے تجسس کا اظہار کیا۔

''ایک مقامی گڈریے سے مجھے اس علاقے میں اگنے والے اس پھل کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ اس کے مطابق یہ پھل ذائقے میں خوشگوار نہ ہونے کے باوجود حیرت انگیز خوبیوں کا مالک ہے۔ اسے کھانے سے زخم جلد ٹھیک ہو جاتے ہیں اور جسمانی توانائی بھی تیزی سے بحال ہو جاتی ہے۔ میں گڈریے کی نشاندہی پر بڑی مشکل سے اس پھل کا درخت تلاش کر کے اسے آپ کے لیے لایا ہوں۔ آپ اسے کھائیں، انشاء اللہ تعالیٰ یہ آپ کو شفایاب ہونے میں ضرور مدد دے گا۔'' اسے پھل کے متعلق آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑے انہماک سے خول کے اندر موجود گودا نکالنے میں مصروف تھا۔ ساشا سمجھ گیا کہ سلیمان کی طرف سے پیغام بھیجے جانے کے باوجود اسے آنے میں اتنی تاخیر کیوں ہو گئی تھی۔

''یہ لیجیے کھائیے۔'' گودا الگ کر لینے کے بعد اسے ایک پیالی میں نکالنے کے بعد وہ اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ ساشا اس کے خلوص کو رد کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے منہ کھول دیا۔ پھل واقعی ذائقے میں اچھا نہیں تھا لیکن وہ اپنے باپ کی بدولت اس سے کئی گنا زیادہ تلخ اور بدمزہ ذائقوں کو چکھ چکا تھا اس لیے اس بدمزہ پھل کے گودے کو بھی آرام سے حلق سے نیچے اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔

''شکریہ محمد صالح! میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسے مخلص شخص کا ساتھ ملا۔'' صالح گودا کھلانے کے بعد رومال سے اس کا منہ صاف کر چکا تو اس نے ممنونیت سے کہا۔

''ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں آقا!''

''شرمندہ تو تم مجھے کرتے ہو محمد صالح! تم کیوں سمجھتے ہو کہ تم پر تمہارے اختیار سے بڑھ کر فرائض عائد ہوتے ہیں۔ صفیہ بیگم کے اغوا میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا لیکن تم نے خواہ مخواہ خود کو موردِ الزام ٹھہرا کر میرے لیے تکلیف کا سبب پیدا کیا۔'' وہ شدت سے آرام کی خواہش محسوس کر رہا تھا لیکن صالح سے اس موضوع پر گفتگو کرنا بھی ضروری تھا۔

''میں شرمندہ ہوں آقا کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔'' وہ سچ مچ بہت شرمندہ نظر آتا تھا۔

''یہ تمہاری سعادت مندی ہے صالح کہ تم اب بھی مجھے آقا کہتے ہو لیکن میرے دل میں تمہارے لیے ایک دوست اور بھائی کے جذبات ہیں۔ تمہاری حد سے زیادہ احتیاط میرے ان جذبات کو ٹھیس پہنچاتی ہے۔'' اس نے اپنا چہرہ اس طرح بستر پر ٹکا رکھا تھا کہ اس کے چہرے کا صرف بائیں رخ صالح کو نظر آ رہا تھا لیکن وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں موند لی ہیں اور بند آنکھوں کے ساتھ بات کر رہا ہے۔ اسے بے اختیار ہی اپنے آقا پر پیار آیا۔

''آئندہ آپ کو مجھ سے ایسی کوئی شکایت نہیں ہو گی میرے آقا! بس اب آپ اطمینان سے آرام کیجیے۔ میں آپ کے قریب ہی موجود رہوں گا۔'' صالح نے اسے یقین دہانی کروائی تو اس نے سکون سے آنکھیں موند لیں۔ کچھ دواؤں کا اثر تھا اور کچھ نقاہت کہ آنکھیں بند کرتے ہی نیند نے اسے دبوچ لیا۔ کافی دیر تک سوتے رہنے کے بعد آنکھ کھلی تو سلیمان واپس آ چکا تھا اور صالح اس کے مقابل چینی کا بنا ایک پیالہ لیے کھڑا تھا۔ سلیمان اس پیالے میں چھوٹی سی ایک شیشی میں سے کسی عرق کے قطرے ٹپکا رہا تھا۔

''اچھا ہوا تم جاگ گئے۔ تمہاری دوا اور خوراک کا وقت ہو گیا ہے۔ میں خود بھی تمہیں جگانے ہی والا تھا۔'' سلیمان اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔

''میں بستر پر بے بس پڑا ہوں۔ تم دونوں مل کر مجھ پر جو چاہے تجربات کرتے رہو۔'' اس نے قصداً ایک آہ بھری۔

''انشاء اللہ ہمارے تجربات کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا۔'' سلیمان نے شیشی کا ڈھکن بند کرتے ہوئے اسے جواب دینے کے ساتھ ساتھ صالح کو بھی اشارہ کیا۔ صالح ہاتھ میں موجود پیالہ لیے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

''اب تمہارے زخم کی حالت قدرے بہتر ہے۔ میں تمہیں بستر سے اترنے کی تو اجازت نہیں دوں گا لیکن اب تم دائیں پہلو پر کروٹ کے بل لیٹ سکتے ہو۔'' سلیمان کی طرف سے دی گئی اجازت اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ مسلسل اوندھے لیٹے رہنے کی تکلیف اٹھانے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ ایک معمولی سی کروٹ بھی انسان کے لیے اللہ کا احسان ہے۔

''امیر محترم سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ کوئی تازہ خبر ساتھ نہیں لائے؟'' سبزیوں اور بکرے کے گوشت کے ریشوں سے بنی خوش ذائقہ یخنی پہلو کے بل لیٹ کر پیتے ہوئے اس نے سلیمان سے دریافت کیا۔

''امیر محترم فی الحال صرف مشاورت کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں تمہاری رائے سے آگاہ کیا تھا جسے اکثریت

نے قرینِ قیاس قرار دیا اور ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ حاکم قابوس سے تاوان کی ادائیگی کے لیے کچھ مزید مہلت مانگ لی جائے اور اس دوران کسی فرد کو بھیس بدل کر آبادی میں بھیجا جائے تاکہ وہ اصل حالات کا کھوج لگا لے۔'' سلیمان نے اپنی دواؤں کی صندوقچی کی ترتیب درست کرتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

''پھر کون جا رہا ہے اس کام کے لیے؟'' اس نے گوشت کے ریشوں کو چبا کر نگلتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

''فی الحال تو کوئی نام تجویز نہیں ہوا ہے۔ نہ ہی کسی نے رضاکارانہ طور پر اس کام کی حامی بھری ہے۔ شاید امیر کسی کو حکماً ہی یہ ذمے داری سونپ دیں۔''

''ظاہر ہے یہ ایک خطرناک کام ہے۔ اس کام کو انجام دینے والے کو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوگا۔ کسی کو ذرا بھی شک ہوگیا کہ ان کے درمیان ایک جاسوس موجود ہے تو سمجھو اس شخص کی خیر نہیں ہوگی۔'' اس نے سنجیدگی سے صورتِ حال پر تبصرہ کیا۔ اگر وہ اٹھ کر چلنے پھرنے کے لائق ہوتا تو یہ ذمے داری بخوشی اپنے سر لے لیتا لیکن فی الحال تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں اس خدمت کے لیے خود کو پیش کرسکتا ہوں۔'' اتنی دیر سے خاموشی سے ان کی گفتگو سنتے صالح نے جھجکتے ہوئے عرض کی۔

''خود کو بہادر ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے صالح کو گھورا۔

''آپ کو میری بہادری پر کوئی شک نہیں ہے اس بات کا مجھے یقین آچکا ہے۔ میں اپنی خدمات محض اس لیے پیش کررہا ہوں کہ مجھے کچھ عرصے نصرانیوں کے درمیان رہنے کا تجربہ ہوچکا ہے اور میں ان کی عادات واطوار سے لے کر عقائد تک کچھ واقفیت رکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں میری ذات ایک بہتر انتخاب ثابت ہوسکتی ہے۔'' اس بار صالح کا انداز بے حد پُراعتماد تھا۔ ساشا کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔

''اگر تمہیں خود پر بھروسا ہے تو میں ہرگز بھی تمہیں نہیں روکوں گا۔ جاؤ...... اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلو۔'' اس نے صالح کا شانہ تھپکا تو مسرت سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس پل وہ ایک عام انسان سے وہ مجاہد ہوچکا تھا جو موت کی ہولناکی سے ڈرے بغیر بے جگری سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ساشا کو اس پر پیار آیا اور اس نے اپنے دل میں چپکے سے اس کی کامیابی کی دعا کر ڈالی۔

☆☆☆

''پتا نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ہمارے لوگوں میں بہت مایوسی اور بددلی پھیلی ہوئی ہے۔'' ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی ثریا اپنے ساتھ بیٹھی سارہ سے مخاطب تھی لیکن سارہ نے کوئی جوابی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔

''کسی کو اس کے رویّے کے لیے غلط بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارے لوگ پہلے ہی بہت دکھ اور پریشانیاں اٹھا چکے ہیں۔ انہوں نے صرف اس امید پر ہجرت اختیار کی تھی کہ نئی سرزمین پر انہیں ایک محفوظ اور پُرسکون ٹھکانا میسر آسکے گا لیکن سب کچھ ان کی امیدوں کے برعکس ہو رہا ہے اور وہ اپنے سروں پر جنگ کے سائے منڈلاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو ان سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔ ان کے اندر ایک اور لڑائی میں حصہ لینے کا حوصلہ نہیں ہے۔'' ثریا کو بھی اس کے جواب سے زیادہ اپنی پریشانی کا اظہار کرنے سے دلچسپی تھی اس لیے بولتی جارہی تھی۔

''جو لڑنے کے لیے تیار نہیں اسے چاہیے کہ خودکشی کرلے کیونکہ لڑائی تو اب ہم پر مسلط ہوچکی ہے اور ہمیں ہر حال میں موت کا سامنا کرنا ہے۔'' وہ جو کسی فکر میں مبتلا دکھائی دیتی تھی، جھنجلا کر تلخ لہجے میں بولی۔

''ہائیں...... یہ کیسی بات کہی تم نے؟'' ثریا اس کے انداز پر حیران ہوئی۔

''سارہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ واقعی اب ہمارے پاس مرنے یا مار دینے کے سوا کوئی انتخاب نہیں رہا ہے۔'' طیبہ جو اسی وقت وہاں پہنچی تھی اور سارہ کی بات سن چکی تھی، اس کی تائید میں بولی۔

''تم بھی......'' ثریا کو گویا صدمہ ہوا۔

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔ لڑ کر مریں گے تو کم از کم شہادت کا رتبہ تو پائیں گے ورنہ دوسری صورت میں مقابل ہمیں تہ تیغ کرتے ہوئے یہ تفریق ہرگز نہیں کرے گا کہ ہم میں سے کون اس کے خلاف لڑنا چاہتا تھا اور کون نہیں۔ ہمارے پاس اب صرف عزت کی موت کے انتخاب کی گنجائش باقی ہے۔'' طیبہ ایک اٹل حقیقت کو بیان کررہی تھی۔

''سردارزادی نے بھی اپنے خطاب میں کچھ ایسی ہی باتیں کی تھیں لیکن ہمارے لوگوں نے اس کی باتوں پر اس لیے کان نہ دھرے کہ ان کے نزدیک وہ ایک غیر عورت

ہے۔'' ثریا افسردگی سے بولی۔

'' تو چلیے، آپ اور میں چل کر انہیں سمجھاتے ہیں۔ ہم تو ان کے اپنے ہیں۔ وہ ہماری بات سمجھیں گے۔'' طیبہ پُرامید تھی۔ ثریا نے حیرت سے اسے دیکھا اور اپنے جذبات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

'' تم ہر قدم پر حیران کر رہی ہو طیبہ! تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تم وہی ہو جو ابھی کچھ عرصے پہلے تک اپنے غموں میں ڈوب کر ہوش و حواس کھوئے بیٹھی تھیں۔''

'' وہ میری نادانی تھی کہ اپنی تربیت و تعلیم کے برخلاف ذاتی غم کو خود پر حاوی کر لیا تھا۔ الحمدللہ! موجودہ حالات نے میرے شعور کو جگا دیا ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ اللہ نے مجھ سے میرا ہر عزیز رشتہ لے لینے کے باوجود اگر مجھے زندہ رکھا ہوا ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی مقصد تو ہوگا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی ایسا کام لینا چاہتا ہو جو مجھے سرخرو کر دے۔ میں اللہ کی دی ہوئی زندگی کو صرف اپنے غموں پر ماتم کرنے میں گزار دوں گی تو روزِ حشر میرے نامۂ اعمال میں ایسی کون سی اچھائی موجود ہوگی جو مجھے جہنم کی آگ سے بچا لے۔ بس اسی سوچ نے مجھ میں بہتری پیدا کر دی اور میں نے اس چند روزہ زندگی کے مصائب کو صبر سے سہہ کر اپنی آخرت کی بھلائی کے انتخاب کا فیصلہ کر لیا۔'' اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز کیے سادگی سے یہ سب کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کوئی انوکھی سی چمک تھی۔ اس چمک نے اس کے حسین چہرے کے جمال میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

'' ماشاء اللہ! رب تعالیٰ نے تمہیں خوب صورت چہرے کے ساتھ ساتھ بہت خوب صورت سوچ بھی عنایت کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے تمہارے لیے آخرت کے علاوہ اس دنیا میں بھی ضرور کوئی انعام رکھا ہوگا۔'' ثریا نے اسے محبت سے گلے لگا لیا۔

'' اس خوش گمانی کے لیے شکریہ! چلیے چل کر اپنی ساتھی خواتین سے بات کرتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے ہنسی پھر سارہ کی طرف رخ کر کے بولی۔

'' آپ کی سہیلی کو لے جاؤں سارہ بہن! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

'' بالکل بھی نہیں۔'' وہ جو اپنے خیالات سے نکل کر ان کی گفتگو کی طرف متوجہ ہو چکی تھی اور خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی، دھیرے سے مسکرا کر بولی تو وہ دونوں وہاں سے چل پڑیں۔

سارہ جانتی تھی کہ انہوں نے جان بوجھ کر اسے اپنے ساتھ آنے کی دعوت نہیں دی ہے کیونکہ وہ جن لوگوں کے خلاف اپنے لوگوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے جا رہی تھیں وہ صرف ثوبان اور اس کے ساتھی نہیں تھے۔ ان کے ساتھ نصاریٰ بھی شامل ہو چکے تھے اور یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ مسلمانوں کے اس گروہ کی پناہ میں ہوتے ہوئے بھی خود بہرحال ایک نصرانی تھی۔ کم از کم اس حد تک ضرور کہ اس کی رگوں میں نصرانی والدین کا خون دوڑ رہا تھا اور وہ نصرانیت میں ہی اپنے لیے راہِ حق کی متلاشی تھی۔

لیکن کیا اسے اپنی اس تلاش میں کامیابی ہو سکی تھی؟ اس کا پہلا ہی تجربہ بے حد بھیانک تھا۔ وہ اس بھیانک تجربے کو کیسے فراموش کرتی کہ اس تجربے کی یادگار کے طور پر چھ مظلوم راہبائیں ان کے قافلے میں شامل ہو چکی تھیں اور ان مظلوموں کو پناہ دینے کی پاداش میں نصرانی اس لٹے پٹے قافلے کے دشمن بن چکے تھے۔ داؤد، ثریا اور طیبہ سمیت قافلے کے بیشتر افراد ان حقائق سے واقف تھے لیکن اب تک کسی نے اس کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی دل آزاری ہوتی۔ وہ پہلے دن کی طرح آج بھی ان کے درمیان محفوظ و مامون تھی۔

'' ان پیارے لوگوں کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے کیا میں ایک چھوٹی سے بے ایمانی نہیں کر سکتی؟'' حالات کے بارے میں سوچتے سوچتے ایک بار پھر اس کے ذہن میں وہی خیال ابھرا جس نے اتنی دیر سے اسے غور و خوض پر مجبور کر رکھا تھا۔

'' میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ بے ایمانی ہی تو کی ہے۔ اگر ایک بار اور ایسا کر جاؤں گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔'' کسی کی شبیہہ اس کے ذہن کے پردے پر لہرائی۔

'' میں تمہاری جس امانت کو اپنی جان سے لگائے پھر رہی ہوں، کسے معلوم ہے کہ زندگی میں کبھی اسے تم تک پہنچانے کا موقع ملے گا بھی یا نہیں۔ بظاہر تو اب ہمارے دوبارہ ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہمیں اب ایک دوسرے سے دور جانے کہاں کہاں بھٹکتے پھرنا ہے۔'' وہ اس کے لیے اداس تھی تو یہ کوئی شعوری عمل نہیں تھا۔ وہ اس کے چاہے بغیر بھی اس کے دل و دماغ پر حکمرانی کرتا تھا۔

'' جب ملنا ایک خواب ہی ہے تو پھر کیوں نہ میں تھوڑی سی خیانت کر ہی ڈالوں۔ میں نے اور تم نے زندگی میں مشکل ہی سے کوئی اچھا کام کیا ہوگا۔ کیا معلوم میری اس خیانت سے ہم دونوں کے اعمال نامے میں کچھ اچھائیاں ہی

لکھ دی جائیں اور یہ جو مظلوم لوگ مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں، ان کے سروں پر سے یہ مصیبت ٹل جائے۔''

ایک نیکی کے خیال نے اس کی سوچ بچار کے سلسلے کو مزید دراز نہیں ہونے دیا۔ پہلے اس نے خلوت میں جاکر اپنے محفوظ تین قیمتی ہیروں میں سے ایک ہیرا الگ کیا پھر داؤد بن معیز کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ وہ اسے قریب میں ہی مل گیا۔

''میں ثریا اور تم سے ملنے کے لیے ہی آرہا تھا۔'' بظاہر وہ خوشگوار لہجے میں بات کررہا تھا لیکن وہ اس کے چہرے پر رقم تھکن اور تفکر پڑھ سکتی تھی۔

''ثریا تو طیبہ کے ساتھ ایک اہم کام میں مصروف ہے، فی الحال آپ مجھ سے ہی ملاقات کرلیجیے۔'' جواب دیتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تمہیں مجھ سے کوئی اہم بات کرنی ہے۔'' اس نے پل بھر میں اس کا مقصد بھانپ لیا۔

''بات تو کرنی ہے لیکن پہلے یہ بتائیں کہ ہم سے ملاقات کے لیے کیوں آرہے تھے؟'' اس نے داؤد کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی۔

''میں تیمور کے ساتھ قریبی مسلمان بستیوں سے مدد مانگنے کی مہم پر جارہا ہوں۔ تم لوگوں سے کہنا تھا کہ ہماری کامیابی کے لیے دعا کرو۔''

''وہ تو ہم آپ کے بغیر کہے بھی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔'' اس نے بےساختگی سے جواب دیا۔

''پھر تو مجھے اپنی خوش نصیبی پر ناز کرنا چاہیے کہ میں کسی کی دعاؤں میں شامل ہوں۔'' داؤد کے ہونٹوں کو ایک مغموم سی مسکراہٹ نے چھوا۔

''کیا رقم کا انتظام ہوگیا ہے؟'' اس نے اس معنی خیز جملے پر ردعمل ظاہر کیے بغیر سابقہ موضوع پر گفتگو جاری رکھی۔

''اونہوں۔'' داؤد نے نفی میں گردن ہلائی اور مزید تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''ہم لوگوں کے پاس تو مختصر زادِ راہ کے سوا پہلے ہی کچھ نہیں ہے اور یہاں والے بھی عجلت میں کچھ خاص مال و اسباب لانے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ ویسے بھی عام لوگوں کے پاس کون سے قیمتی ہیرے جواہرات ہوتے ہیں جو اتنی بڑی ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ بس سردار زادی لیلیٰ نے ہی اپنے پاس موجود کچھ رقم فراہم کی ہے جس سے کچھ دنوں کے لیے خوراک اور چند ہتھیاروں کا بمشکل انتظام ہوسکے گا۔'' وہ مایوسی کا اظہار کرنے والا آدمی نہیں تھا لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ مشکلات کا ادراک اسے بہت زیادہ خوش گمانیاں بھی پالنے نہیں دے رہا۔

''اگر میں ان مشکلات کا کوئی حل پیش کروں تو کیا آپ اسے قبول کرلیں گے؟''

''قبول نہ کرنے کا کیا سوال؟ میں تو اسے غیبی مدد سمجھوں گا لیکن وہ حل کیا ہے؟'' اس کے لفظ لفظ سے حیرت و تجسس ٹپک رہا تھا۔

''حل یہ رہا۔'' اس نے اپنی بند مٹھی اس کے سامنے لاکر کھول دی۔ جگمگاتے ہوئے ہیرے نے گویا اس کی پوری ہتھیلی پر روشنی بکھیر دی۔

''یہ کیا ہے؟'' داؤد کی آنکھیں پھٹیں۔

''غیبی مدد۔'' اس نے برجستگی سے جواب دیا۔

''پھر بھی کچھ تفصیل تو بتاؤ۔'' اس نے اصرار کیا۔

''تفصیل کیا بتانی ہے؟ آپ کو غیبی مدد کی ضرورت تھی وہ مل گئی۔ اب بس قبول کیجیے۔ حجت بازی بھی کفرانِ نعمت کے برابر ہوتی ہے۔''

''مجھے جواہرات کی خاص پہچان نہیں ہے لیکن اسے دیکھ کر ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت قیمتی ہے۔'' وہ اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا ہیرا اٹھانے میں اب بھی متامل تھا۔

''اگر یہ ہیرا ان مظلوم اور دکھی انسانوں کے لیے مداوا بن گیا تو واقعی بہت قیمتی ہوگا ورنہ اس کی حیثیت بس ایک پتھر سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔'' اس بار اس نے خود وہ چمکتا ہوا ہیرا داؤد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''بہت شکریہ سارہ! میں اپنی قوم پر تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔'' اس کا لہجہ رقت آمیز ہوگیا۔

''میں نے قوم و مذہب سے بالاتر ہوکر اس وقت صرف اور صرف انسانیت کی بھلائی کا سوچا ہے لیکن مجھے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ میں آج تک جتنے بھی لوگوں سے ملی ہوں، کردار و اخلاق کے اعتبار سے میں نے آپ سب کو ان سے بلند پایا ہے۔ شاید کردار کی یہ بلندی آپ کی مذہبی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔'' اس کی زبان نے اس بات کا اقرار کیا جسے وہ محسوس کرتی رہی تھی۔

''اگر ہم مسلمان پوری طرح اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے تو آج ہمیں یہ دن دیکھنے کو کیوں ملتا۔ ہمارے اسلاف نے تو اپنے کردار و اخلاق کے بل بوتے پر ایک دنیا پر حکمرانی کی ہے۔'' داؤد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر دھیرے سے بولا۔

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ”آفیشل پیج“ کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تا کہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

''شکریہ سارہ...... میں اس بارے میں پہلے ساتھیوں کو آگاہ کردوں پھر ثریا سے ملنے کے لیے دوبارہ آتا ہوں۔'' بے پناہ ممنونیت کا اظہار کرتے ہوئے وہ تیز قدموں سے وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس غیر متوقع مدد نے اس کے اندر جوش سا بھر دیا تھا لیکن جوش میں بھی اس نے ہوش نہ کھوئے اور سیدھا سردار زادی اور اس کے مقربین کے پاس جانے کے بجائے اپنے قابلِ اعتماد ساتھیوں سے مشاورت ضروری سمجھی۔

''عبدالمالک جہاں بھی ہے اس سے کہو مجھ سے آکر ملے۔ میں حاطب کے پاس ملوں گا۔'' راستے میں ایک ساتھی کو حکم دے کر وہ سیدھا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں حاطب کے لیے عارضی خیمہ لگایا گیا تھا۔ ساز و سامان کی کمی کے باعث بس گنے چنے افراد کے لیے ہی یہ سہولت مہیا کی جاسکتی تھی۔ حاطب اپنی سن رسیدگی کے باعث اس رعایت کا حق دار قرار پایا تھا۔ داؤد پُرجوش سا اس کے خیمے میں پہنچا تو اس نے اپنے فرشی بستر سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

''مجھے آپ کے آرام میں خلل ڈالنے پر افسوس ہے لیکن ایک اہم معاملہ درپیش تھا اس لیے آپ کو زحمت دی۔'' داؤد نے اپنی آمد کی وضاحت کی۔

''اگر یہ چراغ آخری شب کسی کام آگیا تو یہ محض خوش قسمتی ہوگی۔ آرام کا کیا ہے، سفرِ زندگی کا اب بس اختتام ہی ہے پھر آگے آرام ہی آرام ہے۔'' بوڑھا حاطب جو اس سفر میں ان کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہا تھا، سفر کی مشکلات سہتے سہتے کچھ اور بھی زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا تھا، شفقت سے بولا۔

''اللہ رب العزت آپ کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے۔'' داؤد نے خلوص سے کہا۔

''ان باتوں کو چھوڑیے اور وہ مقصد بیان کیجیے جس کے لیے آپ نے زحمت فرمائی ہے۔'' حاطب نے اس کی آمد کا مقصد جاننا چاہا۔

''میں آپ سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے ایک چیز دیکھیے۔'' اس نے ہیرا حاطب کی نظروں کے سامنے کیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر ہیرے کا جائزہ لیا اور یکدم ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''کیا میں اسے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھ سکتا ہوں؟'' سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

''کیوں نہیں۔'' داؤد نے ہیرا اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔ وہ ہر زاویے سے اس کا جائزہ لیتا رہا پھر بلند آواز میں بڑبڑایا۔

''ناقابلِ یقین......''

''میں سمجھا نہیں۔'' داؤد نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ کو یہ ہیرا کہاں سے ملا؟'' اس نے داؤد کی الجھن کو نظرانداز کرکے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' حاطب کا انداز اسے فکر میں مبتلا کرگیا۔

''میرے حساب سے یہ ہیرا دو میں سے بس ایک شخص کی ملکیت میں ہونا چاہیے تھا۔ کیا آپ مجھے اس ہیرے کے مالک سے ملواسکتے ہیں؟'' حاطب کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''وہ کوئی مرد نہیں ہے۔'' داؤد نے اسے آگاہ کیا۔

''پھر اسے اس ہیرے کی ملکیت کا دعویدار بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' حاطب نے اٹل لہجے میں اعلان کیا۔

''مگر مجھے یہ ہیرا ایک عورت نے ہی عطیہ کیا ہے۔'' وہ حاطب کے دعوے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''تو پھر یہ طے ہے کہ وہ کوئی دھوکے باز اور فریبی عورت ہے جس نے جانے کس طریقے سے اسے اس کے مالک سے حاصل کرلیا ہے۔'' حاطب نہیں جانتا تھا کہ وہ کسے ان بُرے القابات سے نواز رہا ہے لیکن پھر بھی داؤد کے دل کو تکلیف ہوئی۔

''میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ یہ ایک اکیلا ہیرا نہیں ہے۔ اس جیسے مزید دو ہیرے اور بھی موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو اس عورت سے تصدیق کرسکتے ہیں۔'' اس کی کیفیت سے بے خبر حاطب اعتماد سے بولتا جارہا تھا۔ اس کا اعتماد بتا رہا تھا کہ اس کے دعوے کی بنیاد ٹھوس ہے۔

''عبدالمالک! سارہ کو بلاکر یہاں لاؤ۔'' اس نے خیمے میں اسی وقت داخل ہونے والے عبدالمالک کو حکم دیا تو اس کی آواز میں ایک محسوس کیا جانے والا کھوکھلا پن تھا اور دل انجانے خوف سے لرزے جارہا تھا۔ سارہ اس کی کوئی نہیں تھی، نہ ہی اس سے ایسا کوئی رشتہ تھا کہ اس کا جرم اس کے لیے باعثِ شرمندگی بنتا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتا جو اس دشمنِ جاں کو کسی طور مجرم کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

پُرخطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

گھونچو

منظر امام

خوبصورت لمحے جب ریت کے مانند ہاتھوں سے پھسل جائیں تو اکثر آنکھوں میں ڈیرا ڈال لیتے ہیں جن کی چبھن ہر پل بے چین کیے رکھتی ہے۔ وہ بھی انہی لمحوں کے اسیر تھے اور دونوں ہی پچھتاوے میں مبتلا بھی۔

چہرے پر معصومیت کا پردہ ڈالے ایک عاشق کی دل سوزی کا قصہ

کیا لکھوں، کیوں لکھوں؟

یہ بہت اہم سوال ہوتا ہے کہ جب طبیعت ترنگ میں ہو اور دل کو سکون ہو، اس وقت قلم بھی ساتھ دیتا ہے۔

اور جب حالات ایسے ہوں کہ پوری دنیا ایک جیل بن چکی ہو، ہر طرف سناٹا ہو، لوگ باہر نکلتے ہوئے بھی خوف میں مبتلا ہوں، اس وقت کیا لکھا جائے؟

جیسے آج کل ہے۔ کہیں پر کوئی فوجی، کوئی پولیس والا بندوق اٹھائے نہیں کھڑا ہے۔ اس کے باوجود ایک ڈر ہے۔

ایک خوف ہے۔ ہم ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ یہ خوف کورونا کا ہے۔

ایک ایسے جرثومے کا جو ننگی آنکھ سے دیکھا بھی نہیں جاتا۔ جس کی موجودگی کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود اس کے قدموں کی چاپ ہر طرف سے آتی محسوس ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ صدیوں کے بعد انسان پر ایسا وقت آیا ہوگا۔

میں نے جب اس عورت کو دیکھا تو اس سے ہمدردی بھی محسوس ہوئی اور اس پر غصہ بھی آنے لگا۔ ان حالات میں ایسے گھر میں رہنا چاہیے تھا۔ وہ بچے کو لے کر باہر گھوم رہی تھی۔ میں اس عورت کو نہیں جانتا تھا۔ میں اس وقت اپنے آفس سے گھر واپس آرہا تھا۔ میں نے گیٹ پر اس عورت کو کھڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک بچے کا ہاتھ تھامے میرے گھر سے آگے جارہی تھی۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ تیس پینتیس سال کی عورت تھی۔ بچہ چھ سات سال کا ہوگا۔ اس نے بہت صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک غبارہ تھا جو پہلے پھولا ہوا ہوگا لیکن اب پچک گیا تھا۔ اس کی ہوا ختم ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسی غبارے سے کھیلتا ہوا چلا جارہا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی ریورس کی اور ان دونوں کے پاس پہنچ کر گاڑی روک لی اور اس وقت میں نے اس عورت کو پہچان لیا۔ وہ رشیدہ تھی جس کو کالج کے زمانے میں، میں روشو پکارا کرتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی ہوا کرتی تھی۔ اب بھی اس کے وہی تیکھے نقوش تھے جنہوں نے پورے کالج کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

میں نے اسے آواز دی۔ ''روشو!''

وہ رک گئی۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا، پھر لہک کر بولی۔ ''ارے گھونچو! تم یہاں کہاں؟''

وہ مجھے گھونچو ہی کہا کرتی تھی اور ابھی تک اسے یاد تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کھڑی کردی۔ گاڑی سے باہر آگیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جبکہ وہ بچہ بھی حیران سا دیکھے جارہا تھا۔

''روشو! یہ میرا گھر ہے۔'' میں نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور تم! تم اس طرف کیسے؟''

''میں بھی یہاں سے کچھ فاصلے پر رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''ڈرائیور گاڑی لے کر مکینک کے پاس گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ پیدل ہی چلتی ہوں۔ تھوڑا سا تو فاصلہ ہے۔''

''کمال ہے، اتنے قریب رہ کر بھی ہم برسوں بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی قریب کے فاصلے بھی بہت دور ہوجاتے ہیں اور کبھی دوریاں بہت پاس آجاتی ہیں۔''

''خیر چھوڑو یہ سب۔ ہم گھر چل کر باتیں کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ، یہ صاحب زادے کون ہیں؟''

''ارے گھونچو۔'' اس نے وہی پرانے انداز سے کہا۔ ''ظاہر ہے میرا بیٹا ہے۔ ساجد نام ہے اس کا۔''

''ہیلو۔'' میں نے مصافحے کے لیے بچے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ہیلو۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''روشو! چلو گھر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ میرا ڈرائیور......''

''اسے فون کردینا۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''

''گھونچو! کیوں اپنی بیوی سے مار کھلواؤ گے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ بہت اچھی ہے اور تمہیں جانتی بھی ہے۔''

''مجھے جانتی ہے...... کس طرح؟''

''میرے حوالے سے۔'' میں نے کہا۔ ''میں درجنوں بار تمہارا ذکر کرچکا ہوں۔''

میں ان دونوں کو اپنے گھر لے آیا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ہمیں دیکھ کر فوراً گیٹ کھول دیا تھا۔

''گھونچو۔'' اس نے ستائشی نگاہوں سے گھر کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا گھر تو بہت شاندار ہے۔''

''تھینک یو۔''

روحیلہ میرے ساتھ ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔

''یہ محترمہ کون ہیں؟''

''ذرا پہچانو تو......''

''تم بتاؤ۔''

''میں یہ بتا چکا ہوں کہ اس دنیا میں صرف ایک ہے جو مجھے گھونچو کہہ کر پکارتی ہے۔''

''ہاں، ہاں روشو؟''

''ہاں، یہ روشو ہیں۔ موصوفہ میرے مکان سے کترا کر آگے جارہی تھیں کہ میں نے دیکھ لیا۔''

روحیلہ نے آگے بڑھ کر روشو کو گلے لگالیا۔

کچھ دیر بعد ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں

کررہے تھے۔ دونوں خواتین کا رویّہ ایسا تھا جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ بچے کو کھیلنے کے لیے میں نے کچھ کھلونے دے دیے تھے۔ وہ ان ہی میں الجھا ہوا تھا۔

بہت کچھ پتا چل گیا تھا۔ روشو کی شادی ایک مہذب شخص راشد سے ہوئی تھی۔ اس کا اپنا کاروبار تھا۔ یہ رشتہ گھر والوں نے طے کیا تھا۔ میں اس زمانے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا اسی لیے مجھے روشو کی شادی کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ واپس آنے پر معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہوگئی ہے۔ ایک بار ملاقات ہوئی تو میں نے بڑی گرمجوشی سے مبارکباد دی۔ وہ خوش تھی۔ ہمارے درمیان جو رشتہ تھا وہ صرف دوستی کا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ میں اس کی شادی کا دکھ لے کر بیٹھ جاتا۔

ایسے تو کئی رشتے ہوتے ہیں مگر یہ دوستی کے رشتے ہوتے ہیں جو ایک عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ خوبصورت بات یہ ہے کہ اس رشتے میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ دوست کس قبیلے اور کس رنگ کا ہے۔ بس دوستی ہی سب سے بڑا اصول ٹھہرتی ہے۔

روشو کچھ دیر بعد واپس چلی گئی تھی۔ اس کا ڈرائیور نہیں آیا تھا اسی لیے میں ہی اسے پہنچانے چلا گیا۔

''یار! تمہاری بیوی تو بہت اچھی ہے۔'' روشو نے راستے میں کہا۔

''تمہیں... حسد تو نہیں ہو رہا۔ تم کون سی میری رقیب بن جاؤ گی، بلکہ رقیبہ۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ تم کبھی اس کی سوکن بن جاؤ۔''

''بکواس مت کرو۔'' روشو نے ڈانٹ دیا۔ ''تم مرد لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تم نے میرے شوہر کو دیکھا ہے؟''

''کہاں سے دیکھوں گا اس خوش نصیب انسان کو۔''

''ایک بات بتادوں۔'' روشو سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ''میرا شوہر واقعی خوش نصیب ہے کیونکہ میں اس سے اتنا پیار کرتی ہوں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''اور وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید مجھ سے بھی زیادہ۔'' روشو نے کہا۔ ''ان کی تو خواہش ہوتی ہے کہ میں ہر وقت ان کی نگاہوں کے سامنے رہوں۔''

''ظاہر ہے، ایسی بیوی سے کون دور ہونا پسند کرے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا اپنا گھر بتادو۔''

''بس یہ سامنے والا۔'' روشو نے سرخ اینٹوں سے بنے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا۔

کاٹیج نما یہ گھر دیکھنے میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ''یار تمہارا گھر بھی بہت خوبصورت ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''ہاں۔ یہ گھر راشد نے اپنے ہی ڈیزائن پر بنوایا ہے۔'' روشو نے بتایا۔ ''راشد ایک آرٹسٹک مزاج کا انسان ہے۔ پینٹر ہے، دنیا کے کئی ملکوں میں اس کی تصویروں کی نمائش ہوچکی ہے۔''

''اوہ! یہ تو اور بھی زبردست بات ہوگئی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھے اپنے شوہر سے ملوا سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ چلو یہیں گاڑی روک دو اور اندر آؤ۔''

''نہیں۔ میں اس وقت تو نہیں آسکوں گا۔'' میں نے کہا۔

''چلو پھر کبھی سہی۔ اب تو چیک ہی گئی ہوں، گھونچو۔''

''ہاں بابا! اب جان چھوڑو اور جاؤ۔''

میں نے اس کے بچے کو پیار کیا اور وہ چلی گئی۔

کچھ دنوں کے بعد میری بیوی نے مجھے بتایا۔ ''کاشف..... روشو کا فون آیا تھا۔''

''اوہ! کیسی ہے وہ۔''

''ٹھیک ہے۔ ہماری خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اپنے گھر بھی بلایا ہے۔''

''چلو کسی دن چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''جب کہیں۔ مجھے تو وہ بہت اچھی لگی ہے۔''

اس کے بعد میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے روشو کے گھر نہیں جاسکا لیکن ایک دن میں نے روشو کو فون کر ہی دیا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہوگئی تھی۔ ''کہاں غائب ہو گھونچو؟'' اس نے پوچھا۔

''بس یار! کاروباری مصروفیت میں گھرا ہوا ہوں۔ اچھا ہم لوگ شام میں تمہاری طرف آئیں گے۔''

''واہ۔ یہ تو اچھی بات ہوگی۔ میرا بیٹا بھی تم لوگوں کو بہت یاد کررہا تھا۔''

ہم دونوں شام کے وقت روشو کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ میں نے راستے سے اس کے بچے کے لیے کچھ بچوں کی کتابیں بھی خرید لی تھیں۔ روشو گھر پر ہی تھی۔ اس دن اس کا شوہر بھی تھا۔ روشو نے بتایا راشد اپنے کمرے میں ہیں۔ وہ گھر انتہائی خوبصورت پینٹنگز سے سجا ہوا تھا۔

''واہ۔'' میں تصویریں دیکھ کر پھڑک اٹھا تھا۔ ''کمال کی پینٹنگز ہیں۔''

''یہ سب راشد نے بنائی ہیں۔'' روشو نے بتایا۔

''راشد نے! یعنی تمہارے میاں نے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تو تھا کہ راشد بہت اچھے مصور ہیں۔تم نے ان کا نام تو سنا ہی ہوگا......راشد جامی۔"

"ارے راشد جامی ہیں تمہارے شوہر!" روحیلہ بھی بول پڑی۔"میں تو کب سے ان کی تصویریں دیکھتی رہی ہوں۔"

"مجھے بھی یہ سن کر حیرت ہوئی ہے کہ راشد تمہارا شوہر ہے۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔کسی نہ کسی کو تو میرا شوہر ہونا تھا اور راشد کی بھی کوئی نہ کوئی بیوی ہونی تھی۔" روشو نے کہا۔

"ہاں، یہ تم نے بہت لاجیکل بات کی ہے۔"

ہم سب کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔روشو کا بیٹا ہم سے مانوس ہو چکا تھا اسی لیے وہ بھی ہمارے پاس آکر مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔اس دوران روشو ہم سے اجازت لے کر کچن میں جا چکی تھی۔

"ہاں بیٹے! تم اسکول سے آکر کیا کرتے ہو؟" روحیلہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔دوستوں کے ساتھ کھیلتا ہوں۔" ساجد نے کہا۔"بابا سے کہتا ہوں کہ مجھے پارک لے چلیں لیکن وہ سنتے ہی نہیں ہیں۔"

"تمہارے بابا ایک مصروف آدمی ہیں نا اس لیے۔" میں نے کہا۔

بچہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ روشو چائے کی ٹرے دھکیلتی ہوئی داخل ہوئی۔

"ارے بھائی تمہارے راشد صاحب کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ آرہے ہیں۔" روشو نے بتایا۔"جب تک تم لوگ چائے پی لو۔"

وہ ہمارے لیے چائے بنانے لگی۔وہ اور روحیلہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔اسی دوران راشد کمرے میں داخل ہوا... میں اس بوڑھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔وہ ایک درشت چہرے کا بوڑھا انسان تھا۔میرے اندازے کے مطابق وہ روشو سے کم از کم بیس پچیس برس زیادہ عمر کا ہوگا۔

اس نے آکر مجھ سے ہاتھ ملایا۔"میں راشد ہوں۔" اس نے تعارف کروایا۔"روشو آپ کے بارے میں بتا چکی ہے۔"

وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔روشو نے چائے کی ایک پیالی اس کی طرف بھی بڑھا دی تھی۔میں نے غور کیا، چائے کی پیالی پر اس کے ہاتھ کی گرفت بہت کمزور تھی۔اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔رعشہ تھا اس کے ہاتھ میں۔تھوڑی سی چائے نیچے بھی گر گئی تھی۔میں نے روشو کی طرف دیکھا۔وہ کچھ شرمندہ سی ہونے لگی تھی۔روحیلہ بھی کچھ الجھ گئی تھی۔ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ روشو جیسی زندہ دل عورت کے شوہر کا یہ حال ہوگا۔

راشد نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔"بس جناب! یہ جو اعصابی کمزوری ہے نا، اس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔میں تو اب تصویریں بھی نہیں بنا پاتا۔جو پرانی پینٹنگز ہیں ان سے ہی کام چلا رہا ہوں۔"

"آپ نے علاج تو کروایا ہوگا۔"

"بہت...... ابھی انگلینڈ بھی اسی سلسلے میں گیا تھا۔وہاں میری تصویروں کی ایگزیبیشن بھی تھی۔میں نے سوچا کہ ساتھ ساتھ اپنا علاج بھی کروالوں۔"

"چلیں، یہ تو ایسی کچھ خاص بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہے جناب! اس کی وجہ سے میں چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم ہوتا جا رہا ہوں۔اب تو چلتے ہوئے بھی دشواری ہوتی ہے۔میرا بیٹا مجھ سے اس لیے ناراض ہے کہ میں اسے پارک نہیں لے جاتا۔لیکن کیسے لے جاؤں۔میرے ہاتھ اور پیر میرا ساتھ نہیں دیتے۔کہیں جا کر تماشا بننے کا کیا فائدہ۔"

میں نے روشو کی طرف دیکھا۔وہ ہنس مکھ لڑکی دوسری طرف منہ کر کے رو رہی تھی۔خود روحیلہ بھی اداس ہو گئی تھی۔سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔روشو کیوں کئی بار ہمیں اپنے گھر بلانے سے کتراتی رہی تھی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہم اس کے شوہر کو دیکھ سکیں اور یہ بھی پتا چل گیا کہ روشو کا بیٹا پارک کیوں نہیں جایا کرتا تھا۔اس کے باوجود وہ اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش تھی۔

اب ان باتوں میں کیا رکھا تھا۔وہ جیسے تیسے کر کے اپنے نصیب کے لکھے کے مطابق زندگی گزار رہی تھی کیونکہ زندگی تو گزر رہی جاتی ہے۔

میں تھوڑا ملول اور تھوڑا مطمئن ہو کر روشو کے گھر سے آیا تھا۔

راستے میں روحیلہ نے مجھ سے کہا۔"میں ایک بات بتاؤں! نہ جانے آپ نے محسوس کیا یا نہیں کیا؟"

"ہاں بتاؤ۔کیا بات ہے؟"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ روشو خوش ہے؟"

"ہاں خوش ہے۔کیوں! تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں۔" اس نے کہا۔

"کوئی عورت ہی عورت کے بھید جان سکتی ہے۔"

”کیا کہنا چاہتی ہو...... کیا روشو خوش نہیں ہے؟“

”نہیں! وہ خوش نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا شوہر ایک بوڑھا انسان ہے بلکہ اس لیے کہ شاید وہ بے رحم بھی ہے۔ اس نے روشو کو تکلیفیں دی ہیں۔ اس کا رویہ روشو کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟“

”میں نے کہا نا کہ آپ ایک مرد ہیں۔ آپ کو عورت کے بھید کیا معلوم۔“

”اب بتاؤ۔ میں اس سے کس طرح پوچھوں؟“

”اگر اس نے بتا بھی دیا تو کیا ہوگا؟ آپ کیا کرلیں گے؟“

روحیلہ کا کہنا درست ہی تھا۔ اگر معلوم بھی ہو جاتا کہ اس کے شوہر کا رویّہ اس کے ساتھ مناسب نہیں تھا تو میں کیا کرسکتا تھا۔ پھر کئی دنوں تک روشو سے ملاقات نہیں ہو سکی اور نہ ہی اس کا فون آیا۔ روحیلہ کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

ایک دن وہ مجھے راستے میں مل گئی۔ وہ شاید کسی دکان سے واپس آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو بڑے شاپرز تھے۔ مجھے اسے اس حال میں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔

”ارے روشو! یہ کیا کر رہی ہو؟“

”گھر کا سامان لا رہی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیا؟“ میں حیران رہ گیا تھا۔ ”تمہارے گھر میں ملازم نہیں ہیں؟“

”نہیں یار! ملازم تو کبھی نہیں رہے۔“ اس نے بتایا۔

”وہ تمہارا ڈرائیور تو ہوگا نا؟“

”جب گاڑی ہی نہیں ہے تو ڈرائیور کیسا؟“

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ ”روشو! یہ سب کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ تم نے اب تک جو بھی دیکھا وہ ایک ناٹک تھا۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ تم ایسا کرو، میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ راشد کہیں گئے ہوئے ہیں۔ اب تم سے کیا چھپانا۔ وہ اپنی پہلی بیگم کے گھر گئے ہیں۔ ایک ہفتہ رہ کر واپس آئیں گے۔“

”روشو! یہ سب تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں سب سن کر پاگل سا ہو رہا تھا۔

”ہاں یار!“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم نے تو سنا ہوگا کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی ہوں۔ اس کے دو جوان بچے بھی ہیں۔ دونوں جاب کرتے ہیں۔ میرا ساجد تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔“

”کیا شادی سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم تھا۔“ اس نے کہا۔ ”اب یہ مت پوچھنا کہ پھر میں نے شادی کیوں کی؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں نے کالج میں بھی کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم کتنے غریب اور مجبور لوگ ہیں۔ میں نے خود کو چھپا کر رکھا۔ شاید کبھی کالج میں تمہیں بھی اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔“

”کبھی نہیں۔“ میں نے کہا۔

”بہر حال حالات ایسے تھے کہ راشد سے میری شادی ہوگئی اور جیسی زندگی گزر رہی ہے، وہ تمہارے سامنے ہے۔“

”ایک بات بتاؤ، کیا تم اس شادی سے خوش ہو؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے خوش ہونا چاہیے؟“ اس نے سوال کیا۔

”نہیں! کیونکہ تم ابھی زندگی کی حرارت سے بھری ہوئی ایک زندہ دل لڑکی ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔

حاضر جوابی

مختلف ممالک کے شہزادگان حکیم ارسطو کے زیرِ تعلیم تھے۔ ایک روز ایک شہزادے سے اس نے سوال کیا۔ ”اگر تو بادشاہی کو پہنچے تو میری تعلیمی خدمات کا صلہ تم کس صورت سے ادا کرو گے؟“

شہزادے نے جواب دیا۔ ”میں تمام تر مہماتِ سلطنت میں آپ کے مشورے کو مقدم رکھوں گا اور آپ کی رائے سے سرِ مو انحراف نہ کروں گا۔“

یہی سوال دوسرے شہزادے سے پوچھا گیا، اس نے کہا۔ ”میں آپ کو اپنا برابر کا شریکِ سلطنت رکھوں گا۔“

جب سکندر کی باری آئی تو اس نے عرض کیا۔ ”اے استادِ محترم! مجھ سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کا فاعلِ حقیقی میں خود نہیں بلکہ خدائے برتر ہوگا۔“ ارسطو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تیری اس دانائی کا جواب سب پر سبقت لے گیا ہے اور مجھے اس سے تیرے فاتحِ عالم ہونے کی بو آتی ہے۔

مرسلہ۔ رفعت اللہ شیروانی، ڈھوک، راولپنڈی

راشد تم سے بہت بڑا ہے۔ ابھی تمہارے لیے زندگی ایک کھلے میدان کی طرح ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ خیر اب مجھے چلنا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔''

''روشو! مجھے سچ مچ یقین نہیں آرہا ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ تم نے میری پوزیشن کا اندازہ کر ہی لیا ہوگا۔''

میں کچھ نہیں بول سکا۔ اس چنچل لڑکی کی زندگی کیسی ہوگئی تھی۔ اب اس کے لیے کیا ہوسکتا تھا۔

ہم واپس آگئے۔ میں نے راستے میں پوچھا۔ ''روشو! یہ بتاؤ تم جس گھر میں رہ رہی ہو، یہ کس کا ہے؟''

''یہ گھر اتفاق سے راشد کی پھوپی کا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ امریکا جا کر بس گئی ہیں۔ یہ مکان انہوں نے راشد کو اس شرط پر دیا ہے کہ تین سال بعد وہ واپس آکر اسے فروخت کردیں گی۔ بس یہ ہے کہانی۔''

وہ تو اتنا بتا کر خاموش ہوگئی تھی لیکن ذہن میں اچانک ایک خیال اس طرح آیا جیسے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں۔

کیا میں روشو کو ہمیشہ کے لیے اپنا نہیں سکتا؟ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ اپنے شوہر سے مطمئن نہیں ہے۔ وہ اس سے بیزار ہوچکی ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک کڑوا گھونٹ ثابت ہو رہی تھی۔ ہر لحاظ سے۔ کیا خوشی ملی تھی اسے؟ کچھ بھی نہیں۔ راشد لاکھ مشہور مصور ہوا کرے، اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔

ایک تو وہ بوڑھا تھا، پھر اس کے پاس زندگی کی وہ خوشیاں بھی نہیں تھیں جو پیسوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے پاس تو اتنی فرصت بھی نہیں ہوتی تھی کہ اپنے بیٹے کو کہیں گھمانے لے جاسکے۔

روشو کا گھر آگیا تھا۔ میں نے گاڑی روک دی۔ ''کیا بات ہے، تم چپ کیوں ہوگئے؟'' روشو نے پوچھا۔

''ایک بات کہوں...... برا تو نہیں مانوگی؟''

''نہیں، بتاؤ۔''

''کیا تم میری ہوسکتی ہو؟'' میں نے کہہ دیا۔

''کیا؟'' روشو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''پوری پلاننگ میرے ذہن میں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اگر تفصیل سے سب سن لو تو میں بتادوں۔''

''چلو بتاؤ۔''

''دیکھو روشو! بات کچھ یوں ہے کہ میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہو۔ میری بات تفصیل سے سنتی رہنا۔ اس خیال کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ تم دونوں کے درمیان عمر کا فرق ہے۔ اس کی وجہ سے تم گھٹ کر رہ گئی ہو ورنہ تم کتنی نٹ کھٹ اور شریر ہوا کرتی تھیں۔ باقاعدہ کرکٹ جیسا گیم کھیلتی تھیں لیکن اب تم ایک گھر میں محدود ہوکر رہ گئی ہو جو بدقسمتی سے تمہارا ابھی نہیں ہے اور تمہارے شوہر کا بھی نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ میں تمہیں محنت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ دوسری طرف میں نے تمہیں اپنانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ باقاعدہ روحیلہ سے مشاورت کے بعد ہی کیا ہے۔ وہ میرے اس فیصلے سے خوش ہے۔''

روشو نے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا، پھر خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ ''دیکھو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت دکھ اٹھا رہی ہوں لیکن کیا ضروری ہے کہ تمہاری روحیلہ مجھے قبول کرلے۔''

''وہ قبول کرلے گی۔ میں نے اس سے بات کرلی ہے۔''

''گھونچو! یہ سب صحیح ہے لیکن تم ایک بات نہیں جانتے۔''

''وہ کون سی؟''

''وہ یہ کہ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں اور مجھے شروع سے گھر میں یہ تربیت دی گئی ہے کہ شوہر پھر شوہر ہوتا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، اس کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہے۔ گھونچو! تمہاری اس پیشکش کا بہت شکریہ لیکن میں راشد کو نہیں چھوڑ سکتی۔ تم صرف اتنا کرسکتے ہو کہ میرے لیے دعائیں کرتے رہو۔ سمجھے گھونچو!''

اور گھونچو یعنی میں سمجھ گیا۔

سب سمجھ گیا۔ سمجھ گیا کہ ہمارے معاشرے میں عورت، عورت ہی ہوتی ہے۔ اسے جس گھر کی طرف روانہ کردیا جاتا ہے وہ بس اسی کی ہوکر رہ جاتی ہے، چاہے کچھ بھی ہو۔

اس کے بعد روشو سے پھر میری ملاقات نہیں ہوسکی اور نہ ہی میں اس کے گھر کی طرف گیا۔

بس ایک بار روحیلہ کے کہنے پر میں اسے اپنے ساتھ اس گھر میں لے گیا تھا۔ وہاں اب دوسرے لوگ رہتے تھے۔ انہیں روحیلہ یا اس کے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

خدا جانے وہ کہاں ہے۔ اگر وہ یہ کہانی پڑھ لے تو اسے بتادیا جائے کہ گھونچو اسے بھولا نہیں ہے۔

⌘⌘⌘

مالوے کے مانڈو نامی شہر میں شیخ ولی اللہ نامی ایک امیر کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ 902ھ کا واقعہ ہے۔ باپ نے اس بچے کا نام عبدالوہاب رکھا۔ عبدالوہاب کی پرورش و پرداخت میں بڑی توجہ دی گئی اور اس امیرزادے کو انتہائی ناز و نعم میں رکھا گیا۔ ابھی اس بچے نے بچپن سے لڑکپن ہی میں قدم رکھا تھا کہ مانڈو کو انتشار اور انقلاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ امراء اور اکابرین نے اپنے مستقبل کو غیر محفوظ دیکھ کر ہندوستان کے دوسرے شہروں کا رخ کیا۔ شیخ ولی اللہ نے بھی برہان پور کا رخ کیا۔ انہوں

سیدی عبدالوہاب علیہ الرحمہ

ضیا تسنیم بلگرامی

کس قدر بلند مرتبے کی بات ہے اس بچے کے لیے جس کی بھوک پیاس کا خیال رکھنے کے لیے حضرت خضر علیہ السلام حاضر ہوجائیں... سبحان اللہ... یہ بچہ بھی اتنا ہی خوبصورت مقدر لے کر پیدا ہوا تھا اور پھر گزرتے وقت نے وہ رنگ جمایا کہ ہر ایک کو ادراک ہوگیا کہ یہ بچہ اللہ کا کتنا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ تھا... بھوک پیاس اور زندگی کی مشکلات کا صبر و استقلال سے سامنا کرکے ثابت کردیا کہ اللہ اپنے نیک بندوں کی آزمائش کسی بھی طرح کرتا ہے اور یہ نیک انسان اللہ کی ہر آزمائش پر پورا اترتے ہیں۔

خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار کرنے والے

ایک معتبر ولی کا زندگی نامہ
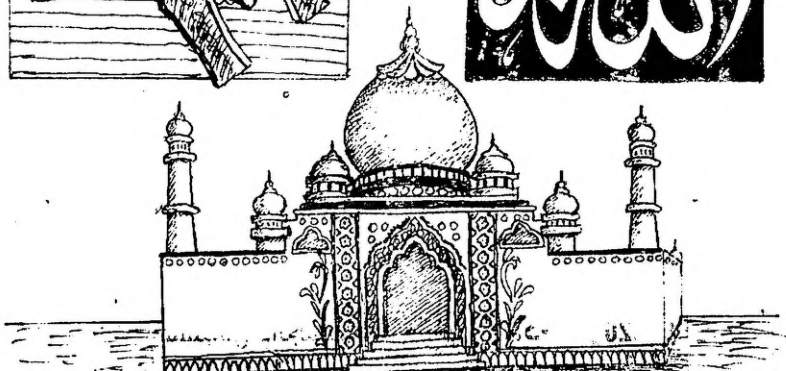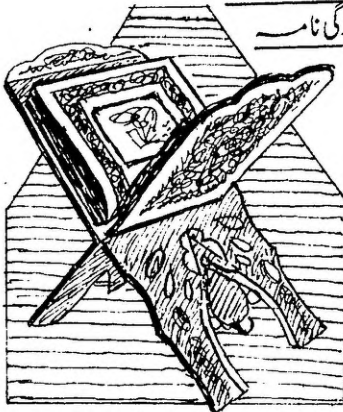
نے اپنی بیوی کو مانڈو ہی میں چھوڑا اور کہا۔ ”بیوی! تم یہیں رہو، میں عبدالوہاب کو لے کر برہان پور جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں وہاں کے دربار میں کوئی اچھا سا منصب حاصل کرلوں گا اور پھر مکان کا بندوبست کر کے تمہیں بھی لے جاؤں گا۔“

بیوی کو اپنے بیٹے کی جدائی کا دکھ ہوا۔ پوچھا۔ ”لیکن کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ برہان پور آپ تنہا جائیں اور عبدالوہاب کو میرے پاس ہی چھوڑتے جائیں؟“

شیخ ولی اللہ نے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”نیک بخت! اگر میں عبدالوہاب کو تیرے پاس ہی چھوڑ دوں گا تو تُو بڑی پریشانی میں پھنس جائے گی۔ مانڈو ان دنوں بدنظمی اور انتشار کا شکار ہے۔ ان حالات میں تو اپنے بیٹے کی ذمے داری نہیں نباہ سکے گی۔ اس لیے اس کا میرے ساتھ جانا ہی مناسب ہے۔“

بیوی نے ہتھیار ڈال دیے، بولی۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔ اب میں بحث کیا کروں آپ سے۔“

شیخ ولی اللہ نے اپنے بیٹے کو ساتھ لیا اور ایک قافلے کے ساتھ برہان پور روانہ ہوئے۔

قافلے نے چلتے چلتے دوپہر کو ایک جنگل میں پڑاؤ کیا۔ یہاں کی گھنی چھاؤں نے قافلے والوں کو باغ باغ کر دیا۔ قافلے میں سب سے بُرا حال ولی اللہ ہی کا تھا۔ سفید پوشی نے انہیں قافلے والوں سے ذرا الگ تھلگ ہی رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی عسرت اور تنگ دستی سے دوسرے بھی واقف ہو جائیں اور پھر ان کا مذاق اڑے۔ ان کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب سے الگ تھلگ تھا۔

ایک تاجر نے ان دونوں کو اپنے خیمے میں پناہ دی تھی۔ یہ تاجر ولی اللہ کی معزز حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ان دنوں ان پر کڑا وقت پڑا ہوا ہے مگر غیرت اور خودداری نے انہیں محتاط اور مہر بہ لب کر دیا ہے۔

ولی اللہ نے ایک پوٹلی میں بھنے ہوئے چنے باندھ رکھے تھے۔ تاجر دوپہر کے کھانے سے پہلے پانی کی تلاش میں نکلا تو باپ بیٹے بہ عجلت پوٹلی کھول کر چنے کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد تاجر واپس آیا اور دسترخوان زمین پر بچھا کر کھانے سجا کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں سے کہا۔ ”جناب! کھانا کھائیں۔ آئیں تشریف لائیں۔“

ولی اللہ نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ”جناب! ہم دونوں ابھی ابھی کھا کے بیٹھے ہیں۔ ہاں اگر پانی مرحمت فرمائیں تو شکر گزار ہوں گے۔“

تاجر نے ان دونوں کو اپنے پیالے میں پانی پیش کیا۔ انہوں نے خوب ڈٹ کر پانی پیا اور زمین ہی پر دری بچھا کر لیٹ گئے۔ تاجر کو ان دونوں پر رحم آرہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”جناب ولی اللہ صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے چند ذاتی سوال کرلوں؟“

ولی اللہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑی بے مروتی سے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں ذاتی سوالوں کے جواب نہیں دوں گا۔“

لیکن تاجر باز نہیں آیا، پوچھا۔ ”حضرت! آپ پر کیا افتاد پڑی جو آپ نے مانڈو چھوڑ دیا اور برہان پور کی راہ لی؟“

ولی اللہ نے سکوت اختیار کیا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

تاجر نے کہا۔ ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کچھ عرض کروں؟“

ولی اللہ نے جواب دیا۔ ”ذاتی سوالوں کے علاوہ جو بات چاہو کرو۔ میں جواب دوں گا۔“

تاجر نے کہا۔ ”حضرت! اگر آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہے ہیں تو اس سے بھاگنا فضول ہے۔ ہندی میں ایک مثل مشہور ہے...... اُتر جاؤ یا دکھن، وہی کرم کے لچھن۔“

ولی اللہ نے جواب دیا۔ ”یہ تیرا خیال ہے کہ میں تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہا ہوں۔ مانڈو اجڑ رہا ہے۔ اب وہاں عزت داروں کے لیے زمین تنگ ہو چکی ہے۔ خدا کا حکم ہے کہ روزی کے لیے اس کی زمین پر پھیل جاؤ چنانچہ میں اس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔“

تاجر خاموش ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے نے تاجر کو نیند کے حوالے کر دیا۔ وہ گہری نیند سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔

آپ نے موقع غنیمت دیکھا تو اپنے بیٹے سے کہا۔ ”عبدالوہاب بیٹے! لوگوں کو ہمارے حالات کا علم ہو چکا ہے۔ ہم اپنی عسرت اور مفلوک الحالی کو نہیں چھپا سکتے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں قافلے سے جدا ہو جائیں اور اپنی مفلسی کی شرم برقرار رکھیں۔“

عبدالوہاب نے پوچھا۔ ”کیا ہم قافلے سے جدا ہو کر راہ نہیں بھول جائیں گے؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”شاید ایسا نہ ہو، اور اگر ہم راستہ بھول بھی گئے تو راستے میں لوگوں سے پوچھتے پاچھتے اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔“

سعادت مند بیٹے نے اپنے باپ سے اختلاف نہیں کیا اور دونوں قافلے سے جدا ہو گئے۔

ولی اللہ کو برہان پور کا راستہ معلوم نہیں تھا۔ وہ اندازے سے برہان پور کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے سے بہت ساری آہٹیں سنائی دیں۔ باپ نے بیٹے سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہمارے پیچھے پیچھے قافلہ بھی چلا آرہا ہے۔“

بیٹے نے تائید کی۔ ”شاید۔ غالباً قافلے دن کو آرام اور شام یا رات کو سفر کرتے ہیں۔“

باپ بیٹے کی ذہانت سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”بے شک تیرا خیال درست ہے۔“

دونوں باپ بیٹے درختوں کے جھنڈ میں چھپ گئے۔ یہاں سے انہوں نے جن آدمیوں کو گزرتے دیکھا وہ مسافر نہیں، سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ ولی اللہ نے ان کے تیور سے انہیں پہچان لیا تھا۔ یہ نہ تو مسافر تھے اور نہ ہی سپاہی۔ یہ ڈاکو تھے جو ان کے قافلے کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ولی اللہ نے بیٹے سے کہا۔ ”بیٹے عبدالوہاب! یہ نہ تو مسافر ہیں، نہ سپاہی، یہ لٹیرے ہیں۔ اب قافلے کی خیر نہیں۔“

جب ڈاکوؤں کا گروہ ان کے سامنے سے گزر گیا تو ان دونوں نے اپنی راہ لی۔ کئی گھنٹے متواتر چلنے کے بعد انہیں کچھ اندازہ نہیں رہا کہ وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں یا غلط راستے پر۔ انہوں نے اپنے آس پاس آبادی تلاش کی تو وہ بھی نظر نہیں آئی۔ پوری رات اسی تگ و دو میں گزر گئی۔ صبح ہوتے ہوتے ولی اللہ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ مزید سفر نہیں کریں گے۔

صبح ہوئی تو دونوں نے ایک ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں جنگل میں تھے۔ پاس کا کھانا پانی ختم ہو چکا تھا۔ باپ نے بیٹے کو تسلی دی۔ ”بیٹے! تم گھبرانا مت۔ امید ہے ہم دونوں دن کی روشنی میں کسی نہ کسی بستی میں پہنچ جائیں گے اور ہم اپنے مصائب سے نجات پا جائیں گے۔“

عبدالوہاب کے چہرے پر طمانیت پائی جا رہی تھی۔ دونوں سارا دن جنگل میں گھومتے پھرتے رہے۔ بستی کا کوسوں پتا نہ تھا۔ ولی اللہ کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ انہیں سب سے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ رات کے لیے کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ کھانا تو کھانا، پانی تک نہیں تھا اور بھوکے پیاسے سفر جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ عبدالوہاب کو بھوک پیاس نے نڈھال کر دیا تھا۔ انہوں نے باپ سے پوچھا۔ ”باوا جان! کھانے پینے کا کیا ہوگا؟“

ولی اللہ نے دروغ مصلحت آمیز کا سہارا لیا، بولے۔ ”بیٹے! مت گھبرا۔ تجھے کھانا بھی ملے گا اور پانی بھی۔ بس ذرا سی بھاگ دوڑ اور کرنی ہوگی۔ ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی۔“

رات پھر آگئی۔ عبدالوہاب نے دوبارہ کھانا پانی نہیں مانگا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سوالوں اور مطالبوں سے باپ شرمندہ ہو۔

جب پوری طرح اندھیرا چھا گیا تو ولی اللہ نے کہا۔ ”بیٹے! ہمیں رات کسی درخت پر گزارنی ہوگی کیونکہ مرا سوتا برابر ہوتے ہیں۔ کوئی بھی درندہ ہمیں گزند پہنچا سکتا ہے۔“

اس کے بعد وہ دونوں ایک اونچے درخت پر چڑھ گئے اور شب بسری کے خیال سے موٹی موٹی شاخوں سے لپٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو تسلی دی۔ ”بیٹے! ذرا صبر و استقلال سے کام لے۔“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”باوا جان! آپ میری فکر نہ کریں۔ آپ مجھے ہر حال میں صابر و شاکر پائیں گے۔“

دونوں نے پوری رات درخت پر گزار دی۔ جنگل کے درندے شاید راستہ بھول گئے تھے۔ ایک درندہ بھی ان کی طرف نہیں آیا۔ بھوک اور پیاس نے ان دونوں کا بُرا حال کر دیا تھا۔ باپ کو بار بار بیٹے کی بھوک پیاس پریشان کر رہی تھی۔ رات بھر میں کئی بار انہوں نے اپنے بیٹے کو تسلیاں دیں اور سعادت مند بیٹے نے ہر بار یہی کہا کہ آپ میری فکر نہ کریں۔ آپ مجھے ہر حال میں شاکی نہیں شاکر پائیں گے۔

علی الصباح دونوں درخت سے نیچے اترنے سے پہلے نیچے دیکھنے لگے۔ انہیں درندوں کا اندیشہ تھا۔ صبح کی سرمئی فضا میں انہوں نے نیچے کوئی سفید چیز دیکھی۔ یہ دونوں آہستہ آہستہ نیچے اترے تو دیکھا ایک سفید پوش بزرگ بیٹھے ہیں۔ سفید کرتہ، سفید پاجامہ، سفید ٹوپی اور سفید ڈاڑھی۔

جب یہ دونوں نیچے اتر کر ان کے سامنے کھڑے ہوئے تو بڑے میاں نے کہا۔ ”کیوں جی! بھوکے پیاسے ہی رات گزار دی؟“

ولی اللہ نے پوچھا۔ ”حضرت! آپ کی تعریف؟ آپ کو یہ بات کس نے بتائی کہ ہم دونوں نے بھوک پیاس ہی میں پوری رات گزار دی؟“

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ”بتاتا کون؟ میں نے تم دونوں کو کل اس جنگل میں بھٹکتے دیکھا تھا۔ یہاں نہ تو کوئی بستی ہے نہ سرائے پھر

تم دونوں کو کھانا پانی کون دیتا؟ کہاں سے ملتا؟ میں رات بھر تم دونوں کو تلاش کرتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے تم دونوں مجھے اس درخت پر نظر آئے اور میں تم دونوں کے انتظار میں نیچے بیٹھ گیا۔" اس کے بعد انہوں نے اپنی بغل سے دو روٹیاں نکال کر ان کے حوالے کر دیں، کہا۔ "لو پہلے انہیں کھالو۔" پھر درخت کے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر پانی کا چشمہ ہے، اس سے پیاس بجھانا۔"

ولی اللہ نے دوسری طرف گردن جو گھمائی تو دیکھا وہاں واقعی چشمہ جاری تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "بیٹے! یہ تو کمال ہو گیا۔ پانی درخت کے نیچے موجود ہے اور ہم رات بھر پیاسے بیٹھے رہے۔"

بیٹے کو روٹی میں مزہ آرہا تھا۔ کہنے کو تو وہ سادی روٹی نظر آرہی تھی مگر ہر نوالہ مزے میں ایسا تھا گویا اس میں قیمہ بھرا ہے۔

ولی اللہ نے پوچھا۔ "بڑے میاں! یہاں سے آبادی کتنی دور ہے؟"

بڑے میاں نے جواب دیا۔ "ادھر اس طرف چلے جاؤ۔ تمہیں ایک چھوٹی سی بستی مل جائے گی۔"

بڑے میاں نے جدھر اشارہ کیا تھا، دونوں باپ بیٹے ادھر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد انہیں ایک بستی مل گئی۔ معاً ولی اللہ کو احساس ہوا کہ کیا نادانی کی کہ بڑے میاں اور چشمے کو وہیں چھوڑا۔ بڑے میاں سے تعارف بھی نہیں چاہا اور چشمے سے پانی بھی نہیں لیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ دونوں ایک بار پھر وہیں واپس پہنچے۔ اب اس درخت کے نیچے نہ تو بڑے میاں تھے اور نہ ہی چشمہ۔ دونوں پر کپکپی طاری ہو گئی۔ باپ نے بیٹے سے پوچھا۔ "بیٹے عبدالوہاب! کیا یہی وہ درخت ہے جس پر ہم دونوں نے رات گزاری تھی؟"

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ "یہی درخت ہے باوا جان! میں نے اس درخت کو پہچان لیا ہے۔"

ولی اللہ نے حیرت سے کہا۔ "اچھا! اگر ہم یہ مان لیں کہ وہ بڑے میاں کہیں چلے گئے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چشمہ کہاں چلا گیا؟"

جب یہ معما کسی طرح بھی حل نہ ہوا تو ولی اللہ کو یہ آواز سنائی دی۔ "ولی اللہ! یہ خضرؑ تھے جو تیرے بیٹے عبدالوہاب کی وجہ سے آگئے تھے اور یہ سارا کرشمہ انہی کا تھا۔"

ولی اللہ کو اس دن پہلی بار اپنے بیٹے کی عظمت اور بڑائی کا علم ہوا تھا۔

☆☆☆

برہان پور میں ولی اللہ کے دن پھر گئے اور وہ امن و آسودگی سے رہنے لگے۔ بیٹے کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دے رہے تھے لیکن اسی دوران انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ عبدالوہاب کو باپ کی جدائی کا غم تو بہت زیادہ ہوا مگر مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ کے مصداق صابر و شاکر رہے لیکن اب ان میں اتنی تبدیلی آچکی تھی کہ وہ برہان پور سے نکل کر سیر و سیاحت میں مشغول ہو گئے۔ آج گجرات میں ہیں تو کل کسی دوسرے شہر میں۔ یہاں تک کہ سیلون بھی ہو آئے۔ پھر سیلون سے مالا بار پہنچے۔ ان دنوں مالا بار میں قاضیِ شہر کا منصب عبدالعزیز شافعی جیسے متدین کو ملا ہوا تھا۔ یہ شخص بہت ہی مردم شناس تھا۔ اس نے عبدالوہاب کو درویشی میں دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ بھی کچھ ہیں۔ اس نے عبدالوہاب سے کہا۔ "نوجوان! آپ اس شہر میں اجنبی نظر آتے ہیں۔ کہاں قیام فرما ہیں آپ؟"

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ "قاضیِ محترم! میں ایک درویش ہوں۔ میں بظاہر دنیا میں ہوں لیکن حقیقتاً میں دنیا چھوڑ چکا ہوں۔"

قاضی نے درخواست کی۔ "تب پھر آپ میرے مہمان ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس شرف سے مجھے محروم نہیں رکھیں گے۔"

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ "مجھے کوئی انکار نہیں لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ کے شہر میں کوئی صالح فقیر بھی ہے یا نہیں؟ میں چاہتا ہوں قیام تو میں آپ کے پاس ہی رکھوں مگر نشست و برخاست میں اس مردِ صالح کے ساتھ رکھوں۔"

قاضی نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "نوجوان! تمہارا نام کیا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "عبدالوہاب...... شیخ عبدالوہاب۔"

قاضی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ "صاحبزادے! یہاں ایک مرد ایسا ہے تو ضرور لیکن میں اسے صالح نہیں کہہ سکتا۔"

عبدالوہاب نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟ کیا اس کے ارادت مند کم ہیں؟ کیا اسے عوام اور خواص میں مقبولیت حاصل نہیں ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس کے مریدوں کی تو خاصی بڑی تعداد ہے مگر مجھے اس کے اعمال اور کرتوت پسند نہیں۔"

عبدالوہاب نے پوچھا۔ "کیا انہیں اس کے کرتوتوں کا علم ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "ہے مگر پھر بھی اس نے لوگوں کو مسحور کر لیا ہے۔ وہ خود کو اہلِ باطن کہتا ہے مگر وہ ممنوعاتِ الٰہی پر بھی کاربند رہتا ہے اور اس کی اسی بات نے مجھے اس کی طرف سے برگشتہ کر رکھا ہے۔"

عبدالوہاب نے کہا۔ "آپ تو مجھے اس کے ٹھکانے کا پتا سمجھا دیں، بقیہ کام ہمارا ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں آپ کو مطمئن کر دوں گا۔"

قاضی نے انہیں مذکورہ مردِ باطن کا پتا سمجھا دیا اور عبدالوہاب نے جب تک اسے پا نہیں لیا، تلاش جاری رکھی۔ پھر جب یہ اس کے ٹھکانے پر پہنچ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک بلند جگہ پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کے دائیں بائیں عورتیں بیٹھی ہیں مگر اس کے سامنے مردوں اور عورتوں کا زبردست ہجوم تھا۔

اس نے عبدالوہاب کو دیکھتے ہی بلند آواز سے کہا۔ ''مرحبا عبدالوہاب! خوش آمدید۔''

عبدالوہاب نے جواب میں کہا۔ ''کیا تو اہلِ باطن میں سے ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''برخوردار! میں جو کچھ بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔ میری کسی بات پر تمہیں اعتراض؟''

ابھی عبدالوہاب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اس شخص نے حکم دیا۔ ''عبدالوہاب کی خوشی میں شراب لائی جائے۔ میں پیوں گا۔ میرے مرید میرے ساتھی پئیں گے اور عبدالوہاب پیے گا۔''

عبدالوہاب نے کہا۔ ''میں شراب نہیں پیوں گا کیونکہ شراب حرام ہے۔''

حکم کی دیر تھی کہ شراب آگئی۔ اس نے شراب کا جام بھرا اور غٹاغٹ چڑھا گیا۔ دوسرا جام بھرا اور عبدالوہاب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو برخوردار پیو۔''

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ''میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ شراب حرام ہے۔ میں نہیں پی سکتا۔''

اس نے سختی سے کہا۔ ''شراب میں دے رہا ہوں، تجھ کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔''

عبدالوہاب نے پوچھا۔ ''تیری حیثیت کیا ہے کہ شراب تُو دے رہا ہے اس لیے میں پی لوں؟''

اس نے کہا۔ ''میں کیا ہوں اور میری حیثیت کیا ہے، یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا لیکن تجھ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ تیرا انکار تجھے بے حد مہنگا پڑے گا۔ میں تجھے اس کی سزا دوں گا۔''

عبدالوہاب اب مزید نہیں برداشت کر سکے۔ وہاں سے کبیدہ خاطر اٹھے اور قاضی کی دی ہوئی قیام گاہ پر چلے گئے۔

قاضی نے چہرہ اترا ہوا جو دیکھا تو قلق سے پوچھا۔ ''کیا ہوا جنابِ والا! آپ کا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے؟''

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے سوال کا جواب دو چار یوم بعد دوں گا۔ بس فی الحال آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

قاضی نے بھی اصرار نہیں کیا۔ اس نے کھانا نکلوایا اور وہ آپ کے سامنے سجا دیا گیا۔ عبدالوہاب گم صم کھانے کی طرف دیکھتے رہے مگر اس میں سے ایک لقمہ بھی نہیں لیا۔

قاضی نے کہا۔ ''میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ آخر آپ اتنے اداس کیوں ہیں مگر یہ ضرور پوچھوں گا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ کھانے نے کیا قصور کیا ہے؟''

عبدالوہاب نے کہا۔ ''براہِ کرم آپ کھانے کو لے جائیں۔ میں کھانا ضرور کھاتا لیکن اس وقت بالکل جی نہیں چاہ رہا۔''

قاضی نے اصرار نہیں کیا۔ کھانا واپس چلا گیا۔

عبدالوہاب چہل قدمی کرتے کرتے بستر پر گر گئے اور روتے ہوئے کہا۔ ''الٰہ العالمین! مجھ پر رحم فرما۔ میری راہنمائی کر۔ یہ شخص مجھے شراب پلانے کی اور کوشش کرے گا لیکن میں نہیں پیوں گا۔''

عبدالوہاب سونے کی کوشش کرتے رہے مگر نیند کا کوسوں پتا نہ تھا۔ کافی دیر بعد مشکل سے نیند آئی تو خواب میں دیکھا عبدالوہاب ایک پُربہار باغ میں پہنچ گئے ہیں۔ وہاں ہر طرف سبزہ ہے، میوے دار درخت ہیں، پھل ہیں اور شفاف پانی کی نہریں ہیں، شراب ہے، جام ہے، دن والا شخص ہے، اس کے مرید ہیں اور وہ سب شراب پینے میں مشغول ہیں۔ وہ شخص شراب کا جام لے کر عبدالوہاب کے پاس آیا اور کہا۔ ''عبدالوہاب! دن میں تو انکار کر دیا تھا مگر یہاں انکار نہ کرنا ورنہ میں روٹھ جاؤں گا۔''

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ''کیا جو چیز پہلے حرام تھی، یہاں حلال ہوگئی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''احمق! یہ جنت ہے اور جنت میں شراب حلال ہے۔''

عبدالوہاب نے کہا۔ ''کس نے کہا یہ جنت ہے؟ جس جگہ تیرے جیسا اوامر و نواہی کا منکر ہوگا، وہ جگہ جنت نہیں ہو سکتی۔''

وہ برہم ہوگیا، بولا۔ ''عبدالوہاب! تو اپنے حق میں بُرا کر رہا ہے۔ ذرا زبان سنبھال کر بات کر، ورنہ میں تجھے جلا کر خاک کر دوں گا۔''

عبدالوہاب نے بھی سخت رویہ اختیار کیا۔ درشت لہجے میں کہا۔ ''تو خود زبان سنبھال کر بات کر۔ تُو مجھے کیا جلائے گا۔ اللہ نے

چاہا تو تُو خود ہی اپنی آگ میں جل کر خاک ہو جائے گا۔ میں تجھ سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔“

اس شخص نے آنکھ دکھائی۔ عبدالوہاب نے لاحول پڑھی۔ اس کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے بعد آپ نے ایک بار پھر لاحول پڑھی اور سجدے میں گر کر عجز و انکسار سے عرض کیا۔ ”الٰہ العالمین! مجھ پر رحم فرما اور آزمائشوں سے نکال ورنہ میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔“ اس کے بعد انہوں نے رسول مقبول ﷺ کا واسطہ دیا۔ ”یا اللہ! اپنے محبوب نبی آخر الزماں رسول مقبول ﷺ کا واسطہ، میری مدد فرما۔“ پھر رسول اللہ ﷺ کو براہِ راست مخاطب کیا۔ ”یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد فرمائیے۔ آپ کا یہ غلام اس رند مشرب شخص سے بچنے کی بڑی کوشش کر رہا ہے مگر یہ کب تک بچے گا؟ خدارا آپ میری مدد کیجیے ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔“

عبدالوہاب دعا مانگتے مانگتے سو گئے۔ اس بار انہوں نے پھر وہی خواب دیکھا۔ وہی شخص پُربہار باغ میں شراب نوشی میں مشغول تھا۔ اُس نے اس بار پھر عبدالوہاب کو مخاطب کیا۔ ”عبدالوہاب! میں بار بار انکار برداشت نہیں کروں گا۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو میرے ہاتھ سے شراب پی لے۔“

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ”میں بھی بار بار تیرے اصرار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں نے تیرے خلاف رسول اللہ ﷺ کے دربار میں استغاثہ داخل کر دیا ہے۔ فیصلے کا انتظار ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس میں تجھے سزا ہو جائے گی۔“

ابھی عبدالوہاب کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ آپ نے دیکھا رسول مقبول ﷺ ہاتھ میں عصا لیے نمودار ہوئے پھر آپ ﷺ نے اپنا عصا اس بدعتی فاسق کی طرف پھینکا۔ عبدالوہاب کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ شخص دیکھتے ہی دیکھتے کتا بن گیا اور روتا بلبلاتا ایک طرف فرار ہو گیا۔

عبدالوہاب پر رسول اللہ ﷺ کا رعب طاری ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ”عبدالوہاب! تجھے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مردود اب اس شہر میں نظر نہیں آئے گا۔“

عبدالوہاب اس خواب سے بیدار ہوئے تو قاضیِ شہر کو یہ خوشخبری سنائی کہ وہ بدعتی فاسق و فاجر شخص اس شہر کو چھوڑ گیا ہے۔

قاضی نے کہا۔ ”یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟“

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ”میں نے خواب میں جو کچھ دیکھا، وہ غلط نہیں ہو سکتا۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”آپ نے خواب میں کیا دیکھا اور اس کی سچائی اور جھوٹ کا امتحان کس طرح کیا جائے؟“

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ”پھر آپ میرے ساتھ اس شخص کے گھر چلیں، وہاں ہر بات کی تصدیق یا تکذیب ہو جائے گی۔“

یہ دونوں اس شخص کے گھر گئے۔ قاضی کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ قاضی نے پڑوسیوں سے پوچھا۔ ”یہ شخص کہاں چلا گیا؟“

ایک پڑوسی نے بتایا۔ ”صاحب! ہمیں اس سے زیادہ نہیں معلوم کہ وہ شخص پریشان حال گھر سے نکلا۔ اپنا سامان گدھوں اور گھوڑوں پر لادا اور فرار ہو گیا۔“

عبدالوہاب نے اس بدعتی فاسق کے گھر میں داخل ہو کر دیکھا۔ وہ بالکل خالی پڑا تھا۔

عبدالوہاب نے اسی جگہ دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی اور قاضی سے کہا۔ ”قاضی صاحب! واقعہ دراصل یہ ہے۔“ اس کے بعد ساری تفصیل بتا دی اور کہا۔ ”میں نے جب رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تھا تو یقین آ گیا تھا کہ اب اس شخص کی خیر نہیں۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”پھر اس شخص میں اتنی قوت یعنی روحانی قوت کہاں سے آ گئی تھی؟“

عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ”یہ استدراج کا کرشمہ تھا۔ جب کوئی غیر مسلم گیان دھیان سے اپنے اندر غیر معمولی قوت پیدا کر لیتا ہے اور اس قوت سے قیاس اور عقل سے بالا واقعے ظاہر ہونے لگتے ہیں تو انہیں استدراج کہا جاتا ہے۔“

قاضی نے اس نوجوان درویش کی بابت یہ رائے قائم کر لی تھی کہ کچھ بھی ہو، ایک نہ ایک دن یہ نوجوان غیر معمولی مقام اور شہرت کا حامل ہو گا۔

☆☆☆

آپ اکیلے بھی سفر کرتے تھے اور فقراء کے ساتھ بھی۔ آپ کی علمیت اور جذب کا چرچا بھی ہونے لگا تھا۔ جب فقراء آپ کے ساتھ ہوتے تو وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے اور آپ ان کے ایسے جواب دیتے کہ سننے والا لاجواب ہو جاتا۔ ایک دن کسی فقیر نے آپ سے پوچھا۔ ”جناب! کیا جذب اور سلوک کے بغیر بھی اللہ تک رسائی ممکن ہے؟ شاید نہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟“

آپ نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا، پھر فرمایا۔ ”میں اس سوال کا جواب اسی وقت دے سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا

جواب کسی مناسب موقع پر دیا جائے تو بہتر ہے۔"
ساتھی درویش نے پوچھا۔ "یہ مناسب موقع کب آئے گا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "جب بھی آجائے۔ میں وقت کا منتظر ہوں۔ جب بھی آیا، تجھے مطلع کر دوں گا۔"
ساتھی درویش نے پوچھا۔ "کیا اس دوران مجھے آپ ہی کے ساتھ رہنا ہوگا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "اگر تو اپنے سوال کا جواب چاہتا ہے تو تجھے میرے ساتھ، میرے پاس رہنا ہوگا۔"

وہ درویش آپ ہی کے ساتھ رہنے لگا۔ سفر میں حضر میں، ہر جگہ ہر حال میں۔ اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے آپ احمد نگر پہنچے۔ اس وقت آپ کے ساتھ کئی درویش اور بھی تھے۔ ان سب نے ایک باغ میں قیام کیا۔ سب نے اپنے اپنے ذمے ایک ایک کام لے لیا تھا۔ کوئی سوکھی لکڑیاں چن لایا، کسی نے چولہا جلایا، کسی نے آٹا گوندھا، کسی نے روٹیاں پکائیں، کسی نے دال چنی اور پانی میں بھگو کر چولہے پر رکھ دی۔ یہ سارے کام ہو رہے تھے۔ عبدالوہاب اپنے حصے کا کام ختم کر کے اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے کہ انہیں دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ عبدالوہاب نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ جب یہ شخص ان کے پاس آجائے گا تو وہ اسے بھی اپنے کھانے میں شریک کر لیں گے۔

وہ شخص سیدھا آپ ہی کے پاس چلا آیا۔ آپ نے اپنے ساتھی درویش سے کہا۔ "میرا خیال ہے اب میں تیرے سوال کا جواب دے سکوں گا۔"

درویش ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ آنے والا جب بالکل آپ کے پاس آ کھڑا ہوا تو آپ نے اس سے کہا۔ "اے شخص! میں خود کو خوش قسمت سمجھوں یا آپ کو؟ کیونکہ کچھ دیر پہلے میں نے اپنے دل میں یہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب آپ میرے پاس آئیں گے تو میں آپ کو کھانا کھلاؤں گا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لے آئے۔"
آنے والے نے پوچھا۔ "یعنی؟ یعنی تو مجھے کھانا کھلائے گا؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ہاں! میں خدا کی طرف سے آپ کو کھلاؤں گا۔ آپ ذرا توقف فرمائیں۔"
نووارد بے چین ہو گیا، بولا۔ "یعنی تو مجھے کھانا کھلائے گا اور تیرا خیال ہے کہ میں کھا بھی لوں گا؟"
آپ نے فرمایا۔ "آپ چاہے ایک لقمہ کھائیں مگر کھائیں گے ضرور۔"
نووارد کو جیسے کسی نے چابک رسید کر دیا ہو۔ وہ تلملا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سامنے جنگل کی طرف بھاگ رہا تھا۔
آپ کو اس کی یہ ادا تنی بھائی کہ اپنے ساتھی درویش سے کہا۔ "آ، ہم دونوں ان کا تعاقب کریں اور دیکھیں ان سے ہمیں کیا ملتا ہے کیونکہ یہ بات مسلمہ ہے کہ اگر انہوں نے ہم سے کچھ لیا نہیں ہے تو یہ ہمیں کچھ نہ کچھ دیں گے ضرور۔"
چنانچہ ان دونوں نے اس نووارد اجنبی کا تعاقب کیا۔ یہ دونوں تیزی سے بھاگتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ جنگل میں اس شخص کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔ ساتھی درویش نے پوچھا۔ "جب آپ کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ میرے سوال کا جواب انہی بزرگ سے ملے گا تو آپ نے انہیں روک کیوں نہیں لیا تھا؟ اگر انہیں روک لیتے تو اب ہم اتنے پریشان نہ ہوتے۔"
آپ نے فرمایا۔ "تو ناحق پریشان ہوتا ہے۔ میں انہیں کہیں نہ کہیں سے پالوں گا۔"
یہ دونوں باتیں کرتے کرتے ایک ایسے درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے جس کی شاخیں زمین کو چھو رہی تھیں اور درخت کا تنا ان میں ایسا چھپ گیا تھا کہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ عبدالوہاب نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "میں پھر یہی کہوں گا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آخر کار اس شخص کو تلاش کر لوں گا۔"
درخت کی شاخوں میں سے کسی نے پوچھا۔ "تم دونوں کس کو تلاش کر رہے ہو؟"
آپ نے اس آواز کو پہچان لیا، فرمایا۔ "ہم دونوں آپ ہی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"
اس شخص نے کہا۔ "تب پھر وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ یہاں میرے پاس آجاؤ۔"
آپ نے جواب دیا۔ "جناب! میرے ساتھ میرا ساتھی بھی ہے۔"
اس نے جواب دیا۔ "اس کو بھی ساتھ لے آؤ۔"
یہ دونوں درخت کی شاخیں ہٹاتے ہوئے ان صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں ان دونوں کے لیے زمین پر جگہ صاف کی جا چکی تھی۔ ان دونوں کو سامنے بٹھا کر حکم دیا۔ "کہو اللہ اللہ۔"
ان دونوں نے اللہ اللہ کہا اور اسی طرح سات بار اللہ اللہ کا ورد کرایا گیا۔ انہیں اچانک اپنے سامنے ایک نور دکھائی دیا۔ ایسا

لطیف نور کہ اس کی کیفیت لفظوں میں نہیں بیان کی جاسکتی۔ عبدالوہاب کی نظریں نور پر جمی رہیں اور ان کی حالت غیر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ سکتے کے مریض ہو گئے۔ ان کے حواس بظاہر کام نہیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مگر قوتِ گویائی ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے اس مردِ حق کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ انہوں نے سنا، وہ شخص کہہ رہا تھا۔ ''عبدالوہاب! مبارک ہو کہ تم نے اسمِ اعظم کا ورد کیا اور اپنی مراد کو پہنچا۔''

اس کے بعد اس مردِ حق نے ان کی گردن سہلانا شروع کر دی اور پھر کان بھی سہلائے۔ کافی دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے عبدالوہاب سے کہا۔ ''اب تو جاسکتا ہے۔''

عبدالوہاب کسی معمول کی طرح وہاں سے چل پڑے۔ ان کا ساتھی بھی ساتھ چل رہا تھا لیکن اس کی اور عبدالوہاب کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ عبدالوہاب اپنی ذات میں نور کا سرور اب بھی بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ہوش میں آجانے کے باوجود وہ مدہوشیت سی محسوس کر رہے تھے لیکن اب ان میں روحانی انقلاب عظیم برپا ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''دیکھ، جو جذب اور سلوک ریاضت اور محنت سے بھی نہیں مل سکتا تھا، ایک بزرگِ کامل کے نظری فیضان سے چشم زدن میں حاصل ہو گیا۔''

ان کا ساتھی افسوس کر رہا تھا کہ وائے افسوس! صد افسوس کہ وہ خود اس سے محروم رہا۔

☆☆☆

آپ کے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا۔ ''حضرت! یہ ہندو جوگی جن کرشموں کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جب تک کوئی جوگی اپنے کرشموں سمیت میرے سامنے نہ ہو، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

اتفاق کی بات کہ انہی دنوں آپ کو کسی نے بتایا کہ یہاں ایک ایسا جوگی موجود ہے جو اپنے چاہنے والوں کو سونے کا قلعہ دکھایا کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ''سونے کا قلعہ! یعنی اتنا سارا سونا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ کہاں ہے؟ میں اس سے ضرور ملوں گا۔''

چنانچہ آپ اس درویش کے ساتھ جوگی کے پاس پہنچ گئے۔ جوگی نے آپ کو دیکھتے ہی کہا۔ ''تو جناب! آپ ہیں جو میرے سونے کے قلعے پر یقین نہیں رکھتے حالانکہ وہ حقیقت ہے اور اسے بے شمار شائقین نے دیکھا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''دیکھا ہو گا مگر اس کا دیکھنا کوئی ضروری تو نہیں۔''

جوگی نے جواب دیا۔ ''میں اس قلعے کو آپ کے پیشِ نظر یوں کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر یقین آجائے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''مگر میں اسے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

جوگی نے طنز کیا۔ ''آپ مسلمان ہیں اس لیے میرے کمال کا دل سے اعتراف نہیں کر رہے ہیں یا آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

آپ نے غصے میں جواب دیا۔ ''میں تیرا مذاق کیوں اڑاؤں گا۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں اور میں جس دن چاہوں گا تیری قوت سلب کر لوں گا اور پھر تُو اپنا سونے کا قلعہ کسی کو دکھانے کے لائق ہی نہیں رہے گا۔''

جوگی کو بھی غصہ آگیا، بولا۔ ''آج تک تو ایسا کوئی پیدا نہیں ہوا جو میری قوت کو سلب کرلے۔ آپ کو اپنی روحانی قوت پر اتنا ہی ناز ہے تو اپنے دعوے میں پورے اتر کر دکھایئے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کہاں ہے تیرا سونے کا قلعہ؟ آج میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

جوگی ان کو ساتھ لے کر ایک طرف چل دیا اور پھر وہ ایک مندر کے در پر کھڑا ہوا تو اس نے مندر کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ادھر دیکھیے، وہ رہا میرا سونے کا قلعہ۔''

آپ نے ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہاں ہے تیرا سونے کا قلعہ، مجھے تو نظر نہیں آرہا۔''

جوگی نے اپنا سونے کا قلعہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ آپ کے سامنے بے حد شرمندہ ہو رہا تھا۔

آپ نے پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ تیرا سونے کا قلعہ؟ میں تیری خواہش پر اسے دیکھنے آیا ہوں۔''

جوگی سونے کا قلعہ دکھانے میں ناکام ہو چکا تھا۔ آپ نے جوگی کو مایوس جو دیکھا تو پوچھا۔ ''کیا خیال ہے جوگی مہاراج! وہ قلعہ کہیں تھا بھی یا محض مذاق تھا تیرا؟''

جوگی نے عرض کیا۔ ''اب میاں جی میں کیا کہوں، ہزاروں کو دکھا چکا ہوں وہ قلعہ۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو تُو ناکام رہا۔ اب اگر تُو چاہے تو میں دکھادوں وہ قلعہ؟''

جوگی نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ دکھائیں گے وہ قلعہ؟ وہ کس طرح؟''

آپ نے جواب دیا۔ ”دیکھ اس طرح۔ دیکھ ادھر دیکھ۔“
اب جوگی نے جو اس طرف دیکھا تو وہاں پر سونے کا قلعہ موجود تھا۔ اس کا بہت بُرا حال ہو رہا تھا۔
آپ نے فرمایا۔ ”جوگی مہاراج جی! اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تو نے جو کچھ دکھانا چاہا تھا وہ ہماری اصطلاح میں تیرا استدراج تھا اور میں نے جو کچھ دکھایا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک ادنیٰ غلام کی کرامت تھی اور یہ مقام رسول اللہ ﷺ کی غلامی کے بغیر نہیں ملتا۔“
جوگی کچھ سوچ رہا تھا۔ مستقل سوچ میں تھا۔ آپ نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگے؟“
جوگی نے جواب دیا۔ ”میاں جی! میں سوچ رہا تھا کہ بڑے گیان دھیان اور تپسیا کے بعد میں نے ایک کارنامہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ آپ نے اسے چٹکی بجا کے زائل کر دیا۔ ایسی تپسیا اور ایسے گیان دھیان پر تف ہے، لعنت ہے اور ایسے دھرم پر بھی۔“
آپ نے پوچھا۔ ”پھر تو کیا چاہتا ہے؟“
جوگی نے جواب دیا۔ ”میں مسلمان ہو جانا چاہتا ہوں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ کلمہ پڑھو اور مسلمان ہو جاؤ۔“
جوگی نے پوچھا۔ ”کلمے میں کیا پڑھنا ہوگا؟“
آپ نے اسے کلمہ پڑھوایا اور اسے مسلمان کر لیا۔ مسلمان ہو جانے کے بعد وہ آپ ہی کے ساتھ رہنے لگا لیکن جب آپ نے دور دور کی سیاحت اختیار کی تو اس کو آپ سے جدا ہو جانا پڑا۔

☆☆☆

آپ کا ایک ہمدرد اور ارادت مند آپ کے کھانے کا بندوبست اس طرح کرتا تھا کہ وہ کسی قصائی کے پاس چلا جاتا اور اس سے بے کار قسم کی ہڈیاں لے کر کسی کھیت میں چلا جاتا۔ وہاں گھنٹوں گیہوں کے تنکے تلاش کرتا رہتا پھر ان دونوں چیزوں کو گھر لے آتا اور انہیں دھو کر ایک دیگچی میں چڑھا دیتا اور پھر جب دونوں چیزیں ابل کر شوربے کی شکل اختیار کر لیتیں تو اس کا ایک پیالہ عبدالوہاب پیتے اور دوسرا پیالہ دوست پی جاتا۔ آپ کی یہ بات جب مشہور ہوئی تو آپ کے ارادت مندوں نے آپ کی خدمت میں قسم قسم کے کھانے پیش کرنا شروع کر دیے۔ آپ کو یہ بات گراں گزری اور اپنے دوست سے پوچھا۔ ”کہو کیا خیال ہے؟ کیا یہ طریقہ درست ہے؟ یا پھر.....“
دوست نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد! میرا خیال ہے یہ طریقہ درست نہیں ہے۔“
آپ نے پوچھا۔ ”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“
دوست نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو آپ سے مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں کیا جواب دوں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر سنو۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب میں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔“
آپ نے اپنے دوست کے ساتھ وہ شہر اسی دن چھوڑ دیا اور ایک ایسے شہر میں جا بسے جہاں کوئی ان کا شناسا نہ تھا۔ یہاں انہیں بڑا سکون ملا کیونکہ یہاں انہیں کھانے پینے کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔
ان دنوں آپ اپنے دوست کے ساتھ ایک مسجد میں رہ رہے تھے۔ اتفاق کی بات کہ جس رزق سے منہ موڑ کر یہ دونوں بھاگے تھے، اسی رزق نے ان دونوں کو بہت پریشان کیا۔ شہر میں قحط پڑ چکا تھا۔ جوان، بچے، بوڑھے اور عورتیں دربدر کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ جب دونوں مسجد میں آئے تو ان کا دوست تو ایک کونے میں اکیلا بیٹھ گیا اور آپ دوسرے کونے میں جا بیٹھے۔ بھوک نے دونوں کا بُرا حال کر دیا تھا۔
جب یہ دونوں بھوک سے نڈھال اور بے حال ہو گئے تو انہوں نے دیکھا کہ مسجد میں ایک حلوا فروش داخل ہوا اور بہت سارا حلوا اپنے برتن میں رکھا اور برتن کو ان دونوں کے بیچ میں رکھ کر حلوا فروش چلا گیا۔ ان دونوں نے حلوے کو دیکھا تو اس کی بُو ناک میں سرسراہٹ سی پیدا کر رہی تھی۔ ان دونوں نے حلوے پر سے نظریں ہٹا لیں لیکن کچھ دیر بعد ان دونوں نے ایک بار پھر حلوے کی طرف دیکھا تو ان کے لیے برداشت ناممکن ہو گئی لیکن ایک دوسرے سے اپنا بھرم قائم رکھا۔
دوسرے دن پھر وہی مشغلہ پیش آیا۔ حلوا فروش حلوا لے کر آیا اور ان دونوں کے درمیان رکھ کر چلا گیا۔ ان دونوں نے پھر اسی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا۔
تیسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا لیکن اس بار حلوا فروش مسجد ہی میں کھڑا رہا۔ اس کا حلوا دونوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ اس

نے پوچھا۔ ''آپ دونوں حلوا کھاتے کیوں نہیں؟''
دوست نے جواب دیا۔ ''جب تک پیرو مرشد خود نہ کھائیں، میں کس طرح کھا سکتا ہوں۔''
اور آپ نے جواب دیا۔ ''اور میں خود کو بے صبرا اور ندیدہ نہیں کہلانا پسند کرتا تھا۔''
حلوا فروش نے کہا۔ ''آج میں خود اپنے ہاتھ سے آپ دونوں کو کھلاؤں گا۔''
اور پھر لوگوں نے یہ پُرلطف منظر دیکھا کہ حلوا فروش ان دونوں کو اپنے ہاتھ سے حلوا کھلا رہا ہے۔

☆☆☆

آپ نے بیس سال کی عمر میں مکہ معظمہ کا سفر کیا۔ یہاں آپ جس جگہ مقیم تھے، ملنے جلنے والوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی۔ اتنی کم عمری ہی میں آپ نے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ یہاں شیخ علی متقی پہلے ہی سے مقیم تھے۔ یہ بھی ملنے پہنچے۔ شیخ علی متقی کو یہ پہلے ہی سے جانتے تھے۔ دونوں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر رخصت ہوتے ہوئے شیخ علی متقی نے کہا۔ ''عبدالوہاب! اگر تم مناسب سمجھو تو میرے پاس چلے آؤ۔''
اس وقت عبدالوہاب خطِ نستعلیق میں کوئی کتاب لکھ رہے تھے۔ شیخ علی متقی نے ان کا خط دیکھا تو بہت خوش ہوئے، فرمایا۔
''عبدالوہاب! تمہارا خط بہت اچھا ہے۔ اب تم پر یہ واجب ہوگیا کہ میرے غریب خانے پر آؤ اور میری چند کتابوں کی کتابت کردو۔''
عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ''آپ کی دعوت اور پیشکش کا بہت بہت شکریہ مگر ہمیں کچھ پتا نہیں کہ ہمارے نصیب میں کیا ہے۔ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ ہم آپ کے پاس رہیں اور آپ کی کتابوں کی کتابت کریں تو ایسا ہو کر رہے گا۔''
کچھ دنوں تک عبدالوہاب شیخ علی متقی کی صحبت میں آتے جاتے اور اٹھتے بیٹھتے رہے اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچے کہ شیخ علی متقی کے علومِ ظاہری اور باطنی میں کوئی ان کا حریف اور مثیل نہیں ہے لیکن اب بھی وہ شیخ علی متقی کی پیشکش سے فائدہ اٹھانے کو تیار نہ تھے۔
ایک رات انہوں نے اپنے والد کو خواب میں دیکھا۔ وہ کھڑے کہہ رہے تھے۔ ''عبدالوہاب! یہ تو کیسی غلطی کررہا ہے۔ شیخ علی متقی جیسا عالم بے بدل اور بے مثل صوفی خوش قسمتی سے مل گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تجھے راہِ حق کے سلوک کی توفیق ہو تو شیخ علی متقی کی صحبت ضرور اختیار کر۔ اگر تو نے غفلت کی تو پچھتائے گا۔''
عبدالوہاب کی آنکھ کھلی تو وہ بے چین اور مضطرب ہوکر ٹہلنے لگے۔ رات کے پچھلے پہر کا وقت تھا۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ اسی وقت شیخ کی خدمت میں پہنچ جاتے، لیکن وہ صبح کا انتظار کرتے رہے۔ صبح فجر کی نماز کے بعد عبدالوہاب شیخ علی متقی کی خدمت میں پہنچے اور مؤدبانہ عرض کیا۔ ''حضرت! میں غلامی کے لیے حاضر ہوگیا ہوں، مجھے بیعت کرلیجیے۔''
شیخ نے عبدالوہاب کو اپنے در پر دیکھا تو بہت خوش ہوئے، پوچھا۔ ''تو خطِ نستعلیق میں بہت اچھا لکھتا ہے۔ یہ تو بتا کہ کیا تجھے خطِ نسخ میں بھی لکھنا آتا ہے؟''
عبدالوہاب نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں خطِ نسخ میں نہیں لکھ سکتا۔''
شیخ علی متقی نے نہایت محبت سے سمجھایا۔ ''مگر میں تمہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ خطِ نسخ میں لکھنے کی عادت ڈالو۔ اگر تم نے اس میں بھی کمال حاصل کرلیا تو سمجھ لو یہاں کام کی کوئی کمی نہیں اور ثواب بھی کماؤ گے۔''
آپ نے اسی دن سے خطِ نسخ کی مشق شروع کردی اور بہت جلد اتنا ملکہ بہم پہنچا لیا کہ قرآن پاک کی کتابت شروع کردی۔ قرآن پاک کے بعد شیخ علی متقی نے اپنی کتابوں کی کتابت شروع کرادی۔ آپ اتنا اچھا اور جلدی کام کرتے کہ شیخ علی متقی ان پر بہت زیادہ اعتماد اور بھروسا کرنے لگے۔ آپ کی علمی لیاقت کے پیش نظر شیخ علی متقی نے اپنی کتابوں کی تصحیح اور ترتیب پر آپ کو لگا دیا۔
ان دنوں میں شیخ علی متقی کی علمی اور روحانی حیثیت نے عبدالوہاب کو مطیع اور فرماں بردار کرلیا تھا۔ آخر جمادی الاول 963ھ میں عبدالوہاب نے شیخ علی متقی کی باقاعدہ مریدی اختیار کی۔ پیرو مرشد نے بیعت کے وقت اپنے لائق اور باکمال مرید کو ایک ہی نصیحت کی۔ ''مالداری پر فقر کو مقدم رکھنا اور زندگی بھر اس اعتقاد پر جمے رہنا۔''
پھر مکہ قحط کا شکار ہوگیا۔ شیخ علی متقی کی مالی حالت جواب دے گئی اور وہ خود بھی اس قحط سے متاثر ہوگئے۔ اب ان کے پاس کام تو تھا مگر مال نہیں تھا۔ عبدالوہاب نے اپنے پیرو مرشد سے پوچھا۔ ''حضرت! اس وقت آپ کے پاس زر کی کمی ہی نہیں، سرے سے زر ہے ہی نہیں۔''
شیخ علی نے پوچھا۔ ''اس طرح تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''صرف یہ کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں کسی اور کے پاس کام شروع کردوں؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''کوئی مضائقہ نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

عبدالوہاب نے ایک متمول کو پکڑ لیا اور اس کے پاس کتابت کرنے لگے۔ اجرت روز کی روز لیتے تھے۔ آپ اس اجرت سے بیگن خرید لیتے اور پھر اس میں نمک شامل کر کے رکھ دیتے۔ یہ بیگن اچار کی شکل اختیار کر لیتا تو آپ اسے اپنے پیرومرشد کے ساتھ بیٹھ کر نوش فرماتے۔ دونوں نے اسی خوراک پر قحط کو نکال دیا۔

آپ اپنے پیرومرشد کی خدمت میں اس طرح رہتے کہ جو دیکھتا رشک کرتا۔ بارہ سال تک خدمت کرتے رہنے کے بعد شیخ علی متقی کا داغ جدائی سہنا پڑا۔ عبدالوہاب مہینوں غمگین اور پریشان رہے۔ اب خود ان کی شہرت اور فضیلت کا یہ حال تھا کہ دور دور تک پہنچ چکی تھی اور آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔

یمن، مصر اور شام کے مشائخ آپ کے پاس آتے اور آپ سے اتنے مرعوب اور متاثر ہو کر جاتے کہ وہ ان کا شب و روز ذکر کرتے رہتے اور ان کی شہرت ملکوں ملکوں پہنچ گئی۔ ان سبھوں نے ایک عجیب و غریب بات کہنا شروع کر دی۔ وہ کہتے۔ ''شیخ عبدالوہاب دراصل قطب وقت ہیں۔ وہ امام ابوالحسن شاذلی کے شاگرد شیخ ابوالعباس کے قدم بہ قدم گامزن ہیں۔''

حالانکہ اس حقیقت سے ہر شخص واقف تھا کہ شیخ ابوالعباس مرسی سے آپ کی کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی اور ان کے وصال کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ بعض مریدوں کے دل میں یہ سوال ابھرتا کہ وہ کس طرح ابوالعباس مرسی کے قدم بہ قدم گامزن ہیں؟ لیکن سوال کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

یمن کے مشائخین نے اہالیانِ حرمین کے نام ایک خط میں شیخ عبدالوہاب کی بڑی تعریفیں لکھیں اور آخر میں نہایت جلی حرفوں میں لکھا۔ ''اے اہالیانِ حرمین! تم میں منجانب اللہ ایک شمع روشن ہے۔ اس سے روشنی حاصل کرو۔''

یمن کے صاحبِ حال عارف اور محقق شیخ حاتم مکہ معظمہ پہنچے اور شیخ عبدالوہاب سے کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

آپ نے جواب میں کہلا بھیجا۔ ''حاتم! دلوں کی ملاقات زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ سردست، جسمانی ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں۔''

سید حاتم اس جواب سے بے حد خوش ہوئے اور یمن واپس چلے گئے۔

ان دنوں شیخ عبدالحق محدث دہلوی مکہ معظمہ ہی میں قیام پذیر تھے اور ان کا بیشتر وقت شیخ عبدالوہاب کی خدمت میں گزرتا تھا۔ شیخ محدث دہلوی ہندوستان جانا چاہتے تھے، اسی خیال سے انہوں نے حزب البحر کی کتابت شروع کر دی۔ وہ اس کو بحری سفر میں پڑھنا چاہتے تھے۔ کتابت کے دوران مکہ معظمہ کے مشہور شیخ علاء الدین ان سے ملنے پہنچے۔ شیخ محدث دہلوی نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

شیخ علاء الدین نے پوچھا۔ ''حضرت! یہ آپ کس چیز کی کتابت فرما رہے ہیں؟''

محدث دہلوی نے جواب دیا۔ ''حزب البحر کی۔ میں عنقریب ہندوستان واپس چلا جاؤں گا۔ سوچتا ہوں بحری سفر کے دوران اس کا ورد جاری رکھوں اور نقل بھی پاس رہے گی۔ برکت کی خاطر۔''

شیخ علاء الدین نے پوچھا۔ ''حضرت! اس کی کتابت آپ اپنی مرضی سے کر رہے ہیں یا کسی بزرگ سے اجازت بھی حاصل کی ہے؟''

محدث دہلوی نے جواب دیا۔ ''میں نے شیخ عبدالوہاب سے اجازت حاصل کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مجھے منع نہیں کریں گے۔''

شیخ علاء الدین نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم شیخ عبدالوہاب کو کس طرح جانتے ہو؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں دو سال سے ان کی خدمت کر رہا ہوں۔''

شیخ علاء الدین نے بے ساختہ کہا۔ ''عبدالحق! مبارک ہو، تمہارے حج مقبول ہوئے اور اعمال بارگاہِ ایزدی میں پسندیدہ قرار پائے۔''

محدث دہلوی نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟''

شیخ علاء الدین نے جواب دیا۔ ''عبدالحق! جن دنوں میں یمن میں تھا تو وہاں کے جملہ مشائخ نے متفقہ طور پر شیخ عبدالوہاب کی بابت کہا کہ شیخ عبدالوہاب مکہ معظمہ میں اپنے وقت کے قطب ہیں۔''

شیخ عبدالحق محدث دہلوی آپ سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور انہیں قلمبند کر لیتے۔ ایک دن پوچھا۔ ''پیرومرشد! درویش جو ذکر اور حلقہ وغیرہ کرتے ہیں، اس کی سند سنتِ نبوی ﷺ سے ملتی ہے یا نہیں؟''

شیخ نے جواب دیا۔ ''اس کی کوئی سند سنتِ نبوی ﷺ سے نہیں ملتی مگر مشائخ کا یہ عمل اس لیے مستحسن ہے کہ ہر وہ کام جس کی

بنیاد ذکرالٰہی ہو، وہ مؤثر ہوتا ہے۔ اصلی ذکر لا الٰہ الاّ اللہ ہے اور بقیہ اذکار معنوی اور صوری طور پر اسی سے مستنبط ہیں۔ ذکر میں لفظوں کو پوری طرح اور صحیح طور پر ادا کرنا چاہیے۔ ذکر لا الٰہ الاّ اللہ میں لفظ لا کو اور الاّ اللہ میں لفظ الاّ کو کھینچ کر ادا کرنا چاہیے۔ اسی طرح حرف 'ہا' کو بخوبی واضح طور پر ادا کیا جائے۔ غلبۂ شوق اور استیلائے ذکر میں الفاظِ ذکر جس طرح بھی ادا ہوں، درست ہے۔"

شیخ محدث دہلوی نے پوچھا۔"اور ذکرِ خفی کی بابت آپ کیا فرماتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔"جو ذکر آہستہ کیا جائے، اتنی آہستہ کہ اس کے پاس والا نہ سن سکے، ذکرِ خفی ہے۔"

شیخ محدث دہلوی نے کہا۔"بعض لوگ ذکرِ خفی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں زبان اور قلب کو دخل نہ ہو بلکہ انہیں بھی خبر نہ ہو۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟"

آپ نے فرمایا۔"یہ تو ذکرِ خفی کا منتہا ہے۔ ورنہ ذکرِ خفی کا ادنیٰ مقام یہی ہے کہ ذاکر خود تو سن لے، دوسرا نہ سن سکے جیسے غیر جہری نماز۔ اگر دل میں خدا کو یاد کیا جائے تو بہت اچھا ہے لیکن اس پر ذکر کا اطلاق نہیں ہوگا۔"

شیخ محدث دہلوی نے فرطِ عقیدت سے عرض کیا۔"حضرت! میری استدعا ہے کہ آپ کبھی کبھی اپنے اخبار و حالات سے مستفید فرماتے رہیں تو شکر گزار رہوں گا۔"

آپ نے جواب دیا۔"اس کے لیے ضروری ہے کہ تم خود بھی جستجو کرتے رہو۔"

شیخ محدث دہلوی نے کہا۔"بہتر ہے۔ میں ضرور جستجو کروں گا۔"

☆☆☆

آخر کچھ عرصے کے بعد شیخ محدث دہلوی نے آپ سے پوچھ ہی لیا۔"حضرت! یہ یمن کے مشائخ اور فقراء یہ کیوں کہتے ہیں کہ آپ شیخ ابوالعباس کے قدم بہ قدم گامزن ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟"

آپ مسکرائے اور فرمایا۔"پتا نہیں وہ ایسا کیوں کہتے ہیں؟" پھر شیخ ابوالعباس مرسی کے مناقب و فضائل بیان کرنے لگے۔

شیخ مرسی، شیخ ابوالحسن شاذلی کے مرید تھے۔ شیخ ابوالعباس مرسی کے شاگرد شیخ ابن عطا، اللہ نے آپ کی سوانح حیات پر کتاب لکھی ہے، لطائف المنن فی مناقب شیخ ابوالعباس و ابی الحسن۔ شیخ ابوالعباس بہت بڑے بزرگ تھے۔ ان کے ہم عصر بادشاہ کو ان سے بڑی بدگمانی تھی۔ بادشاہ کو آپ کے تقویٰ اور پرہیزگاری پر ہمیشہ شبہ رہتا تھا چنانچہ اس نے آپ کا ایک بار امتحان لیا۔ اس نے آپ کی دعوت کی اور اس دعوت میں دو قسم کے کھانے پکوائے۔ ایک تو وہ کھانے جو عام طور پر رائج تھے اور گھر گھر کھائے جاتے تھے اور دوسرے وہ کھانے جو حرام ہیں۔ بادشاہ نے اپنے خدمت گاروں کو درِ پردہ یہ حکم دے دیا کہ حرام کھانے کسی کو بتائے بغیر درویشوں کے سامنے رکھ دیے جائیں اور حلال کھانے شاہی امراء اور فوجیوں کے سامنے سجا دیے جائیں۔

چنانچہ جب درویشوں اور شاہی امراء اور فوجیوں نے آنا شروع کیا تو انہیں اسی ترتیب سے دو حصوں میں بٹھا دیا گیا۔ جب حسبِ ہدایت دونوں کے سامنے کھانے رکھ دیے گئے تو اچانک شیخ ابوالعباس مرسی اپنی جگہ سے اٹھے اور درویشوں کے سامنے رکھے ہوئے کھانے اٹھا اٹھا کر فوجیوں اور امراء کے سامنے رکھنے لگے اور ساتھ ہی یہ فرماتے جا رہے تھے۔"آج میں مخلوقِ خدا کی خدمت کروں گا۔"

لوگوں نے دیکھا آپ کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں اور امراء اور فوجیوں کے آگے کھانے رکھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔"خراب چیزیں خراب لوگوں کے لیے۔"

اس کے بعد حلال کھانے درویشوں کے سامنے رکھ دیے اور فرمایا۔"اور عمدہ چیزیں عمدہ لوگوں کے لیے۔"

بادشاہ نے امراء اور فوجیوں کو کھانے سے روک دیا اور خود شیخ کے قدموں میں گر گیا، بولا۔"حضرت! میں اپنی بدگمانیوں پر نادم ہوں۔ خدارا مجھے معاف کر دیجیے۔"

اس کے بعد آپ ایک دم خاموش ہو گئے۔ محدث دہلوی انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

ایک سال بعد آپ نے بغیر پوچھے ہی محدث دہلوی سے فرمایا۔"عبدالحق! پچھلے سال ہم نے ایک قصہ بیان کیا تھا، وہ تمہیں یاد ہوگا؟"

شیخ محدث دہلوی نے فرمایا۔"جی پیر و مرشد! یاد تو ہے، وہ کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔"

آپ نے جواب دیا۔"واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد طاہر یمنی کا ایک ملازم شیخ ابوالعباس مرسی کی زندگی ہی میں ان کے پاس آیا تھا۔ یہ ملازم شیخ مرسی کے مہمان خانے میں ٹھہر گیا۔ اسی دوران وہ بیمار پڑ گیا۔ میں کبھی کبھی اس کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ اے عبدالوہاب! جاؤ اور اس بیمار کی خبر لو اور ثابت قدم رکھو۔

"چنانچہ میں بیدار ہوا اور اس بیمار کے پاس پہنچا۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کا آخری وقت ہے۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگا۔ تلاوت کے ساتھ ساتھ دعاؤں کا ورد بھی شروع کر دیا۔ اتنے میں بیمار نے آنکھ کھولی اور اس آیت کی تلاوت کی۔ "ویثبت اللہ الذین بالقول الثابت" اس کے بعد وہ جاں بحق ہو گیا۔ اس آیت کی تلاوت سے میں نے رسول اکرم ﷺ کے اس فرمان کو کہ اس کو ثابت قدم رکھو، بالکل ثابت پایا۔

"میں دوسرے دن اس کی قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور قبر کے پاس بیٹھ کر اس کے آخری دنوں کو یاد کرنے لگا۔ اسی عالم میں میری آنکھ لگ گئی اور میں نے خواب میں دیکھا وہ بیمار بالکل صحت یاب ہو چکا ہے اور مجھے قبر کے پاس بیٹھا دیکھ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "شیخ عبدالوہاب! تیری تثبیت اور ثابت قدم رکھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نزع کے وقت شیطانی وسوسوں سے نجات بخشی اور شیخ ابوالعباس مرسی کے محل کے پاس جنت میں مجھے جگہ دی گئی۔"

"میں نے اپنا یہ خواب اپنے پیرومرشد سے بیان کیا۔ وہ رونے لگے، ان کے ساتھ میں بھی رونے لگا۔"

شیخ محدث دہلوی آگے کا حال جاننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے لیکن عبدالوہاب نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

محدث دہلوی نے پوچھا۔ "پیرومرشد! بس یا اور کچھ باقی رہ گیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ واقعہ ادھورا ہے۔ وہ بیمار مجھ سے کہنے لگا۔ حضرت! آیئے اور ذرا ہمارے گھر کی بھی سیر کر لیجیے۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ اس کے دروازے تک چلا گیا۔ دروازہ کھلا اور ہم دونوں اس کے اندر داخل ہو گئے۔ اس کا گھر کیا، پورا محل تھا جو ہر قسم کے سازوسامان سے آراستہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس سے رخصت ہو کر باہر آیا تو وہ شخص میرے ساتھ ساتھ تھا۔ یہاں میری ملاقات ایک اور شخص سے ہو گئی۔ اس کے چہرے سے ولایت و کرامت کے آثار ہویدا تھے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر السلام علیکم کہا اور کہا...... "جناب! میرے گھر بھی تشریف لے چلیں۔"

چونکہ میں اس شخص سے واقف نہیں تھا اس لیے صاف صاف کہہ دیا۔ "حضرت! ہماری آپ کی کوئی شناسائی تو ہے نہیں، پھر میں آپ کے گھر کیوں چلوں؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "آپ نے بجا فرمایا۔ ہم دونوں میں بظاہر کوئی شناسائی نہیں لیکن اتحاد اور یگانگت کی ایک خاص نسبت ضرور ہے۔"

اس کے بے حد اصرار پر میں اس کے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر ایک شاندار محل تھا۔ پہلے محل سے زیادہ شاندار۔ جواہر و یاقوت کا بنا ہوا۔ میں نے اس سے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے کہا۔ "میرا نام ابوالعباس مرسی ہے۔" پھر انہوں نے مجھے اپنی نشست گاہ پر بٹھا دیا اور کہا۔ "حضرت! آپ یہاں تشریف رکھیں، آپ ہمارے جانشین ہیں۔"

میں وہاں بیٹھ گیا اور مجھے ایسا لگا گویا میں نے اس جگہ ایک زمانہ بتا دیا ہے۔ پھر میں وہاں سے رخصت ہوا۔ باہر نکلا تو اپنے پیرمرشد شیخ علی متقی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے محل میں لے گئے۔ ان کے محل کی شان ہی نرالی تھی۔ یہاں تو نہریں تک جاری تھیں۔ انہوں نے ایک نہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "عبدالوہاب! یہ جامع کبیر ہے۔" پھر دوسری نہر کی طرف اشارہ کیا، فرمایا۔ "اور یہ جامع صغیر ہے۔" اس کے بعد ایک تیسری نہر کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ میری فلاں کتاب ہے اور یہ میری فلاں کتاب۔"

سب کچھ بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ "یہ میرا خواب تھا۔ شیخ ابوالعباس مرسی کے متعلق میں اتنا ہی جانتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔ ممکن ہے شیخ مرسی نے اس واقعے کی خبر فقرائے یمن کو دے دی ہو اور اہالیانِ حرمین کو بھی اسی طرح مطلع کر دیا ہو۔"

☆☆☆

آپ نے پچاس سال کی عمر میں شادی کی۔ شادی سے پہلے آپ جو کماتے تھے، اسے حاجت مندوں پر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ ہندوستان سے جو لوگ وہاں پہنچتے تھے آپ ان کا بے حد خیال رکھتے تھے لیکن شادی کے بعد اس میں کمی آ گئی تھی کیونکہ بیوی اور اس کے بعد بچوں کی ذمے داریاں انہیں محتاط بنا چکی تھیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ان سے زیادہ علوم شرعیہ کا ماہر کوئی دوسرا نہیں تھا۔ لغتِ قاموس آپ کو ازبر تھی۔ فقہ، حدیث اور فلسفہ انہیں ازبر تھے۔ برسوں حرم شریف میں ان کا درس دیتے رہے۔ آپ کا قول تھا کہ علم غذا کی طرح ہے جس کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے اور اس کا نفع عام ہے۔ ذکر دوا کی طرح ہے جس کے ذریعے علاج کیا جاتا ہے۔ طالب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کاموں سے فرصت نکال کر خلوت میں فراغتِ دل اور حضورِ قلب کرے، خاص کر رمضان کے آخری عشرے اور بقرعید کے پہلے عشرے میں ذکر و شغل اور عبادت جاری رکھے اور باقی دنوں میں تحصیلِ علم کرے۔

لوگوں نے کہا۔ ''حضرت! مشائخ تو یہ کہتے آئے ہیں کہ انسان کو ہمیشہ اور ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنا چاہیے، اس کا کیا مطلب ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جو شخص اچھے کاموں میں مشغول ہے تو سمجھ لو وہ ذکرِ الٰہی کر رہا ہے۔ نماز ادا کرنا، تلاوت قرآن پاک علوم شرعیہ کی تدریس اور دوسرے اچھے کام۔ یہ سب ذکر میں داخل ہیں لیکن جو لوگ پڑھنا، پڑھانا اور تمام کاموں کو چھوڑ کر ذکر میں مصروف ہو جاتے ہیں وہ گویا خطرناک بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ہاں، جب یہ محسوس ہو جائے کہ بیماری سخت ہے تو خلوت میں زیادہ سے زیادہ انہماک سے ذکرِ الٰہی کیا جائے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''کیا علم کو چھوڑا جا سکتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''علم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے چھوڑ دیا جائے۔ واقعتاً یہ تو وہ نعمت ہے کہ جس کے لیے سچی نیت سے کوشش کی جائے۔''

ایک دن ایک فقیر آیا اور کہا۔ ''حضرت! میں آپ کے پاس مال و زر کے لیے نہیں آیا بلکہ میں ایک مسئلہ لایا ہوں اور اس کا جواب درکار ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اپنا سوال دہرا۔''

فقیر نے کہا۔ ''نماز پڑھنا بہتر ہے یا ذکر کرنا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''نماز پڑھنا بہت بڑا کام ہے لیکن بہ کثرت ذکرِ الٰہی سے اتصال و اتحاد کی وہ دولت ہاتھ آتی ہے جو بالآخر فنائے وحدت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔''

فقیر کے کان کھڑے ہوئے۔ حیرت سے پوچھا۔ ''حضرت! یہ فنائے وحدت سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''فنائے وحدت ایک لذت کا نام ہے جو چکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس نے اپنی عمر میں ایک بار بھی یہ لذت چکھ لی، وہ زندگی بھر اس مزے اور لذت کو نہیں بھولے گا۔''

کسی نے پوچھا۔ ''حضرت! درویش جس انداز میں دعوتِ حق دیتے ہیں، یہ حق کی وصولی کا صحیح طریقہ ہے یا نہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے حق کی وصولی کا یہ طریقہ ہو لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں یہ حق کی دعوت دینے والے بہت بد اخلاق ہوتے ہیں۔ دعوت دینے والوں کو خوش اخلاق اور مصائب جھیلنے والا ہونا چاہیے۔''

کسی نے پوچھا۔ ''پیر و مرشد! یہ عمرۂ جعرانہ کیا ہوتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مکہ معظمہ سے تقریباً سات میل دور جعرانہ نامی گاؤں واقع ہے۔ اس جگہ جنگِ حنین کی غنیمتیں تقسیم کرنے کے لیے سرورِ دوعالم ﷺ نے قیام فرمایا تھا۔ جب تم وہاں سے گزرو تو عمرہ ضرور کرنا۔ اس عمرے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ عمرے کے بعد اگر وہاں سو جاؤ تو خواب میں رسول مقبول ﷺ کی زیارت ضرور ہو جاتی ہے۔''

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس پر عمل کیا اور عمرۂ جعرانہ کے بعد وہاں سو گئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف فرما ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو وہ جگہ خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔

آپ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اڑ کر سبز گنبد کے اوپر پہنچ گئے ہیں۔ اچانک گنبد شق ہو گیا اور یہ اس میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ یہ مزار مبارک تک پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد اس میں سے نکلے تو کسی متجسس اور متلاشی کی طرح مشرق و مغرب کی ہر چیز سے بلند محوِ پرواز ہیں۔

انہوں نے اپنا یہ خواب، خواب ہی میں اپنے پیر و مرشد کو سنایا اور پوچھا۔ ''پیر و مرشد! اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟''

پیر و مرشد نے جواب دیا۔ ''عبدالوہاب! تم پیروی سرورِ کائنات ﷺ میں کامل اور آقائے دوعالم کی محبت میں مست و غرق رہو گے اور یہی خصوصیات اور اوصاف تمہاری زندگی میں نمایاں اور سبب امتیاز ٹھہریں گے۔''

اور واقعی جب تک آپ زندہ رہے، ان میں یہ خصوصیات اور اوصاف نمایاں رہے۔ آخر ننانوے سال کی عمر میں 1001ھ میں مکہ معظمہ ہی میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ اللہ آپ پر رحمتیں نازل فرمائے۔ ''پیدا کہاں ہیں ایسے......''

ماخذات

اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب، شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ روض الریاحین۔ ترجمہ جعفر علی نگینوی۔ اخبار الصالحین، نواب معشوق جنگ بہادر

احساسِ محرومی

شاہ زین رضوان

اولاد کی نعمت سے محروم رہ جانے والے جوڑے کس قدر ذہنی اذیت کا شکار رہتے ہیں، زیرِ نظر کہانی پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ادھوری ممتا کا احساس زندگی سے کیسے دور لے جاتا ہے۔ وہ بھی خود کو ادھورا تصور کرتی تھی مگر ایک دن... اچانک اس کی بے قرار ممتا کو جیسے قرار آگیا کیونکہ خدا نے اس کی سن لی تھی اور اس کی ادھوری زندگی گویا مکمل ہونے والی تھی۔

خالی گود رہ جانے والے ایک جوڑے کی بے رنگ کیفیتوں کا احوال

اس بچی کی آنکھیں اتنی صاف تھیں کہ جان کو کسی چشمے کے شفاف پانی کا گمان ہوا پھر جب اس بچی نے اپنی ٹانگوں کو حرکت دی اور تھوڑا سا کسمسائی تو اس نے غور کیا کہ وہ آنکھیں صاف ہونے کے ساتھ ساتھ سیاہ بھی تھیں۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ انہوں نے بے بی باکس نصب کرنے کے لیے عطیات جمع کیے تھے لیکن وہاں ایک نوزائیدہ بچی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ قلقاریاں مار رہی تھی۔ جان ایک قدم پیچھے ہٹا اور آنکھیں بند کر کے ایک چھوٹی سی دعا مانگی پھر اس

نے شیلا کو فون کیا۔ گو کہ اس کے خیال میں اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔
''کسی نے اس بے بی باکس کو استعمال کیا ہے۔'' اس نے فون پر کہا۔ اسے وضاحت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔
اب وہ شیلا کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی بچی کے منہ میں رکھی تو وہ اسے چوسنے لگی۔ اس کے سنہرے بال ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ جان نے ہی اس بے بی باکس کے لیے فنڈ اکٹھا کیا تھا۔ اس نے فرائی فش بیچ کر پانچ ہزار ڈالرز جمع کیے جبکہ شیلا نے ایک درجن گیس اسٹیشن پر عطیات جمع کرنے کے لیے باکس رکھے۔
جان اور شیلا اگلے مہینے اپنی شادی کی تیسویں سالگرہ منانے والے تھے اور وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس بچی کے بارے میں سوچ کر وہ کیوں خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے انگلی باہر نکالنا چاہی لیکن بچی کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے ہلکی آوازیں نکالنا بند کر دیں اور منہ پھلا لیا۔ لگتا تھا کہ وہ ابھی رونا شروع کر دے گی۔
جان نے شیلا کی کار رکنے کی آواز سنی۔ بچی اب براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ جان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ شیلا کا استقبال کرنے کے لیے پنجوں کے بل گھوم گیا۔ شیلا پورا منہ کھول کر مسکرا رہی تھی۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔
شیلا کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ جان اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن پھر اس کی سمجھ میں آ گیا اور وہ اسے سننے لگا۔ اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، اس نے کس طرح تمہاری انگلی پکڑ رکھی ہے۔'' پھر اسے ٹھوکا مارتے ہوئے بولی۔ ''لاؤ مجھے دو۔''
جان نے بچی اسے پکڑا دی اور پیچھے ہٹ کر جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے۔ ایک عجیب سی خنکی اس کے سینے میں سرایت کر گئی۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب بے ہوشی کے ڈاکٹر نے اسے ایک سے سو تک گننے کے لیے کہا تھا۔ اس کی دو شریانیں جزوی طور پر بند ہو گئی تھیں اور وہ ان کے علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت بھی اسے ایسی ہی ٹھنڈ محسوس ہوئی تھی۔
شیلا نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ ''کیا ہوا؟''
جان نے کندھے اچکا دیے۔ شیلا بولی۔ ''تم فکر مت کرو۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' پھر اس نے بیگ سے کمبل نکال کر بچی کے گرد لپیٹ دیا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔
جان اس بے بی بیگ سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکا۔ وہ کتنے قرینے سے تیار کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شیلا کافی عرصے سے اس کی تیاری کر رہی تھی۔
دوسری رات جان کو یقین تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ شاید اس بچی کو تلاش کیا جا رہا ہو، اس لیے وہ کہیں نہیں گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بے اولاد تھے۔ جوانی میں انہوں نے اولاد کے لیے ہر طرح سے کوشش کی۔ کئی ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ دعائیں مانگیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ شیلا نے کئی ہفتے بیماری میں گزار دیے، اسی وجہ سے اس کی ملازمت بھی ختم ہو گئی تاہم انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بارے میں کبھی ایک دوسرے کو الزام نہیں دیں گے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔
ایک رات پہلے جان نے واضح الفاظ میں شیلا کو بتا دیا تھا۔ ''یہ بچہ ہمارا نہیں ہے۔'' لگتا تھا کہ شیلا نے اس کی بات نہیں سنی یا پھر اس کی وارننگ کو نظر انداز کر دیا۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی اور جان نے اپنی حدود کو قبول کر لیا تھا لیکن اس نے اپنی بیوی کے جنون کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اولاد کے لیے ترس رہی تھی اور رات کی تاریکی میں وہ یہ توقع کرتی تھی کہ وہ کسی بھوکے بچے کو اپنی گود کی گرمی دے۔ اس نے جان کو مجبور کیا کہ بچے کو اپنے پاس رکھے اور یہ ظاہر کرے کہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی لیکن جان کو یقین تھا کہ اس بچی کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آ سکتی ہے اور اس نے بیوی کو یہی سمجھانے کی کوشش کی۔
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' شیلا نے کہا تو جان کو کچھ سکون ہوا لیکن اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بچہ ہمارا نہیں لیکن خدا کی دین ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اسے اپنے پاس رکھیں۔''
تیسرے دن جان سامان سے لدا پھندا گھر جا رہا تھا۔ اس میں بچوں کے استعمال کی چیزیں تھیں اور ان کی فہرست شیلا نے کمپیوٹر کی مدد سے بنائی تھی۔ ان میں چھوٹے تولیے، ببب، کئی قسم کے لوشن، ٹالکم پاؤڈر، بچے کا پالنا، کمبل، چادریں اور کھلونے شامل تھے۔ اس خریداری پر اچھی خاصی رقم خرچ ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے ایک وقت میں اتنی بڑی خریداری نہیں کی گئی چنانچہ کریڈٹ کارڈ کمپنی نے اپنے اطمینان کے لیے پیغام بھیجا کہ کہیں ان کا کارڈ ہیک تو نہیں ہو گیا۔ شیلا نے ایک بار پھر جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کمپنی کے نمائندے کو فون پر بتایا۔ ''دراصل ہم اپنی بھتیجی کے یہاں بچی کی پیدائش پر بہت خوش ہیں اور اسی لیے

جذبات میں آکر کچھ زیادہ خریداری کر لی۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بستر پر پھینکا اور بچی کو گود میں اٹھا لیا۔

جان اس کے برابر میں بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے نرم آواز میں بولا۔ ''ہنی۔'' لیکن شیلا جانتی تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا اور اس کی آواز بڑھا دی۔ جان بولتا رہا لیکن شیلا نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ ''کوئی ایک یا بچی کی ماں تو خبریں دیکھتی ہو گی اور وہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس بچے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا جا رہا جسے ڈراپ باکس میں چھوڑ دیا گیا تھا لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ بہت جلد ہم تک پہنچ جائیں گے۔''

وہ شیلا کے جواب کا انتظار کرنے لگا لیکن اس نے بچی کو گدے پر لٹایا اور اس کا ڈائپر تبدیل کرنے لگی۔ ''ڈراپ باکس میں چھوڑے گئے دوسرے دو بچوں کو بہت زیادہ کوریج مل رہی ہے۔'' جان نے کہا۔ شیلا نے جواب دینے کے بجائے اپنی پیٹھ موڑ لی اور بچی سے کھیلنے لگی۔

جان نے سامان سے بھرے ہوئے بیگز پر نظر ڈالی۔ ان کا بیڈ روم ایک مضبوط پناہ گاہ لگ رہا تھا۔ ''شیلا۔'' اس نے کہا، پھر اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی آواز بند کی اور شیلا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم اس بچی کو واپس ڈراپ باکس میں رکھ سکتے ہیں اور اس مرتبہ ہم متعلقہ اداروں کو میسیج بھیج دیں گے جس سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہم اس بچی سے دستبردار ہو گئے ہیں۔''

شیلا بچی کے کپڑے بدلنے کے بعد بستر پر بیٹھ گئی۔ ''میں اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے کہا۔ اس کا لہجہ پہلے کے مقابلے میں کافی سخت تھا۔ ''اور اگر تم نے کچھ کیا یا کسی کو بتایا، جب تک میں فیصلہ نہ کر لوں کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے تو میں اس بار ہمیشہ کے لیے تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔''

اس نے اپنے شوہر کے چہرے پر سے نظریں ہٹائیں اور دوبارہ بچی سے اسی کی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ جان کچھ دیر کھڑا انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ دوبارہ اس کی طرف دیکھے لیکن پھر مایوس ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔

اتوار کی رات تک وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ شیلا کو سوچنے کا موقع دے گا۔ اسے خود یہ اندازہ ہونا چاہیے کہ بچی کو اپنے پاس رکھنے کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں۔ وہ صبح پانچ بجے بستر سے اٹھا اور کچن میں جا کر کافی بنائی۔ وہ کچن کی میز پر بیٹھ کر کافی پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شاید اس کی بیوی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کسی کو معلوم بھی نہیں ہو گا کہ انہوں نے بچی کو واپس ڈراپ باکس میں رکھ دیا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ شدید لڑائی کے دوران سفید جھنڈا لہرا دیا جائے۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران شیلا نے کئی بچوں کو گود لیا لیکن وہ سب کسی نہ کسی سبب اس سے بچھڑ گئے اور شیلا کا احساس محرومی بڑھ گیا اور وہ شدید ڈپریشن میں مبتلا ہو گئی۔ اس کا لہجہ ہمیشہ سے زیادہ تلخ ہو گیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر وہ بچہ پیدا نہ کر سکے تو وہ اسے چھوڑ دے گی۔ جب بے بی باکس نصب ہوا تو جان نے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک دیکھی جسے وہ اس وقت بیان نہیں کر سکا لیکن اب اس کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور گھر سے روانہ ہو گیا۔

اس نے فائر اسٹیشن پہنچ کر تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور دوسرے فائر مین کو دیکھ کر سر ہلانے لگا جو سامنے والے دروازے سے اندر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی میز پر سے ڈراپ باکس کو دیکھا اور اسے وہ عورت یاد آ گئی جس نے اس تصور کو ایجاد کیا تھا۔ وہ ترپن سالہ عورت خود یتیم تھی۔ اس نے سی این این پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ کسی بچے سے دستبردار ہونا اور ایسی عورت کو دینا باعثِ شرم ہے جو ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے تیار نہ ہو مثلاً منشیات کی عادی یا بہت کم عمر ہو۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی جان کو اطمینان ہو گیا کہ انہوں نے بچی کو اپنے پاس رکھ کر کچھ غلط نہیں کیا۔

گیارہ بجے کے قریب استقبالیہ کلرک چارلی نے فون پر اسے بتایا کہ فائر اسٹیشن کا انچارج کیپٹن کروز اس سے ملنا چاہتا ہے تاکہ بچی کی گمشدگی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر بات کی جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ اس بچی کے بارے میں کوئی اطلاع تو نہیں ملی۔ جان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پُرسکون رہے گا اور زیادہ بات نہیں کرے گا۔ ویسے بھی عام طور پر کیپٹن کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں میں وہ یہی کرتا تھا۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر تھوڑی سی ریہرسل کی کہ اسے کس طرح ایکٹ کرنا ہے پھر گہرے گہرے سانس لیتا ہوا دفتر کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن کیپٹن کسی سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے جان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جان کرسی پر بیٹھ کر کچھ دیر اپنے باس کو فون پر باتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اسے اکتاہٹ ہونے لگی تو اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دیواروں پر سیاست دانوں کی تصویریں، سجاوٹی تختیاں، ایوارڈ اور سنہرے فریم میں اعزازی

سرٹیفکیٹ آویزاں تھے۔ خدا خدا کر کے گفتگو ختم ہوئی اور کیپٹن نے فون رکھ دیا۔

جان کرسی پر سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے لیکن کروز چار بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ چاروں بیٹے اسی پر گئے تھے۔

''یہ بھی ایک مثالی دن ہے۔'' کروز نے کہا اور جان کو میز پر رکھے ہوئے تھرماس میں سے کافی نکال کر پیش کی پھر وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

''کاؤنٹی سے فلپ کا فون تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ انہوں نے تالاب پر عورتوں کے ریسٹ روم میں خون دیکھا ہے۔'' کروز اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

''اوہ!'' جان نے کہا۔ ''امید ہے کہ سب ٹھیک ہوں گے۔''

''فلپ نے شیرف کو بھی فون کیا تھا۔ اس نے ایک ڈپٹی کو معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ بچے کی پیدائش کے بعد خارج ہونے والا مواد ہے۔''

''کیا انہوں نے کسی اسپتال کو فون کیا؟'' جان نے پوچھا۔

''یقیناً وہ ہر جگہ چیک کر رہے ہیں۔ وہ تینوں اسپتالوں سے رابطہ کر رہے ہیں۔ اب تک سینٹ ونسنٹ سے تصدیق ہوئی ہے کہ ان کے ہاں ایسی کوئی مریضہ نہیں آئی۔''

کیپٹن کروز دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی کا ایک اور کپ بھرنے لگا۔ اس میں کریم ڈالنے کے بعد جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

جان نے اپنے دونوں ہاتھ ملے اور سر ہلا دیا۔ اس نے کروز کی طرف دیکھا اور کچھ نہیں بولا۔ اس نے اپنا منہ کھولا لیکن فوراً ہی بند کر لیا۔ اس نے کچھ کہنا شروع کیا لیکن الفاظ گڈمڈ ہو گئے۔

''تم ٹھیک تو ہو جان؟'' کروز نے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ پہلے ان دونوں میں بہت دوستی تھی جب کیپٹن کے لڑکے بہت چھوٹے تھے اور لگتا تھا کہ شیلا ان سے حسد کرتی ہے۔ کروز کی بیوی اکثر کہا کرتی تھی کہ جان اور شیلا نے ہزاروں ڈالرز بچا لیے جو بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش میں خرچ ہوتے لیکن جب چاروں لڑکے جونیئر اور ہائی اسکول میں پہنچ گئے تو ان کے تعلقات میں سرد مہری آ گئی اور شیلا ایک سے زیادہ مرتبہ کہہ چکی تھی کہ وہ کروز فیملی سے نہیں ملنا چاہتی۔

جان نے تھوک نگلا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل ان دنوں میرا پیٹ ٹھیک نہیں رہتا۔''

کروز نے مشورہ دیا کہ اسے کافی پینے سے پہلے دہی کھانی چاہیے۔

''تم جانتے ہو۔'' کروز نے کہا۔ ''میں نے اس بے بی باکس کے بارے میں نہیں سوچا۔'' وہ دوبارہ کھڑا ہو گیا اور اپنی میز کے گرد ایک چکر لگا کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''جب اسے دو مرتبہ استعمال کیا گیا اور اخبار میں اس کی خبر شائع ہوئی تو میں نے اپنا ذہن تبدیل کر لیا۔''

''یقیناً یہ ایک سماجی خدمت ہے۔'' جان نے کہا۔

''ہاں۔ اس بارے میں تمہارا خیال درست تھا۔'' کروز نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ اس طرح کی صورتِ حال میں شاید ہم بے بی باکس کو پروموٹ کرنے کے لیے بھرپور کام نہیں کر رہے۔ اس کے لیے لوگوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے تاکہ کوئی نوجوان لڑکی ٹوائلٹ میں بچے کو جنم دے کر بے بی باکس میں نہ چھوڑ جائے۔ تم اس سلسلے میں روٹری اور لائنز کلب سے بات کرو۔ میں کیبل چینل والوں کو فون کر سکتا ہوں، تم انہیں بھی استعمال کر سکتے ہو۔''

''ہاں۔ میرا خیال ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔''

''شیلا؟ کیا وہ تمہاری مدد کرنا چاہے گی؟'' کروز نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اگر تم دونوں کوشش نہ کرتے تو اس کمیونٹی کو یہ بے بی باکس نہ ملتا۔''

جان کھڑا ہو گیا۔ اس نے کروز کو یقین دلایا کہ وہ شیلا کے ساتھ مل کر یہ مہم چلائے گا اور شاید وہ ایک پریس ریلیز بھی جاری کریں۔ وہ جانے کے لیے مڑا لیکن رک گیا۔ اس نے کہا۔ ''کیا تالاب کا ذکر کرنا مناسب ہوگا؟''

کیپٹن کروز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ شیرف اسے نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔ شاید کوئی نوجوان ماں اس تفصیل پر پوری اترے اور وہ پہلے سے اسپتال میں ہو۔ ممکن ہے کہ یہ اچانک زچگی کا معاملہ ہو لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو شیرف اس ماں کی تلاش شروع کر دے۔ دیکھو اگر کوئی عورت دو دن پہلے حاملہ تھی اور اب نہیں ہے۔''

جان نے سر ہلا دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک کمزور سی مسکراہٹ آئی اور وہ جانے کے لیے مڑا۔

''جان!'' کروز نے کہا۔ ''کیا تم اس کے علاوہ کوئی اور بات کرنا چاہ رہے تھے؟''

جان نے ایک سرد آہ بھری۔ وہ واپس مڑا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ زانوؤں پر تھے اور وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ کیپٹن کروز نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جان۔" اس نے کہا۔ "تم ٹھیک تو ہو؟"
جان نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "مجھے اور شیلا کو کچھ مشکلات کا سامنا ہے۔"
کروز نے ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا جس سے جان کو آگے بولنے کا حوصلہ ہوا۔
"ہمارے درمیان پہلے بھی جھگڑے ہوتے رہے ہیں۔"
"کیا تمہاری ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہے؟" کروز نے پوچھا۔
"اس سے پہلے کبھی معاملہ اتنا سنجیدہ نہیں ہوا لیکن اس بار وہ جو کچھ کرنا چاہ رہی ہے اسے میں برداشت نہیں کرسکتا۔"
کیپٹن کروز نے سر ہلایا لیکن اس کی نظریں جان کے سر کے اوپر بڑی کھڑکی پر مرکوز تھیں جہاں سے لابی نظر آرہی تھی۔ وہاں کچھ گڑبڑ لگ رہی تھی اور کچھ لوگ اندر آرہے تھے۔
"کہتے رہو جان۔" کروز نے کہا، لیکن شور بڑھتا گیا اور مزید لوگ اندر آگئے۔
"ایک منٹ۔" کروز نے کہا اور اٹھ کر دوسری کھڑکی پر گیا جو پارکنگ لاٹ کی طرف کھلتی تھی۔ اس نے انگلی سے پردہ ہٹا کر دیکھا اور پلٹ کر بولا۔ "لوگ اس واقعے پر احتجاج کررہے ہیں یا پھر بے بی باکس میں کوئی اور بچہ ملا ہے۔ مجھے فورٹ وائن اسٹیشن کے لوگ بھی نظر آرہے ہیں۔"
یہ کہہ کر وہ مڑا اور ریک پر سے اپنی جیکٹ اور کیپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا لیکن ہم بعد میں بات کریں گے۔"
جان کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت کروز کی میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ دونوں کمرے کے وسط میں بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ لابی میں رپورٹرز کے قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔ ان کے کندھوں پر کیمرے اور ہاتھوں میں مائک تھے۔
"مجھے یقین ہے کہ بے بی باکس کے بارے میں سوالات ہوں گے۔" کروز نے کہا۔ "میں تمہاری مدد لے سکتا ہوں اگر تم برجستہ پریس بریفنگ کے لیے تیار ہو۔"
جان سوچنے لگا کہ شیلا کا ردعمل کیا ہوگا جب وہ اسے سوالوں کا سامنا کرتے اور جھوٹ بولتے دیکھے گی جس کی ابتدا خود شیلا نے ہی کی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بچے کو لیے ہوئے بیٹھی تھی اور اپنی ممتا کی تسکین کررہی تھی۔
اس رات جان اور شیلا بستر میں ساتھ لیٹے ہوئے تھے اور بچی پالنے میں سو رہی تھی جو چھ فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن شیلا نے مانیٹر لگا رکھا تھا۔ جب بھی بچی ہلتی تو شیلا سرگوشی میں کہتی۔ "سوجاؤ کیری۔"
"تم نے بچی کا نام بھی رکھ دیا۔" جان نے کہا۔
"ہاں۔" شیلا نے جان کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ ہم کئی ہفتوں یا مہینوں تک اس بچی کو نام کے بغیر رکھ سکتے تھے لیکن میں نے اس کے برعکس فیصلہ کیا اور اس کا نام اپنی دادی کے نام پر رکھ دیا۔"
اس کے بعد شیلا نے اسے دن بھر کی روداد سنانا شروع کردی کہ کس طرح کیری اس کے کتاب پڑھنے کے دوران غوں غاں کررہی تھی اور دو مرتبہ وہ گہری نیند سوئی۔ وہ شیلا کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا، گو کہ شیلا کو اپنی بات منوانے کی عادت تھی تاہم اپنی عیاری اور ناراض موڈ کے باوجود وہ ایک مہربان عورت تھی۔ وہ اس کے برابر میں لیٹی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ جان کی گردن پر تھے پھر اس کے ہاتھ جان کے بدن پر رینگنے لگے۔
یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ سونے سے پہلے شیلا کو اچانک کچھ یاد آگیا اور وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "ویڈیو کیمرا۔"
"بے بی باکس کے اندر ایک ویڈیو کیمرا لگا ہوا ہے۔ اس نے ہمیں بچی کو اٹھاتے ہوئے ریکارڈ کرلیا ہوگا۔" جان نے جواب دیا۔
شیلا پریشان ہوگئی اور اس نے جان کا پیٹ سہلانا شروع کردیا۔ جان نے کہا۔ "میں صبح سویرے جاؤں گا اور اگر کسی نے کچھ پوچھا تو کہہ دوں گا کہ میں دفتری کام کررہا تھا۔"
شیلا نے مطمئن ہوکر سر ہلایا اور ایک بار پھر اس کا طویل بوسہ لیا پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ "تم نے پریس کانفرنس میں بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔" اپنی بیوی سے تعریف سن کر جان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی بہت ہی خطرناک آگ بجھائی ہو۔ جان نے خود بھی اعتراف کیا کہ اس نے پریس کانفرنس میں بڑی عمدگی سے سوالوں کے جواب دیے اور اپنے آپ کو پرسکون رکھا۔ یہاں تک کہ جب ایک رپورٹر نے اس سے بے بی باکس پر ہونے والی سرگرمی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "اگر ہمارے پاس مزید بے بی باکس ہوتے اور وہاں تربیت یافتہ عملہ ہوتا تو ہم اس مشکل میں نہ پڑتے۔"
"کیا تمہیں یہ بات معتبر لگی؟" جان نے پوچھا لیکن اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ وہ اپنے کہے ہوئے لفظ بھول کر پرانے موڈ میں واپس آچکی تھی۔ وہ اس پر

جھی کانوں میں سرگوشی کررہی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

☆☆☆

جان فائر ہاؤس کے دفتر میں داخل ہوا اور خاموشی سے چلتا ہوا کنٹرول روم میں چلا گیا جہاں ایک بڑی سی دیوار پر کمپیوٹر سرور لگے ہوئے تھے اور ان کی زرد و سبز روشنیاں اس طرح جل بجھ رہی تھیں جیسے کوئی خلائی جہاز زمین پر اتر آیا ہو۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا جب تک کہ اسے ویڈیو کنٹرول نہ مل گیا۔ اس نے دو سال پہلے آئی ٹی کے ایک بندے کی مدد سے یونٹ کو فون پر سیٹ کیا تھا لیکن وہ اس کے استعمال سے واقف نہیں تھا۔ اس نے ایل ای ڈی اسکرین پر ہاتھ پھیرا جہاں اسے دو لفظ ویڈیو ون اور ویڈیو ٹو نظر آئے۔ اس نے گوگل کی مدد سے مینوفیکچرر کا نام معلوم کیا اور دوبارہ ٹائپ کر کے پوچھا کہ ڈیٹا کو کس طرح مٹایا یا دوبارہ سیٹ کیا جائے۔

عین اسی وقت اسے گیلری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ کونسگ یونٹ کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگا۔ خاتون پہرے دار مسز جولین گشت کر رہی تھی۔ وہ ایک خاموش طبع عورت تھی اور دیکھنے میں کسی آٹو پائلٹ کی طرح لگتی تھی۔ تاہم کچھوے جیسی چال اور کمزور نظر کے باوجود وہ یہاں برسوں سے ملازمت کر رہی تھی۔ 1970ء میں اس وقت کے فائر چیف نے مسز جولین کو ملازمت دی تھی جب اس کے گھر والے ایک آتش زدگی میں ہلاک ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ اگر اسے ملازمت نہ دی جاتی تو وہ دربدر ہو جاتی۔

مسز جولین کے جانے کے بعد جان نے دوبارہ اپنا فون اٹھایا اور بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنے لگا۔ سبز اسکرین پر کئی زیرو نمودار ہوئے تو جان نے ایک گہری سانس خارج کی۔ اگر ماں واپس نہ آئی تو یہ پتا نہیں لگایا جاسکتا کہ اس بچی کو کس نے بے بی باکس میں رکھا تھا۔ وہ شیلا کے جوش و خروش کے بارے میں سوچ کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

دو گھنٹے بعد کیپٹن کروز اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کرسی پر بیٹھ کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا۔ اسے رپورٹرز سے ملاقاتیں کرتے پورا ہفتہ ہو گیا تھا۔ اس دوران کاؤنٹی میں دو جگہ آتش زدگی بھی ہوئی جسے بجھانے میں اسے کافی وقت لگا۔

جان نے اپنا لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ لوگ آگاہی بڑھانے کے حوالے سے میرے احسان مند نہیں ہیں۔''

''ہاں۔'' کروز نے کہا۔ ''تم نے بہت اچھا کام کیا۔''

گزشتہ چار روز میں جان کی جب بھی رپورٹرز سے بات ہوئی تو شام میں شیلا کی طرف سے اس کا صلہ ضرور ملتا۔ وہ اسے کھانا کھلاتی، اس کی کمر سہلاتی اور وہ دونوں مستقبل کے حوالے سے اس طرح منصوبہ بندی کرتے جیسے ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہو۔

کروز نے اپنی ٹوپی اتار کر زانو پر رکھ لی۔ جمعے کی دوپہر وہ ہمیشہ روٹری کلب میں لنچ کیا کرتا تھا۔ ''ہمیں اس ہفتے میں بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔'' کروز نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہارے اور شیلا کے درمیان پھر مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''ہاں، میں اس وقت کچھ پریشان تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔''

''تم نے بتایا تھا کہ شیلا کوئی ایسا کام کرنا چاہتی ہے جس سے تم متفق نہیں ہو۔''

''اوہ! میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔'' جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے درمیان صلح ہو گئی بلکہ اس ہفتے ہم نے دو مرتبہ رومانٹک ڈنر بھی کیا۔''

''یہ سن کر خوشی ہوئی۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ میں اور مسز، تم دونوں کے ساتھ ایک شام گزارنا چاہتے ہیں۔ آج رات کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اوہ!'' جان نے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ ہم آج رات مل سکیں گے۔ شیلا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اسے آدھے سر کے درد کی شکایت ہے۔''

''لیکن ابھی تو تم نے کہا تھا کہ اس ہفتے تم دونوں نے باہر ڈنر کیا تھا۔''

''بالکل...... لیکن گزشتہ رات ہی وہ دوائیں لینے باہر گئی تھی۔''

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' کروز نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم بعد میں دوبارہ کوشش کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ جان کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

گھر پہنچ کر جان نے شیلا کو کروز کی دعوت کے بارے میں بتایا۔ وہ اس وقت بچی کو بوتل سے دودھ پلا رہی تھی۔ ''وہ عورت گزشتہ برسوں میں میری بے حد بے عزتی اور طعنے دیتی رہی ہے۔ اس کے بعد میں اس کے ساتھ کس طرح کھانا کھا سکتی ہوں۔''

جان کچھ کہنے والا تھا لیکن خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ

شیلا کا اشارہ میگن کروز کی جانب تھا جسے اپنے چار بیٹوں پر بڑا ناز تھا اور وہ شیلا کو بانجھ ہونے پر کئی مرتبہ طعنے دے چکی تھی تاہم جان نے دبی زبان سے کہا۔ ''شاید ہمیں ایک کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ کیپٹن اور شیرف ڈیپارٹمنٹ کے درمیان کچھ بات چیت ہو رہی ہے۔''

شیلا کو اچانک ہی خطرے کا احساس ہوا۔ وہ کھڑے ہو کر کمرے کا چکر لگانے لگی۔

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' شیلا نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ''کیا تم مجھے ہر بات بتا رہے ہو؟''

''یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔'' وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''انہیں تالاب سے صرف خون ہی نہیں بلکہ زچگی کے بعد خارج ہونے والا مواد بھی ملا ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' شیلا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ انہیں صرف خون ہی ملا ہے۔ تم نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ وہ تحقیقات کر رہے ہیں۔''

''تم فکر مت کرو۔ وہ تمام اسپتالوں میں ایک ایسی ماں کو تلاش کر رہے ہیں جو زچگی کے لیے داخل ہوئی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ انہیں ایسی کوئی عورت ملی ہے۔'' جان نے اس کے بازو پر تھپکی دینے کی کوشش کی لیکن وہ دور ہٹ گئی۔

''یہ محض اتفاق ہے جان، اور اگر انہیں وہ ماں نہیں ملی تو کیا وہ یہ سوچ کر حیران نہیں ہوں گے کہ وہ کہاں ہے اور اس کے بچے کے ساتھ کیا ہوا؟''

''پرسکون ہو جاؤ۔'' جان نے کہا۔ ''میں اس کا خیال رکھوں گا۔'' پھر وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ آسان ہفتہ نہیں تھا۔''

''تم اس سلسلے میں کیا کرنے والے ہو؟'' شیلا اس کے پاس سے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اور ویسے بھی میں نے تمہیں یہ شکایت کرتے نہیں سنا کہ پچھلا ہفتہ کتنا مشکل تھا۔''

جان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ اس کی وضاحت کرنے میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ماں بننے کے بعد شیلا پہلے سے زیادہ پرکشش ہو گئی تھی اور اس سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ''تم کس طرح اس کا خیال رکھو گے جان؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم اس بارے میں پریشان ہو۔'' جان نے کہا اور آگے بڑھ کر شیلا کے گال کا بوسہ لے لیا۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ شیلا پیچھے ہٹی اور اس نے اپنا چہرہ جان سے دور کر لیا۔ گھنٹی دوبارہ بجی تو شیلا نے اپنی بھویں چڑھائیں اور بولی۔ ''کوئی ایسی حرکت نہ کرنا جس سے ظاہر ہو کہ کچھ غلط ہوا ہے۔ بس انہیں اتنا بتا دینا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میں سو رہی ہوں۔''

جان نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے پیپ ہول سے جھانکا اور سوچنے لگا کہ اسے جوتوں کے بغیر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دروازے کے باہر سیڑھیوں پر کروز فیملی کھڑی ہوئی تھی۔ میگن کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی۔ جان نے دروازہ اتنا کھولا کہ پورچ میں جا سکے۔

''شام بخیر۔'' دونوں میاں بیوی نے ہم آواز ہو کر کہا۔

جان نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ اب بھی بہتر محسوس نہیں کر رہی۔''

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' میگن کروز نے کہا۔ ''وہ ہر وقت بہت مصروف رہتی ہے۔ میں شرطیہ کہتی ہوں کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے اس پر دباؤ ہے۔''

کیپٹن کروز نے میگن کے ہاتھ سے ٹوکری لی اور جان کو پیش کی۔ میگن نے سرگوشی میں کہا۔ ''اس میں کچھ پھل، بسکٹ اور آئل وغیرہ ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ شیلا کو فرنچ فرائز پسند ہیں لیکن اسے دو ہفتوں تک سادہ خوراک لینی چاہیے تاکہ اس کے سر کا درد ٹھیک ہو جائے۔''

کروز بولا۔ ''میں جانتا ہوں کچھ لوگوں میں یہ مرض موروثی ہوتا ہے۔ میں نے یہ کسی میگزین میں پڑھا تھا۔''

''میں جانتا ہوں کہ شیلا اسے سراہے گی۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اس وقت زحمت اٹھانا پڑی۔'' جان نے کہا۔ ایک بار پھر دونوں میاں بیوی ہم آواز ہو کر بولے کہ انہیں کوئی زحمت نہیں ہوئی بلکہ یہاں آنا ان کے لیے خوشی کا باعث ہے۔

یہ کہہ کر وہ دونوں واپس جانے کے لیے مڑے۔ اسی وقت کروز کے سیل فون پر ایک کال موصول ہوئی۔ اس نے فون سنا اور جان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''کل صبح شیرف آفس میں ان کا ایک ٹیکنیشن ویڈیو فوٹیج چیک کرنے آ رہا ہے۔ اگر تم بھی اس کے ساتھ بیٹھ جاؤ تو اچھا رہے گا۔''

جان کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔ ''ٹھیک ہے لیکن ہم سب چیک کر چکے ہیں۔ اس میں کچھ نہیں تھا۔''

''درست۔'' کروز نے کہا۔ ''لیکن ان کا نوجوان

ٹیکنیشن کہتا ہے کہ ہمارے یونٹ میں ایک خفیہ بیک اپ سسٹم بھی ہے۔شاید ہمیں وہاں سے کچھ معلوم ہو جائے۔''
کروز جانے کے لیے مڑا۔ ''ہمیں ایک ڈنر پر جانا ہے۔تم سے صبح ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائیو وے کی طرف چل دیا اور وہ دونوں اپنی کار میں سوار ہو گئے۔
جان کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر کھڑکی سے شیلا کی آواز آئی۔ ''اندر آجاؤ جان۔''
صبح شیلا نے دروازے پر سے وہ ٹوکری اٹھائی جو کیپٹن کروز لے کر آیا تھا اور کچن میں لے جا کر اس کی چیزیں ڈسٹ بن میں پھینک دیں۔ پھر اس نے تیل کی بوتلیں کھولیں، انہیں سونگھا اور سب کو سنک میں بہا دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے جان سے لائٹر لے کر وہ ٹوکری بھی جلا دی اور جان کو بتانے لگی کہ اسے فائر اسٹیشن جا کر کیا کرنا ہے۔
''اس منصوبے کے دو حصے ہیں۔ اسے یاد رکھنا۔ اگر کوئی کسی اطلاع یا ثبوت کے ساتھ سامنے آتا ہے تو تم دوسرے حصے پر عمل کرنا۔''
جان نے اس کے کہے ہوئے الفاظ اچھی طرح ذہن نشین کر لیے۔ گھڑی دیکھی اور فائر اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر کانفرنس روم میں جھانکا۔ کروز، آئی ٹی ٹیکنیشن اور ایک ایڈمن اسسٹنٹ پہلے سے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔
جان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور سب لوگوں کو صبح بخیر کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکال کر سامنے میز پر رکھ لی۔
آئی ٹی ٹیکنیشن کا نام جیمس تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور کام شروع کر دیا۔ اس دوران کروز نے گزشتہ شب کے ڈنر کا قصہ چھیڑ دیا جو دونوں میاں بیوی نے مسٹر ہیمپٹن اور اس کی بیوی کے ساتھ ویگن ریسٹورنٹ پر کیا تھا۔ تبھی ٹیکنیشن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''لوکل ڈرائیو میں گڑبڑ کی گئی ہے۔''
وہ نظریں اٹھائے بغیر ٹائپ کرتا رہا۔ اس نے کئی بار انٹر کا بٹن دبایا اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ جان کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کروز بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ خاموشی سے ٹیکنیشن کی انگلیوں کو لیپ ٹاپ پر حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ٹیکنیشن نے کہا۔ ''حالانکہ ریموٹ سرور کا بیک اپ بھی ہوگا۔'' اس کے بعد وہ پھر ٹائپ کرنے لگا۔ اچانک ہی اس نے ٹائپنگ روک دی اور بولا۔ ''ریموٹ سرور میں غلطی نظر آرہی ہے۔'' وہ کچھ جھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے بیک اپ کے لیے اضافی انتیس ڈالر اور ننانوے سینٹ ادا نہیں کیے۔''
کروز یہ سن کر چونک پڑا۔ اس نے ایڈمن اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ اکاؤنٹس سے اس بارے میں معلوم کرے۔ وہ فوراً ہی کمرے سے چلی گئی۔ ٹیکنیشن نے کروز کو بتایا۔
''کسی نے سات دن پہلے لوکل سسٹم کو پانچ بج کر انچاس منٹ پر دوبارہ سیٹ کیا ہے۔''
کروز کی آنکھیں جھک گئیں۔ ''ہم لوگ شیٹ سے چیک کر سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ صفائی کرنے والی عورت اور دو فائر مین یہاں موجود تھے۔''
جان نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اس روز جلدی آگیا تھا۔''
''یہ میرے علم میں نہیں۔'' کروز نے کہا۔
''مجھے پریس ریلیز لکھنی تھیں۔ اس کے علاوہ نئے انٹرویوز کی تیاری بھی کرنا تھی۔''
''اچھا۔ ہاں میں سمجھ گیا۔'' کروز نے کہا۔ ''کیا تم نے کسی کو آئی ٹی سرور روم میں جاتے دیکھا تھا؟''
جان نے نظریں جھکا لیں، جیسے اس نے کوئی شرمناک حرکت دیکھی ہو۔ کروز بولا۔ ''جان! بتاؤ تم نے کیا دیکھا۔ ہم جاننا چاہتے ہیں۔''
''میں کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتا جس سے کسی کو پریشانی ہو۔''
''تم جانتے ہو کہ میں ایسی ہدایات نہیں دیتا۔'' کروز نے کہا۔ ''لیکن اگر کوئی ناجائز تبدیلی ہوتی ہے تو ہمیں اس کا پتا لگانا ہوگا۔ کسی اسپتال میں کوئی عورت داخل نہیں ہوئی اور تالاب والے واقعے کو کل دس روز ہو جائیں گے۔ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم ابھی تک اس ماں کو کیوں تلاش نہیں کر سکے جس نے ایک بچی کو جنم دیا اور اسے بے بی باکس میں چھوڑ کر چلی گئی۔''
ایڈمن اسسٹنٹ واپس آئی اور اس نے بتایا۔ ''اکاؤنٹنٹ کا کہنا ہے کہ ہم نے ریموٹ بیک اپ کے لیے اضافی فیس نہیں دی تھی۔''
کروز نے ٹیکنیشن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں کاؤنٹی کمشنر کو ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوتا ہے اور ہمارے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔''
ٹیکنیشن نے ناگواری سے سر ہلایا اور اپنا لیپ ٹاپ

بند کر دیا۔ کروز نے کچھ جھلاہٹ دکھائی اور بولا۔ ''جان! مجھے بتاؤ کہ تم کیا جانتے ہو؟''

''مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا کہ اس روز جب میں صبح سویرے کام پر آیا تو مسز جولین وہاں موجود تھی۔ وہ صفائی کر رہی تھی لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی شوگر کم ہو گئی ہو لیکن وہ سرور کی دیواریں صاف کرنے کے بجائے انہیں کھرچ رہی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہی ہے تو وہ سمجھی کہ وائٹ بورڈ صاف کر رہی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے نادانستگی میں اسے دوبارہ سیٹ کر دیا۔''

''شٹ۔'' کروز نے کہا۔ ''میں ایچ آر سے انکوائری کے لیے کہوں گا۔''

کروز کو مایوس دیکھ کر جان کے جسم میں بجلی بھر گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ یہی بہتر ہے۔ اسے ملازمت کرتے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ وقت ہے کہ وہ......''

کروز نے تائید میں سر ہلایا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا، پھر اس نے رک کر پوچھا۔ ''اور شیلا...... اس کا کیا حال ہے؟''

''اب بھی موسم کا اثر ہے لیکن بہتر ہو رہی ہے۔'' جان نے کہا۔

''گڈ! میگن یہ جان کر خوش ہو گی کہ اس کی بھیجی ہوئی چیزوں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔'' کروز نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام آٹھ بجے جان فائر اسٹیشن سے نکلا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں رک کر اس نے شیلا کے لیے پھول خریدے اور گھر پہنچ کر اسے بتایا کہ سب ٹھیک ہے۔ وہاں کوئی بیک اپ نہیں تھا اور لوکل ویڈیو کو مٹانے کا الزام مس جولین پر آ گیا۔ شیلا کی آنکھیں جگمگانے لگیں اور جان کے لبوں پر ایک کمزور مسکراہٹ دوڑ گئی۔

ایک گھنٹے بعد شیلا کچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ جان کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف کروز تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک گمنام عورت نے اسے فون کر کے کہا ہے کہ اس نے بے بی باکس میں ایک بچی چھوڑی تھی۔ اس نے ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھیں اور محسوس کیا کہ اسے کسی کو بتانا چاہیے۔ جان خاموشی سے سنتا رہا پھر کروز نے کہا کہ وہ صبح فائر اسٹیشن آ جائے کیونکہ سات بجے شیرف کے دفتر میں میٹنگ ہو گی۔

شیلا نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں تو جان نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر اس نے چابیاں اٹھائیں اور پہلے سے تیار کیا ہوا بیگ شیلا کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ گھر سے روانہ ہوا اور پارکنگ لاٹ میں رک کر انتظار کرنے لگا کہ رات کی ڈیوٹی والا عملہ چلا جائے۔ اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ وہ اگلے دن کی تیاری کے لیے آیا ہے لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ڈیوٹی پر موجود فائر مین گیم روم میں کھیلنے اور کھانے پینے میں مصروف تھے۔

جان برآمدے میں چلتا ہوا لاکرز کی طرف گیا۔ اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے۔ اس نے چابی سے مسز جولین کا چھوٹا سا کمرا کھولا۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ اس نے بیگ میں سے بے بی کمبل نکالا اور اسے نیچے کی دراز میں ٹھونس دیا پھر اس نے بے بی بیگ میز کے نیچے رکھا جس میں ناخن تراش، بے بی بوتل اور چند ڈائپرز تھے۔ پھر اس نے کرسی پر لٹکے ہوئے مسز جولین کے سوئیٹر کی جیب میں کچھ رقم رکھی اور گھر واپس آ گیا۔

صبح دفتر پہنچ کر مسز جولین نے اپنا سوئیٹر اٹھایا تو وہ کچھ بھاری لگا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو ڈالر کے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا۔ اس کے ساتھ ایک کمپیوٹر پر ٹائپ شدہ تحریر تھی جس پر لکھا تھا۔ ''آج سفر پر چلی جاؤ۔''

☆☆☆

سورج کی روشنی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ وہ دونوں بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور کیری درمیان میں سو رہی تھی۔ ''ہم نے اس غریب عورت کے ساتھ کیا کر دیا۔'' جان نے کہا۔

شیلا نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ اگر بچی کی لاش نہیں ملتی تو اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ ایک دن کے لیے بھی جیل نہیں جائے گی۔''

جان نے جھرجھری لی اور دوبارہ کہا۔ ''یہ ہم نے کیا کر دیا؟''

شیلا نے اس کا دایاں ہاتھ اٹھا کر کیری کے سینے پر رکھ دیا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر مسکرانے لگی۔ جان نے کہا۔ ''ہم بڑے ظالم ہیں۔''

''نہیں۔'' شیلا بولی۔ ''ہم اولاد کو ترسے ہوئے والدین ہیں۔ اس بچی کے آنے سے ہماری محرومی دور ہو گئی ہے اور تم مسز جولین کی فکر مت کرو۔ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ ویسے بھی اب اسے آرام کرنا چاہیے۔''

جان سوچنے لگا کہ احساس محرومی نے شیلا کو کتنا خود غرض بنا دیا ہے۔

⌘⌘⌘

دوسرا رخ

غوثیہ شبیر

کہتے ہیں کہ قانون اندھا ہوتا ہے اور عشق میں آنکھیں بند ہوجاتی ہیں... مگر دونوں صورتوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے... اردگرد کچھ دکھائی نہیں دیتا سوائے اپنے مدعا کے... وہ جو بدلتے موسم اور بکھرتے رنگوں کی قوسِ قزح میں زندگی ڈھونڈا کرتی تھی... برستی بوندوں کی جھنکار میں سانسوں کے ردھم سن لیا کرتی تھی... جس کی جاگتی آنکھیں ہمیشہ خوابوں میں کھوئی رہتی تھیں، جانے کیسے مصمم ارادوں اور مضبوط قدموں میں لرزش آگئی... جس نے جانے کتنی سازشوں کو جنم دے ڈالا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے خوابوں کا تاج محل کرچی کرچی ہوگیا جس کے ٹکڑے چنتے چنتے اس کے ہاتھ زخمی ہوگئے مگر افسوس... نہ درد نے پیچھا چھوڑا اور نہ ہی در در کی رسوائیوں نے منہ موڑا کیونکہ... جب حسد اور جبر کے درمیان جنگ چھڑ جائے تو تباہی ایسے ہی رنگ دکھاتی ہے۔

محبت کی انتہاؤں کو چھو لینے والے جذبات کی جنوں خیزی کا عبرت اثر انجام

”بھائی جان، منیب کے لیے سدرہ کے رشتے پر زور دے رہے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا جواب دوں انہیں؟“ چائے کا کپ رائٹنگ ٹیبل کے ایک سرے پر رکھتے ہوئے نسیمہ نے کاغذ قلم میں غرق فہیم سے گفتگو چھیڑی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اور وہ اسی استغراق سے کاغذ سیاہ کرتے رہے۔ نسیمہ اس صورتِ حال پر جھنجلا گئیں اور ان کا شانہ ہولے سے ہلاتے ہوئے قدرے بلند آواز میں بولیں۔

”آپ سن رہے ہیں، میں آپ سے کیا پوچھ رہی ہوں؟“

”ہاں......آں۔ کیا پوچھ رہی ہو بھئی؟“ ناچار انہیں بیوی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

”پوچھ رہی ہوں بھائی جان کو کیا جواب دوں؟“

”کس بات کا جواب؟“

”بیٹی کے رشتے کا جواب اور کس چیز کا جواب۔ اب میرے بھائی جان کوئی آپ کی طرح شاعر تو ہیں نہیں کہ انہیں جوابِ غزل درکار ہو۔“ نسیمہ کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔

”ان رشتے ناتوں کے بارے میں، میں کیا کہوں؟ یہ تو تمہارا ہی شعبہ ہے اور تم ہی بہتر فیصلہ کرسکتی ہو۔ مجھے تو تم بس اتنا بتادینا کہ کب اور کتنی رقم کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے بے نیازی سے جواب دے کر دوبارہ اپنی تازہ غزل کی طرف متوجہ ہونا چاہا لیکن نسیمہ کی گھورتی نظروں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔

”اب کیا ہے بھئی؟“

”میں حیران ہورہی ہوں کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کی شادی کے معاملے میں بھی ایسی بے نیازی برت سکتا ہے۔“

”بے نیازی کی کیا بات ہے۔ میں اپنی ذمے داری پوری کرنے کو تیار ہوں۔ مرد کا کام ہوتا ہے مالی مسائل حل کرنا، باقی گھریلو معاملات تو عورتیں خود بھی دیکھ سکتی ہیں۔“ وہ جیسے بیوی کی حیرانی پر حیران تھے۔

”آپ کے اس رویّے کو سہتے سہتے برسوں گزر گئے، مجال ہے جو اتنے برسوں میں آپ نے کبھی گھر کے کسی معاملے میں دلچسپی لی ہو۔“

”میں دلچسپی نہ لیتا ہوتا تو یہ گھر کیسے چلتا۔ تم جب جتنی رقم مانگتی ہو، فوراً ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں پھر بھی عجیب ناشکری کی باتیں کررہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ بنا روک ٹوک اس گھر کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار تمہارے پاس ہے۔ اگر میں ایسا نہیں ہوتا تو تم بھی اپنی بہنوں کی طرح رونے رورہی ہوتیں کہ شوہر نے بیوی کے بجائے لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیتا، وغیرہ وغیرہ۔“

”اب آپ سے کون بحث کرے۔ ٹھیک ہے پھر میں خود ہی بھائی جان کو جواب دے دوں گی۔ آپ وقت کے وقت آکر بیٹی کی منگنی میں شرکت کرلیجیے گا۔“

”وہ بھی کرلیں گے بھئی۔ فی الحال تو تم مجھے یہ غزل مکمل کرنے دو تاکہ میں یونیورسٹی میں ہونے والے مشاعرے میں شرکت کرسکوں۔“ انہوں نے اپنا رخ موڑ لیا۔ نسیمہ پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں اور لاؤنج میں بیٹھ کر موبائل سے بھاوج کا نمبر ڈائل کیا۔ تھوڑی دیر جاری رہنے والی اس ٹیلی فونک گفتگو میں دونوں خواتین بہت سے معاملات طے کرچکی تھیں۔ فون سے فارغ ہوکر نسیمہ نے اوپری منزل پر موجود سدرہ کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ ہینڈ فری لگائے گانے سن رہی تھی۔ ماں کی صورت دیکھ کر سمجھ گئی کہ کوئی کام ہے، اس لیے ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”میں نے منیب سے تمہارا رشتہ طے کردیا ہے۔ اس اتوار کو تم دونوں کی منگنی ہے۔ تمہیں اپنی جن فرینڈز کو انوائٹ کرنا ہو، کرلینا۔ کل شام تک انویٹیشن کارڈز چھپ کر آجائیں گے۔“ انہوں نے جیسے سدرہ کے سر پر بم پھوڑا۔ پہلے تو ماں کی دی اس اطلاع پر اس کا منہ حیرت کے باعث کھلا کا کھلا رہ گیا لیکن پھر اگلے لمحے چہرے پر غصے کی سرخی چھانے لگی۔ یہ کوئی بات تھی کہ اس کی منگنی ہونے جارہی تھی اور اسی کو مہمانوں کی طرح عین وقت پر اطلاع دی جارہی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ امی! میری منگنی، وہ بھی منیب سے اتنی اچانک......؟“ غصے کے باوجود اس نے اپنے لہجے کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کی۔

”اتنی اچانک تو خیر نہیں۔ کئی دنوں سے بھائی جان اور بھابی جان نے منیب کا رشتہ تمہارے لیے دے رکھا تھا۔ آج میں نے تمہارے ابو سے مشورہ کرکے انہیں ہاں کردی۔“ انہوں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”اور میری مرضی......آپ نے ماموں کو ہاں کرنے سے پہلے اس رشتے کے لیے مجھ سے میری مرضی معلوم کرنے کی زحمت کیوں نہیں کی؟“ سدرہ گھر کی بڑی بیٹی تھی۔ بچپن سے اس کے بہت لاڈ اٹھائے گئے تھے۔ خصوصاً مرحومہ دادی کی تو آنکھ کا تارا تھی اس لیے خلافِ مزاج کچھ برداشت کرنا مشکل لگتا تھا اور مزاج میں ذرا سی جارحیت تھی جو اس وقت بھی لہجے سے جھلکنے لگی تھی۔

"تمہاری مرضی! تمہاری مرضی معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ہماری اولاد ہو اور ہمیں تمہارے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ویسے بھی اس رشتے میں کوئی خامی نہیں ہے۔ منیب گھر کا بچہ ہے۔ مستقبل میں ڈاکٹر بننے والا ہے۔ بھائی جان کے مالی حالات بھی اچھے ہیں۔ ایسے میں، میں اس رشتے کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتی۔ منیب پر تو سارے خاندان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ خوش قسمتی سے تمہارے لیے اس کا رشتہ آ گیا ہے تو تم شکر کرنے کے بجائے اعتراض کر رہی ہو کہ ہم نے تم سے تمہاری مرضی کیوں نہیں پوچھی۔" نسیمہ کو شدت سے بیٹی کے اعتراض پر غصہ آ گیا۔

"آپ کو میری مرضی پوچھنی چاہیے تھی امی! یہ میرا شرعی اور قانونی حق ہے۔" ماں کے غصے کے باوجود وہ اپنی فطری بے باکی کی وجہ سے خاموش نہیں رہ سکی۔ ایک تو اسے منیب بیان کی گئی تمام خوبیوں کے باوجود پسند نہیں تھا اور اس سے عجیب سی الجھن محسوس ہوتی تھی، دوسرے اس کے اپنے دل کا معاملہ بھی کہیں اور جڑا ہوا تھا اس لیے ماں کے ساتھ اتنی بحث کر رہی تھی۔

"ہم تمہارے والدین ہیں اور ہمارا بھی شرعاً اور قانوناً تم پر حق ہے۔ ویسے بھی اس رشتے میں قابلِ اعتراض بات ہے ہی کیا جو تم اتنی بحث کر رہی ہو؟" اس کی بے باکی ان کے غصے کا گراف بھی بلند کر رہی تھی۔

"سب سے قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ مجھے منیب پسند نہیں ہے اور آپ مجھے ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ ساری زندگی گزارنے پر مجبور کر رہی ہیں۔" اس نے ان کے غصے کی پروا کیے بغیر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"اچھا، تو میں بھی سنوں کہ وہ پسندیدہ شخص کون ہے جس کے ساتھ تم اپنی ساری زندگی خوشی خوشی گزارنے کے لیے تیار ہو؟" اس بار انہوں نے سدرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیکھے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ وہ اتنی بھی انجان نہیں تھیں کہ اپنی نوجوان بیٹی کی دلچسپی کے مرکز سے واقف نہ ہوں۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں سائرہ آنٹی سے کتنی زیادہ اٹیچڈ ہوں اور وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں جبکہ مامی تو اچھی خاصی روڈ خاتون ہیں۔ اتنی روڈ ساس کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ میں سائرہ آنٹی جیسی تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی خاتون کے ساتھ رہ لوں۔" لاکھ بے باک سہی لیکن اپنی زبان سے جبران کا نام لیتے ہوئے جھجک گئی اور گھما کر اپنی خواہش بیان کی۔

"بے وقوف! آج کل ساسوں کے ساتھ رہتا کون ہے جو تم اچھی بری ساس کی فکر میں مبتلا ہو۔ ہم تمہیں جہیز میں اپارٹمنٹ گفٹ کریں گے۔ تم شادی کے چند دن بعد منیب کے ساتھ وہاں شفٹ ہو جانا۔" انہوں نے گویا چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کر دیا۔

"منیب کے ساتھ......" وہ تلملائی۔ "میں نے آپ سے کہا نا کہ مجھے منیب پسند نہیں ہے۔"

"پھر کون پسند ہے؟ وہ پھٹیچر جبران...... جس کے مستقبل کا کچھ پتا نہیں ہے۔ نہ تو وہ کسی پروفیشنل کالج میں پڑھتا ہے اور نہ ہی اس کے باپ کی کوئی جائداد ہے کہ اس کے بل بوتے پر تمہیں پُرآسائش زندگی دے سکے۔ تم جو دنیا بھر کی آسائشات کی عادی ہو، کیسے اس کے پچاس سال پرانے گھٹیا سے گھر میں رہ سکو گی؟" انہوں نے بھی اس بار بنا لحاظ کے اس کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیے۔

"محبت ہو تو انسان آسائشات کے بغیر بھی زندگی گزار سکتا ہے۔ کیا ہوا کہ جبران پروفیشنل کالج میں نہیں پڑھتا لیکن وہ ہے تو محنتی طالب علم۔ اس کا ارادہ ہے کہ بی ایس سی کے بعد ایم ایس سی کرے گا اور پھر کمیشن کا امتحان دے کر لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کر دے گا۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ایف ایس سی کے زمانے میں اقبال انکل کی بیماری کی وجہ سے وہ لوگ کتنے پریشان تھے اسی لیے جبران میڈیکل کے لیے میرٹ نہیں بنا سکا لیکن پھر بھی اس کے مارکس منیب سے تو زیادہ ہی تھے۔ منیب کو تو ماموں نے پیسے کے بل بوتے پر میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کروا دیا ورنہ اس کے جتنے نمبر آئے تھے اسے کون ایڈمیشن دیتا۔ منیب غیر ذمے دار انسان ہے جبکہ بے چارہ جبران تو اتنا ذمے دار ہے کہ ٹیوشنز پڑھا کر اپنی محنت کی کمائی سے پڑھ رہا ہے۔" اس نے اپنے تئیں جبران کے حق میں بہترین دلائل دیے۔

"یہ محبت وغیرہ کی فلمی باتیں تو تم مجھ سے کرو نہیں۔ عملی زندگی میں یہ سب نہیں چلتا اور نہ ہی یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کیسے کامیاب زندگی گزار رہا ہے۔ دیکھا بس یہ جاتا ہے کہ کامیاب کون ہے اور کس کے ساتھ بہتر زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ جبران کو تو تم خود بے چارہ کہہ رہی ہو اور میں تمہیں کسی بے چارے کے ساتھ بے چارگی کی زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

ان کے پاس اس کی ہر بات کا جواب تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ دلیل سے ماں کو نہیں ہرا سکتی تو ہٹ دھرمی پر اتر

آئی اور بولی۔
''آپ کچھ بھی کہیں، میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں منیب کے ساتھ منگنی، شادی کچھ بھی نہیں کرنے والی۔ مجھے جبران پسند ہے اور اسی کو اپنی زندگی کا ساتھی بناؤں گی۔''
''اور میں بھی تمہیں بتا رہی ہوں کہ جبران کے ساتھ تمہاری شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اس دنیا میں آخری لڑکا رہ جائے تب بھی نہیں۔'' ان کا لہجہ بھی اٹل تھا۔ سدرہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔
''امی...... آپ اپنی رقابت......'' صدمے کی زیادتی کے باعث وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہیں کرسکی۔
''تم جو چاہے سمجھو۔'' انہوں نے اس سے نظریں چرالیں اور ایک جھٹکے سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ سدرہ کی بے یقین نگاہیں ان کے تعاقب میں تھیں۔

☆☆☆

''میری بیٹی کے لیے...... سائرہ کے بیٹے کا رشتہ۔ نہیں، کبھی نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' نسیمہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر چکراتی پھر رہی تھیں۔
''اس سائرہ ناگن نے ساری زندگی مجھے سکون سے جینے نہیں دیا۔ میری ہر خوشی کے راستے میں کالی بلی بن کر بیٹھی رہی اور اب...... اب بیٹی کی ساس بنا کر میں آگے کی زندگی کے لیے اسے اپنے سر پر مسلط کرلوں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ نہیں ہوسکتا۔'' سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ زور زور سے اپنے سر کو بھی نفی میں جنبش دیتی جارہی تھیں۔
''ابھی وہ صرف فہیم کی نظموں اور غزلوں میں دکھائی دیتی ہے۔ دل کی بات دل میں رکھ کر وہ اس کا ذکر زبان پر نہیں لاتے۔ کل کو سمدھن بن گئی تو بیٹی کے بہانے وہ اس کا نام زبان پر بھی لانے لگیں گے۔ مجھ سے اس کی خاطریں کروائی جائیں گی۔ آنے بہانے وہ میرے گھر کے چکر لگائے گی۔ اچھا میزبان اور سمدھی ہونے کا ثبوت دینے کے لیے فہیم اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کریں گے اور یہ سب مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ مجھ سے تو اس کا کبھی کبھار بھی اپنے گھر آنا برداشت نہیں ہوتا۔ میں بیٹی کی ساس کی حیثیت سے کیسے اس کی آؤ بھگت کروں گی۔'' وہ جوں جوں سوچ رہی تھیں، ان کا اضطراب بڑھتا جارہا تھا اور اپنے افکار پر مزید پختہ ہوتی جارہی تھیں۔
''سدرہ بچی ہے۔ اسے اپنے بُرے بھلے کی کیا تمیز۔ میں ماں ہوں۔ میں نے سوچ سمجھ کر اس کے لیے بہترین فیصلہ کیا ہے۔ منیب میرے اکلوتے بھائی کا بیٹا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھلا میں کسی کو داماد بنانے پر کیسے ترجیح دے سکتی ہوں۔ جذبات سے ہٹ کر بھی دیکھوں تو منیب کی پوزیشن ہر طرح سے جبران کے مقابلے میں مضبوط ہے۔'' ان کے پاس خود کو قائل کرنے کے لیے بھی دلائل کے انبار تھے۔
سائرہ سے ان کی رقابت کی کہانی بڑی عام سی تھی۔
سائرہ، فہیم کی چچازاد کزن تھیں۔ فہیم اور سائرہ کے والد آپس میں بے حد محبت رکھنے والے بھائی تھے اور اپنی اس محبت کو برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے بچپن میں ہی اپنے بچوں کے رشتے آپس میں طے کردیے تھے۔ فہیم اور سائرہ اس ادراک کے ساتھ پل کر بڑے ہوئے تھے کہ وہ منگیتر ہیں اور مستقبل میں انہیں ایک دوسرے کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ہے۔ اتنے مضبوط رشتے کا خیال جذبات کو متاثر نہ کرتا یہ کیسے ممکن تھا۔ مزید زبردست ذہنی ہم آہنگی نے بھی دونوں کو قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک جیسے مضامین، کتابوں کا شوق، شاعری کا شغل، مصوری سے دلچسپی...... کیا کیا نہیں تھا ان کے پاس جو گفتگو کا موضوع بنتا تو پھر بات سے بات نکلتی ہی چلی جاتی اور وہ بے تکان ایک دوسرے سے گفتگو کیے جاتے۔ اس گفتگو کے لیے انہیں کسی پردہ داری کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ سب کے درمیان بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے رہتے۔ یہ اور بات کہ اس عام سی گفت وشنید کے دوران ان کی محبت کا دریا بھی کہیں گہرائی میں سکون سے بہتا رہتا۔
محبت کے گلاب کے ساتھ کانٹوں کا وجود نہ ہو تو یہ تو ممکن ہی نہیں۔ ان کی محبت کا کانٹا ان کی ماؤں کی باہمی چپقلش اور دیورانی جٹھانی کی روایتی مسابقت کی صورت میں موجود تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں لیکن خاوندوں کی باہمی محبت کے باعث اوپری دل سے اس رشتے کو نبھانے پر مجبور تھیں۔ مجبوری کی یہ ڈور فہیم کے والد کی موت نے توڑ دی۔ وہ ہارٹ فیل کے باعث اتنی اچانک دنیا چھوڑ گئے کہ اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا موقع نہیں ملا اور ان کی شریکِ حیات کو دیورانی سے عمر بھر کی پرخاش نکالنے کا موقع مل گیا۔ خاوند کے انتقال کے ابتدائی عرصے میں ہی ان کے رویے میں واضح تبدیلی آنے لگی۔ ذرا ذرا سی باتوں کو پہاڑ بنا کر باہمی فاصلے بڑھائے جانے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جٹھانی اور دیورانی میں گفتگو اور میل ملاپ کا سلسلہ ہی منقطع ہوگیا۔ اس صورتِ حال پر ہکا بکا فہیم اور سائرہ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اپنی ماؤں کو راہِ راست پر لاسکیں

لیکن جس کی نیت ہی نہ ہو اسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ فہیم کی والدہ نے تو اکلوتے دیور کے خود چل کر آنے اور بیوی کے کردہ و ناکردہ گناہوں کی اپنی طرف سے معافی مانگنے کی لاج نہ رکھی اور صاف کہہ دیا۔

''جس عورت سے میں دیورانی کی حیثیت سے نہ نباہ سکی، اس سے سمدھن کا رشتہ کیسے نبھا ہوں گی۔ عمر بھر کی چخ چخ سے بہتر ہے یہ رشتہ ہی ختم کر دیا جائے۔'' اپنی ضد میں وہ نہ تو مرحوم شوہر کی خواہش کو خاطر میں لائیں نہ بیٹے کی التجائیں اور منتیں رنگ لاسکیں۔ فہیم نے بہت اصرار کیا تو بولیں۔

''میرے جیتے جی تو سائرہ اس گھر میں بہو بن کر نہیں آسکتی۔ تمہیں اس سے بیاہ کا اتنا ہی ارمان ہے تو میرے مرنے کا انتظار کرو۔ اگر وہ بھی نہیں کر سکتے تو کہیں سے زہر لا کر ماں کو کھلا دو تا کہ تمہاری راہ کا کانٹا نکل جائے۔'' اتنی سخت بات کے بعد فہیم میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے مزید اصرار کرتے۔ انہیں خاموش ہونا پڑا اور اسی خاموشی کے دوران انہوں نے سائرہ کا رشتہ کہیں اور طے ہو جانے کی خبر بھی بہت صبر سے سہہ لی۔ شکوہ کرتے بھی تو کس سے؟ چچا نے انہیں یہ خبر خود اپنے منہ سے سنائی تھی اور مغموم سے لہجے میں بولے تھے۔

''میری خوشی تو اسی میں تھی بیٹا کہ بھائی جان کی دیرینہ آرزو پوری ہوتی لیکن حالات ایسے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ جوان بیٹی کا باپ ہوں اور صحیح وقت پر اسے اس کے گھر کا دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ بھابی جان کے رویّے میں تھوڑی سی بھی گنجائش ہوتی تو میں یہ تکلیف دہ فیصلہ نہیں کرتا۔''

فہیم نے چچا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش دلاسا دیا اور خود یوں خاموش ہو گئے کہ گویا ان کا اس دنیا سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ زندگی کے سارے امور انجام دیتے ہوئے بھی ان کے انداز میں ایک ایسی لاتعلقی در آئی جو ہمیشہ کے لیے ان کے مزاج کا حصہ بن گئی۔

سائرہ کی شادی کے ٹھیک ایک سال بعد انہوں نے والدہ کے اصرار پر اپنی خالہ زاد نسیمہ سے بیاہ بھی رچا لیا اور اس کے سارے حقوق و فرائض بھی اسی بے تعلقی کے انداز میں ادا کرنے لگے جو ان کی شخصیت کا خاصہ بن چکا تھا۔ نسیمہ کزن تھیں۔ انہیں فہیم اور سائرہ کی منگنی سے لے کر اب تک کے ہر واقعے کی مکمل خبر تھی۔ فطری طور پر انہوں نے فہیم کی لاتعلقی اور بے نیازی کو سائرہ کے ہجر کا ردِعمل جانا اور رقابت کی ایسی آگ میں جھلسنے لگیں جس کو چھپانے کی کوشش کے باوجود چھپانے میں کامیابی حاصل نہیں کر پائیں۔ سائرہ کا نام طعنے کی صورت ان کی زبان پر رہنے لگا۔ فہیم نے ان کی کسی تلخ اور ترش بات پر کبھی نہیں ٹوکا اور اپنے خول میں مزید سمٹ کر بیٹھ گئے۔ اس خول پر نسیمہ کتنی ہی ضربیں لگاتیں، وہ ٹس سے مس نہ ہوتے اور لگے بندھے انداز میں اپنے فرائض انجام دیتے رہتے۔ ان کی دنیا بڑی محدود تھی۔ گھر، یونیورسٹی کی ملازمت، کاغذ قلم کا رشتہ اور کبھی کبھار کسی مشاعرے میں شرکت۔ مہینے میں ایک بار وہ ان دکانوں کا کرایہ لینے چلے جاتے تھے جو ان کے والد نے سستے وقت میں خرید کر چھوڑ دی تھیں اور اب ان دکانوں سے کرائے کی مد میں ان کی تنخواہ سے بھی دگنی آمدن ہوتی تھی۔

سائرہ کے ہاں جبران اور نسیمہ کے ہاں سدرہ کی پیدائش کے بعد سائرہ کی والدہ انتقال کر گئیں۔ چچا اکیلے رہ گئے تو انہوں نے بیٹی اور داماد سے ساتھ رہنے کی درخواست کی اور یوں سائرہ جو پہلے ہی نسیمہ کو کسی بھوت کی طرح اپنی زندگی میں دکھائی دیتی تھیں، پڑوس میں آبسیں۔ وہ اپنی زندگی میں بہت مگن دکھائی دیتی تھیں۔ فہیم کو بھی اپنے معمولات سے فرصت نہیں تھی لیکن نسیمہ اپنی بے چینی کا کیا کرتیں۔ انہوں نے ہر وہ رویہ اپنایا جس کے باعث دونوں گھرانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات نہ پنپ سکیں۔ سائرہ نے بھی ان کے خوف کو بھانپ کر اور کچھ اپنی قلبی کیفیت کے باعث لیا دیا سا انداز اختیار کر لیا لیکن بچوں کی باہمی دوستی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں۔

چچا کے لیے مرحوم بھائی کی پوتی اپنے سگے نواسے سے کم نہیں تھی۔ وہ خود آ کر سدرہ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے اور اس کے ایسے لاڈ اٹھاتے کہ وہ گھنٹوں وہاں گزار کر بھی بیزار نہیں ہوتی۔ نسیمہ کو یہ بات اتنی پسند نہیں تھی لیکن ایک تو چچا کے احترام میں خاموش رہنا پڑتا، دوسرے اپنی طبیعت کی خرابی بھی مجبوری بن جاتی۔ سدرہ کے سال بھر بعد ہی وہ پھر سے امید سے ہو گئیں۔ گھریلو ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ طبیعت کی خرابی نے نڈھال کیا تو انہیں سدرہ کا کچھ گھنٹوں کے لیے پڑوس میں وقت گزار آنا غنیمت لگنے لگا۔ سدرہ کی دادی یعنی ان کی ساس یوں تو پوتی کے بہت لاڈ اٹھاتی تھیں لیکن بچی کو ذمے داری سے سنبھالنا انہیں پسند نہیں تھا۔ ایسے میں چار و ناچار نسیمہ کو سدرہ کا سائرہ کے گھر جانا گوارا کرنا پڑا۔ طوبیٰ کی پیدائش کے بعد یہ مجبوری مزید بڑھ گئی کہ طوبیٰ پیدائشی طور پر بہت کمزور اور چڑچڑی بچی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ ہنستا بچہ سب کا، روتا بچہ صرف ماں

کا۔ سوطوبیٰ کو نسیمہ کے سوا کوئی گود میں لینے والا نہیں تھا۔ دادی تو اس کو سنبھالنے کے نام پر ہی کان پکڑ لیتی تھیں۔ تیسری بیٹی رمشا دنیا میں وارد ہوئی تو دادی پر بیٹے کے اولادِ نرینہ سے محروم ہونے کا صدمہ اس بری طرح حاوی ہوا کہ وہ اپنی اس تیسری پوتی سے دنیا دکھاوے کا پیار بھی نہیں جتا سکیں۔ نسیمہ جو کبھی ان کی چہیتی بھانجی ہوا کرتی تھیں، صرف بہو ہو کر رہ گئیں۔ ایسی بہو جس نے انہیں ایک پوتے تک کی خوشی نہیں دی پھر بھلا وہ ان سے خوش کیسے رہتیں۔

''میرے اختیار میں تھا کیا جو انہیں پوتا پیدا کر کے دے دیتی۔ عورت ہو کر عورت کی مجبوری کو نہیں سمجھتیں۔ اگر یہ انسان کے بس کی بات ہے تو خود کیوں ایک اکیلا بیٹا پیدا کر کے بیٹھی رہ گئیں۔ لائن کیوں نہیں لگا دی بیٹوں کی؟'' نسیمہ ان کے رویے پر بہت دلبرداشتہ ہوتیں تو آئے گئے کے سامنے تلخی سے کہے بنا نہ رہ پاتیں۔ ایسے میں نوبت خالہ بھانجی کے درمیان بحث مباحثے تک بھی چلی جاتی لیکن فہیم مٹی کا مادھو بنے اپنی جگہ بیٹھے رہتے۔ نہ انہوں نے کبھی ماں کو ان کی غلط سوچ پر ٹوکا، نہ کبھی بیوی کو درگزر کی نصیحت کی۔ خیر یہ گزری کہ تیسری پوتی کے سال بھر بعد ہی بڑی بی دنیا سے سدھار گئیں اور گھر میں جاری رہنے والے معرکے جگ ہنسائی کی حد تک نہیں پہنچے۔ ہاں سدرہ کا پڑوس میں آنا جانا اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ فہیم کے چچا یعنی سائرہ کے والد کے انتقال کے بعد بھی اس کا یہ معمول برقرار رہا اور نسیمہ نے ایک بار پھر اسے روکنے سے خود کو قاصر پایا کہ اب وہ اسکول جانے لگی تھی اور سائرہ ہی اس کا ہوم ورک وغیرہ کروا دیتی تھیں۔ ایک طرف ذمے داری سے آزادی کا احساس تھا تو دوسری طرف اس چخ چخ سے نجات مل رہتی تھی جس کا تینوں بچیوں کے بیک وقت گھر میں رہنے پر سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سدرہ خصوصاً زیادہ جھگڑالو طبیعت کی مالک تھی۔ پہلی پوتی ہونے کی وجہ سے دادی نے اسے بڑا سر چڑھایا تھا اس لیے وہ کسی بات پر ''نہ'' سننے کی عادی نہیں تھی، نہ ہی اسے بہنوں سے کوئی چیز شیئر کرنے کی عادت تھی۔ اس لیے اس کی موجودگی میں زیادہ تر گھر میں فساد ہی برپا رہتا تھا اور نسیمہ کو یہی غنیمت لگتا تھا کہ یہ فتنہ گھر سے دور ہی رہے۔ سائرہ سے تمام تر رقابت کے باوجود یہ اطمینان تو بہرحال انہیں تھا کہ اس کے گھر ان کی بچی محفوظ اور خوش رہتی ہے لیکن اب جبکہ وہ بچی بڑی ہو گئی تھی اور خود اپنے منہ سے کہہ رہی تھی کہ وہ سائرہ آنٹی کے ساتھ ان کے گھر میں زیادہ خوش رہ سکتی ہے تو انہیں اس کی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی اور عمر کے اس حصے میں جذبۂ رقابت پوری طرح سر اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''جس عورت نے کبھی میرے شوہر کو پوری طرح میرا نہ بننے دیا، اسے میں اپنی بیٹی سونپ دوں، اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ضرورت اور مجبوریوں کا سارا وقت گزر چکا تھا اس لیے اب نئے سرے سے جذبۂ رقابت کو نباہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سو وہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کو روند کر اپنا قد اونچا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئیں، بالکل اپنی خالہ کی طرح جنہوں نے دیورانی سے کدورت کو بیٹے کی خوشیوں کی بھینٹ دے کر نبھایا تھا۔

☆☆☆

''پلیز سدرہ! چپ ہو جاؤ۔ مجھے تمہارے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔'' جبران نے بڑی بے بسی کے عالم میں دھواں دھار آنسو بہاتی سدرہ کو خاموش کروانے کی کوشش کی۔

''رونے سے تکلیف ہو رہی ہے اور اس بات سے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی کہ میں کسی اور کی بننے جا رہی ہوں؟'' سدرا کی جذباتی سدرہ نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

''تم تو ایسی بات نہیں کرو۔ کیا تم سے بڑھ کر بھی کوئی میرے دل کا حال جاننے والا ہے۔ جس تکلیف سے تم گزر رہی ہو اسی سے میں بھی گزر رہا ہوں۔''

''تو پھر کچھ کرتے کیوں نہیں؟'' وہ جو ماں سے بحث میں ناکام ہو کر یہاں چلی آئی تھی، اس سے شکوہ کرنے لگی۔

''کیا کروں؟ امی سے اس سلسلے میں میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہارے کہنے پر سدرہ کا رشتہ مانگنے تو جا سکتی ہوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ ایک تو منیب کی پوزیشن تمہارے مقابلے میں ہر طرح سے زیادہ مضبوط ہے، دوسرے عزیز و اقارب میں بھی یہ بات پھیل چکی ہے کہ سدرہ اور منیب کا رشتہ طے پا چکا ہے اور اتوار کو باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ ایسے میں تم خود ہی سوچ لو کہ وہ لوگ تمہارے حق میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟'' جبران نے بے بس سے انداز میں اسے اپنے اور سائرہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔

''یہ بھی عجیب تماشا ہے کہ جس رشتے کے طے پانے کی خبر مجھے خود چند گھنٹے پہلے ملی ہے، اس کے بارے میں خاندان کا ہر فرد آگاہ ہو چکا ہے۔'' سدرہ جھنجلائی۔

''یہ موبائل اور انٹرنیٹ کا دور ہے یار۔ ہر خبر ایسے ہی تیزی سے پھیل جاتی ہے۔ اب دیکھو نا کہ ہمیں بھی تمہارے

بتانے سے پہلے ہی خبر مل چکی تھی۔'' جبران اداسی سے بولا تو سدرہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اسے شبہ تھا کہ اس خبر کو پھیلانے میں نسیمہ کا اپنا ہاتھ ہے۔ اس طرح انہوں نے اس کی مزاحمت کی راہیں مسدود کرنے کی کوشش کی تھی اور ماں باپ کی عزت سنبھالنے کا وہ بوجھ اس پر لاد دیا تھا جسے تقریباً ہر مشرقی بیٹی اٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

''ویسے مجھے حیرت ہے کہ تمہارا رشتہ اتنے روایتی طریقے سے کیسے طے کر دیا گیا۔ نسیمہ آنٹی کو میں اتنی روایتی خاتون نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اس دور میں بیٹی کی مرضی معلوم کیے بغیر اس کا رشتہ طے کر دیں گی۔ آنٹی سے بھی زیادہ مجھے انکل پر حیرت ہے۔ وہ یونیورسٹی پروفیسر ہیں اور میرے خیال سے اچھے خاصے روشن خیال آدمی ہیں۔ کیا انہوں نے بھی آنٹی سے نہیں کہا کہ رشتے کے لیے ہامی بھرنے سے پہلے تمہاری رائے لے لیں؟''

''ابو کی تو تم رہنے ہی دو۔ وہ کسی معاملے میں دخل ہی کہاں دیتے ہیں۔ انہوں نے ہر معاملہ امی پر چھوڑ رکھا ہے اور امی کو اپنے بھتیجے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا حالانکہ پہلے وہ ماموں کی فیملی کو اتنی خاص لفٹ نہیں کرواتی تھیں۔'' منہ پھٹ سدرہ کی اس بات میں بھی سچائی تھی۔ نسیمہ کو بھائی سے تو فطری طور پر محبت تھی لیکن چند سال قبل تک وہ بھاوج کو زیادہ منہ نہیں لگاتی تھیں۔ وجہ اسٹیٹس کا فرق تھا۔ بھائی کسی سرکاری محکمے میں معمولی ملازمت پر تھے اس لیے گھر میں زیادہ خوش حالی نہیں تھی لیکن پھر جانے کس کے کہنے پر انہوں نے روش بدلی اور ''فضلِ ربی'' سے مستفید ہونے لگے۔ اس فضلِ ربی کو ہوشیاری سے کاروبار میں لگانے پر انہوں نے تیزی سے ترقی کی سیڑھیاں طے کیں اور سونے کے بچھڑے کو پوجنے والے اس معاشرے میں عزت دار کہلانے لگے۔ نسیمہ سمیت ساری بہنیں اب بھائی بھاوج سے اچھے تعلقات رکھنے میں بھلائی محسوس کرتی تھیں لیکن قرعہ فال نسیمہ کے حق میں یوں نکلا تھا کہ تینوں بہنوں میں وہ ہی سب سے زیادہ خوش حال تھیں۔

''تمہاری امی کو بھتیجے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا اور میری امی کو صاف نظر آ رہا ہے کہ اس وقت رشتہ لے جانے کا مطلب صرف اور صرف انکار ہوگا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟''

وہ واقعی بے بسی کا شکار تھا۔ اپنے طور پر تو اس نے یہی سوچا تھا کہ تعلیم مکمل ہونے پر ملازمت مل جائے تو پھر ماں باپ کو رشتے کے لیے سدرہ کے گھر بھیجے گا۔ اسٹیٹس کا فرق تھا لیکن اسے امید تھی کہ بات بن جائے گی۔ آخر فہیم خود بھی تو تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اور وہ بھی اس شعبے سے منسلک ہونے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اسے تو قسمت آزمانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور بالا ہی بالا سدرہ کا رشتہ منیب سے طے کر کے اس کی راہ مسدود کر دی گئی تھی۔ اس صورت حال نے اسے بہت بڑا دھچکا لگایا تھا۔ اس پر سے سدرہ کے آنسو الگ اس کے دل پر قیامت بن کر گر رہے تھے۔

''تم کچھ نہیں کر سکتے تھے تو مجھ سے محبت کیوں کی تھی؟'' سدرہ کا کسی پر زور نہیں چل رہا تھا اس لیے وہ اس کا ہی ناطقہ بند کیے ہوئے تھی۔

''اس پر مجھے کہاں اختیار تھا۔ اگر اختیار ہوتا تو خود سے اونچی حیثیت رکھنے والی لڑکی کو دل میں بسانے کی غلطی نہ کرتا۔'' اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''فضول باتیں بند کرو اور اس مسئلے کا کوئی حل سوچو۔'' سدرہ نے اسے ٹوکا۔

''مجھے تو یہی حل سمجھ آ رہا ہے کہ فی الحال یہ منگنی ہو جانے دو۔ منگنی کوئی ایسا رشتہ تو ہے نہیں کہ توڑا نہ جا سکے۔ منگنی کے فوراً بعد شادی کا بھی خدشہ نہیں ہے۔ ابھی منیب اپنا ایم بی اے مکمل کرے گا، پھر ہاؤس جاب اور باقاعدہ ملازمت کا نمبر آئے گا۔ اس لیے ابھی تمہارے پاس کافی مہلت ہے۔ اتنے عرصے میں، میں بھی اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کر کے جاب پر آ جاؤں گا تو میری پوزیشن ذرا بہتر ہو جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ ہی ہمارے دل [illegible] کی سن کر ہماری مشکل دور کر دے۔ میں دعا کروں [illegible] دعا کرنا۔ دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے او[illegible]لی گہرائیوں سے مانگی گئی دعائیں ناممکن کو بھی ممکن ب[illegible] دیتی ہیں۔'' سدرہ کی منگنی کا سن کر صدمہ اسے بھی ہوا تھا لیکن فی الوقت اپنے سے زیادہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کو بھی وہی ساری امیدیں دلا رہا تھا جن کے سہارے اس نے خود پر ضبط کا بند باندھا تھا۔ ایک شریف اور نوعمر لڑکا موجودہ حالات میں اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اپنی طبیعت کے جذباتی پن کے باوجود سدرہ کو بھی اس کی بات ماننے میں ہی بہتری نظر آئی۔

☆☆☆

سدرہ کے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی منگنی منیب سے ہو گئی۔ منگنی ہوتے ہی اس نے خشوع و خضوع سے اس منگنی کے ٹوٹ جانے کی دعائیں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ وہ پڑھنے میں اچھی تھی اور فرسٹ ائیر میں اس کے اچھے مارکس آئے تھے لیکن یہ

مارکس میڈیکل میں داخلے کے اعتبار سے کم تھے۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ سیکنڈ ائیر میں اس کمی کو پورا کرلے گی اور میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر دم لے گی۔ اس طرح وہ اپنے لیے کچھ اور مہلت حاصل کرنے کی تدبیر کررہی تھی کہ بالفرض جبران جلد سیٹ نہ ہوسکا اور منیب سے رشتہ ختم ہونے کی بھی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوئی تو وہ اپنی تعلیم کا بہانہ بنا کر چند سال کی مہلت مزید حاصل کرلے گی۔ اس سے قبل اس نے کبھی ڈاکٹر بننے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اب جو اس کو ڈاکٹر بننے کا جنون چڑھا تو سب کو یہی گمان گزرا کہ مستقبل کے ڈاکٹر سے منگنی ہونے کا اثر ہے کہ وہ خود بھی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے۔

''اچھا ہے بھئی۔ میاں بیوی ایک ہی فیلڈ میں ہوں گے تو آسانی رہے گی۔'' لوگوں کے اس تبصرے کو سن کر وہ بس خاموشی سے مسکرا دیتی۔ پڑھائی کی مصروفیت اس کے لیے اچھی ڈھال بن گئی تھی۔ منیب سے سامنا ہونے سے بچنے کے لیے اس نے ننھیالی رشتے داروں کے گھر آنا جانا ترک کردیا تھا۔ موبائل فون اس کے پاس تھا نہیں کہ منیب اس سے براہِ راست رابطہ کرسکتا۔ لینڈ لائن پر بات کرنے کے حوالے سے اس نے خود نسیمہ کو پابند کررکھا تھا اور صاف کہہ دیا تھا۔ ''آپ کی زبردستی کی وجہ سے میں نے منگنی تو کرلی ہے لیکن انگیجمنٹ پیریڈ میں مجھ سے منیب اور دیگر افراد کے ساتھ خوامخواہ کا ربط ضبط رکھنے کی امید نہیں رکھیے گا۔''

نسیمہ نے اس کی بات پر اسے کڑے تیوروں سے گھورا تو ضرور لیکن مجبور اس لیے نہیں کیا کہ وہ خود ڈرتی تھیں کہ ان کی منہ پھٹ بیٹی کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ بول جائے۔ وہ خود ہی بیٹی کے رویّے پر پردہ ڈالتی رہیں۔ کبھی کہتیں۔ ''وہ بہت شرمیلی ہے۔ اسے بات کرتے شرم آتی ہے۔'' کبھی بہانہ بناتیں۔ ''آج اس کا بہت امپورٹنٹ ٹیسٹ ہے۔ فون پر بات کیا کرے گی، اسے تو کھانا کھانے کا بھی ہوش نہیں ہے۔''

منیب نے کچھ عرصے یہ بہانے سنے لیکن وہ ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ آزاد مزاج رکھنے والا بندہ تھا اور اپنی سوچ کے مطابق منگیتر سے تعلقات رکھنے کا خواہش مند تھا چنانچہ باقی راہیں مسدود پا کر اس نے یہ راہ نکالی کہ ایک روز چھٹی کے وقت سدرہ کے کالج جا پہنچا۔ سدرہ نے کالج سے باہر نکلتے ہی اسے دیکھ لیا اور چاہا کہ انجان بن کر نکل جائے لیکن منیب نے اس کی اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا اور بلند آواز میں اسے پکارا۔ مجبوراً سدرہ کو اس کے قریب جانا پڑا لیکن موڈ سخت خراب ہوچکا تھا۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' منیب کی کالج کے گیٹ پر موجودگی اسے بے حد ناگوار گزری تھی، اس لیے اپنے لہجے پر قابو نہ پاسکی اور سختی سے دریافت کیا۔

''یہاں نہ آتا تو کیا کرتا؟ تم تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ نہ تم فون پر بات کرتی ہو، نہ گھر آنے پر سامنا کرتی ہو۔ میں نے طوبیٰ اور رمشا کی زبانی تمہیں کتنے پیغامات بھجوائے لیکن تم نے ان کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔'' منیب اس کے لہجے کی پروا کیے بغیر عاشقانہ لہجے میں بولتا چلا گیا۔

''مجھے ایسی حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ اس لیے برائے مہربانی آئندہ ایسی چھچھوری حرکت مت کرنا۔ خوامخواہ تمہاری وجہ سے میری کالج میں بدنامی ہوگی۔'' سدرہ نے پہلے سے بھی زیادہ سخت لہجے میں اسے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔ اپنی اس بے عزتی پر منیب کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ آس پاس سے گزرتی لڑکیوں میں سے کئی کے کانوں تک سدرہ کی آواز پہنچ چکی ہے اور وہ محظوظ ہونے والے انداز میں مسکرا رہی ہیں۔ شدید طیش کی کیفیت میں اس نے سدرہ کو زیرِلب ایک گالی دی اور پھر طوفانی انداز میں وہاں سے بائیک نکال کرلے گیا۔ منگنی کے دن سے ہی سدرہ کے انداز اسے ٹھکرا رہے تھے اور آج جس انداز میں سدرہ نے اس سے بات کی تھی، اس انداز کو تو وہ قطعی اس کی شرم و جھجک پر محمول نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس کم عمری میں بھی اچھا خاصا کھایا کھیلا لڑکا تھا اس لیے اس کے اندر خطرے کا الارم سا بج اٹھا اور اسے یہ اندازہ لگانے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کہ اس منگنی میں سدرہ کی رضا شامل نہیں ہے۔ اب اسے اس بات کی کھوج لگ گئی تھی کہ آخر سدرہ کی رضا کہاں تھی۔ یہ کھوج اسے اپنی خالہ زاد ثروت تک لے گئی۔

☆☆☆

''کل تمہارے منگیتر صاحب ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔'' اگلے دن ثروت نے سدرہ کو اطلاع دی۔ وہ سدرہ کی کلاس فیلو ہی تھی لیکن پابندی سے کالج نہیں آتی تھی۔

''یہ تو پوچھو کہ محترم کیوں تشریف لائے تھے؟'' ثروت کی دی اطلاع پر متوجہ ہونے کے بجائے وہ مزے سے چناچاٹ کے ساتھ انصاف میں لگی رہی تو ثروت کو اسے ٹوکنا پڑا۔

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے بھئی۔ آخر وہ بھی اس کی پھپو کا گھر ہے۔ جب چاہے آجاسکتا ہے۔'' سدرہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''لیکن کل محترم کی آمد کا ایک خاص مقصد تھا۔''

ثروت نے اس کا تجسس ابھارنے کی کوشش کی۔
''کیا اس نے تمہیں اپنا منگیتر ثانی بنالیا ہے۔'' سدرہ نے مذاق کیا۔
''ایسی بھلا ہماری کہاں قسمت۔ وہ تو تمہارے ہی فراق میں آئے تھے۔'' ثروت نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اطلاع دی۔
''لگتا ہے کہ کل عزت افزائی کروانے کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔''
''کیا مطلب! کیا ہوا تھا کل؟'' ثروت چونکی۔
جواب میں سدرہ نے سارا قصہ کہہ سنایا۔
''جب ہی کل مجھ سے اتنی تفتیش ہو رہی تھی۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کہیں تم کسی اور کے ساتھ تو انوالوڈ... نہیں ہو۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔''
''اچھا کیا۔''
''لیکن سچ کہوں سدرہ کہ میں خود اپنے جواب سے مطمئن نہیں ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ میں نے منیب سے غلط بیانی کی ہے۔''
''کیا مطلب؟'' سدرہ کو اس کے لہجے کی معنی خیزی نے چونکایا۔
''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری جبران کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ آئی مین، تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔''
''خوامخواہ کے اندازے نہ لگاؤ۔'' اس کے درست اندازے پر سدرہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔
''خوامخواہ کا اندازہ تو نہیں ہے۔ منگنی والے دن تم بالکل بھی خوش نظر نہیں آرہی تھیں۔ سائرہ آنٹی بھی اداس اداس سی تھیں ا...بران نے تو منگنی میں شرکت ہی نہیں کی تھی حالانکہ ہم ...ے تو ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ تمہارے گھر کے آدھے سے زیادہ کام وہی نمٹاتا ہے۔''
ثروت کی اس تیز نظر پر سدرہ سٹپٹا گئی اور بودے سے لہجے میں بولی۔ ''اس روز شاید جبران کہیں مصروف تھا اس لیے شریک نہیں ہوسکا۔''
''بہانے مت بناؤ یار! میں سب سمجھ رہی ہوں لیکن تم نہ بتانا چاہو تو کوئی بات نہیں۔'' ثروت کے جملے نے عجیب سا کام کیا اور سدرہ اس کو سب کچھ بتاتی چلی گئی۔
''خالہ نے تم لوگوں کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ سائرہ آنٹی سے بہت خائف رہتی ہیں۔ میں نے ساری زندگی انہیں امی کے سامنے یہی شکوے کرتے سنا ہے کہ سائرہ آنٹی کی محبت نے فہیم خالو کو کہیں کا نہیں چھوڑا اور یہ سائرہ آنٹی ہی ہیں جن کی وجہ سے انہیں کبھی وہ محبت نہیں ملی جس کا وہ ایک بیوی کی حیثیت سے حق رکھتی تھیں۔'' سب سن کر ثروت نے ہمدردی سے تبصرہ کیا۔
''امی کو میں کیا کہوں۔ خوامخواہ ماضی کی ایک بات کو دل میں بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ میں نے تو کبھی ابو کو سائرہ آنٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ ایک دوسرے سے بات تک نہیں کرتے دونوں، پھر بھی امی کے اندیشے ختم نہیں ہوتے۔'' سدرہ نے شکوہ کیا۔
''خالہ کا کہنا ہے کہ دونوں کے دلوں میں ابھی تک ماضی کی بات ہے اسی لیے جان بوجھ کر نارمل نہیں ہوئے۔'' ثروت نے نکتہ بیان کیا۔
''امی بھی تو اس بات کو بھولتی نہیں ہیں اور کبھی نہ کبھی ابو کو باور کروا دیتی ہیں اسی لیے بھی ہوسکتا ہے کہ ابو نہ بھول سکے ہوں۔''
''شاید...... ویسے کہتے ہیں انسان اپنا پہلا پیار کبھی نہیں بھول پاتا۔'' ثروت کے لہجے میں کچھ عجیب تھا۔
''سچ ہی کہتے ہوں گے۔ میں بھی جبران کو بھولنے کا تصور نہیں کرسکتی۔'' گفتگو الگ ہی نہج پر چلی گئی۔
''تو پھر ڈٹی رہو محاذ پر۔ ہوسکتا ہے تمہاری نیّا پار ہو ہی جائے۔'' ثروت نے جواب دیا پھر پیریڈ کی بیل ہونے پر دونوں اپنے کلاس روم کی طرف دوڑ گئیں۔
وقت بہت تیزی سے گزرا۔ ذہنی دباؤ کے باوجود سدرہ کی تیاری اچھی تھی اور سارے پرچے بہت اچھے جارہے تھے۔ ثروت بھی اس کے ساتھ ہی امتحان دے رہی تھی۔ دونوں کے نام ایس (S) سے آتے تھے اور حروفِ تہجی کی ترتیب کے حساب سے ثروت کا رول نمبر اس سے پہلے تھا۔ وہ امتحانی ہال میں اس سے آگے والی سیٹ پر بیٹھا کرتی تھی۔ ثروت اوسط سے بھی کچھ نیچے درجے کی طالبہ تھی اور امتحانی ہال میں سدرہ کو بار بار اس کے پکارنے پر اس کی مدد کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح اس کے اپنے ارتکاز میں فرق پڑتا تھا لیکن دوستی کی مروت صاف انکار کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح کام چل ہی رہا تھا۔
آخری پرچہ زولوجی کا تھا اور اس میں انہیں ایک ڈایاگرام انسانی آنکھ کی اندرونی ساخت کی بھی بنانی تھی۔ سدرہ کی پریکٹس تھی اس لیے اس نے بہت مہارت اور صفائی سے لیبل ڈایاگرام بنا ڈالی جبکہ ثروت اٹک گئی۔ اس نے سرے سے اس ڈایاگرام کی پریکٹس ہی نہیں کی تھی۔ اس نے

سرگوشیوں میں سدرہ کو پکار پکار کر اس کا ناک میں دم کر دیا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ سدرہ تھوڑی دیر کے لیے اس سے کاپی بدل کر اس کی کاپی پر ڈایا گرام بنا دے۔ زبانی کوئی جواب بتا دینا الگ بات تھی اور کاپیاں تبدیل کرنا الگ بات۔ سدرہ ایسی حماقت کی جرأت نہیں کر سکی اور ثروت کی سرگوشیوں کو نظر انداز کر کے اپنا پرچہ حل کرتی رہی۔ پرچے کا وقت ختم ہوا تو ثروت کا موڈ خراب تھا۔ وہ سدرہ سے بات کیے بغیر منہ موڑ کر امتحانی ہال سے باہر نکل گئی۔ سدرہ بھی کہاں کسی کی زیادہ پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ سر جھٹک کر ثروت کا خیال دل سے نکالا اور اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد بہت سارے دن تیزی سے گزر گئے۔

امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد بھی سدرہ نے چین سے بیٹھنا گوارا نہ کیا اور انٹری ٹیسٹ کی تیاری کرنے لگی۔ رزلٹ آیا تو وہ اے گریڈ سے پاس ہوئی تھی۔ اصل میں اس کی سیکنڈ ایئر میں تو بہت اچھی پرسنٹیج آئی تھی لیکن فرسٹ ایئر کے کم مارکس نے گریڈ پر اثر ڈالا تھا۔ وہ اللہ کا نام لے کر انٹری ٹیسٹ میں بیٹھ گئی۔ ٹیسٹ اچھا ہوا لیکن میرٹ لسٹ، انٹری ٹیسٹ اور ایف ایس سی کے نمبروں کی اوسط پر بنتی ہے اور میرٹ لسٹ پر سدرہ سے کہیں زیادہ نمبر لینے والے طلبہ کا راج تھا۔ اس ناکامی نے اسے اتنا دلبرداشتہ کیا کہ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں سر منہ لپیٹ کر پڑی رہنے لگی۔ نسیمہ سے اس کی یہ اداسی نہ دیکھی گئی اور ایک دن اس کے کمرے میں جا پہنچیں۔

”میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہونے کو اتنا سر پر کیوں سوار کر لیا ہے میری جان! داخلہ نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں۔ تم بی ایس سی کر لو۔“ انہوں نے اس کے بیڈ پر اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے اس کے الجھے بالوں کو محبت سے سہلاتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”آپ جانتی ہیں امی کہ میں ایک بار جو سوچ لوں اس سے ہٹ کر کچھ نہیں کر پاتی۔ مجھے اب کچھ بھی نہیں پڑھنا ہے۔“ وہ سچ مچ بہت اپ سیٹ تھی۔

”اگر ایسی بات ہے تو میں تمہارا پرائیویٹ کالج میں ایڈمیشن کروا دیتی ہوں۔ منیب بھی تو پرائیویٹ ہی پڑھ رہا ہے۔ اچھا ہے اسی کے کالج میں ایڈمیشن لے لینا۔ تمہیں ہیلپ بھی مل جائے گی۔“ نسیمہ کی پیشکش نے سدرہ کو سوچ میں ڈال دیا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی اور روزانہ منیب کا سامنا کرنے کے خیال سے بھی وحشت ہو رہی تھی۔

”بھرے کالج میں بھلا منیب میرا کیا بگاڑ لے گا۔ جیسے منگنی کے باوجود اب تک میں اس سے فاصلہ برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں، ویسے ہی کالج میں بھی زیادہ فری نہیں ہونے دوں گی۔ یوں بھی اب اس کا وہاں صرف ایک سال ہی باقی ہے۔ فائنل مکمل ہوگا تو وہ خود کالج آنا چھوڑ دے گا۔“ وحشت کو اس سوچ نے لگام دی تو اس نے نسیمہ کے سامنے ہامی بھر لی۔ اس کے ہامی بھر لینے پر نسیمہ کے دل میں اطمینان سا اتر آیا ورنہ خود انہیں اندیشہ تھا کہ منیب کے کالج میں داخلے کا سن کر وہ انکار کر دے گی۔ اس کے اقرار نے ان کے اندر اس خوش فہمی کو جنم دیا کہ آہستہ آہستہ سدرہ سمجھوتے کی راہ پر آتی جا رہی ہے اور اس نے منیب کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔

”چلو پھر اٹھو اور بہنوں کے ساتھ جا کر اپنے لیے تھوڑی شاپنگ کر لو۔ ایڈمیشن ہونے کے بعد تمہیں پڑھائیوں میں فرصت نہیں ملے گی اور میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے پاس ڈھنگ کے چند جوڑے بھی نہ ہوں۔ آخر ڈاکٹر بننے جا رہی ہو، کوئی مذاق تو نہیں۔ میں تو ابھی سے اس وقت کے تصور سے نہال ہو رہی ہوں جب تم اور منیب ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہو گے اور لوگ تمہاری جوڑی کو رشک سے دیکھیں گے۔“ اس کے جواب نے ان کے اندر ایسی خوشی بھری کہ وہ پُرجوش سی دکھائی دینے لگیں۔ سدرہ نے بھی فی الحال ان کی کسی بات کی تردید نہ کرنا ہی مناسب سمجھا اور ان کے مشورے کے مطابق چھوٹی بہنوں کے ساتھ خریداری کے لیے روانہ ہو گئی۔

جلد اس کا داخلہ ہو گیا اور کلاسیں بھی شروع ہو گئیں۔ اس کے خدشات کے برخلاف منیب نے اسے بالکل ڈسٹرب نہیں کیا اور بس صرف ایک بار طوبیٰ کے ذریعے پیغام بھجوایا کہ اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ اس سے رابطہ کر سکتی ہے۔ وہ اس پیغام کو کہاں خاطر میں لانے والی تھی۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا لیکن کالج میں داخلے کے چند دنوں بعد ہی اس کو اس بات نے زچ کر کے رکھ دیا کہ اس کے کلاس فیلوز سمیت شاید پورا کالج ہی اس بات سے واقف تھا کہ وہ فائنل ایئر کے منیب کی کزن اور منگیتر ہے۔ لڑکیاں اس حوالے سے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں اور لڑکے بھی بھابی کہہ کر پکارنے سے باز نہیں آتے تھے۔ یہ اس کے کزنز اور منیب کے چھوٹے بھائی نہیں تھے جو وہ انہیں بے مروتی سے جھاڑ کر رکھ دیتی۔ اسے ان کے ساتھ تقریباً پانچ سال کا عرصہ گزارنا تھا اور وہ سب سے کٹ کر نہیں رہ سکتی تھی، سو یہاں خاموشی کو

اپنا ہتھیار بنا لیا۔ کوئی کچھ بھی کہتا، وہ ردعمل ظاہر نہ کرتی اور بے نیاز بنی رہتی۔ اس کے اس رویّے پر کچھ چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیاں بھی ہوئیں لیکن اس نے پروا نہیں کی اور آہستہ آہستہ چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ کم ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر لی۔ اگرچہ اسے ڈاکٹر بننے کا خاص شوق نہیں تھا لیکن اس کی فطرت تھی کہ جب کسی کام میں ہاتھ ڈالتی تو پھر مستقل مزاجی سے اس کام میں جت جاتی۔ چنانچہ میڈیکل کی پڑھائی کو بھی سنجیدگی سے لے رہی تھی۔ دوسری طرف جبران بھی بھرپور محنت کر رہا تھا۔ دونوں کی مصروفیت نے ملاقات کے مواقع کم کر دیے تھے اور کبھی کبھار ہی آمنا سامنا ہوتا تھا لیکن دونوں کے دل ایک ہی لے پر دھڑکتے تھے۔ دونوں اس مناسب وقت کے منتظر تھے جب ان کی راہ کی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی اور وہ پوری قوت سے بڑوں کی عدالت میں اپنی محبت کا مقدمہ لڑ سکیں گے۔ سدرہ کے لیے فی الحال یہ اطمینان کافی تھا کہ ابھی دور دور تک اس کی شادی کا امکان نہیں۔ اس کے حساب سے ایم بی بی ایس مکمل ہونے تک راوی اس کے لیے چین ہی چین لکھتا تھا۔ لیکن پہلا سال مکمل ہوتے ہی اس کا یہ چین رخصت ہو گیا۔ وہ جو خوش تھی کہ فائنل مکمل ہونے کے بعد منیب ہاؤس جاب پر چلا گیا ہے اور وہ روز روز کالج میں اس کی شکل دیکھنے کی کوفت سے بھی بچ چکی ہے، نئے پیدا ہونے والے مسئلے پر بری طرح سٹپٹا کر رہ گئی۔

☆☆☆

”میں نے بتا دیا ہے جبران! میں جان دے دوں گی لیکن وہ نہیں ہونے دوں گی جو یہ لوگ چاہتے ہیں۔“ آج ایک بار پھر وہی منظر تھا اور وہ دھواں دھار روتی ہوئی جبران کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کر رہی تھی۔ خود جبران کا چہرہ اترا ہوا تھا اور صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ صدمے اور پریشانی سے دوچار ہے پھر بھی اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور نرمی سے بولا۔

”پلیز سدرہ! تم رونا تو بند کرو۔ تب ہی میں سوچ سکتا ہوں کہ اس مسئلے کے حل کے لیے کیا کرنا چاہیے۔“

”اس بار مجھے یہ مشورہ مت دینا کہ جو ہو رہا ہے وہ ہونے دو، بعد میں کوئی حل نکال لیں گے۔ میں پہلے ہی تمہارے مشورے پر منگنی کروا کر پھنس چکی ہوں۔“ سدرہ کا انداز جارحانہ تھا۔ عمر میں جبران سے چھوٹی ہونے کے باوجود وہ بچپن سے اسے تم کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور اکثر معاملات میں اس پر حاوی رہتی تھی۔ جبران اس کا یہ جارحانہ انداز بڑی آسانی سے برداشت کر لیتا تھا۔ اس بار بھی بغیر ماتھے پر شکن لائے دھیرے سے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ ذرا مجروح سی تھی لیکن اس نے اپنے لہجے کی نرمی برقرار رکھی اور بولا۔

”میں احمق نہیں ہوں جو تمہیں ایسا مشورہ دوں۔ منگنی کی بات الگ تھی کہ میرے حساب سے اس کی کوئی قانونی اور شرعی حیثیت نہیں ہوتی لیکن نکاح بہت بڑی بات ہے۔ تمہارا نکاح ہو گیا تو ہمارے پاس کچھ بھی کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔“

”یہی تو وہ لوگ چاہتے ہیں۔ منیب کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ میں اس رشتے پر خوش نہیں ہوں اسی لیے مجھے پابند کرنے کے لیے یہ ترکیب لڑائی ہے۔“ وہ جذباتی تھی لیکن اتنی کم عقل نہیں کہ ماموں کی فیملی کی طرف سے اچانک نکاح کا مطالبہ سامنے آنے کی وجہ نہ سمجھ پاتی۔ ماموں ممانی نے کہا تو یہی تھا کہ منیب مزید تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے کا خواہش مند ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی روانگی سے قبل دونوں کا نکاح کر دیا جائے۔ اس طرح ایک تو منیب کو زیادہ ذمے داری سے اپنے پابند ہونے کا احساس رہے گا، دوسرے سدرہ کے لیے بھی آسانی رہے گی کہ منیب اس کے کاغذات تیار کروا لے گا اور وہ بھی آسانی سے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جا سکے گی۔ سب کے نزدیک یہ ایک منطقی بات تھی لیکن سدرہ کے خیال میں منیب نے چالاکی سے کام لے کر ایسا بندوبست کرنے کی کوشش کی تھی کہ کسی طرح وہ اس کی دسترس سے نہ نکلنے پائے۔ وجہ جو بھی تھی، ان لوگوں کی طرف سے نکاح کا مطالبہ ایک سنجیدہ مسئلہ تھا اور سدرہ نے تعلیم کے بہانے مہلت حاصل کرنے کی جو ترکیب لڑائی تھی، وہ ضائع ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

”میں ایک بار پھر امی سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس بار وہ کچھ کر سکیں۔“ جبران کے پاس فی الحال یہی حل تھا۔

”صرف بات نہیں کرنی۔ آنٹی کو رشتہ لے کر ہمارے گھر آنے پر مجبور کرنا ہے۔ وہ رشتہ لے کر آئیں گی تب ہی میں بھی کوئی اسٹینڈ لے سکوں گی۔“ اس نے جبران پر زور دیا۔ جبران جوز و شور سے اس کی تائید میں سر ہلا رہا تھا، دروازے پر موجود سائرہ کو دیکھ کر چونک گیا۔

”امی......“ اس کے لبوں سے سرسراہٹ کی طرح نکلنے والے لفظ نے سدرہ کو بھی متوجہ کیا۔ اس نے پلٹ کر سائرہ کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے کے تاثرات سے

ہی سمجھ گئی کہ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی ہیں۔

''آئیں امی! اندر آئیں۔'' جبران نے کچھ کچھ گھبراہٹ کے عالم میں انہیں پکارا تو وہ کھوئی کھوئی سی اندر آگئیں اور ان دونوں کے ساتھ ہی آبیٹھیں۔

''آپ کو شاید علم ہو گیا ہو امی کہ منیب کے گھر والے منیب اور سدرہ کے نکاح پر زور دے رہے ہیں اور ان کے اس مطالبے کی وجہ سے ہم دونوں بہت پریشان ہیں۔'' آر یا پار کے مصداق جبران نے فوری طور پر ماں سے اس موضوع پر گفتگو کا فیصلہ کرتے ہوئے بات چھیڑ دی۔ سائرہ نے فقط اثبات میں سر ہلا کر اپنے باعلم ہونے کا اظہار کیا۔

''آپ ہم دونوں کے جذبات سے واقف ہیں امی! کیا آپ اس نازک صورتِ حال میں ہماری کوئی مدد نہیں کریں گی؟''

''کیسی مدد؟'' سائرہ جیسے تنویمی کیفیت میں تھیں اور ان کی آواز بہت دور سے آرہی تھی۔

''آپ فہیم انکل کے پاس میرا رشتہ لے کر جائیں اور انہیں بتائیں کہ بے شک منیب کی پوزیشن مجھ سے مضبوط ہے لیکن سدرہ اس کے ساتھ اتنی خوش نہیں رہ سکتی جتنا میں اسے خوش رکھوں گا۔'' وہ جذباتی سے لہجے میں انہیں سبق پڑھانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

''اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بیٹا! فہیم کچھ نہیں کر سکیں گے۔'' سائرہ نے جواب دیا۔

''کیوں نہیں کر سکیں گے۔ وہ سدرہ کے والد اور گھر کے سربراہ ہیں۔ آپ اگر انہیں کونوینس کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'' جبران نے ان سے اصرار کیا۔

''کسی شخص میں جس کام کی صلاحیت ہی نہ ہو تو اس سے مطالبہ کرنے کا کیا فائدہ؟ میں تم سے بڑھ کر فہیم کو جانتی ہوں۔ وہ خیالی دنیا میں رہنے والے ایک بے عمل اور بزدل انسان ہیں، ان میں لڑنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔'' ان کا لہجہ اداس تھا۔

''ہر وقت ایک جیسا نہیں ہوتا آنٹی! ضروری نہیں کہ اگر ابو ماضی میں آپ کا اور اپنا رشتہ نہیں بچا سکے تھے تو اب بھی کچھ نہ کر سکیں۔ تب اور اب میں بہت فرق ہے۔ اس وقت ان کی ماں ان کے مقابل تھیں اور وہ ان کے احترام میں ان کے سامنے نہیں کھڑے ہو سکے تھے۔'' ماضی میں بچوں سمیت سب ہی کے علم میں تھا اس لیے منہ پھٹ سدرہ فوراً ہی باپ کے دفاع کے لیے میدان میں کود پڑی۔

''وقت اب بھی وہی ہے۔ کل ان کے مقابل ان کی ماں تھیں اور آج ان کے بچوں کی ماں ہے۔ وہ کل بھی ڈرتے تھے اور آج بھی ڈر جائیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ مقابلہ کرنے کی صورت میں نسیمہ ہرگز بھی انہیں نہیں بخشیں گی۔ ماضی کے بخیے ادھیڑے جائیں گے، جوان بچوں کے سامنے الزامات کی بوچھاڑ ہوگی، زبان سے پھرنے کے طعنے دیے جائیں گے۔ سارے خاندان کے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے گا اور اتنا کچھ فہیم فیس نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ذات کے گنبد میں بند رہ کر خود کو محفوظ رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان میں طوفانوں سے لڑنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔'' سائرہ نے فہیم کی ذات کا پورا نقشہ کھینچ کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

''پھر بھی امی! ایک بار کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ کم از کم ہمیں یہ پچھتاوا تو نہیں ہوگا کہ ہم نے کوشش ہی نہیں کی۔ کوشش کرتے تو من کی مراد پا بھی سکتے تھے۔'' مضطرب سے جبران نے ایک بار پھر انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''برسوں پہلے میرے ابا کو اپنی کوششوں کے نتیجے میں ناکامی ملی تھی اور میں ساری زندگی اس بات پر پچھتاتی رہی کہ کاش ابا کوشش نہ کرتے تو کم از کم میری انا کا پندار تو سلامت رہتا۔''

''تو کیا آپ اپنے بیٹے کو اپنی انا کی بھینٹ چڑھا دیں گی؟'' ان کے جواب پر جبران نے وہ سوال کیا جس نے انہیں تڑپا کر رکھ دیا۔

''یہ انا نہیں، عزتِ نفس کا معاملہ ہے بیٹے۔ تم کیوں چاہتے ہو کہ میں ایک در سے بار بار انکار کی ذلت اٹھاؤں۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''یہاں سب کو اپنی انا اور عزتِ نفس کی پڑی ہے۔ کوئی بھی میرے اور جبران کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ میں آپ کو خاصی مختلف خاتون سمجھتی تھی سائرہ آنٹی! لیکن آج ایسا لگ رہا ہے کہ آپ بھی میری امی کا ہی ایک پرتو ہیں اور آپ کو بھی اولاد کی خوشی سے زیادہ اپنی انا پیاری ہے۔'' وہ یوں بھی منہ پھٹ تھی اور اس وقت تو اپنی زندگی پر بنی ہوئی تھی اس لیے جذبات میں سائرہ کو بھی نہیں بخشا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو سدرہ! مجھے اپنی اولاد کی خوشی سے بڑھ کر کچھ عزیز نہیں لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزما کر کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اگر

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔
کراچی 03002680248
لاہور 03004009578
ملتان 03006301461
حیدرآباد 03213060477
سرگودھا 03447475344
پشاور 03005930230
کوئٹہ 03337805247
فیصل آباد 03006698022
راولپنڈی 03335205014
نواب شاہ 03003223414
سکھر 03009313528
رحیم یارخان 03009672096
بہاولپور 0622730455
گوجرانوالہ 03316667828
جہلم 03235777931
سیالکوٹ 03008711949
جھنگ 0477626420
بھکر 03337979701
گجرات 03016215229
وزیرآباد 03456892591
لالہ موسیٰ 03216203640
خان پور 03337472654
کوہاٹ 03325465062
ساہیوال 03446804050
پاک پتن 0300694678
مظفرآباد 03469616224
بورِوالہ 03347193958
وہاڑی 03136844650
تونسہ شریف 03346712400
ڈیرہ غازی خان 03336481953
بہاولنگر 03336320766
بنوں شہر 03329776400
رائے ونڈ 03004719056
ہڑپہ 03317400678
ڈیرہ اسماعیل خان 03349738040
چشتیاں 03348761952
منڈی بہاؤالدین 03460827027
سیالکوٹ 0524568440
میرپور AK 03460397119
اٹک سٹی 057210003
دیپالپور 03004059957
لیہ 03002373988
قصبہ ڈنگہ 03083360600
عارف والا 03008758799
لورالائی 03023844266
کوٹلہ ارب علی خان 03016299433
جلالپور پیروالا 03338303131
ہری پور 03321905703
چکوال 03348761952
واہ 03346383400
حافظ آباد 03006885976
کوہاٹ 03325465062
ایبٹ آباد 0992335847
پتوکی 03454678832
منڈی بہاؤالدین 0331-7619788
منچن آباد 0301-7681279
مانسہرہ 0333-5021421
ڈسکہ 0300-9463975
سمبڑیال 0333-8604306
کوٹ رادھا کشن 03004992290
حجرہ شاہ مقیم 03006969881
ٹوبہ ٹیک سنگھ 0315-6565459
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو خود ایک بار یہ کوشش کر کے دیکھ لو۔ چاہو تو اپنی خواہش کو میری جانب سے اپنے باپ کے روبرو بیان کر دینا اور پھر وہ جو جواب دیں، مجھے آکر بتانا۔ خدا کی قسم اگر ان کی جانب سے معمولی سی بھی امید دلائی گئی تو میں تمہارے گھر کی چوکھٹ پکڑ لوں گی اور تمہیں اپنے جبران کی دلہن بنا کر ہی دم لوں گی۔ لیکن ایک امید، ایک چھوٹی سی امید ہونی چاہیے میرے دامن میں۔''

سائرہ نے نہایت خوبصورتی سے گیند سدرہ کے کورٹ میں پھینک دی۔ وہ ایک لمحے کے لیے تو دم بخود رہ گئی لیکن پھر فیصلے پر پہنچتی ہوئی اپنے فطری بے باک انداز میں بولی۔

''مجھے منظور ہے۔ اپنی محبت پانے کے لیے میں کسی بھی حد سے گزر سکتی ہوں۔'' اس اعلان کے بعد وہ ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہرے بغیر اپنے گھر واپس آ گئی۔

☆☆☆

''چائے لے لیں ابو! میں نے خود آپ کے لیے بنائی ہے۔'' فہیم سے بات کرنے کی فکر میں مبتلا سدرہ کو بالآخر ایک موقع مل ہی گیا۔ نسیمہ نے نکاح کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور اسی سلسلے میں طوبیٰ اور رمشا کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ہمت کر کے اسٹڈی میں جا پہنچی۔

''تھینک یو بیٹا! لیکن مجھے چائے کی بالکل بھی طلب نہیں ہے۔ تمہاری امی جانتی ہیں کہ میں رات کے کھانے سے پہلے قطعی چائے نہیں پیتا۔ معدے میں تیزابیت ہو جاتی ہے۔'' فہیم نے سہولت سے اسے انکار کیا اور ایک بار پھر کاغذوں کے اس پلندے کی طرف متوجہ ہو گئے جس کے ساتھ وہ جانے کب سے بیٹھے سر کھپا رہے تھے۔

''مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے ابو......'' سدرہ نے ہمت کر کے انہیں دوبارہ متوجہ کیا۔

''کیا بات کرنی ہے بھئی! ذرا جلدی سے کر لو تو میں یکسوئی سے اپنا کام مکمل کر سکوں۔'' وہ خاصی عجلت کا شکار دکھائی دے رہے تھے۔ سدرہ کے لیے بات جاری رکھنا مشکل ہونے لگا۔ فہیم کوئی سخت گیر باپ نہیں تھے جن کے سامنے بچیاں اونچی آواز میں بات بھی نہ کر سکیں لیکن حقیقت یہ بھی کہ ساری دنیا کے ساتھ ساتھ ان کا رویہ اپنی بچیوں سے بھی لیا دیا سا ہی رہتا تھا۔ سلام دعا، ضروری ڈاکیومنٹس پر دستخط اور ضروریات کے لیے رقم کی فراہمی سے زیادہ انہوں نے بچیوں کے کسی معاملے میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ بچیوں کے سارے معاملات نسیمہ خود ہی دیکھتی تھیں اور ان کے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ نسیمہ کو بچیوں کی طرف سے کوئی قابلِ ذکر شکایت نہیں ہے۔ ایسے میں سدرہ کو ایک نازک موضوع پر ان سے گفتگو کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

''پڑھائی میں کوئی مشکل پیش آ رہی ہے تو اپنی امی سے کہہ کر اپنے لیے ٹیوشن لگوا لو۔'' سدرہ خاموش رہی تو انہوں نے خود ہی ایک اندازہ لگا کر حل بھی پیش کر دیا اور تیزی سے کاغذ پر قلم کی مدد سے کچھ لکھنے لگے۔

''ابو...... کیا آپ کو معلوم ہے کہ امی نے میرے نکاح کا فیصلہ کر لیا ہے اور آج کل وہ اس سلسلے میں تیاریوں میں مصروف ہیں؟'' اس نے ایک نظر ابو کی موتیوں سی لکھائی پر ڈالی اور اپنے تئیں بات بڑھانے کے لیے ایک سرا ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

''ذکر تو کیا تھا تمہاری امی نے...... میں نے انہیں تیاری کے سلسلے میں رقم بھی فراہم کر دی تھی۔ اگر تم اس سلسلے میں خود کچھ خاص خریدنا چاہتی ہو تو اپنی امی سے کہہ دینا۔ مزید رقم کی ضرورت پڑی تو میں انہیں فراہم کر دوں گا۔''

اس نے سنا تھا باپ بیٹی کو بیاہنے کے خیال سے بڑے جذباتی ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باپ کو تو سر اٹھا کر اس موضوع پر گفتگو کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی اور وہ اس سے زیادہ اپنے کاغذات کی طرف متوجہ تھے۔

''کیا آپ کو معلوم ہے ابو کہ میرے نکاح کی کیا ڈیٹ فکس کی گئی ہے؟'' ان کی اس بے نیازی پر سدرہ کو غصہ آ گیا اور اس نے دانت چبا چبا کر ان سے پوچھا۔

''تم فکر نہ کرو بھئی۔ مجھے یاد ہو نہ ہو، تمہاری امی میری شرکت کو یقینی بنا دیں گی۔ یاد رکھنے اور یاد دلانے میں وہ کمال کی مہارت رکھتی ہیں۔'' ان کے لہجے میں استہزا تھا، خودترسی یا ازلی بے نیازی...... سدرہ اندازہ نہیں لگا سکی اور یوں ہی چپ چاپ انہیں گھورنے لگی۔

''میں کل صبح لاہور جا رہا ہوں۔ وہاں ایک پبلشر سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ میرا شعری مجموعہ شائع کرنے میں بے حد دلچسپی رکھتا ہے۔ مجھے خود سے تو کبھی اس کام کا خیال نہیں آیا تھا لیکن اب ایک اچھی پیشکش ملی ہے تو اس معاملے میں خاصا ایکسائٹڈ ہو رہا ہوں۔ کافی ساری غزلیں اور نظمیں جمع ہیں میرے پاس۔ مجموعے کے لیے ان میں سے خاص خاص کو سلیکٹ بھی کر لیا ہے اور اب ان پر ایک آخری نظر ڈال رہا ہوں تاکہ کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے۔ آج رات میں ہی اس کام کو نمٹانا ہے تاکہ صبح سکون سے روانہ ہو سکوں۔

پبلشر صاحب نے وہاں کافی سارے لوگوں سے ملاقات کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ ایک آدھ ہفتہ تو لگ ہی جائے گا مجھے وہاں سے فارغ ہو کر واپس آنے میں۔ بہر حال فکر مت کرو۔ تمہارے نکاح سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔"

اس نے اپنے باپ کے منہ سے ایک ساتھ اتنی ساری باتیں پہلی بار سنی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید خوشی سے پھولے نہیں سماتی لیکن اس وقت تو ان کی بے حسی نما بے نیازی پر دل ہی بھر آیا۔ وہ کیسے باپ تھے جو اس کے چہرے سے اس کے دل کا حال نہیں پڑھ پا رہے تھے اور ان کی ساری توجہ کاغذ کے بے جان ٹکڑوں پر لکھے ان لفظوں پر مبذول تھی جنہوں نے ان سے وابستہ کسی شخص کو کچھ نہیں دیا تھا۔ کم از کم ایسا کچھ نہیں دیا تھا جو باعث خوشی ہوتا۔ وہ بے حد مایوس سی ان کی اسٹڈی سے باہر نکل گئی۔ اپنا مقدمہ پیش کرنے سے قبل ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سائرہ آنٹی کی ان کے بارے میں رائے بالکل درست تھی۔ وہ ایسے انسان نہیں تھے جن سے کوئی امید وابستہ کی جا سکتی۔ اسے اپنے مسئلے کے حل کے لیے کوئی اور راہ نکالنی تھی۔

☆☆☆

"اب بولو! ایسی کیا بات ہے جو تم گھر پر نہیں کر سکتی تھیں اور جس کے لیے تم نے مجھے یوں باہر ملنے پر مجبور کیا ہے؟" اوسط درجے کے ایک ریستوران میں سدرہ کے مقابل بیٹھا ہوا جبران قدرے تشویش کے ساتھ اس سے دریافت کر رہا تھا۔ اس سے قبل انہیں کبھی کہیں باہر ملنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ انہیں آپس میں جو کچھ کہنا سننا ہوتا تھا، گھر پر ہی ایک دوسرے سے کہہ لیتے تھے لیکن آج سدرہ نے بصد اصرار اس سے باہر ملنے کی فرمائش کی تھی اور دونوں اپنے اپنے تعلیمی اداروں سے طے شدہ وقت پر اس ریستوران میں پہنچ گئے تھے جہاں جبران اس کے مقابل بیٹھا ہوا ابھی الجھن کا شکار تھا۔

"مجھے تم سے بہت اہم گفتگو کرنی تھی اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اس گفتگو کا کوئی حصہ سائرہ آنٹی یا کسی اور فرد کے کانوں میں پڑے اس لیے میں نے تم سے یہاں ملنے کی فرمائش کی تھی۔" وہ آج معمول سے بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور جبران کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ اس سے کوئی بہت ہی غیر معمولی بات کرنے والی ہے اس لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"میں نے اپنے مسئلے کے بارے میں بہت سوچا ہے اور سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ میری زندگی ہے اور میں اپنی زندگی سے کسی کو بھی کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ کسی کی بھی انا کے کھیل کی ہار جیت کا فیصلہ میرے ارمانوں کی لاش پر نہیں ہو سکتا۔ سب کی اپنی اپنی زندگی ہے اور میں بھی اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کا حق رکھتی ہوں۔"

"تم اتنے منفی انداز میں کیوں سوچ رہی ہو؟" جبران نے اسے ٹوکا۔

"جہاں کسی کو ہماری اور ہماری خوشیوں کی فکر نہ ہو، وہاں اسی انداز میں سوچنا پڑتا ہے۔ تم ان لوگوں کے رویے دیکھو۔ سائرہ آنٹی اس لیے رشتہ لے کر نہیں آنا چاہتیں کہ کہیں ماضی کی طرح اب بھی انہیں امی کے مقابلے میں شکست سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ ابو کو اپنی مصروفیات میں ہوش ہی نہیں ہے کہ اس بات پر غور کر سکیں کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ ان کے لیے میری بات سننے اور سمجھنے سے زیادہ یہ اہم ہے کہ وہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کروا سکیں اور امی...... امی سب کچھ جانتے بوجھتے انجان بنی ہوئی ہیں۔ ان کا سارا وقت تقریب کی تیاری میں گزر رہا ہے۔ صرف نکاح کی تقریب کے لیے وہ پانی کی طرح پیسا بہا رہی ہیں۔ منیب سمیت اس کے سارے گھر والوں کے لیے انہوں نے بے حد قیمتی تحفے لیے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں خالاؤں اور ان کے بچوں کو بھی نیگ کے نام پر جانے کیا کچھ دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ یہی امی تھیں جو اقبال انکل کی بیماری کے دنوں میں نہایت کفایت شعار اور کنجوس خاتون بنی ہوئی تھیں اور میرے اصرار پر بھی انہوں نے تم لوگوں کی ذرا سی بھی مالی معاونت نہیں کی تھی کہ گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس وقت امی تھوڑا سا دل بڑا کر لیتیں تو تمہارا فیوچر خراب نہیں ہوتا اور آج تم بھی کسی پروفیشنل کالج میں پڑھ رہے ہوتے۔" اس کا اتنا بولنا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بے حد منتشر ہے۔

"خوامخواہ گڑے مُردے کیوں اکھاڑ رہی ہو سدرہ! اگر نسیمہ آنٹی اس وقت مدد کی پیشکش کرتیں بھی تو ہماری طرف سے قبول نہیں کی جاتی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری امی بہت خوددار خاتون ہیں۔" جبران نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"خودداری نہیں، یہ ان لوگوں کی انا پرستی ہے جس کی بھینٹ ہماری زندگیاں چڑھائی جا رہی ہیں۔ مجھے اپنے بڑوں کے رویے پر سخت غصہ آ رہا ہے اور میں نے طے کر لیا ہے کہ اب اس سلسلے کو رک جانا چاہیے۔" اس کا چہرہ غصے اور جذبات کی شدت سے سرخ پڑ چکا تھا۔

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟" جبران نے تشویش سے پوچھا۔

’’میں نے سوچ لیا ہے کہ ان لوگوں کو اپنے سلوک کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ جب انہیں ہمارے احساسات کی فکر نہیں تو ہم کیوں ان کی پروا کریں۔‘‘ وہ جارح مزاج تو پہلے سے ہی تھی، اب بغاوت پر اترتی نظر آرہی تھی۔ اس کا یہ انداز جبران کو خوف زدہ کر گیا اور رسان سے سمجھانے لگا۔

’’دیکھو سدرہ...... جذبات میں کوئی الٹی سیدھی بات مت سوچنا۔ بے شک ہم تکلیف میں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے والدین سے باغی ہوجائیں اور انہیں دکھ یا نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچنے لگیں۔‘‘

’’نصیحتوں کا وقت گزر چکا ہے جبران...... اب صرف وہ ہوگا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔ تمہیں صرف اور صرف یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرا ساتھ دوگے یا نہیں۔‘‘ اس کا لہجہ سنگلاخ چٹانوں جیسا سخت تھا۔

’’آخر کچھ پتا بھی تو چلے کہ تمہارے دماغ میں کیا ہے؟‘‘ جبران نے بے بسی سے پوچھا۔ وہ جب سے آئی تھی، اس کا انداز غیر معمولی تھا۔ جبران نے ریستوران میں بیٹھنے کا جواز پیدا کرنے کے لیے چائے کے ساتھ جو چند اسنیکس منگوائے تھے، اس نے ان کی طرف ایک نگاہِ غلط بھی نہیں ڈالی تھی اور یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنی ساری توجہ کسی ایک نکتے پر مرکوز رکھنا چاہتی ہے۔ جبران نے اس کے ذہن میں موجود بات جاننا چاہی تو وہ بہت نیچی آواز میں اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کرنے لگی۔ اس کا منصوبہ سن کر جبران کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آخر وہ بول پڑا۔

’’تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا سدرہ! ٹھیک ہے ہمارے بڑے ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ردعمل میں اتنی انتہا کو پہنچ جائیں۔ تمہارا کسی اور کا بن جانا بے شک میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے لیکن اپنی تکلیف دور کرنے کے لیے اپنے قریبی رشتوں سے ایسی بدسلوکی میرے بس کی بات نہیں۔ خصوصاً میں اپنے ماں باپ کے خوابوں کی قبر پر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ وہ میرے روشن مستقبل کی آس میں اپنے مشکل دور بڑے صبر سے گزار رہے ہیں۔ میں کیسے ان کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کرسکتا ہوں۔‘‘ وہ بولنے کے ساتھ ساتھ مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

’’تو پھر میرے ساتھ محبت کا دھوکا کیوں کیا تھا؟‘‘ سدرہ نے اسے طعنہ دیا۔

’’دھوکا...... کیسا دھوکا؟ میں آج بھی تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں اور تم اس بات سے اچھی طرح واقف ہو پھر تم مجھے اس قسم کا طعنہ کیسے دے سکتی ہو؟‘‘ جبران شدید صدمے سے دوچار ہوا۔

’’ساتھ نہ نبھانا بھی دھوکا ہی ہوتا ہے۔ جو محبت کرتے ہیں، وہ ہر حال میں ساتھ نبھاتے ہیں۔‘‘ اس کے دکھ کو محسوس کرنے کے باوجود سدرہ نے طعنے بازی جاری رکھی۔

’’تمہارا دماغ چل گیا ہے سدرہ! تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ اپنے جذباتی پن میں تم مجھ سے کس بات کا مطالبہ کر رہی ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ تم گھر جاؤ اور ٹھنڈے دل و دماغ سے اس بارے میں سوچو پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم کتنے غلط انداز میں سوچ رہی ہو۔‘‘ جبران نے تحمل سے کام لیتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’میں نے جتنا اور جو سوچنا تھا، سوچ چکی ہوں۔ اب بس تمہیں یس اور نو کا فیصلہ کرنا ہے لیکن انکار کرنے سے پہلے اتنا سوچ لینا کہ اس صورت میں، میں یہاں سے اٹھ کر گھر نہیں جاؤں گی۔ کم از کم زندہ حالت میں نہیں جاؤں گی۔ تمہارے انکار کے بعد میری لاش ہی گھر پہنچ سکے گی۔‘‘ اس کے لہجے کی سنگینی نے جبران کو دہلا کر رکھ دیا۔

’’تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو سدرہ! اول فول بولے جا رہی ہو۔‘‘ اندر سے سہم جانے کے باوجود جبران نے اسے رعب میں لینے کی کوشش کی۔

’’میں پاگل ہی ہوگئی ہوں اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں جو کہتی ہوں وہ کر کے بھی دکھاتی ہوں اس لیے مجھے سمجھانے بجھانے کے بجائے تم اپنا فیصلہ سناؤ۔‘‘ وہ جیسے لڑکی نہیں سنگلاخ چٹان تھی جس سے سر پھوڑ کر آدمی اپنا سر زخمی کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ جبران کے سمجھانے کی ہر کوشش کو اس نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا۔

’’تم صرف یہ فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنے ماں باپ کے خواب زیادہ عزیز ہیں یا میری زندگی؟‘‘

اور جبران کو ہار ماننا پڑی تھی کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا سدرہ محض دھمکی نہیں دے رہی۔ وہ سچ مچ اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔ وہ بچپن سے بہت ضدی تھی اور وہ ہمیشہ اس کی ضد سے ہارتا آیا تھا۔

☆☆☆

’’آج تو بری طرح تھک گئی۔ طوبیٰ...... رمشا...... بیٹا، ذرا یہ سارا سامان اٹھا کر اندر الماری میں تو رکھ دو۔‘‘ نسیمہ حسبِ معمول خریداری کر کے تھکی ہاری گھر لوٹی تھیں اور اب لاؤنج میں ہی بیٹھی دونوں چھوٹی بیٹیوں کو پکار رہی

تھیں۔ ردعمل میں انہیں ان دونوں کے بجائے سدرہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آتی دکھائی دی۔

''یہ طوبیٰ اور رمشا کہاں ہیں؟ کب سے آوازیں دے رہی ہوں لیکن اتنی زحمت نہیں نواب زادیوں کو کہ نیچے آکر تھکی ہاری ماں کو ذرا ایک گلاس پانی ہی پلا دیں۔ باپ کی طرح اولاد بھی بے حس ہے۔ وہ عین بیٹی کے نکاح کے قریب لاہور جا کر بیٹھ گئے ہیں اور کوئی پروا نہیں ہے کہ یہاں میں اکیلی کیسے سارے معاملات نمٹا رہی ہوں۔''
نسیمہ کو حسبِ عادت غصہ آنے لگا۔ فہیم کے رویے کبھی کبھی انہیں بہت زیادہ شاکی کر دیتے تھے اور وہ طیش میں آکر بچیوں کے سامنے بھی اول فول بول جاتی تھیں۔

''یہ طوبیٰ اور رمشا کی اکیڈمی کا ٹائم ہے امی! آپ مجھے بتائیں کیا کام ہے، میں کر دیتی ہوں۔'' ان کے رویے کو نظر انداز کر کے سدرہ نے نرم لہجے میں پیشکش کی تو وہ اپنا غصہ بھول کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئیں اور دھیرے سے ہنستے ہوئے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

''کاموں کی زیادتی نے میری تو مت ماردی ہے۔ یاد ہی نہیں رہا کہ اس وقت وہ دونوں گھر پر نہیں ہوتیں۔''

''آپ نے بھی تو خود پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال لیا ہے۔ جب دیکھو کسی نہ کسی چکر میں الجھی ہوئی ہوتی ہیں۔'' سدرہ نے لاؤنج میں ہی ایک طرف رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکال کر انہیں گلاس میں پانی ڈال کر دیتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیں اور بولیں۔

''پہلی پہلی بیٹی کی خوشی ہے۔ میرا تو بس نہیں چل رہا کہ کیا کچھ کر ڈالوں۔''

''پھر بھی امی، آپ کو اتنی فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے۔ ٹھیک ہے کہ ہم خوشحال ہیں لیکن پیسے کو اس طرح لٹانا بھی اچھی بات نہیں ہے۔ آگے آپ کو طوبیٰ اور رمشا کی پڑھائی اور شادیوں پر بھی خرچ کرنا ہوگا۔ آپ اس حوالے سے سوچ سمجھ کر خرچ کریں۔'' میز پر رکھے ہوئے ڈھیروں شاپنگ بیگز کو دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں ٹوک گئی۔

''تم فکر مت کرو بیٹا! ان کا وقت آنے پر ان کے لیے بھی سب ہو جائے گا۔ مجھے تم سے زیادہ ان کی فکر ہے اور میں ان کے مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی یہ سب کر رہی ہوں۔ بڑی بیٹی کی شادی اچھی طرح کرو تو چھوٹی بیٹیوں کے لیے بھی اچھے گھرانوں سے رشتے آتے ہیں۔''

انہوں نے اپنے دلائل سے اس کے اعتراضات رد کر دیے۔ وہ قائل نہیں ہوئی لیکن مزید بحث بھی نہیں کی اور بات کو ختم کرنے والے انداز میں بولی۔

''اچھا یہ بتائیں کہ یہ سب کہاں رکھنا ہے۔ میں رکھ کر آجاتی ہوں۔''

''میرے بیڈ روم کی الماری میں رکھ دو۔ اس کا بیچ والا حصہ میں نے ان ہی چیزوں کے لیے خالی کر رکھا ہے تاکہ سب کچھ ایک ہی جگہ موجود رہے اور ضرورت پڑنے پر اِدھر اُدھر تلاش نہ کرنا پڑے۔'' انہوں نے اسے مفصل جواب دیا تو وہ خاموشی سے سارے شاپنگ بیگز سمیٹ کر ان کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ تینوں بہنوں کے علم میں تھا کہ الماری کی چابیاں کہاں رکھی رہتی ہیں۔ مخصوص جگہ سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس نے کنگ سائز الماری کا بیچ والا پٹ کھولا اور اس میں شاپنگ بیگز رکھنے لگی۔ الماری کا یہ حصہ اچھا خاصا بھر چکا تھا اور اسے ان شاپنگ بیگز کو رکھنے کے لیے جگہ بنانی پڑی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اگر یہ سب اس کے اور منیب کے نکاح کے سلسلے میں نہیں کیا جا رہا ہوتا تو تب بھی اسے اتنا ہی برا لگتا جتنا کہ اب لگ رہا تھا یا نہیں۔ فی الحال تو وہ اپنے دل میں ایک کڑھن سی محسوس کر رہی تھی۔

سامان رکھ کر الماری بند کرنے سے قبل اس کی نظر الماری کے اسی حصے میں موجود لاکر پر پڑی۔ اسے معلوم تھا کہ امی زیورات اور رقم اسی لاکر میں رکھتی ہیں اور لاکر کی چابی اوپر والے خانے میں گول مول ہو کر پڑے ایک پرانے سے دوپٹے کے پلو سے بندھی رہتی ہے۔ اس نے لاکر اور مذکورہ دوپٹے پر ایک ترچھی نظر ڈالی اور الماری بند کر کے لاؤنج میں امی کے پاس واپس آگئی۔

''رات کے کھانے کے لیے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔ ایسا کرو فریزر میں سے چپلی کبابوں کا پیکٹ نکال کر رکھ دو۔ طوبیٰ اور رمشا اکیڈمی سے واپس آتی ہیں تو ان سے کہتی ہوں کہ کباب فرائی کر کے ان کے ساتھ سلاد اور چٹنی بنا لیں۔ چپاتیاں میں بازار سے منگوا لوں گی۔ تمہارے ابو تو گھر پر ہیں نہیں اس لیے اسی میں آرام سے گزارہ ہو جائے گا۔'' سوچتے سوچتے انہوں نے خود ہی حل بھی نکال لیا۔

''رہنے دیں امی! میں نے نیٹ پر چکن بریانی کی ایک ریسیپی دیکھی تھی۔ اسے ٹرائی کر کے دیکھ لیتی ہوں۔'' اس نے پیشکش کی تو نسیمہ کو حیرت ہوئی۔

''خیریت! آج تمہیں اپنی پڑھائی نہیں کرنی کیا؟'' نہ نہ کرتے بھی ان کی زبان سے حیرت کا اظہار ہو ہی گیا۔ جو لڑکی اپنی زندگی کے اتنے اہم موقع پر خریداری میں حصہ نہیں لے رہی تھی، اس سے وہ اتنی مہربانی کی امید کیسے

رکھتیں کہ وہ خود کھانا بنانے کی پیشکش کر رہی تھی۔

''ایک دن کی چھٹی سہی۔'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ تینوں بہنوں میں وہ ہی سب سے کم کچن میں قدم رکھتی تھی لیکن قدرتی طور پر اس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ اب بھی وہ کھانا پکانے کھڑی ہوئی تو سارے گھر میں خوشبوئیں گردش کرنے لگیں۔

''واؤ! بڑی زبردست خوشبو آرہی ہے۔ کیا بن رہا ہے؟'' طوبیٰ اور رمشا اکیڈمی سے واپس آئیں تو خوشبو سونگھ کر سیدھی کچن میں جا گھسیں۔ بچپن کی نسبت اب بہنوں میں لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا لیکن بہت زیادہ بے تکلفی بھی نہیں تھی۔ اصل میں والدین کے درمیان اچھی انڈراسٹینڈنگ نہ ہونے کا اثر گھر کے ماحول پر پڑا تھا اور افرادِ خانہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کے باوجود اپنے اپنے دائروں میں محدود رہتے تھے۔

''آپ کھانا بنا رہی ہیں۔ میں سمجھی امی ہیں۔'' رمشا، سدرہ کو کچن میں موجود پا کر ٹھٹکی۔

''امی شاپنگ سے تھکی ہوئی آئی تھیں تو میں نے کھانا بنانے کی آفر کر دی۔'' سدرہ نے سادگی سے اسے جواب دیا۔

''اگر ہیلپ کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔'' رمشا نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ سدرہ کے موڈ کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس بات کو پسند کرے گی اور کسے نہیں۔

''نہیں، میں کر لوں گی۔ تم لوگ جا کر ریسٹ کرو۔'' اس نے نرمی سے انکار کر دیا تو وہ دونوں اوپر کے پورشن میں چلی گئیں۔ تینوں بہنوں کے کمرے اوپری حصے میں تھے اور ان کا بیشتر وقت اپنے اپنے کمروں میں ہی گزرتا تھا۔

''السلام علیکم بھابی! جی بالکل ٹھیک ہوں۔ بس کچھ دیر پہلے ہی بازار سے واپس آئی ہوں اور اب ریسٹ کر رہی ہوں۔'' کچن میں کام کرتے ہوئے سدرہ نے فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی اور پھر اسے نسیمہ کے الفاظ سنائی دینے لگے۔ وہ ابھی تک لاؤنج میں ہی موجود تھیں اور ایک کاؤچ پر نیم دراز آرام کر رہی تھیں۔ ان کے چند جملوں نے ہی سدرہ کو بتا دیا کہ کال کرنے والی منیب کی والدہ یعنی اس کی اکلوتی ممانی صاحبہ ہیں۔

''تیاری مکمل ہونے کی کیا بات کروں۔ مجھے تو لگتا ہے نکاح والے دن بھی میں کچھ نہ کچھ خرید کر لا رہی ہوں گی۔'' نسیمہ کے لہجے میں ذرا ناز سا تھا۔

''کیا کروں بھابی! سدرہ بڑی بیٹی ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس کی جھولی میں زمانے بھر کی خوشیاں بھر دوں۔'' ان کے الفاظ نے پل بھر کو اس کے دل کی کیفیت عجیب سی کر دی۔

''اونہہ...... میرے دل کی سب سے بڑی خوشی چھین کر مجھے مادی چیزوں سے بہلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔'' اگلے ہی پل ذہن میں ابھرنے والی سوچ نے اسے ایک بار پھر پتھر بنا دیا اور ہاتھ تیزی سے کام نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔

''آج تو آپ کی ہونے والی بہو نے کچن کو رونق بخشی ہوئی ہے۔ زبردست خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں کچن سے اور لگتا ہے ہم لوگ بڑے مزے کی بریانی کھانے والے ہیں۔'' اب وہ ہونے والی سسرال میں بیٹی کے نمبر بڑھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ارے نہیں بھئی۔ میری بیٹی صرف کتابی کیڑا نہیں ہے۔ گھر کے کام کاج بھی بہت عمدگی سے کر لیتی ہے لیکن پڑھائی کے برڈن کی وجہ سے میں خود ہی اسے زیادہ ان کاموں میں الجھنے نہیں دیتی۔'' ممانی کبھی ملنے بھی آتی تھیں تو سدرہ پڑھائی کا بہانہ بنا کر زیادہ دیر ان کے سامنے نہیں ٹکتی تھی اسی لیے شاید انہوں نے اس کے کھانا بنانے کا سن کر کوئی تبصرہ کیا تھا جواب نسیمہ وضاحتیں دے رہی تھیں۔ سدرہ نے سر جھٹک کر ان کی باتوں کی طرف سے دھیان ہٹا لیا اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد وہ کچن سے برآمد ہوئی تو اس کے ہاتھ میں لسّی سے بھرا ہوا ایک گلاس تھا۔ وہ لاؤنج میں نسیمہ کے قریب بیٹھ کر لسّی پینے لگی۔

''کھانے کے وقت لسّی پینے بیٹھ گئی ہو۔ کھانا کیسے کھاؤ گی؟'' نسیمہ نے اسے ٹوکا۔

''گرمی بہت لگ رہی ہے امی اور بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی تو میں نے سوچا لسی پی کر دونوں مسئلے حل کر لیتی ہوں۔ بریانی بس دم پر ہے۔ آپ طوبیٰ اور رمشا کے ساتھ کھانا کھا لیجیے گا۔ میں اب کچھ دیر پڑھوں گی پھر بعد میں آرام سے کھانا کھاؤں گی۔''

اس نے ماں کو مطمئن کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ رائتے اور سلاد کے ساتھ پیش کی گئی گرما گرم بریانی نے سب کو لطف دیا اور تینوں ماں بیٹیاں ذرا زیادہ ہی شکم سیر ہو کر کھا گئیں۔ سدرہ ان کی تعریفیں وصول کرتی معنی خیزی سے مسکراتی رہی۔ کسی نے اس کی مسکراہٹ کے انداز پر غور نہیں کیا۔ کھانے کے بعد تینوں ماں بیٹیاں جلدی نیند آنے کی شکایت کرتی ہوئی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں تو سدرہ نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اب اسے طے شدہ وقت کا انتظار تھا۔ گھڑی کی سوئیاں رینگتی ہوئی

مقررہ وقت کے قریب پہنچیں تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ پہلے دونوں بہنوں کے کمرے میں جھانک کر ان کے سوئے ہوئے ہونے کا اطمینان کیا پھر گربہ چال چلتی ہوئی ماں کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہ بھی بے خبر سو رہی تھیں۔ ان کے کمرے میں اس نے بہنوں کے کمرے کے مقابلے میں ذرا زیادہ وقت گزارا، بالآخر باہر نکل گئی۔ نکلتے نکلتے ایک بار پھر پلٹ کر سوئی ہوئی ماں کو دیکھا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہوا اور ماں سے ناراض ہونے کے باوجود فطری محبت نے زور مارا۔ ضمیر نے دہائی دی کہ وہ جو کچھ اپنے پیاروں کے ساتھ کرنے جا رہی ہے، کیا وہ کسی طور مناسب ہے؟ لیکن پھر طبیعت کی سرکشی اور سوچ کا باغی پن اس پر غالب آگیا اور اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دروازہ کھولتے ہی منتظر کھڑے جبران پر نظر پڑی تو اس نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا اور دل سے سارے اندیشوں اور وسوسوں کو نکال ڈالا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد وہ گھر کا بیرونی دروازہ بند کر کے اوپر کے پورشن کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور آنکھیں بری طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ تین گھنٹے اس کے لیے بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوئے تھے اور ان تین گھنٹوں میں جو کچھ بیتا تھا، اسے سہنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ وہ بہت عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ اپنے کمرے میں بستر پر جا کر لیٹی تو بھی بہت دیر تک روتی رہی۔ روتے روتے ہی کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ یہ بڑی بے چین نیند تھی۔ بالکل ایسے جیسے وہ سولی پر لٹکی سوتی رہی ہو۔ اس کچی پکی نیند سے وہ کال بیل کی آواز پر جاگی۔ پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آیا پھر گھڑی پر نظر پڑی تو خیال آیا کہ اوپری کاموں کے لیے رکھی گئی ملازمہ افسانہ آئی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے علاوہ گھر کا کوئی اور فرد فی الوقت دروازہ کھولنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اس لیے خود بستر سے اٹھ کر نیچے کی طرف دوڑی۔ ملازمہ مسلسل گھنٹی بجائے جا رہی تھی۔

''کیا ہے افسانہ...... ذرا دیر صبر نہیں کر سکتیں۔ گھنٹی بجا بجا کر دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے ملازمہ کو ڈپٹا۔

''تسی اج کالج نئی (نہیں) گئے ہو باجی؟'' نوعمر ملازمہ نے اس کی ڈانٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دانت نکال کر پوچھا۔

''نہیں گئی ہوں، تب ہی تو تمہیں گھر پر نظر آ رہی ہوں۔'' سدرہ نے اسے گھورا۔

''وڈی باجی بھی دکھائی نئی (نہیں) دے رہیں۔'' ملازمہ اندر آنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ اس نے حسبِ عادت سدرہ کے گھورنے کی پروا نہیں کی تھی اور نسیمہ کی خلافِ معمول غیر موجودگی کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔

''امی اپنے روم میں سو رہی ہیں۔ رات کو سب لوگ بہت دیر سے سوئے تھے اس لیے ابھی کوئی نہیں اٹھا ہے۔ تم اپنا کام خاموشی سے نمٹا کر چلی جاؤ۔ میں بھی اپنے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔'' سدرہ نے اسے ہدایات جاری کیں۔ افسانہ اعتبار کی ملازمہ تھی اور اس کی سب سے اچھی عادت یہ تھی کہ اس نے کبھی کسی معمولی سے معمولی شے پر بھی ہاتھ صاف نہیں کیا تھا، اس لیے سب کو اعتبار تھا۔

''ہائے اللہ! کیا رات بھر باجی نے ڈھولکی رکھوائی تھی جو سب اتنی دیر سے سوئے۔ میں نے باجی سے کہا بھی تھا کہ مجھے بڑی اچھی ڈھولک بجانی آتی ہے۔ آپ جب بھی ڈھولکی رکھوائیں، مجھے ضرور بلائیے گا لیکن باجی پھر بھی مجھے بھول گئیں۔'' گھر کے مکینوں کے دیر سے سونے کی خبر سن کر افسانہ بیگم نے خود ہی افسانہ تراش لیا اور لگیں شکوے کرنے۔

''کوئی ڈھولکی وولکی نہیں رکھوائی گئی۔ تم خوامخواہ کا غم پالنے کے بجائے خاموشی سے اپنا کام نمٹا کر چلتی بنو۔'' سدرہ جو پہلے ہی اپ سیٹ تھی، اس کی بے وقت کی راگنی سن کر چڑ گئی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

''یہاں ماتم کرنے اور نوحے پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے اور یہ محترمہ چلی ہیں ڈھولکی رکھوانے۔''

''عجیب چڑچڑی سی کڑی ہیں سدرہ باجی! ان کی جگہ میرا نکاح ہونے والا ہوتا تو خوشی سے لڈیاں ڈال رہی ہوتی۔'' افسانہ نے بھی جواباً بڑبڑانے میں حرج نہیں سمجھا اور سب سے پہلے نسیمہ کی خواب گاہ کی طرف قدم بڑھائے۔ خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ برآمد ہوئی۔ سدرہ جو سیڑھیوں کے آخری قدمچے تک پہنچ چکی تھی، اس کی چیخ سن کر تیزی سے پلٹی۔ افسانہ پھٹی آنکھوں اور سفید پڑے چہرے کے ساتھ گرتی پڑتی نسیمہ کی خواب گاہ سے باہر آ رہی تھی۔

''کیا ہوا افسانہ؟ کیا بات ہے؟'' اس کی کیفیت پر سدرہ کے چہرے پر بھی سراسیمگی چھا گئی۔

''وہ...... وہ وڈی باجی......'' خوف کے باعث افسانہ کے منہ سے الفاظ بھی ڈھنگ سے برآمد نہیں ہو رہے

تھے اور وہ نسیمہ کے بیڈروم کے کھلے دروازے کی طرف ہاتھ اٹھائے انگلی سے اشارہ کیے جارہی تھی۔

سدرہ تیزی سے نسیمہ کی خواب گاہ کے کھلے دروازے تک گئی اور دروازے پر کھڑے ہوکر اندر نظر ڈالی۔ اندر کے منظر پر نظر پڑتے ہی خود اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس کے بعد وہ ایک تسلسل سے چیختی ہی چلی گئی۔

☆☆☆

کوئی حادثہ سا حادثہ تھا۔ جو سنتا، حیرت اور خوف سے اس کی آنکھیں پھیل جاتیں۔ افسانہ اور سدرہ کی چیخیں سن کر وہاں آنے والوں نے جہاں نسیمہ کی گلا گھٹی لاش ان کے بستر پر پڑی دیکھی وہیں طوبیٰ اور رمشا کو بھی اسی حال میں ان کے کمروں میں مردہ پڑا پایا گیا۔ فوراً ہی پولیس کو تہرے قتل کی اس واردات کی اطلاع دی گئی۔ سدرہ چیختے چیختے موقع پر ہی بے ہوش ہوگئی تھی اور لاکھ کوشش کے باوجود اسے ہوش میں نہیں لایا جاسکا تھا۔ چنانچہ مجبوراً اسے اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ لڑکیوں کی چیخیں سن کر فہیم کے گھر آنے والوں میں سائرہ اور ان کے شوہر اقبال بھی شامل تھے۔ قریب ترین پڑوسی ہونے کے علاوہ رشتے دار ہونے کے ناتے ان کے شانوں پر بھاری ذمے داری آپڑی تھی۔ اقبال صاحب نے فہیم کو لاہور فون کرکے اس بدترین حادثے کی اطلاع دی۔ دیگر رشتے داروں کو بھی فون کیے گئے۔ سائرہ، سدرہ کے ساتھ اسپتال چلی گئیں۔

''قتل اور ڈاکے دونوں کی واردات ہے۔ لگتا ہے ڈاکو بڑا مال لے کر گئے ہیں۔'' نسیمہ کی خوابگاہ کی کھلی الماری اور خالی لاکر دیکھ کر تبصرے کیے جانے لگے۔ پولیس اپنی کارروائی نمٹاتی رہی۔ جائے واردات سے شواہد اکٹھے کرنے، پاس پڑوس والوں سے سرسری بیان لینے اور لاشیں اٹھوائے جانے کی ابتدائی کارروائی میں ہی اچھا خاصا وقت لگ گیا۔ فہیم لاہور سے واپس پہنچے تو ان کا بسا بسایا گھر اجڑ چکا تھا۔

''آپ کو کسی پر شک ہے؟'' ابھی تک جائے واردات پر رکے ہوئے ایک اے ایس آئی نے ان سے پوچھا تو وہ ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھتے چلے گئے۔ ابھی تو ان کا ذہن اس بھیانک واردات کو ہی قبول نہیں کررہا تھا، وہ کسی پر شک کا اظہار کیا کرتے۔

''میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے خواہش ظاہر کی۔

''چلو میں لے چلتا ہوں۔'' اکلوتے سالے نے انہیں پیشکش کی اور اپنی گاڑی میں اس قریبی اسپتال تک لے گئے جہاں سدرہ کو داخل کیا گیا تھا۔ وہاں ان سے پہلے کئی اور رشتے دار بھی پہنچے ہوئے تھے۔

''مریضہ کو بہت شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ کسی عام فرد کے ملنے کا تو کیا ہی سوال ہے، ہم تو فی الحال پولیس کو بھی بیان لینے کے لیے اس سے ملاقات کی اجازت نہیں دے سکتے۔''

ڈاکٹر کسی کو بھی اس سے ملاقات کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فہیم پر باپ ہونے کے ناتے بس اتنی مہربانی کی گئی کہ شیشے کے چوکور خلا سے اس کا دیدار کروادیا گیا۔ سفید بستر پر لیٹی وہ خود بھی دھلے لٹھے کی طرح سفید ہورہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ فہیم کو ایک منٹ کے اندر ہی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس موقع پر سائرہ نے بھی انہیں دیکھا اور ان کی اجڑی حالت دیکھ کر خود بھی بے حد دکھی ہوگئیں۔ فہیم سے لاکھ شکوے سہی لیکن اس وقت انہیں ان کے لیے اپنے دل میں شدید دکھ محسوس ہورہا تھا۔

فہیم اپنے سالے کے ساتھ گھر واپس آگئے۔ گھر عزیز و اقارب سے بھرا ہوا تھا لیکن گھر کے اصل مکین غائب تھے۔ فہیم جو برسوں پہلے سائرہ کو نہ پاکر اپنی ذات میں سمٹ گئے تھے اور ماں کے اصرار پر دلہن بن کر گھر آنے والی نسیمہ سے اپنے تئیں زبردستی کا بندھن نبھاتے رہے تھے، اس پل ان کی اور بچیوں کی کمی محسوس کرکے پھوٹ پھوٹ کررو پڑے۔

''نارسائی کے غم نے میرے ہاتھوں تم سے اور بچیوں سے زیادتی کروا ڈالی نسیمہ۔ بلکہ میں نے خود سے بھی زیادتی کی کہ قسمت کے لکھے پر شاکر ہونے کے بجائے لاحاصل کے لیے تڑپتا رہا اور خود کو کبھی ان نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہونے دیا جن سے اللہ نے مجھے نوازا تھا۔ میری بچیاں...... آہ ..... کتنی پیاری تھیں میری بچیاں جنہیں میں نے کبھی ڈھنگ سے پیار بھی نہیں کیا۔'' پچھتاوے کی آگ میں جلتے وہ تصور میں نسیمہ سے مخاطب تھے۔

''صبر کیجیے بھائی صاحب! صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' چھوٹے ساڑھو نے انہیں سمجھایا۔

''صبر کیسے آئے گا بھیا...... کچھ بھی تو نہیں بچا۔ ایک سدرہ ہے جسے سوئی بھی نہیں چبھی لیکن وہ بھی اسپتال میں پڑی ہے۔ جانے آگے کیا کیا دیکھنے کو ملنے والا ہے۔'' ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سلجھ نے جو جملہ ادا کیا اس کا مفہوم فہیم کا ٹوٹا پھوٹا ذہن پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا لیکن ایک عجیب

سا احساس ضرور ان کے اندر اترا تھا۔ کچھ تھا جو غلط تھا۔

☆☆☆

تہرے قتل کی یہ واردات ایک سنسنی خیز خبر بن گئی تھی جسے پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرانک میڈیا نے بھی بے حد اہمیت دی تھی اور ہر فورم پر مختلف سوالات اٹھائے جا رہے تھے۔ سوالات اس کیس کے تفتیشی افسر جمال کے ذہن میں تھے جن کے حصول کے لیے وہ اپنی سی تگ و دو کر رہا تھا۔ کیس کی نوعیت کے اعتبار سے اس نے محلے داروں اور رشتے داروں کو خاص طور پر فوکس کر رکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ فہیم کے گھر کے عین سامنے والے گھر میں رہنے والے نوجوان لڑکے سے گفتگو کر رہا تھا۔

''سنا ہے تم کیبل نیٹ کا کام کرتے ہو اور تم نے اپنے گھر کی اوپری منزل پر ہی سارا سیٹ اپ لگا رکھا ہے۔ اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً تم راتوں کو دیر تک جاگنے کے عادی ہو گے۔ کیا واردات والی رات بھی تم دیر تک جاگتے رہے تھے؟''

''جی ہاں۔ میں رات کو تقریباً چار بجے سویا تھا۔'' لڑکے نے اس کی معلومات اور اندازوں کی تصدیق کی۔

''تمہارے اور فہیم صاحب کے گھروں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا کہ تمہارے اتنے نزدیک ڈاکے اور قتل کی بھیانک واردات انجام دی جا رہی ہے؟''

''جی نہیں۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں یقیناً پولیس سے رابطہ کرتا لیکن یقین جانیے کہ اتنی بڑی واردات کے باوجود ذرا سا بھی شور شرابا نہیں ہوا تھا جو میں یا کوئی اور فرد اس طرف متوجہ ہوتا۔ میں نے سنا ہے کہ ڈاکو باقاعدہ چابی سے لاک کھول کر گھر کے اندر آئے تھے؟'' اس نے بہت مہذب لہجے میں جواب دینے کے ساتھ ساتھ آخر میں قدرے تجسس کا مظاہرہ کیا۔

''مین گیٹ کے علاوہ گھر میں داخلے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور گیٹ کا لاک بالکل درست حالت میں ملا ہے، اس لیے یہ اندازہ قائم کیا گیا ہے۔'' انسپکٹر جمال نے سرسری انداز میں اسے جواب دیا اور پھر اصرار کرنے کے انداز میں بولا۔

''تم اپنی یادداشت پر زور دے کر سوچو کہ اس رات کوئی غیر معمولی بات محسوس کی ہو، محلے میں کوئی مشکوک فرد نظر آیا ہو، کسی گاڑی کی آواز سنی ہو یا کچھ اور؟''

''گاڑی یہاں تقریباً سب ہی کے پاس ہے اور کراچی جیسے شہر میں لوگوں کا رات گئے آنا جانا ایک معمول کی بات ہے، اس لیے میں نے اگر کسی گاڑی کے آنے اور جانے کی آواز سنی بھی ہو گی تو توجہ نہیں دی۔ البتہ ایک بات...... ایک بات ایسی ہے کہ جس پر میں نے اس وقت تو غور نہیں کیا تھا لیکن موجودہ حالات میں ذرا مشکوک سی لگ رہی ہے۔'' اسے اچانک ہی جیسے کوئی خیال سوجھا۔

''کون سی بات؟ تفصیل سے بتاؤ۔'' انسپکٹر جمال چونکا۔

''میں پان کھانے کا عادی ہوں۔ اس رات ایک بجے کے قریب بھی میں پان کھا رہا تھا اور مجھے پیک تھوکنے کی ضرورت پیش آئی تھی لیکن واش روم میں میرا ہیلپر لڑکا تھا تو میں نے سوچا کہ کھڑکی سے باہر گلی میں تھوک دیتا ہوں۔ میں پیک تھوکنے کے لیے کھڑکی پر پہنچا تو میں نے فہیم صاحب کی بڑی بیٹی سدرہ کو دروازہ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے دیکھا۔ اسی وقت مجھے ان کا پڑوسی جبران بھی باہر کھڑا نظر آیا۔ دونوں فیملیز کی آپس میں رشتے داری ہے اور آپس میں ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی ہے اس لیے مجھے اس وقت یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں لگی تھی اور میں یہی سمجھا تھا کہ جبران کسی کام سے وہاں آیا ہوگا اس لیے سدرہ نے اس کے لیے دروازہ کھولا ہے۔''

''کیا آپ نے جبران کو فہیم صاحب کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟'' انسپکٹر جمال نے بے تابی سے پوچھا۔

''جی نہیں۔ اسی وقت میں واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر پلٹ گیا تھا۔ جبران اور سدرہ کی موجودگی کے باعث مجھے گلی میں پیک تھوکنا کچھ مناسب نہیں لگا تھا۔''

''پیک تھوکنے کے بعد تم نے دوبارہ کھڑکی سے جھانک کر نہیں دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے اتنی رات گئے ایک لڑکا لڑکی ساتھ نظر آئیں تو آدمی کو تھوڑا بہت تجسس تو ہوتا ہے نا......؟''

''میں نے آپ سے کہا نا کہ اس وقت مجھے یہ ایسی غیر معمولی بات نہیں لگی تھی۔ سدرہ اور جبران کے درمیان کوئی افیئر بھی تھا تو مجھے اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ آج کل یہ عام سی باتیں ہیں اور میں ایسی باتوں میں انٹرسٹ نہیں لیتا۔ ہاں آپ کی دلچسپی کے لیے اتنا بتا سکتا ہوں کہ کچھ دن پہلے میں نے ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں بھی ساتھ دیکھا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ دونوں اپنے اپنے کالجز سے نکل کر ملاقات کے لیے وہاں پہنچے ہوئے ہیں لیکن میں نے کہا نا کہ فی زمانہ یہ باتیں اتنی انوکھی نہیں لگتیں اس لیے میں ان معاملات میں اتنا انٹرسٹ نہیں لیتا۔''

''اس واقعے کے بعد تمہاری جبران سے ملاقات

ہوئی؟ کیا واردات کے حوالے سے تم لوگوں نے آپس میں کوئی ڈسکشن کی؟'' انسپکٹر جمال اس معمولی سے کلیو میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔

''نہیں۔ جبران مجھے نہیں ملا۔ اس کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہ اپنے کسی دوست کے پاس اس کے گاؤں گیا ہوا ہے۔''

''او کے تھینک یو مینیز! امید ہے کہ آئندہ بھی ضرورت پڑنے پر تم اسی طرح ہمارے ساتھ تعاون کرو گے۔'' انسپکٹر جمال اس سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔ فہیم کے گھر کے سامنے آج اچھا خاصا رش تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد آج لاشیں ورثا کے حوالے کی جارہی تھیں جن کی آج ہی تدفین ہونی تھی۔ اسی لیے لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انسپکٹر جمال نے فہیم کے دائیں ہاتھ کے پڑوس والے گھر کی کال بیل بجائی۔ دروازہ ایک پُرکشش خاتون نے کھولا۔

''آپ کے پڑوس میں جو تہرے قتل کی واردات ہوئی ہے، میں اس کے سلسلے میں کچھ تفتیش کے لیے آپ کی فیملی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے خاتون سے مہذب لہجے میں مدعا بیان کیا۔

''لیکن آپ تو پہلے ہی اس سلسلے میں میرے شوہر سے مل چکے ہیں۔''

''جی! محلے کے دوسرے افراد کے ساتھ میں نے ان سے ملاقات کی تھی لیکن اس وقت ذرا تھوڑی تفصیل سے ملنا چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر جمال کے لہجے میں خود بخود ہلکی سی سختی آ گئی۔

''آپ اندر تشریف لے آئیں۔'' خاتون جو کہ سائرہ تھیں، نے قدرے پریشانی سے اسے اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ اپنے ماتحت کے ساتھ اس کی راہنمائی میں اندر ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم کشادہ اور صاف ستھرا تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ برسوں سے اس کی یہی آرائش چلی آرہی ہے اور اہلِ خانہ نے آرائش میں کسی نئی شے کا اضافہ نہیں کیا۔ سائرہ ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد اقبال صاحب کو بلانے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر میں دونوں میاں بیوی انسپکٹر جمال کے روبرو تھے۔

''آپ کا بیٹا جبران اس وقت گھر میں نہیں ہے کیا؟''

''جی نہیں۔'' انسپکٹر جمال کے سوال کا نہایت اختصار سے جواب دیا گیا۔

''کہاں گیا ہے؟''

''جی، وہ اپنے ایک دوست سے ملاقات کے لیے اس کے گاؤں گیا ہوا ہے۔'' سائرہ نے جواب دیا تو ان کے لہجے میں ہلکی سی پریشانی تھی۔

''کب گیا ہے؟'' انسپکٹر جمال کے لیے یہ اطلاع اہم تھی۔

''جی پرسوں صبح سے گیا ہوا ہے۔'' سائرہ حتی الامکان کوشش کے باوجود لہجے کی پریشانی چھپانے سے قاصر تھیں۔ ان کے مقابلے میں اقبال صاحب بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کے چہرے پر بھی تفکر کی پرچھائیاں بالکل واضح تھیں۔

''پرسوں صبح ...... یعنی واردات والی رات سے اگلے دن۔'' انسپکٹر جمال نے پُرتفکر انداز میں ہنکارا بھرا۔

''دوست کا نام اور اس کا پتا وغیرہ بتائیں۔''

''وہ تو ہمیں نہیں معلوم انسپکٹر صاحب! بس اتنا معلوم ہے کہ اس کا دوست بلتستان کے کسی دور دراز گاؤں میں رہتا ہے۔''

''کمال ہے۔ آپ کا جوان اکلوتا بیٹا گھر سے اتنی دور گیا ہوا ہے اور آپ کو اس کا کچھ اتا پتا ہی معلوم نہیں ہے۔'' انسپکٹر جمال نے طنز کیا۔

''وہ بہت جلدی میں گیا تھا۔ اس کے دوست کا فون آیا تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہے تو وہ ہم سے کوئی بات کیے بغیر جلدی میں چلا گیا تھا۔'' سائرہ کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی۔

''آپ کا فون پر تو اس سے رابطہ ہوگا؟''

''جی نہیں۔ جب سے وہ گیا ہے، اس کا فون بند جا رہا ہے۔ ہم خود پریشان ہیں کہ اس سے ہمارا رابطہ کیوں نہیں ہو رہا۔'' سائرہ کے انداز میں بے بسی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ کے بیٹے اور آپ کے پڑوسی فہیم صاحب کی بڑی بیٹی سدرہ میں کوئی افیئر چل رہا تھا؟'' انسپکٹر جمال کے بالکل اچانک کیے گئے سوال نے سائرہ کا چہرہ فق کر دیا۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں بول سکیں بس سر کو نفی میں ہلانے لگیں۔

''دیکھیں بی بی! جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرے پاس ایسے گواہان ہیں جنھوں نے دونوں کو گھر سے باہر ہوٹلوں اور پارکوں میں ملتے دیکھا ہے۔'' انسپکٹر جمال پولیس والا تھا اس لیے خود کو ملنے والی ایک چھوٹی سی اطلاع کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

''معاف کیجیے گا انسپکٹر صاحب! ہمارے لیے یہ اطلاع ناقابلِ یقین ہے۔'' اقبال صاحب جن کے اپنے چہرے پر بھی تفکر کے بادل چھائے ہوئے تھے، پہلی بار لب

کشا ہوئے اور قدرے رسان سے بولے۔

''ذاتی طور پر مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ کسی بچی کی بدنامی ہو لیکن حالات کے پیشِ نظر میں آپ کے سامنے اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ بچپن کے ساتھ کی وجہ سے دونوں بچوں میں ذرا قربت تھی اور وہ مستقبل میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ کے خواہاں تھے لیکن دونوں ہی اس مزاج کے بچے نہیں ہیں کہ ہوٹلوں اور پارکوں میں ملاقاتیں کر کے اپنے اور والدین کے لیے بدنامی کا باعث بنتے، وہ بھی ایسی صورت میں کہ انہیں گھر میں ملنے اور بات چیت کرنے کی آسانی تھی۔''

''مگر میں نے تو سنا ہے کہ سدرہ کی اپنے ماموں زاد منیب سے منگنی ہو چکی ہے اور شاید ایک آدھ دن میں ان کا نکاح بھی ہونے والا تھا؟''

''آپ کی اطلاعات بالکل درست ہیں۔ آنے والے کل یعنی اتوار کی شام منیب اور سدرہ کا نکاح ہونے والا تھا۔ جبران اس حوالے سے تھوڑا سا ڈسٹرب بھی تھا لیکن اس بات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جذبات میں کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھتا۔'' اقبال صاحب کے لہجے میں ایک یقین سا تھا۔

''جب آپ لوگوں کو دونوں بچوں کے درمیان پسندیدگی کا علم تھا تو آپ نے سدرہ کی منگنی ہونے سے قبل ان کا آپس میں رشتہ طے کرنے کا کیوں نہیں سوچا؟ کیا جبران نے اس سلسلے میں آپ سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی؟'' وہ اس معاملے کے سارے بخیے ادھیڑ ڈالنا چاہتا تھا۔

''جبران نے خواہش ظاہر کی تھی لیکن حالات نے ہمیں اجازت نہیں دی۔ اول تو یہ کہ ہمیں سدرہ اور منیب کے رشتے کی خبر ہی اس وقت ہوئی جب سارے معاملات طے پا چکے تھے۔ دوسرے ابھی ہم رشتہ لے جانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھے۔'' اقبال صاحب نے اپنی طویل بیماری، کمزور مالی حالات اور جبران کی ادھوری تعلیم سمیت ہر وہ وجہ تادی جو رشتہ لے جانے میں مانع تھی۔

''ہوں......'' سن کر انسپکٹر جمال نے ہنکارا بھرا۔ حالات ایسے تھے کہ دو محبت کرنے والے جذباتی نوجوانوں سے کسی بھی انتہائی قدم کی امید کی جا سکتی تھی۔

''میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ موجودہ حالات میں آپ کے بیٹے کی پوزیشن بہت نازک ہے۔ آپ جلد از جلد اس سے رابطہ کر کے اسے صفائی کے لیے پیش کریں ورنہ ہم اسے مفرور ملزم بھی ڈکلیئر کر سکتے ہیں۔'' آخر کار اس نے سخت لہجے میں کہا اور باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے جبران کی تلاش کے سلسلے میں اپنے ماتحت کو چند ہدایات دیں اور چند ایک فون کالز بھی کھڑکا ئیں۔ معاملے کا ایک سرا ہاتھ آیا تھا تو اسے دور تک اس کے پیچھے جانا ہی تھا۔

☆☆☆

نسیمہ اور دونوں بیٹیوں کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کا مرحلہ پیش آیا تو اپنے، غیروں کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ نسیمہ خود ابھی بیالیس سال کی تھیں اور نک سک سے رہنے کی وجہ سے جوان ہی لگتی تھیں۔ طوبیٰ اور رمشا بالترتیب سترہ اور اٹھارہ سال کی تھیں اور کفن میں لپٹے ان کے وجود دیکھ کر یہی احساس ہو رہا تھا کہ کسی ظالم نے نوخیز کلیوں کو مسل کر رکھ دیا ہو۔

اس موقع پر سدرہ بھی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر پہنچ چکی تھی۔ ماں بہنوں کی کفن میں لپٹی لاشیں دیکھ کر وہ زار وقطار روتی اور چیختی رہی۔ جنازے اٹھائے جانے لگے تو ماں کی میت سے لپٹ کر چیخنے لگی۔

''مجھے چھوڑ کر مت جائیں امی! مجھے معاف کر دیں۔ میں بہت بُری بیٹی ہوں۔ میں نے آپ کو بڑا دکھ دیا۔ بس ایک بار رک جائیں۔ ایک بار مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔ آپ جو کہیں گی، میں وہی کروں گی۔'' عالم خود فراموشی میں چیختی چلاّتی اور ہذیان بکتی وہ بے ہوشی کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ رشتے دار خواتین اسے سنبھالنے کی اپنی سی کوشش کرتی رہیں۔ بے ہوشی کے عالم میں ہی ماں بہنوں کے جنازے اٹھ گئے۔ اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ خود فراموشی کے عالم میں کیا کچھ کہہ گئی ہے اور اس کے کہے کے کیا کیا مطالب اخذ کیے گئے ہیں۔ وہ تو اپنے ہی پچھتاووں اور دکھوں تلے کچلی جا رہی تھی۔ اس عالم میں تو اسے جبران کا بھی ہوش نہیں تھا اور حیران کن بات تھی کہ وہ جو اسے اپنے .... پیاروں سے زیادہ پیارا لگتا تھا، یکدم ہی پس منظر میں چلا گیا تھا۔ زندگی کے اس موڑ پر اسے بڑی شدت سے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ خون کے وہ رشتے جنہیں وہ بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی، ان سے بڑھ کر تو کچھ بھی پیارا نہیں تھا۔ ماں بہنوں کی المناک موت اور ہمیشہ کی جدائی کا غم ایسا تھا کہ اسے اپنی رگیں کٹتی محسوس ہوتیں اور صدمے کی شدت سے بار بار بے ہوش ہو جاتی۔ ناچار ڈاکٹرز کو ایک بار پھر اس کے لیے سکون آور ادویات تجویز کرنی پڑیں جن کے سہارے وہ عارضی طور پر سہی، اذیت ناک سوچوں سے رہائی پا گئی۔

☆☆☆

جبران بہت بکھری ہوئی حالت میں گھر سے نکلا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اسے کچھ عرصے کے لیے اپنا پس منظر میں چلا جانا ہی مناسب لگا تھا۔ وہ یہاں رہ کر کسی کا سامنا کرنے اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پا رہا تھا اور صرف ایک خواہش دل میں تھی کہ اتنی دور چلا جائے کہ کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے۔ اس خواہش نے ہی اسے اس کا بھولا بسرا دوست اکرم خان یاد دلایا تھا۔

اکرم خان ایف ایس سی میں اس کا کلاس فیلو تھا۔ وہ اچھا ذہین لڑکا تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اچانک ہی اس کا باپ حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا تو اسے واپس اپنے گاؤں جانا پڑا۔ اکرم کا باپ ایک منجھا ہوا پورٹر تھا جو پہاڑوں کو سر کرنے والے سرپھروں کے ساتھ برف پوش پہاڑوں میں بھٹکتا پھرتا تھا اور یہی اس کا ذریعۂ روزگار تھا۔ پہاڑوں کا رمز شناس اکرم کا باپ اپنی تمام تر مہارت اور تجربے کے باوجود ایک روز قسمت سے مار کھا گیا اور ساتھ جانے والی غیر ملکی ٹیم کے ارکان کے ساتھ ایک ایوالانچ کی زد میں آ گیا۔ پہاڑوں پر جان دینا ان کے خاندان کے لیے ایک معمول کی بات تھی۔ اکرم کا باپ مرا تو ذریعۂ روزگار بھی ختم ہو گیا اور اکرم خان کو اعلیٰ تعلیم کا خواب ادھورا چھوڑ کر گاؤں واپس جا کر باپ کی جگہ سنبھالنی پڑی۔

جبران کے پاس اب بھی کبھی کبھار اس کے خطوط آتے تھے اور اپنے ہر خط میں وہ اسے اپنے گاؤں آنے کی دعوت دیتا تھا۔ گردش زمانہ، تعلیمی مصروفیات اور کمزور مالی حالات نے جبران کو کبھی دوست کی دعوت قبول کرنے کا موقع نہیں دیا تھا لیکن اب سر پر مصیبت پڑی تو وہ دور دراز بیٹھا دوست یاد آیا اور وہ عجلت میں ماں باپ کو بھی ڈھنگ سے کچھ بتائے بغیر مختصر سامان کے ساتھ ایسے گھر سے بھاگا جیسے اس کے پیچھے بدروحیں لگی ہوں۔

بذریعہ سڑک کراچی سے بلتستان جانے والوں کو گھنٹوں نہیں، دنوں کے حساب سے وقت لگتا ہے۔ ڈائیوو کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی۔ راستے میں کچھ مقامات پر تازہ دم ہونے کے لیے اسٹے بھی کیا گیا لیکن پھر بھی وہ جو پہلے ہی شل اعصاب کے ساتھ روانہ ہوا تھا، بری طرح تھک گیا تھا۔ اپنے حالات سے فرار ہو کر کسی ایسے مقام تک پہنچنے کی شدید خواہش نہ ہوتی جہاں تک دوسروں کی رسائی اتنی آسان نہیں تھی، تو وہ شاید اس سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، وہ بھی ان دنوں میں جبکہ اس کی پڑھائی زور و شور سے جاری تھی۔ وہ جو تعلیم مکمل کر کے ماں باپ کے خواب پورے کرنے کا سوچا کرتا تھا، کیسے سوچ سکتا تھا کہ اب جبکہ منزل چند قدم کے فاصلے پر رہ گئی تھی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس طرح کسی دور افتادہ مقام پر جانے کے لیے نکل کھڑا ہوگا لیکن فرار کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔

پورے سفر کے دوران اس نے مشکل ہی سے کسی سے بات کی تھی۔ زیادہ تر کھڑکی سے باہر جھانکتا رہتا تھا یا پھر آنکھیں موندے بیٹھا رہتا تھا۔ دیکھنے والوں کو اس کے چہرے پر وحشت اور کرب کے تاثرات نظر آتے تھے لیکن اس نے کسی کو اتنی لفٹ ہی نہیں کروائی تھی کہ کوئی اس سے اس کے بارے میں دریافت کر پاتا۔ راستے میں ایک ہوٹل پر رکنے پر وہ تازہ دم ہونے کے لیے باتھ روم گیا تو اپنا موبائل واش بیسن پر رکھ کر بھول گیا۔ موبائل اسے دوبارہ نہیں ملا اور اس نے بھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ویسے بھی اس نے اپنا موبائل آف کر رکھا تھا کہ کوئی اس سے رابطہ نہ کر سکے۔ وہ تو خود کو گم کرنے کے لیے ہی گھر سے نکلا تھا۔ موبائل کی گمشدگی اسے کیا پریشان کرتی۔

اکرم خان کے گاؤں پہنچا تو وہ یوں اچانک اس کی آمد پر حیران ہی رہ گیا پھر والہانہ اور پُرجوش استقبال کیا۔ وہ اکرم خان کے جوش کا چاہتے ہوئے بھی جوش سے جواب نہ دے سکا۔ شروع کے چار پانچ گھنٹے تو طویل سفر کی تھکان اتارنے کے بہانے ہی تنہا بستر پر لوٹتے پوٹتے گزار دیے لیکن خلوص سے بھرے میزبان سے کتنی دیر گریز کرتا۔ مہمان نوازی میں بچھے جاتے اکرم خان کے ساتھ حتی الامکان خوش دلی سے پیش آنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پھر بھی اس نے اس کی کیفیت کو تاڑ لیا۔

”کیا بات ہے یار! تم مجھے پریشان لگ رہے ہو۔ کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ؟“ پُرخلوص اکرم خان کا سوال اسے شرمندہ کر گیا اور عاجزی سے بولا۔

”مجھے معاف کر دینا یار! میں تمہاری محبت میں تمہارے پاس نہیں آیا ہوں بلکہ اپنے حالات سے فرار ہو کر آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ سب سے چھپ کر کچھ دن یہاں گزار سکوں۔“

”کوئی بات نہیں یار!...... تم جس وجہ سے بھی آئے ہو، میرا گھر اور دل کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ تم نے مشکل وقت میں میرا انتخاب کیا ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا انتخاب غلط ثابت نہیں ہوگا۔ تم کسی کو قتل بھی کر کے آئے ہو تب بھی جب تک چاہو یہاں آرام سے رہ سکتے ہو۔“

"ایسی تو کوئی بات نہیں......" اکرم خان کے آخری جملے نے اسے سٹپٹا کر رکھ دیا۔

"ایسی بات ہو تو بھی پروا نہیں۔" اکرم خان پر اس کی وضاحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بھی مزید صفائی دینا غیر ضروری سمجھا۔ وہ دن اکرم خان کے گھر کی بیٹھک میں ہی سوتے جاگتے گزر گیا۔

"مجھے کوہ نوردوں کی ایک ٹیم کے ساتھ کل صبح روانہ ہونا ہے۔ اگر تم بھی پہاڑ دیکھنا چاہتے ہو تو ساتھ چلو۔" رات کا کھانا کھاتے ہوئے اکرم خان نے اسے پیشکش کی۔

"پہاڑوں پر......!" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"پہاڑ سر کرنا تو کافی مشکل کام ہے اور مجھے اس کام کی ذرا بھی شد بد نہیں ہے۔" اکرم خان اس کا جواب سن کر ہنس پڑا اور بولا۔

"ہم کوئی پہاڑ سر کرنے نہیں جا رہے۔ مقامی سیاحوں کا ایک گروپ ہے جو یہاں کی جھیلیں، چشمے اور چراگاہیں وغیرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ بس ان کے ساتھ جانا ہے۔ اگر تمہیں دلچسپی ہو تو میں تمہارے لیے بھی بات کر لیتا ہوں۔"

اسے اس وقت دنیا کی کسی بھی شے سے دلچسپی نہیں تھی لیکن سارا وقت اکرم خان کے گھر کی بیٹھک میں پڑا رہنے سے بہتر تھا وہ اس کے ساتھ چلا جاتا چنانچہ ہامی بھر لی۔

"ٹھیک ہے تو پھر صبح جلدی تیار رہنا۔ تمہارے لیے گرم کپڑوں کا بندوبست میں کر لوں گا۔" اکرم خان دیکھ چکا تھا کہ اس کے مختصر اسباب میں ایسا سامان موجود نہیں جو یہاں کے موسموں میں اس کی حفاظت کر سکے، اس لیے جاتے جاتے دوستانہ انداز میں بولا۔

"جو چاہو کرو لیکن ذرا مجھے کاغذ قلم تو لا دو۔ میں اپنے گھر خط لکھنا چاہتا ہوں۔"

"خط......؟ تم فون کیوں نہیں کر لیتے گھر؟" اکرم اس کی فرمائش پر حیران ہوا۔ جواب میں اس نے اپنا فون کھو جانے اور امی ابو کے زیر استعمال سم کا نمبر یاد نہ ہونے کی کہانی سنا ڈالی۔

"چل تو پھر خط ہی لکھ دے۔ ہم تو سویرے نکل جائیں گے۔ بعد میں ڈاک خانہ کھلنے پر میرا چھوٹا بھائی خط پوسٹ کر دے گا۔" اکرم خان نے اب بھی زیادہ بحث نہیں کی اور اسے اس کی مطلوبہ اشیا فراہم کر دیں۔ وہ ہاتھ میں قلم تھامے بہت دیر تک کورے کاغذ کو گھورتا رہا تھا پھر آخر کار چند سطریں گھسیٹنے کی ہمت کر ہی لی۔

☆☆☆

''تفتیشی افسر تم سے ملنا چاہتا ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں بیٹھی سپاٹ دیواروں کو خالی الذہنی کی کیفیت میں گھور رہی تھی کہ فہیم نے اسے اطلاع دی۔ وہ انہیں بھی خاموش نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔ چند دنوں میں وہ کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ وہ جو سدا اکھڑ اور گھر والوں سے لاتعلق نظر آتے تھے، اب لگتا تھا اندر ہی اندر غم سے گھلے جا رہے ہیں لیکن عجیب بات تھی کہ انہوں نے یہ غم اس سے نہیں بانٹا تھا۔ دردِ مشترک کے باوجود وہ اس سے لاتعلق سے تھے لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ سوال کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ گھر میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اب بھی وہ چپکے سے سب کے درمیان سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آبیٹھی تھی کہ ہر آئے گئے کے سامنے ان لرزہ خیز واقعات کو دہرایا جاتا تھا جنہیں وہ بھول جانا چاہتی تھی۔

''سدرہ گھر میں ہوتے ہوئے بھی کیسے بچ گئی؟'' ہر سننے والا اس سوال کو دہراتا تو اسے نظریں چرانی پڑتیں پھر بھی سامنے والے کی نظروں میں موجود شک کی تپش محسوس ہو جاتی۔ اب بھی وہ ان سوالوں اور نگاہوں سے بچ کر اپنے کمرے میں پناہ گزین ہوئی تھی لیکن فہیم کی دی اطلاع نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کے لیے کہیں کوئی پناہ نہیں ہے۔

''نیچے ڈرائنگ روم میں آجاؤ۔ تمہاری طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ویسے ہی انسپکٹر کو بہت ویٹ کرنا پڑا ہے۔ اب وہ مزید صبر کے لیے تیار نہیں ہے۔'' فہیم نے اس کی ہلدی ہو جانے والی رنگت پر ایک نظر ڈالی اور روکھے سے لہجے میں کہہ کر پلٹ گئے۔

'شاید سب کی طرح ابو کو بھی مجھ پر شک ہے۔' اس نے سوچا اور کسی نہ کسی طرح قدموں کو گھسیٹتی ہوئی ڈرائنگ روم تک پہنچ گئی۔

''انسپکٹر صاحب تم سے اکیلے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔'' اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی فہیم باہر نکل گئے۔ اسے تفتیشی افسر کے سوالوں کا جواب دینے کے لیے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بہت زیادہ ہمت صرف کرنی پڑی پھر بھی انداز میں واضح گھبراہٹ تھی۔

پینتیس چھتیس کی لگ بھگ عمر والے قبول صورت انسپکٹر جمال نے اپنی ذہین آنکھیں اس کے وجود پر گاڑ دیں اور فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکی بہت زیادہ کنفیوز اور خوفزدہ ہے۔ کسی قسم کی تمہید میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس نے جارحانہ انداز اپنانے کا فیصلہ کیا اور قدرے تند لہجے میں بولا۔

''میں تم سے پہلا سوال وہ کرنا چاہتا ہوں مس سدرہ فہیم، جس نے مجھ سمیت ہر فرد کو الجھا رکھا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ واردات والی رات جبکہ تمہاری والدہ اور بہنوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا، صرف تم کیسے اور کیوں محفوظ رہیں؟''

''میں اپنے کمرے میں لاک کے علاوہ اندر سے کنڈی بھی لگا کر سوئی تھی، شاید اس لیے بچ گئی۔'' اس نے انگلیوں کو مروڑتے ہوئے جھکی نظروں سے جواب دیا تو انسپکٹر جمال کو صاف پتا چل گیا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی ہے۔

''کیا تم ہمیشہ اسی طرح سوتی ہو؟'' اس نے تیکھے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔

''نہیں۔ بس اس رات اتفاق تھا۔'' وہ انسپکٹر کے انداز پر سٹپٹا رہی تھی۔

''کیا تمہیں سوتے میں بالکل بھی احساس نہیں ہوا کہ گھر میں کچھ لوگ موجود ہیں اور اتنی بڑی کارروائی ہو رہی ہے؟''

''نہیں۔ اس رات میں کچھ زیادہ ہی گہری نیند سو گئی تھی اور صبح ملازمہ کی آمد پر ہی میری آنکھ کھلی تھی۔''

''کیا تم نے سوتے وقت کوئی نشہ آور دوا استعمال کی تھی؟'' لہجہ مزید تیکھا ہوا۔

''جی...... جی نہیں۔'' اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

''کیا تم نے وہ بریانی بھی نہیں کھائی تھی جو باقی افرادِ خانہ کھا کر سوئے تھے؟''

''نہیں...... اصل میں، میں نے کھانے سے کچھ دیر قبل ہی لسی پی لی تھی اس لیے میرا کھانے کا موڈ نہیں بنا۔'' سدرہ کی نظروں کے ساتھ ساتھ گردن بھی بے انتہا جھک گئی۔

''بریانی کس نے بنائی تھی......؟'' انسپکٹر کے اس سوال کا سدرہ جواب نہیں دے سکی اور چپ سادھ لی۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق تینوں مقتولین کو شدید نشے کی حالت میں قتل کیا گیا تھا جس کے باعث وہ ذرا بھی مزاحمت نہیں کر سکے اور مجرموں کا کام آسان ہو گیا۔ پوسٹ مارٹم اور فریج میں بچی رکھی بریانی کے نمونوں، دونوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نشہ آور دوا بریانی میں ملائی گئی تھی اس لیے یہ سوال بہت اہم ہے کہ بریانی کس نے پکائی تھی؟'' انسپکٹر کے لہجے کی جارحیت بڑھ گئی لیکن سدرہ نے اپنی خاموشی نہیں توڑی۔

''واردات والی شام تمہاری ممانی اور ہونے والی ساس صاحبہ نے تمہاری والدہ کو فون کیا تھا تو دورانِ گفتگو تمہاری والدہ نے انہیں بتایا تھا کہ رات کا کھانا تم بنا رہی ہو

اور بریانی کی کوئی نئی ریسیپی ٹرائی کررہی ہو۔ کیا میری یہ معلومات غلط ہیں؟'' وہ اس پر تابڑتوڑ حملے کررہا تھا اور اس کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

''کیا تم بتاسکتی ہو کہ واردات والی رات ایک بجے کے قریب تمہارا پڑوسی اور عزیز جبران تمہارے گھر کے دروازے پر کیا کررہا تھا؟ وہ تم ہی تھیں نا جس نے اتنی رات گئے جبران کی آمد پر اس کے لیے دروازہ کھولا تھا؟'' انسپکٹر بے حد چبھتے لہجے میں سوال نہیں کررہا تھا، اس پر شک کے کوڑے برسا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ہی سسکیاں نکل گئیں۔

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم جبران کو پسند کرتی تھیں اور تمہاری والدہ نے تمہاری مرضی کے خلاف تمہارا رشتہ منیب سے طے کردیا تھا۔ اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے تم منیب اور اس کے گھر والوں سے رکھائی سے پیش آتی تھیں اور کبھی انہیں وہ عزت اور احترام نہیں دیا تھا جس کے وہ بطور سسرالی حق دار تھے؟'' انسپکٹر اس کی سسکیوں پر رحم کھانے کے بجائے مزید بے دردی سے حملے پر حملے کررہا تھا۔

''کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم اپنی خالہ زاد ثروت کے سامنے اس بات کا برملا اظہار کرچکی تھیں کہ منیب سے منگنی صرف ماں کو ٹالنے کے لیے کی ہے ورنہ حقیقتاً تمہیں اس وقت کا انتظار ہے جب جبران اپنی تعلیم مکمل کرکے اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے گا۔ تم نے شوق نہ ہوتے ہوئے بھی میڈیکل کالج میں صرف اس لیے ایڈمیشن لیا تھا کہ پڑھائی کے بہانے شادی کو ٹالے رکھو۔'' واردات والی صبح سے لے کر اب تک انسپکٹر نے مسلسل اس کیس پر کام کیا تھا اور بے شمار لوگوں سے ملا تھا۔ ان لوگوں میں اس کی کلاس فیلو اور دوست ثروت بھی شامل تھی اس لیے اس کے پاس سدرہ کے متعلق معلومات کا ڈھیر موجود تھا۔ ان معلومات کی روشنی میں وہ اپنے طور پر واردات سے متعلق ایک تھیوری قائم کرچکا تھا اور اب وہی تھیوری سدرہ کے سامنے دہرا رہا تھا۔

''تو بات یہ ہے مس سدرہ فہیم کہ ناپسندیدہ رشتے سے بچنے کے لیے تم اپنی ساری ترکیبیں لڑا چکی تھیں اور اپنے طور پر مطمئن بھی تھیں لیکن جب منیب کے گھر والوں کی طرف سے نکاح کا مطالبہ کیا گیا اور تمہیں اپنے لیے کوئی راہ نظر نہیں آئی تو تم نے جبران کے ساتھ مل کر ایک خطرناک منصوبہ بنایا اور تمام نقدی اور زیورات چرانے کے ساتھ ساتھ اپنی ماں اور بہنوں کو بھی بے دردی سے قتل کرڈالا۔ اب یہ تم ہمیں بتاؤ گی کہ جبران ان زیورات اور نقدی سمیت بھاگ کر کہاں گیا ہے؟'' انسپکٹر جمال کا یہ آخری جملہ اتنا سخت تھا کہ سدرہ کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ محض ساڑھے انیس سال کی ایک لڑکی ہی تو تھی۔ کہاں تک برداشت کرپاتی۔ آخرکار پھٹ پڑی اور سسکتے ہوئے بولنے لگی۔

''اپنی محبت کے حصول کے لیے میں اندھی ہوچکی تھی انسپکٹر صاحب! اپنے جذبات کے سامنے مجھے کسی کا کوئی خیال نہیں تھا، اسی لیے اس رات......'' وہ ایک ایک بات بتاتی چلی گئی اور انسپکٹر توجہ سے اس کی پوری داستان سنتا رہا۔

☆☆☆

''پیارے امی اور ابو...... السلام علیکم!

مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ میرے لیے پریشان ہوں گے۔ اس تکلیف کے لیے میں آپ دونوں سے معافی چاہتا ہوں۔ راستے میں ایک جگہ موبائل فون گم کربیٹھنے کے باعث میں آپ دونوں سے رابطہ نہیں کرسکا تھا۔ اب اپنے دوست اکرم کے تعاون سے یہ خط لکھ کر آپ کو اپنی خیریت سے آگاہ کررہا ہوں۔ یہ خط آپ تک پہنچنے میں ذرا وقت لگ جائے گا لیکن مجبور ہوں کہ فی الحال میرے پاس رابطے کا یہی ذریعہ ہے۔ بھیجنے کو میں آپ کو اپنی خیریت کا تار بھجوا دیتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس سے آپ کی تسلی و تشفی نہیں ہوسکتی۔ خط میں، میں ذرا تفصیل سے اپنے دل کی بات کرسکتا ہوں۔

سب سے پہلے تو میں آپ دونوں کا شکرگزار ہوں کہ آپ دونوں نے میری بات سمجھی اور ایک مشکل صورت حال سے نکلنے میں میری بھرپور مدد کی۔ صورت حال سنبھل گئی لیکن میرے دل پر بڑا بھاری بوجھ ہے کہ میں نے سدرہ کو دھوکا دیا اور اس کا مان توڑا۔ شاید اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ آپ دونوں میرے والدین ہی نہیں، ہمدم و ہمراز بھی ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے یہ فرار میری ضرورت تھا۔ مجھے امید ہے کہ جب تک میں واپس آؤں گا، حالات سنبھل چکے ہوں گے اور اس پاگل اور جذباتی لڑکی نے بھی حالات سے سمجھوتا کرلیا ہوگا۔

آپ سے جتنا ممکن ہو اس کا خیال رکھیے گا امی! مجھے علم ہے کہ وہ ان دنوں بہت شدید تکلیف سے گزر رہی ہوگی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انسان ہر تکلیف سے بہرحال گزر ہی جاتا ہے۔ وہ بھی اس دکھ کو سہہ لے گی۔ دو خاندانوں کی بقا اور عزت کے لیے اس قربانی کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اب آپ مجھے اجازت دیں اور میری طرف سے بالکل بے فکر رہیں۔ اللہ نے چاہا تو کچھ عرصے کی دوری کے بعد میں دوبارہ آپ کے درمیان موجود ہوں گا۔

آپ کی دعاؤں کا طلب گار
آپ کا فرمانبردار بیٹا
جبران احمد''

خط کی تحریر ختم ہوئی تو انسپکٹر جمال نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے اقبال صاحب کو دیکھا۔ وہ بڑی امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان پر رحم آنے کے باوجود اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سپاٹ رکھے۔ اسے اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ اقبال صاحب ایک نہایت شریف آدمی ہیں اور کسی بھی طرح اپنے بیٹے کی اس الزام سے برائت چاہتے ہیں جس کے سلسلے میں پولیس اس پر شک کر رہی تھی۔ اسی لیے بیٹے کی طرف سے خط موصول ہوتے ہی فوراً اس خط کو لے کر تھانے پہنچ گئے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ یہ خط یہیں چھوڑ دیں اور آپ گھر واپس جائیں۔'' چہرے کے تاثرات کی طرح اس کا لہجہ بھی سپاٹ تھا۔

''یقین کریں انسپکٹر صاحب! میرا بیٹا بالکل بے قصور ہے۔ ہم نے آپ کو ہر سچ سے آگاہ کر دیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ میرے بیٹے کا اس واردات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کی پرورش میں رزقِ حرام کا ایک پیسا بھی خرچ نہیں کیا پھر وہ کیسے اتنے بھیانک جرم کا مرتکب ہوسکتا ہے۔'' بیٹے کی صفائی دیتے ہوئے اقبال صاحب کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے محترم! ہوسکتا ہے آپ کی بات درست ہو لیکن قانون کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور مجھے ان تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔'' اس نے نرمی سے انہیں جواب دیا تو وہ ہتھیلی سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انسپکٹر کو سلام کر کے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد انسپکٹر نے لفافے پر موجود ڈاک کی مہر اور پتے کو بغور دیکھا اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کچھ دیر وہ فون پر کسی سے بات کرتا رہا۔ ابھی اس نے ریسیور کریڈل کیا ہی تھا کہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ وہ کرائم رپورٹر صادق تھا اور انسپکٹر جمال کے بے تکلف دوستوں میں سے تھا۔

''اور کیا خبریں ہیں یار؟'' صادق نے سلام دعا کا تکلف کیے بغیر کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

''ابھی تو اس تہرے قتل کے کیس میں پھنسا ہوا ہوں۔ عجیب الجھا ہوا کیس ہے۔ مجرم تک پہنچ ہی نہیں پا رہا۔''

''مجھے تو اس کیس نے ماضی کے ایک کیس کی یاد دلادی ہے۔ کراچی کے ایک علاقے میں پیش آیا تھا وہ واقعہ۔ اس لڑکی نے خود اپنے عاشق اور اس کے دوست کے ساتھ گھر والوں کو بے دردی سے قتل کر کے واردات کو ڈکیتی کا رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی سزا کاٹ کر آزاد تو ہوچکی ہے لیکن سنا ہے کہ نفسیاتی مریض ہوچکی ہے۔'' صادق نے اپنی رائے دی۔

''وہ کیس مجھے بھی یاد ہے۔ ان دنوں ہم اسی علاقے میں... رہائش پذیر تھے اور میں بہت نوعمر ہوا کرتا تھا۔ اب تو حالات بہت بدل گئے ہیں اور نت نئے انوکھے کیسز سامنے آتے رہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ پر آئے بے حیائی کے طوفان نے لوگوں سے آنکھ کی حیا اور دل کی نرمی چھین لی ہے اس لیے خونی رشتوں کو بھی بے دردی سے ہلاک کر دینا کوئی بڑی بات نہیں رہی لیکن اس وقت یقین نہیں آتا تھا کہ اولاد، وہ بھی بیٹی، اتنی بے دردی سے ماں باپ کو قتل کرسکتی ہے۔ میں ہمیشہ سے خوش گمانی میں مبتلا رہنے والا آدمی ہوں، اس وقت بھی میں سوچا کرتا تھا کہ وہ لڑکی بے قصور ہوگی اور اسے کسی سازش کا نشانہ بنایا گیا ہوگا لیکن میری خوش گمانیوں کے برعکس وہ لڑکی سچ مچ شاملِ جرم تھی۔''

''کہیں اس کیس میں بھی تم خوش گمانی سے کام لے کر اس لڑکی سدرہ کو چھوٹ تو نہیں دے رہے ہو؟ شاید اسی لیے تم نے ابھی تک اسے حراست میں نہیں لیا ہے۔'' صادق نے اسے بغور دیکھا۔

''نہیں یار! اب میں وہ نوعمر لڑکا نہیں، پولیس والا ہوں اور معاملات کو حقیقت پسندی سے دیکھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکی سدرہ سچ مچ سازش کا شکار ہوئی ہے لیکن سازش کرنے والے کردار فی الحال میرے سامنے نہیں ہیں۔ میں اس کیس کا ہر پہلو سے جائزہ لے رہا ہوں۔ سدرہ اور جبران کو بھی میں نے مکمل طور پر شک کے دائرے سے خارج نہیں کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ایک بار پھر سدرہ سے ملاقات کر کے کوئی کام کی بات معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ جبران کو بھی میں نے بلتستان سے واپس بلوانے کی کارروائی شروع کر دی ہے۔ امید ہے کہ میں جلد اس کیس کو حل کرلوں گا۔'' انسپکٹر جمال نے صادق کو جواب دیا تو اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ میرا ذہین دوست جلد یہ کیس حل کرلے گا اور مجھے اپنے اخبار کے لیے ایک شاندار اسٹوری مل جائے گی۔''

''ہر وقت اسٹوریز ڈھونڈتے رہا کرو۔'' انسپکٹر

جمال مسکراتے ہوئے بولا۔
''اخبار والا جو ٹھہرا۔ تم پولیس والے مجرموں کو تلاش کرتے ہو اور ہم اخبار والے کہانیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دونوں کی روزی روٹی اسی طرح چل رہی ہے۔'' صادق نے اطمینان سے تسلیم کیا تو دونوں دوست ہنس پڑے۔

☆☆☆

''مجھے معاف کر دیں ابو! میں بہت بُری بیٹی ہوں۔ میں نے آپ کے اعتبار کو دھوکا دیا۔'' سدرہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ باپ کا سامنا کرے۔ آج وہ بہت ہمت کر کے ان کے لیے چائے لے کر گئی تھی اور شرمساری سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔
''شاید ہماری قسمت میں ہی اس طرح لکھا تھا۔ تم سے زیادہ یہ تمہاری امی اور میری غلطی تھی۔ میں نے مرد ہونے کا صرف یہ مطلب سمجھا کہ بیوی بچوں کے مالی مسائل حل کر دوں اور بس...... میں نے اس بات کو سمجھا ہی نہیں کہ گھر کا سربراہ ہونے کے ناتے مجھ پر بے شمار فرائض عائد ہوتے ہیں اور میں گھر کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی دلچسپی لینے کا ذمے دار ہوں تاکہ میرے بیوی بچوں کو تحفظ اور محبت کا احساس ہو۔ میری غفلت اور بے نیازی نے تمہاری امی کو حد سے زیادہ خود مختاری دے دی۔ عورتوں کی عمومی فطرت کے مطابق ایک تو ان کا رجحان ویسے ہی میکے کی طرف زیادہ تھا، دوسرے سائرہ سے حسد نے بھی انہیں جبران کے متعلق مثبت انداز میں نہیں سوچنے دیا۔ کردار کو پرکھنے کے بجائے ظاہری خصوصیات پر نظر رکھنے کے باعث بھی وہ منیب کو جبران پر ترجیح دینے پر مجبور ہوگئی ہوں گی اس لیے ان سے فیصلے میں غلطی ہوگئی اور انہوں نے تمہاری مرضی اور پسند کے خلاف ایک ایسا فیصلہ کر لیا جس نے تمہیں غلط قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ تم ہم دونوں کو ہماری غلطیوں کے لیے معاف کر دینا بیٹا۔'' اس حادثے کے بعد فہیم صاحب نے پہلی بار اتنی تفصیلی بات کی تھی۔
''مجھے شرمندہ نہ کریں ابو! امی کے جانے کے بعد میں دن رات یہ سوچتی ہوں کہ میری خوشی سے بڑھ کر ان کا ہونا اہم تھا۔ بس کسی طرح وہ واپس آجائیں۔'' اس کے لبوں سے سسکیاں نکلنے لگیں۔
''صبر کرو بیٹا! جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ ہمیں ان پر صبر ہی کرنا ہوتا ہے۔'' فہیم اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے لگے۔ اسی وقت ڈور بیل بجی۔ فہیم نے جا کر چیک کیا تو معلوم ہوا انسپکٹر جمال، سدرہ سے ملنے آیا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہی سدرہ ڈرائنگ روم میں اس کے روبرو تھی۔ انسپکٹر جمال کی زبانی علم ہوا کہ جبران کو بلتستان سے بلوا لیا گیا ہے اور پولیس نے تفتیش کے لیے اسے زیرِ حراست لے رکھا ہے۔ اس خبر نے سدرہ کو تکلیف پہنچائی۔ جبران بے چارہ تو صرف اس کی محبت میں مارا گیا تھا ورنہ اس صاف ستھرے کردار کے لڑکے کے بارے میں بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ ایک دن وہ پولیس کی حراست میں ہوگا۔
''دیکھو بی بی! میں نے تمہاری بات پر اعتبار کر کے ابھی تک تمہیں حراست میں نہیں لیا ہے کہ میں جانتا ہوں تھانے میں گزری ایک رات بھی لڑکی کے لیے ساری عمر کا داغ بن جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم ہی اس کیس میں سب سے زیادہ مشکوک فرد ہو اور تمہیں فرار سے روکنے کے لیے میں تمہاری نگرانی کروا رہا ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ اس الزام سے اپنی جان چھڑا سکو تو اصل مجرم تک پہنچنے میں میری مدد کرو۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مجرم کوئی باہر کا فرد نہیں ہے۔ وہ چابی سے تالا کھول کر گھر کے اندر آیا تھا اور جانتا تھا کہ تمہاری امی رقم اور زیورات وغیرہ کہاں رکھتی ہیں اسی لیے ان کی الماری کے سوا کسی اور شے کو نہیں چھیڑا گیا۔ مجھے اس واردات میں ڈکیتی کے علاوہ دشمنی کی بو بھی محسوس ہو رہی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہاری یا تمہارے خاندان کی کسی سے ایسی کیا دشمنی تھی کہ وہ اس حد تک چلا گیا۔'' انسپکٹر جمال قدرے سخت لہجے میں اس سے پوچھنے لگا۔
''میں کیا بتا سکتی ہوں انسپکٹر صاحب! میرے ذہن میں تو ایسا کوئی فرد نہیں ہے جس کی ہم سے دشمنی ہو۔ معمولی اختلافات ہر خاندان میں ہوتے ہیں لیکن ہمارا کسی سے ایسا کوئی اختلاف نہیں تھا کہ وہ دشمنی پر اتر آتا۔ ہاں ایک بات میرے ذہن میں آرہی ہے کہ اس واقعے سے کچھ عرصے پہلے امی کے پرس سے بیرونی گیٹ کی چابی غائب ہوگئی تھی اور بہت تلاش کرنے پر بھی نہیں ملی تھی تو امی نے اپنے لیے نئی چابی بنوالی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ امی اور ہم تینوں بہنوں کے پاس اپنی اپنی چابیاں موجود تھیں جس سے گیٹ کا لاک کھول کر ہم خود ہی گھر میں آجاتے تھے اور ہمیں کال بیل بجانے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی تھی۔''
''چابی کی گمشدگی بہت اہم نکتہ ہے۔ تم ذرا سوچ کر بتاؤ کہ جس روز چابی گم ہوئی اس روز یا اس سے ایک آدھ دن پہلے گھر میں کون لوگ آئے تھے؟''
''جس روز امی کو اپنی چابی کی گمشدگی کا علم ہوا، اس سے ایک دن پہلے امی نے گھر پر ڈھولکی رکھوائی تھی۔ نکاح

کی تقریب میں ابھی کچھ وقت تھا لیکن وہ بہت شوقین مزاج خاتون تھیں اور انہوں نے طے کر رکھا تھا کہ نکاح تک وہ ہر ویک اینڈ کی رات ڈھولکی رکھیں گی۔ وہ پہلی ڈھولکی تھی جس میں تمام ننھیالی رشتے داروں اور پڑوسیوں نے شرکت کی تھی۔ اس ڈھولکی نے ہی مجھے اتنا زچ کیا تھا کہ میں انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئی تھی۔'' سدرہ نے انکشاف کیا۔

''تم نے سوچا ہے کہ اگر تم اس رات گھر پر موجود ہوتیں تو تم بھی قتل کردی جاتیں۔'' انسپکٹر جمال نے سوال کیا۔

''ہاں۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش میں اس رات گھر میں موجود ہوتی تو ان تکلیف دہ حالات کو سہنے کے لیے زندہ تو نہ رہتی۔'' سدرہ کا انداز جذباتی تھا۔ انسپکٹر جمال نے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

''تم سب کے مرجانے پر کسے فائدہ ہوسکتا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ مالی فائدہ؟''

''کسی کو نہیں۔ ابو کے ہوتے ہوئے بھلا کسی کو کیا مل سکتا تھا۔'' سدرہ نے واضح جواب دیا لیکن جمال کے ذہن میں شک کا سانپ سرسرا گیا۔ اس نے سوچا کہیں اس واردات کے پیچھے خود فہیم کا ہی تو ہاتھ نہیں تھا۔ بظاہر یہ ناممکن سی بات لگتی ہے لیکن اس دنیا میں سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ مرد بعض اوقات دوسری عورت کے چکر میں پڑ کر بیوی بچوں کی جان کے دشمن بھی بن جاتے ہیں۔

''تم نے کہا کہ تمہاری یا تمہارے گھر والوں کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن دورانِ تفتیش کچھ لوگوں نے میرے سامنے تمہارے لیے سخت الفاظ کا استعمال کیا۔ کیا کبھی تمہاری کسی سے ایسی لڑائی وغیرہ ہوئی تھی کہ اس نے بات دل میں رکھ لی ہو؟'' اپنے شک کو خود تک محدود رکھتے ہوئے اس نے سدرہ سے سوال جواب کا سلسلہ جاری رکھا۔

''میں تھوڑی سی منہ پھٹ ہوں اس لیے لوگوں کے لیے زیادہ پسندیدہ نہیں ہوں۔ اپنے ماموں کی فیملی سے تو میری بالکل بھی دوستی نہیں تھی اور امی کے لاکھ پردے ڈالنے کے باوجود وہ لوگ اس بات کو سمجھتے تھے کہ میں منیب سے رشتے پر خوش نہیں ہوں۔''

''اور خالاؤں کی فیملیز سے کیسے تعلقات تھے تمہارے؟''

''بس نارمل سے تھے۔ میں شروع سے اپنے ننھیال والوں کے مقابلے میں سائرہ آنٹی سے زیادہ قریب رہی ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''لیکن مجھے علم ہوا ہے کہ تمہاری ایک خالہ زاد تمہاری کلاس فیلو رہی تھی اور اس سے تمہاری اچھی خاصی دوستی رہی تھی۔''

''ہاں! میری خالہ کی بیٹی ثروت سے میری بہت دوستی تھی لیکن سیکنڈ ائیر کے پیپرز کے دوران میں نے ایک پیپر میں اسے چیٹنگ نہیں کروائی اور وہ اس پیپر میں فیل ہوگئی تو اس کے بعد ہماری دوستی میں دراڑ پڑ گئی۔ ہم آپس میں ملتے تو تھے لیکن پہلے والی بات نہیں رہی تھی۔'' سدرہ نے اسے جواب دیتے ہوئے دل میں سوچا کہ انسپکٹر جمال اس کیس پر بہت محنت کر رہا ہے جب ہی تو اس کے پاس معمولی معمولی باتوں کی بھی معلومات موجود ہے۔

''کیا ثروت تمہاری ہمراز سہیلی تھی اور جانتی تھی کہ تم منیب کے بجائے جبران میں دلچسپی رکھتی ہو؟''

''جی ہاں۔ اسے معلوم تھا۔'' سدرہ نے اعتراف کیا۔

''ٹھیک ہے۔ فی الحال میں چلتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں جلد اصل مجرم تک پہنچ جاؤں گا۔'' انسپکٹر جمال وہاں سے رخصت ہوگیا اور سدرہ کے ذہن میں ایک بار پھر وہ بھیانک رات چکرانے لگی جب وہ اپنے پیاروں سے محروم ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اس رات سدرہ نے ہی گھر والوں کو بریانی میں وہ نشہ آور دوا ملا کر کھلائی تھی جسے کھا کر سب گہری نیند سوتے رہ گئے تھے اور وہ طے شدہ منصوبے کے مطابق طے شدہ وقت پر جبران کے ساتھ گھر سے نکل گئی تھی۔ اس رات سے پہلے اس نے جبران سے ریسٹورنٹ میں جو ملاقات کی تھی، اس ملاقات میں اس نے اپنی جان دینے کی دھمکی دے کر جبران کو اس بات پر راضی کرلیا تھا کہ وہ دونوں گھر سے بھاگ کر نکاح کرلیں گے۔ جبران ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے سدرہ کی دھمکی کی وجہ سے ہامی بھرنا پڑی۔ سدرہ فرار ہوتے ہوئے گھر سے کیش اور زیورات وغیرہ بھی لے جانا چاہتی تھی لیکن اس کے لیے جبران نے اسے سختی سے منع کردیا۔ وہ گھر والوں کو بے ہوشی کی دوا دے کر اس لیے نکلی تھی کہ بہت دیر تک کسی کو اس کے غائب ہونے کی اطلاع نہ ملے اور وہ جبران کے ساتھ کہیں دور نکل جائے لیکن اس کا یہ سارا منصوبہ اس وقت دھرا رہ گیا جب سائرہ اور اقبال صاحب ان کے پیچھے پیچھے ہی جبران کے دوست کے فلیٹ پر پہنچ گئے جہاں اس نے نکاح کا انتظام کیا تھا۔ اس وقت سائرہ نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے جبران کی اس کے دوست سے فون پر ہونے والی گفتگو سن لی تھی اسی لیے وہ دونوں عین وقت پر ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔

اس وقت بھی سدرہ نے اڑنے کی کوشش کی تھی اور بضد رہی تھی کہ وہ جبران سے نکاح ضرور کرے گی۔ اس کی ضد پر سائرہ نے زندگی میں پہلی بار اس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا اور پھر روتے ہوئے اپنا دوپٹا اس کے پیروں میں ڈال دیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر اس سے درخواست کر رہی تھیں کہ وہ یہ قدم اٹھا کر خاندان کی تباہی کا سامان نہ کرے۔ وہ دونوں نکاح کر کے کہیں چلے جاتے تو ان کے لیے تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ وہ ساری زندگی کے لیے لوگوں کے سامنے شرمسار ہو جاتیں اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل کی تباہی انہیں جیتے جی مار دیتی۔ انہوں نے سدرہ کا اسی پر الٹاتے ہوئے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اپنے قدموں کو واپس نہیں موڑا تو وہ اپنی جان دے دیں گی۔ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ چھٹی منزل پر واقع جبران کے دوست کے فلیٹ کی کھلی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھیں۔ سدرہ لاکھ ہٹ دھرم سہی، اتنی سخت دل نہیں تھی کہ اپنے قدموں میں پڑا سائرہ کا دوپٹا، ان کے جڑے ہوئے ہاتھ اور خودکشی کے لیے تیار قدموں کو نظر انداز کر دیتی۔ آخر کار اسے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ ہتھیار ڈالنے کے لیے راضی ہونے میں اس نے تقریباً دو گھنٹے لگا دیے تھے۔ آنے جانے کا وقت ملا کر وہ گھر سے تقریباً تین گھنٹے باہر رہی تھی اور واپس لوٹی تھی تو اتنی ہاری ہوئی تھی کہ گھر میں اگر کوئی غیر معمولی پن موجود بھی تھا تو وہ محسوس نہیں کر سکی تھی اور صبح ملازمہ کی چیخوں پر ماں کے کمرے میں جانے پر ہی اسے علم ہو سکا تھا کہ اس کے غیاب کے تین گھنٹوں میں کیا بیت چکی ہے۔ اسے شدید دکھ تھا کہ اگر اس نے ان لوگوں کو بے ہوشی کی دوا نہ دی ہوتی تو قتل کیے جانے پر وہ کچھ تو چیختیں چلاتیں اور مزاحمت کرتیں تو شاید کوئی ان کی مدد کے لیے آ جاتا اور تینوں میں سے کسی کی جان تو بچ جاتی۔

بعد میں سائرہ کے پولیس کو دیے ہوئے بیان سے اسے یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ اس رات سائرہ اور اقبال صاحب کا ان کے پیچھے جبران کے دوست کے گھر پہنچ جانا کوئی اتفاق نہیں تھا۔ جبران نے خود اس کی خودسری کو قابو میں کرنے کے لیے ماں باپ کو اس چکر میں شامل کیا تھا اور سدرہ کو خودکشی سے روکنے کے ساتھ ساتھ ماموں کی عزت بچانے میں بھی کامیاب رہا تھا لیکن تقدیر میں کتنا بڑا دکھ اور پریشانی لکھی تھی، یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ انہوں نے اپنے پیاروں کو کھویا تھا اور اب وہی لوگ مشکوک قرار پا کر پولیس کی تفتیش کی زد میں تھے۔ سدرہ کو اپنی پروا نہیں تھی لیکن وہ جبران کے اس چکر سے نکل آنے کے لیے دعا گو تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جبران اس روز صبح سویرے گھر سے نکل کر اپنے دوست کے گاؤں اس لیے چلا گیا تھا کہ سدرہ کو کسی اور کا ہوتے دیکھنا خود اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ دوسرے وہ چاہتا تھا کہ اسے دسترس سے دور پا کر سدرہ آسانی سے ہتھیار ڈال دے۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا لیکن اتنا خودغرض نہیں تھا کہ اپنی محبت پانے کے لیے اپنے ماں باپ اور سدرہ کی فیملی کو تکلیف سے دوچار کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی اور سدرہ کی قربانی دو خاندانوں کو بچا لیتی ہے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ لیکن افسوس یہ قربانی بھی رائگاں چلی گئی تھی۔ اب تو زخموں پر مرہم رکھنے کی بس ایک ہی صورت تھی کہ کسی طرح اصل مجرم یا مجرمان پکڑے جاتے اور اپنے انجام تک پہنچتے۔ ہمیشہ کی ضدی سدرہ نے اب اللہ سے ضد باندھ لی تھی کہ وہ اس کی ماں اور بہنوں کے قاتلوں کے چہرے ضرور بے نقاب کرے۔ اس کے شب و روز کا بڑا حصہ جائے نماز پر بیٹھ کر مقتولین کے لیے دعائے مغفرت کرنے اور قاتلوں کی گرفتاری کے لیے دعا کرنے میں گزرنے لگا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر جمال بغور اپنے سامنے بیٹھی اس انیس سالہ قبول صورت لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس سے آج وہ دوسری بار مل رہا تھا اور پہلی ملاقات کے مقابلے میں اس ملاقات کو کرنے میں اسے کچھ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہرحال اپنے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر وہ ملاقات کرنے میں کامیاب رہا تھا اور لڑکی کے چہرے کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس انداز میں دیکھنے پر لڑکی نروس ہو رہی تھی اور ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے بار بار ماتھے سے پسینا صاف کر رہی تھی۔

"تو سدرہ نے سیکنڈ ایئر کے پیپر میں تمہیں چیٹنگ کروانے سے انکار کر دیا تھا اور تم اس پیپر میں فیل ہو گئی تھیں؟" لڑکی جو کہ ثروت تھی، اسے اچھی طرح نروس کرنے کے بعد اس نے بالکل اچانک گفتگو کا آغاز کیا، وہ بھی ایسے جملے سے کہ وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"جب سدرہ نے تمہیں چیٹنگ نہیں کروائی تو تمہیں بہت غصہ آیا ہوگا۔ اس کے بعد تم نے کیا کیا؟"

"کک...... کچھ نہیں۔ میں کیا کرتی؟" اپنی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"کیا تم نے منیب کو نہیں بتایا کہ سدرہ اپنے پھوپی

زاد جبران کو پسند کرتی ہے اور کسی صورت منیب سے شادی نہیں کرے گی۔'' انسپکٹر جمال نے تکّا لگایا جس پر ثروت مزید ٹپٹا گئی۔ اس کی خاموشی ہی اس کا اعتراف تھا۔

''میرے خیال میں تم خود بھی منیب کو پسند کرتی تھیں اور اس بات پر پہلے ہی خار کھائے بیٹھی تھیں کہ منیب کی منگنی تمہارے بجائے سدرہ سے ہوگئی اس لیے تم نے منیب کو سدرہ کے خلاف بھڑکانے کی پوری پوری کوشش کی اور اپنی ممانی کو بھی سب کچھ بتا ڈالا۔ اس طرح تم یہ منگنی ختم کرانا چاہتی تھیں لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں اور پھر بات نکاح تک آپہنچی۔ اس کے آگے تم نے کیا کیا، مجھے وہ بتاؤ۔''

انسپکٹر جمال بولنے کے ساتھ ساتھ ثروت کے چہرے پر آتے جاتے رنگ بھی دیکھ رہا تھا۔ خوف سے اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہوجائے گی۔ انسپکٹر جمال نے اپنے ساتھ آئی لیڈی پولیس اہلکار کو اشارہ کیا کہ وہ ثروت کو پانی پلائے۔ اس نے وہیں رکھے ایک جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر ثروت کو تھمایا۔ اس نے مشکل سے ایک گھونٹ پانی پیا اور پھر گلاس واپس میز پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''چلو شاباش! اب تفصیل سے بتاؤ کہ سچ کیا ہے اور کیا ہوا تھا؟'' اس بار انسپکٹر جمال کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ لڑکی ٹوٹ چکی ہے اور اب سچ ہی بولے گی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق ثروت نے بولنا شروع کر دیا۔

''یہ سچ ہے کہ میں منیب کو پسند کرتی تھی اور اس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے کوشش کرتی رہتی تھی لیکن اس کی منگنی سدرہ سے ہوگئی تو میں دکھی ہونے کے باوجود خاموش ہوگئی۔ میرے ذہن میں کوئی سازش نہیں آئی۔ پہلی بار میں نے غصے میں اس وقت منیب کو سدرہ اور جبران کے بارے میں بتایا جب سدرہ نے پیپر سولو کرنے میں میری مدد کرنے سے انکار کردیا۔ اس دن کے بعد ہی مجھے خیال آیا کہ اگر میں منیب کو سدرہ کے خلاف بھڑکاتی رہوں تو یہ منگنی ٹوٹ سکتی ہے۔ منیب کے ساتھ ساتھ میں نے ممانی کو بھی جبران والی بات بتادی۔ میری توقع کے مطابق منگنی تو نہیں ٹوٹی لیکن میں منیب کے قریب ہونے میں کامیاب ہوگئی اور وہ مجھے سدرہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنے لگا۔ میں نے ہی اسے بتایا کہ سدرہ نے میڈیکل میں ایڈمیشن صرف اس لیے لیا ہے کہ وہ جبران کے لیے وقت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ جبران کسی لائق ہوجائے گا تو اس کی امی فہیم انکل سے رشتے کی بات کریں گی۔ منیب بہت تلملاتا تھا کہ سدرہ جبران کو اس پر ترجیح دے رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خود بھی سدرہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور میرا قدردان ہے کہ میں اس سے بے لوث محبت کرتی ہوں لیکن اپنے والدین کی وجہ سے مجبور ہے کہ وہ پیسے کے لالچ میں سدرہ کو ہی اس کی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی تو سدرہ کے بعد رمشا اور طوبیٰ پر بھی اپنے چھوٹے بیٹوں کے لیے نظر تھی تاکہ فہیم انکل کا سارے کا سارا پیسا ان کے پاس آجائے۔ منیب نے مجھے امید دلائی تھی کہ وہ سدرہ سے شادی کر کے سارا مال ہڑپ کرلے گا اور پھر اسے طلاق دے کر مجھ سے شادی کرے گا۔ ان خوابوں کے سہارے ہی میں اس کی ہر بات آنکھیں بند کر کے مانتی تھی اور جہاں جہاں وہ مجھے ملنے کے لیے بلاتا تھا، چلی جاتی تھی۔

''تنہائی کی ملاقاتوں میں وہ حد سے گزر گیا تب بھی میرا اس کی محبت پر سے یقین کم نہیں ہوا۔ سدرہ سے نکاح کا منصوبہ بھی اس نے سدرہ کو قابو میں رکھنے کے لیے بنایا تھا ورنہ وہ اتنا اچھا طالب علم نہیں تھا کہ باہر کے کسی ملک میں اسے اسپیشلائزیشن کے لیے جانے کا چانس مل جاتا۔ نسیمہ خالہ کی طرف سے نکاح کی ہامی بھر لی گئی تب بھی وہ مطمئن نہیں ہوا۔ اسے لگا کہ نکاح کے بعد رخصتی ہونے میں بھی کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ دوسرے ایک لمبا عرصہ انتظار پھر بھی کرنا پڑتا چنانچہ اس نے ایسا منصوبہ بنایا کہ جلد از جلد شادی ہوجائے اور فہیم انکل کا سارے کا سارا پیسا اس کے ہاتھ آجائے۔ وہ رمشا اور طوبیٰ کو اپنے بھائیوں کی دلہن بنا کر ان کے ساتھ بھی مال نہیں بانٹنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے نئی اسکیم تیار کی۔ میرے ذریعے اس نے نسیمہ خالہ کے پرس سے ان کی چابی حاصل کی اور اپنے ایک دوست کے ساتھ چپکے سے ان کے گھر میں گھس کر خالہ، رمشا اور طوبیٰ کو قتل کر ڈالا۔ خالہ کا آدھا روپیا اور زیور اس نے اپنے دوست کو اس کام کے معاوضے کے طور پر دے دیا۔ سدرہ اس رات گھر میں موجود نہیں تھی۔ منیب سمجھا کہ وہ اپنی پھپو کے گھر ہوگی۔ وہ کبھی کبھار وہاں رکنے چلی جاتی تھی۔ سدرہ کو وہ قتل کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ اسے کسی طرح بے ہوش کر کے کمرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دے گا، بعد میں جب حالات معمول پر آجائیں گے تو وہ سدرہ کے دکھ اور تنہائی کو بہانہ بنا کر فہیم انکل کو نکاح کے ساتھ ساتھ رخصتی پر بھی آمادہ کرلیا جائے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سدرہ انکل کے سامنے کچھ نہیں بول سکتی اس لیے یہ شادی ہو کر

رہے گی اور سدرہ انکل کی واحد وارث کی حیثیت سے جہیز میں سب کچھ لے کر آجائے گی۔ تھوڑے عرصے بعد وہ سدرہ کو بھی کسی طرح ٹھکانے لگادیتا اور بقول اس کے مجھ سے شادی کرلیتا لیکن مجھے اس کی اس بات پر یقین نہیں۔ میں اس کے اتنے بھیانک منصوبے میں بھی صرف اس لیے شامل ہونے پر مجبور ہوئی تھی کہ اس نے ہماری تنہائی کی ملاقاتوں کی شرمناک تصویر سوشل میڈیا پر ڈالنے کی دھمکی دی تھی۔ بعد میں حالات کسی اور طرح سامنے آئے اور سدرہ کی ذات ہی مشکوک ٹھہر گئی تو منیب نے خاموشی اختیار کرنے اور حالات کے مطابق قدم اٹھانے کا سوچا۔ اس موقع پر اس کی یہ الجھن بھی دور ہوگئی کہ اگرچہ اس نے اور اس کے دوست نے نسیمہ خالہ، رمشا اور طوبیٰ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ان کے گلے کاٹے تھے پھر بھی انہیں کچھ تو مزاحمت کرنی چاہیے تھی۔ وہ تینوں تو بہت آرام سے اپنی جان دے بیٹھی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس طرح مجھ تک پہنچے لیکن اچھا ہوا کہ پہنچ گئے۔ میرے دل پر ان تینوں کی دردناک موت کا بہت بوجھ تھا لیکن میں خود سے کسی کے سامنے اعتراف کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ منیب بھی اندر سے خوفزدہ ہے اور چپکے سے ملک سے باہر جانے کی تیاری کررہا ہے۔ اس کا خیال ہے سدرہ اگر اس کیس سے بچ نکلی تو وہ بعد میں آکر اس سے شادی کرلے گا۔ مجھے بھی اس نے شادی کا لارا دے رکھا ہے لیکن میں سمجھ گئی ہوں کہ وہ ہرگز مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ ویسے بھی میں اپنی پوری زندگی اتنے خطرناک آدمی کے ساتھ گزارنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آپ مجھے منیب کے جرم میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار کرسکتے ہیں لیکن اس شخص کو بھی کسی صورت ہاتھ سے نہ نکلنے دیجیے گا۔''

ثروت نے اپنا طویل بیان ختم کیا تو اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ انسپکٹر جمال نے وہیں بیٹھے بیٹھے فون پر منیب کی گرفتاری کے احکامات صادر کیے اور پھر لیڈی پولیس اہلکار کو اشارہ کیا کہ وہ ثروت کو ساتھ لے چلے۔ گھر والوں کے چیخنے چلانے کے باوجود ثروت کو پولیس کی تحویل میں تھانے لے جایا گیا۔

☆☆☆

''آخر تم ثروت تک پہنچے کیسے؟ وہ تو اس کیس میں کہیں نظر ہی نہیں آرہی تھی۔'' صادق نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے انسپکٹر جمال سے دریافت کیا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''سچ پوچھو یار تو میں بہت معمولی کلیو اور بڑے بڑے تکوں کے سہارے اس تک پہنچنے اور سچ اگلوانے میں کامیاب ہوسکا۔ میں جب سدرہ کے رشتے داروں سے مل رہا تھا تو اس کی ممانی اور ہونے والی ساس نے اس کے لیے سخت الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ انہوں نے صاف الفاظ میں تو نہیں کہا تھا لیکن دبے دبے لہجے میں سدرہ اور جبران پر شک کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ سدرہ، جبران کو پسند کرتی تھی اور منیب سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتادیا تھا کہ ان کی معلومات کا ذریعہ ثروت تھی۔ جب سدرہ کی زبانی مجھے ثروت سے اس کی چپقلش کا علم ہوا تو میں نے خود تانے بانے بُن لیے جن کی بنیاد اندازوں پر تھی۔ بہرحال میں نے ثروت پر ہلکا سا ہی دباؤ ڈالا تو وہ کھل گئی۔ رقابت اور حسد میں وہ جس مقام پر پہنچ گئی تھی اس کے لیے وہی بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ کوئی عادی مجرم تو تھی نہیں کہ انسانی خون کا بوجھ آسانی سے برداشت کرجاتی۔ اس پر سے منیب کی اصلیت کھلنے پر بھی وہ دلبرداشتہ اور شکست خوردہ تھی اس لیے مجھے اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ البتہ منیب نے اقبال جرم میں خاصا وقت لگایا۔ وہ بہت چالاک لڑکا ہے۔ باپ کے پیسے پر میڈیکل کالج پہنچ گیا تھا اور کسی نہ کسی طرح ڈگری بھی حاصل کرلی تھی لیکن مسیحا ہونا تو دور کی بات، اس میں انسانیت بھی نہیں تھی۔ محبت کا دھوکا دے کر وہ پہلے بھی کئی لڑکیوں کی زندگی برباد کرچکا تھا۔ میڈیکل کالج میں اس کے ساتھ پڑھنے والی کئی خوش حال گھرانوں کی لڑکیاں ثروت کی طرح اس کے ہاتھوں بلیک میل ہورہی تھیں اور وہ ان سے رقوم سمیٹ رہا تھا۔ اصل میں اس کی پرورش ہی مال حرام پر ہوئی تھی۔ باپ نے رشوت لے لے کر دولت بنائی تھی اور اولاد کو حرام کی چاٹ لگی ہوئی تھی اس لیے وہ محنت سے زیادہ چالبازی سے پیسے بنانے پر یقین رکھتا تھا۔ اس کی دوستیاں بھی اوباش لڑکوں سے تھیں لیکن بظاہر بڑا مہذب اور سوبر بنا پھرتا تھا۔ جس لڑکے کی مدد سے اس نے یہ واردات کی، وہ بھی عادی مجرم ہے اور ہنوز مفرور ہے۔ گرفت میں آئے گا تو اسے بھی انجام تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔'' جمال نے صادق کے سوال کا بہت دیانت داری سے جواب دیتے ہوئے اسے اصل حقائق سے آگاہ کیا۔

''جو بھی ہے یار! افسوس کا مقام ہے کہ ایک جوان لڑکا اپنی غلط روش کی وجہ سے پھانسی چڑھ جائے گا اور ایک باعزت گھرانے کی لڑکی اس کی شریک جرم ہونے کی وجہ سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے وقت گزارے گی۔ ایسی

لڑکیوں کو تو رہا ہونے کے بعد اُن کے گھر والے بھی قبول نہیں کرتے۔'' صادق نے افسوس کا اظہار کیا۔

''ہر ایک کو اپنی کرنی کا صلہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ مجھے ایک اور ایسا .... کیس نہیں دیکھنا پڑا اور ایک بیٹی اپنوں کی قاتل نہیں نکلی۔ میں بیٹی کے کردار کو اس شقاوت سے الگ دیکھنے کا خواہش مند تھا اور میری یہ خواہش پوری ہوگئی۔''

''کمال ہے۔ پولیس والے ہو کر بھی کسی ادیب اور شاعر کے انداز میں سوچتے ہو۔''

''میں ایک باپ بھی تو ہوں یار! اور میری بھی دو چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری بیٹیاں ہیں۔ میں کیسے بیٹی کے پیارے سے تصور کو ٹھیس پہنچتے ہوئے برداشت کر سکتا ہوں۔''

جمال نے جذباتی لہجے میں جواب دیا تو صادق نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے ایک ہی گھونٹ میں باقی ماندہ چائے ختم کی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنے اخبار کے لیے ایک جاندار اسٹوری مل گئی تھی۔

☆☆☆

سرخ جوڑے میں ملبوس سدرہ کسی بے جان لاش کی طرح بیٹھی تھی۔ اس نے جو چاہا تھا ہو گیا تھا لیکن دل اس خوشی کو محسوس کرنے سے عاری تھا، جو انسان اپنی شدید خواہش پوری ہونے پر محسوس کرتا ہے۔ فہیم نے اپنی اور نسیمہ کی غلطی کی تلافی کرتے ہوئے اسے اور جبران کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ اس فیصلے سے قبل انہوں نے اپنا پرانا گھر فروخت کر دیا تھا۔ ان کی درخواست پر سائرہ اور اقبال صاحب کو بھی یہی کرنا پڑا تھا اور اب وہ لوگ اپنے علاقے سے دور ایک دوسرے محلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ساری بری یادوں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتے تھے لیکن سدرہ کے دل سے وہ یادیں کسی آسیب کی طرح چمٹی ہوئی تھیں جب ہی تو وہ جبران کی دلہن بن کر بھی خوش نہیں تھی۔

جبران نے اس کے مقابل بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما تو اس کے ہاتھ کا بے پناہ سرد پن اسے چونکا گیا۔ یہ وہ سدرہ کہاں تھی جو جوش اور امنگ سے بھری رہتی تھی۔ اسے تو حالات اور کچھ اپنی جذباتیت نے مار دیا تھا۔

''سدرہ......!'' اس نے دھیرے سے اسے پکارا تو اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کب سوچا تھا کہ وہ دلہن بنے گی تو سینے سے لگا کر رخصت کرنے کے لیے ماں نہیں ہوگی اور بہنیں وداع کے گیت نہیں گائیں گی۔

وہ تو اپنے آپ کو جبران جیسے صاف ستھرے کردار کے لڑکے کے لائق بھی نہیں سمجھتی تھی لیکن اس بار نافرمانی کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی اس لیے فہیم کی خواہش پر سر جھکا دیا تھا۔

''میں تم سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا سدرہ! بس یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر انسان چاہے تو دکھوں کو بھی اپنی طاقت بنا کر جینے کی راہ نکال سکتا ہے۔ تم اب میری خاطر نہیں بلکہ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے خوب دل لگا کر ڈاکٹر بنو۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو زندگی عیش میں گزارنے کے خواب نہیں دیکھتے اور بنیادی ضروریات پوری ہو جانے پر بھی مطمئن رہتے ہیں۔ فہیم انکل سے تمہیں جو جائداد ورثے میں ملی ہے ہم اسے تمہارے ایک اچھا ڈاکٹر بننے تک محفوظ رکھیں گے اور پھر اس پیسے سے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کریں گے۔ تم اس اسپتال میں دکھی انسانیت کی خدمت اور غریبوں کا مفت علاج کرنا۔ گھر میری تنخواہ سے چل جایا کرے گا۔ خواہشات محدود ہوں تو ایک عام ملازم کی تنخواہ میں بھی گھر چل جاتے ہیں اور مردوں کو پردیس کاٹنے، رشوت لینے اور دوسری ہیرا پھیریاں کرنے جیسی زحمتیں نہیں اٹھانا پڑتیں۔ تم ایک معمولی لیکچرار کی تنخواہ میں گزارہ کر لو گی نا؟''

اس نے اس بار سدرہ کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں دکھ کے ساتھ امید کے رنگ بھی نظر آئے۔ سرد ہاتھ میں دھیرے دھیرے پیدا ہوتی حرارت تو وہ پہلے ہی محسوس کر چکا تھا۔

''بولو.....گزارہ کر لو گی نا؟'' اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

''تم بہت اچھے ہو جبران! میں تم جیسے اچھے انسان کے لائق کہاں تھی؟'' وہ رو پڑی۔

''کون کس کے لائق ہے، یہ فیصلہ کرنے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ ہمارا بس اتنا فرض ہے کہ ہم اپنی زندگیاں دیانت داری کے ساتھ حقوق العباد ادا کرتے ہوئے گزار دیں۔'' جبران نے نرمی سے کہتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے سینے سے لگی اب وہ کچھ اور شدت سے رونے لگی تھی لیکن جبران محسوس کر سکتا تھا کہ برف کا مجسمہ زندگی کی حرارت پا چکا ہے اور زندگی نے دکھوں کو طاقت بنا کر اپنے لیے راہ نکال لی ہے۔ زندگی ہر بار اپنی راہ نکال لیتی ہے جب ہی تو یہ دنیا قائم اور آباد ہے۔

⌘⌘⌘